تجلیاتِ محمدیہ ﷺ
یعنی عقائد صوفیہ
مترجم
سید طاہر بخاری چشتی نظامی نیازی
موضع لاہور (صوابی)
صوبہ سرحد
یونیورسٹی بک ایجنسی
خیبر بازار پشاور

هوالکل

یا معین

حضرت امیر حمزہ شنواری، چشتی، نظامی نیازی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

کی

علم تصوف و سلوک پر معرکتہ الارا کتاب الموسوم بہ

تجلیات محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

(یعنی عقائد صوفیہ)

مترجمہ

سید طاہر بخاری، چشتی، نظامی، نیازی

موضع لاہور (صوابی)

صوبہ سرحد

ایڈیشن بہ ترجمہ اردو		طبع اول
تعداد		۱۰۰۰
سن طباعت		۱۹۹۸ء
مطبع		جدون پریس پشاور
زیر اہتمام		یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور
قیمت	اعلیٰ کاغذ/۵۰۰ روپے	عام کاغذ/۳۵۰ روپے
کمپوزنگ		کمپوزنگ سنٹر قصہ خوانی بالمقابل شہیدان

ملنے کا پتہ

دربار حضور سید عبد الستار شاہ باچہ جان قدس سرہ

بیرون ڈبگری دروازہ، پشاور

انتساب

میں ترجمے کی اس کتاب کو حضرت خواجہ راجہ سائیں
محمد عظیم صاحب قدس سرہ چشتی، نظامی،
نیازی کے نام نامی سے منسوب
کرتا ہوں۔
گر قبول افتدز ہے عز و شرف

جمعرات ۲۶ رجب ۱۴۱۸ھ
مطابق ۲۷ نومبر ۱۹۹۷ء

خادم و احقر
سید طاہر، بخاری، چشتی، نظامی، نیازی

اظہار تشکر

(۱) ہم جناب و محترم ڈاکٹر حیدر زمان خٹک صاحب کے بے حد شکر گزار ہیں۔ جنہوں نے "تجلیات محمدیہ" کے اردو ایڈیشن کی طباعت سے متعلق سارا خرچہ خود برداشت کیا۔ ہماری دعا ہے کہ حق تعالیٰ ان کے دین، اور دنیا کو سنوارے۔ آمین

(۲) اسی طرح ہم حمزبابا رحمتہ اللہ علیہ کے فرزند جناب مراد شنواری کے بھی تہہ دل سے شکر گزار ہیں جنہوں نے از راہ کرم "تجلیات محمدیہ" کے ترجمہ اور اشاعت و طباعت کی اجازت عنایت فرمائی۔ حق تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ آمین

سید محمد حکیم شاہ باچہ متولی دربار
حضور سید عبد الستار شاہ باچہ جان
(قدس سرہ)
بیرون ڈبگری، پشاور

سید طاہر بخاری چشتی، نظامی، نیازی
موضع لاہور (صوابی)
صوبہ سرحد

فہرست مضامین

بسم اللہ خیر الاسماء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

تمام ستائشیں اس ذات احدیت کے لئے مختص ہیں جہاں اس کی تعریف ممکن ہی نہیں اور جہاں وہ خود اپنی تعریف کرتا ہے۔ اگر چہ مرتبہ وحدت میں تمام کے تمام اسماء و صفات اس کے لئے مخصوص ہیں۔ وہی ذات احدیت جو بے نام و نشان ہے مگر مرتبہ وحدت میں اول و آخر' ظاہر و باطن بھی ہے۔ وہ اپنی احدیت میں لیس کمثلہ شیئی ہے مگر تعین وحدت میں سمیع و بصیر و قادر و علیم ہے اور وہی حیی و قیوم اپنے شیون و اعیان کو ظاہر کرنے والا بھی ہے اور فنا کرنے والا بھی ہے وہی علیم و حکیم اپنی حکمت سے اپنے بعض بندوں کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے اور بعض کو گمراہ کر دیتا ہے۔ مگر انتہائی رحیم و کریم ہے' جس نے اس جہان رنگ و بو میں اپنی طرف سے ہادی یعنی انبیاء مبعوث فرمائے اور ان برزگزیدہ ہستیوں کو نیکی' طہارت اور انسانیت کی علامتیں قرار دیا۔ لہٰذا بے شمار درود و سلام ہو اس کے پیارے حبیب' خلاصہ کائنات' مظہر اتم و اکمل' رحمتہ للعلمین' شفیع المذنبین' رسول برحق' احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جن کا نور قدسی احدیت ذات اور واحدیت کے درمیان برزخ کبریٰ ہے جو وحدت کے نام سے موسوم ہے اور یہی تعین اول ہے جہاں اس نور وحدت کا نام نامی اور اسم ذات گرامی

اللّٰہ

ہے اور یہی اسم ذات اس کے حبیب و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا رب اسم ہے۔

بے حساب و بے عدد سلام اور رحمتیں نازل ہوں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی اور داماد جناب مولائے کائنات، مظہر العجائب ولغرائب، فاتح خیبر، امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام پر جو تعین دوم میں علم امامت و خلاف کا خزانہ دار ہے اور عالم ناسوت میں شہر نبوت کے علم کا دروازہ ہے۔

بعد ازاں سب کے سب اہل بیت رسول صلی علیہ وسلم، امہات المومنین اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر خدا کی بے شمار رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں جنکی زندگی کا ایک ایک لمحہ حق سبحانہ، و تعالیٰ کی بندگی میں گذرا اور جن کی سیرت کا ایک ایک لحظہ عالم بشریت کے لئے نشان راہ اور کلید نجات ہے۔

خدا کی ان گنت رحمتیں اور برکتیں اولیائے امت کی قدسی روحوں پر نازل ہوں جو اپنی مرضی سے رضائے الٰہی کی برہنہ تلوار سے شہید ہوئے اور اپنی قابل تقلید سیرت و کردار کو بندگان خدا کے لئے جریدہ عالم پر ثبت کیا۔ اور اس طرح ان کی گفتگو، عمل و کردار اور ان کی تصنیفات و تالیفات تمام عالم بشریت کے لئے مشعل راہ ہیں۔ "تجلیات محمدیہ" بھی خدائے مہربان کے ایک برگزیدہ بندے حضرت امیر حمزہ شنواری (چشتی) رحمتہ اللہ علیہ کی ایک جامع علمی اور تحقیقی تصنیف ہے۔ اصل کتاب پشتو میں ہے اور قیام پاکستان سے قبل شائع بھی ہو چکی ہے مگر ناپید تھی چنانچہ قریباً" ایک سال ہوتا ہے کہ میرے برادر طریقت ملک عبد الرحمان کے نوجوان مگر صالح ترین فرزندوں ڈاکٹر ملک مسعود اور ڈاکٹر ملک افتخار نے مجھے آمادہ کیا کہ "تجلیات محمدیہ" کا اردو زبان میں ترجمہ پیش کروں۔ اس وقت اگرچہ میں کسی اور کام کے لئے سوچ رہا تھا ڈاکٹر ملک افتخار نے دلائل سے مجھے مجبور کر دیا اور اسی طرح میں نے ترجمے کا کام شروع کیا تاہم بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس خیال کے اصل محرک جناب محترم و سید حکیم شاہ بادشاہ (درگاہ عالیہ سیدنا عبد الستار شاہ۔ حضور باچہ جان پشاور) ہیں۔

بہر حال ۲۶ جمادی الاول ۱۴۱۶ھ بمطابق ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۹۵ء بروز جمعرات ترجمے کا کام اختتام پذیر ہوا جس کو یہ حقیر سرمایہ دارین سمجھتا ہے۔ فالحمد للہ۔

ترجمہ۔ جیسا بھی ہے نذر قارئین ہے البتہ یہاں پر چند ضروری امور پیش کئے جاتے ہیں پہلی بات یہ کہ ترجمے کے فن سے واقف احباب جانتے ہوں گے کہ اس حقیر نے بالکل آزاد ترجمہ کیا ہے اس لئے کہ لفظی ترجمہ عمداً" چیستان بلکہ معما اور پہیلی نما قسم کی چیز ہوتی ہے۔ ایسے ترجمہ کو صرف مترجم سمجھتا ہو تو سمجھتا ہو گا مگر قاری حضرات شروع سے لے کر آخر تک ساری کتاب پڑھ لیتے ہیں مگر اکثر ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ چنانچہ اس حقیر نے لفظی ترجمہ سے عمداً" دامن بچایا ہے۔ مگر ایسا کرنے میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں لکھا۔ البتہ میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ اپنی فطری تشریحی سٹائل کے پیش نظر میں نے بابا کے مفاہیم کو ترجمے کے دوران ہی تشریحی طور پر مزید واضح کیا ہے۔ میں دعوی تو نہیں کر سکتا مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے توقع رکھتا ہوں کہ اس ترجمہ میں بابا کے مشکل مفاہیم کو سمجھنے میں کسی بھی معزز قاری کو کوئی دقت نہ ہو گی۔ البتہ میں واشگاف لفظوں میں عرض کر سکتا ہوں کہ میں نے "تجلیات محمدیہ" کا انتہائی ایماندارانہ اور دیانت دارانہ (Faithful Translation) ترجمہ کیا ہے۔

ہاں! میں نے یہ ضرور کیا ہے کہ جہاں ضرورت تھی بابا کے مطالب کو کہیں کہیں مزید کھولنے کے لئے اپنے مختصر ترین جملے کو قوسین کے اندر لکھ دیا ہے۔ ایسا کرنے سے میرا مطلب محض یہ ہے کہ قوسین کے اندر لکھے ہوئے اضافی جملے بابا کے نہیں بلکہ اس ہیچ و حقیر مترجم کے ہیں۔ مگر دیکھا جا سکتا ہے کہ ایسا کرنے میں بھی نہایت احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور بلا ضرورت افراط و تفریط سے کوئی کام نہیں لیا گیا ہے۔

۔ اسی طرح قوسین کے علاوہ حسب ضرورت کہیں کہیں حاشیہ میں بھی چند ایک وضاحتیں کی ہیں اور ان کے خاتمہ پر "مترجم" یا اپنا نام لکھ دیا ہے مگر جہاں جہاں بابا نے خود

حاشیہ میں کچھ لکھا ہے تو اس کے خاتمہ پر "مولف" لکھ دیا ہے۔ تاکہ اس حقیر و فقیر اور حضرت بابا کے حاشیوں میں فرق کیا جا سکے۔

مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑھتا ہے کہ ترجمہ کی ضخیم کتاب کو میں نے دوبارہ پڑھ تو لیا ہے مگر دوبارہ لکھنے کی ہمت نہ پاکر بحال چھوڑ دیا۔ در اصل اس حقیر کی صحت ایک عرصے سے خراب ہے کمر کی تکلیف کی وجہ سے زیادہ دیر تک بیٹھنا ہوتا ہے اگرچہ اپنے محبوب و کامل مشائخ سلسلہ رضی اللہ عنہم کی توجہ سے حضرت بابا رحمتہ اللہ علیہ کی نادر کتاب "تجلیات محمدیہ" کا ترجمہ کر دیا۔ یہاں پر یہ حقیر اپنی کوتاہیوں اور خطاؤں کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ اس ترجمہ میں اگر کہیں جھول، اغلاط یا یکسانیت کا فقدان نظر آتا ہو تو اس کی بڑی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ حقیر اس کو دوبارہ نہ لکھ سکا۔ چنانچہ قارئین کرام سے گذارش کی جاتی ہے کہ اس حقیر کی کوتاہیوں سے درگذر فرمالیں۔

یہ حقیر مندرجہ ذیل برادران طریقت کا شکر گذار ہے:۔

برخورداران ڈاکٹر ملک مسعود اور ڈاکٹر ملک افتخار کا اس لئے کہ فی الاصل انہی دونوں بھائیوں نے مجھے بابا رحمتہ اللہ علیہ کی اس معرکتہ الآرا کتاب کو ترجمہ کرنے پر آمادہ کیا اور پھر وافر مقدار میں سفید کاغذ بھی لکھائی کے لئے مہیا کیا۔

اسی طرح یہ حقیر برادر طریقت جناب محبوب عالم (پشاور۔ حال ایبٹ آباد) کا بھی بے حد شکر گذار ہے جنہوں نے شیخ حضرت عبد الحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب "مدارج النبوت" (بترجمہ اردو) کا ایک مکمل سیٹ قیمتاً خرید کر اس حقیر کے حوالے کیا۔ "مدارج" کے بہت سے حوالہ جات "تجلیات محمدیہ" میں دیئے گئے ہیں اور مذکورہ کتاب سے اس حقیر کو بڑی مدد ملی۔

یہ حقیر جناب حافظ محمد ہمایوں صاحب کا بھی بے انتہا شکر گذار ہے کہ انہوں

نے قرآنی آیات کی محنت طلب تلاش میں بڑی مدد فرمائی۔ حافظ صاحب میرے پوچھتے ہی مطلوبہ آیت کی رکوع اور سورہ مبارکہ وغیرہ کی نشاندہی فرماتے اور اس طرح اس حقیر کا کافی وقت آیتوں کی تلاش میں صرف ہونے سے بچ گیا۔ حافظ صاحب علاقہ رستم و سدوم کے رہنے والے ہیں۔ اور ماننا پڑتا ہے کہ قرآن مجید کے ایک اچھے اور مستند حافظ ہیں۔ خدا ان کو جزائے خیر دے۔

برادر طریقت اورنگ زیب (لاہور۔ صوابی) نے "تجلیات محمدیہ" کا اصل پشتو نسخہ مہیا کیا اور یہ ترجمہ اسی نسخہ سے کیا گیا ہے یہ حقیر ان کا بھی بے حد شکر گذار ہے۔

سب سے آخر میں یہ حقیر و فقیر جناب سید حکیم شاہ بادشاہ صاحب کا بھی انتہائی شکر گذار ہے کہ فی الحقیقت انہیں کے ایماء اور تجویز پر "تجلیات" کا ترجمہ کیا۔ گیا اور اب وہ دوبارہ اس کی اشاعت و طباعت کا بیڑہ اٹھا رہے ہیں۔

حقیر:۔

سید طاہر چشتی۔ نظامی۔ نیازی

۲۶ جمادی الاول ۱۴۱۶ھ

۲۲۔ اکتوبر ۱۹۹۵ء

بسم اللہ الرحمان الرحیم

مقدمہ

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض علمائے ظاہر نے ہر دور میں اولیائے کرام کی مخالفت کی ہے۔ ان میں سے بعض علماء ایسے بھی تھے جو خالصتاً حق تعالیٰ اور تحفظ شریعت اسلام کے لئے مخالفت کیا کرتے تھے۔ مگر ان میں اکثریت ایسے علمائے ظاہر کی تھی جو محض حسد، بغض اور ناواسنگی کی وجہ سے اولیائے کرام کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ مگر دور حاضر کی تو بات ہی اور ہے کیونکہ اب تو علمائے ظاہر کا کام ہی صوفیائے کرام پر کفر کے فتوے صادر کرنا رہ گیا ہے۔ بخدا میں یہ نہیں کہتا کہ بحیثیت مجموعی تمام علماء ایک جیسے ہیں حاشا وکلا بلکہ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ان میں اکثریت علمائے سوء کی ہے اور علمائے حق کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اسی طرح اولیائے کرام بھی بمصداق حدیث "قدسی" اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم غیری "قبائے الٰہی میں پوشیدہ ہیں اور انہیں حق تعالیٰ کے بغیر کوئی نہیں جان سکتا۔ پھر بھی علمائے ظاہر کی مخالفت اتنی نقصان دہ چیز نہ تھی۔ کیونکہ ان مخالفین کے مقابلے میں بعض خدا کے بندے ایسے بھی تھے اور ہیں جو صدق دل سے صوفیائے کرام کی حمایت کرتے چلے آئے ہیں۔ مگر اس سے قطع نظر ہمارے دور میں ایک ایسے فتنے نے جنم لیا ہے جو تمام مذاہب عالم کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہا ہے اور یہ بلائیں نیچریت، دھریت اور لامذہبیت کے فتنے ہیں۔ غضب یہ کہ یہ تمام فرقے حق تعالیٰ کی برحق ہستی سے انکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ صرف مادہ ہی کو سب کچھ جانتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ ہر چیز مادہ کی محتاج ہے۔ بقول ان کے مادہ ہی قدیم ہے۔ کہتے ہیں کہ ابتداء میں یہی

مادہ آگ کے ایک گولے کی مانند حرکت پذیر تھا اور بعد ازاں مادے کی حرکت اور ترکیب سے موجودات ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ یہ لوگ قیامت کے بھی منکر ہیں۔ ان کے نزدیک ماں اور بیٹی میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی جاتی۔ بقول ان کے مخلوقات عالم مادے کی پیداوار ہیں اس لئے ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی مرضی سے مادے کو کام میں لائے۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کو اپنی بہن پسند آگئی تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے رکھ لے۔ تعجب یہ کہ حق تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرنا یہ لوگ ایک کمزوری سے تعبیر کرتے ہیں۔ طرفہ یہ کہ نیچری لوگوں کا "رہنما" ڈارون تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ انسان نے بندر کے روپ سے ترقی کر کے انسان کی صورت اختیار کی ہے۔ گویا موجودہ انسان پہلے پہل بندر کی شکل میں تھا۔ آج کل اگرچہ اس عقیدے کے لوگ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں مگر ان کی اکثریت روس میں ہے ہندوستان (برصغیر پاک و ھند) میں بھی موجود ہیں۔ صوبہ سرحد اور پنجاب میں بھی پائے جاتے ہیں۔ تاہم اپنے مفسدانہ عقائد کا برملا اظہار نہیں کرتے۔ انہی میں سے بعض تو دین اسلام کے بڑے ہمدرد دکھائی دیتے ہیں بلکہ ایسے لوگ اسلام کی حمایت میں لمبی چوڑی تقریروں اور تحریروں کا اہتمام بھی کرتے ہیں مگر ایسا کرنے سے ان کا مطلب دام فریب پھیلانا ہے۔ نیچری عقائد سے ہندوستان (برصغیر پاک وھند) کے مذاہب پر کافی منفی اثر پڑا ہے یہاں تک کہ سرسید احمد خان (بانی علی گڑھ کالج) اور مرزا غلام احمد قادیانی (جو نبوت اور مہدیت کا مدعی تھا) نے انبیائے کرام کے معجزات کے ضمن میں عجیب و غریب تاویلات پیش کیں ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ نیچری لوگوں کے اعتراضات بہت سخت تھے اور یہ دونوں ان کو بھرپور جوابات دینے سے معذور تھے۔ مثلاً" اصحاب کرام' تابعین اور تبع تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ آپ بنا باپ کے محض خدا کے حکم سے پیدا ہوئے تھے اور بعد ازاں وجود

عنصری سمیت حق تعالیٰ نے آسمان پر اٹھا لیے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر سرسید مرحوم اور مرزا صاحب نے کچھ تو خود غرضی اور کسی قدر بے علمی کی وجہ سے قرآنی آیات کی تاویلات پیش کیں اس لئے کہ اگر مرزا صاحب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع جسمانی کو تسلیم کرتے تو پھر بزعم خود۔ "مسیح موعود" ثابت نہ ہوتے یا بالفرض اگر کوئی یہ کہہ دیتا کہ عیسیٰ علیہ السلام تو خدا کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے تھے اب اگر تم (مرزا صاحب) مسیح موعود ہو تو زیادہ نہ سہی صرف ایک مردہ کو زندہ کر دکھا دو تو ظاہر ہے کہ مرزا صاحب مشکلات میں پھنس کر رہ جاتے۔ دوسری جانب نیچری لوگ بھی قانون فطرت کے مطابق اس بات کا ثبوت مانگتے تھے کہ کوئی شخص بغیر باپ کے کیسے اور کس طرح پیدا ہو سکتا ہے! اور نیز کیسے آسمان کی بلندیوں تک چڑھ سکتا ہے! یا مردہ کو کس طرح زندہ کر سکتا ہے! (مطلب یہ کہ) سرسید مرحوم اور مرزا صاحب کے لئے ضروری تھا کہ وہ سکوت اختیار کرتے اور کلام الٰہی میں تحریف نہ کرتے۔ مگر افسوس کہ مرزا صاحب کو نبوت و مہدیت کے دعوی کے باوصف یہ علم ہی نہ تھا کہ کچھ عرصہ کے بعد یہی نیچری لوگ اس بات کو خود بھی تسلیم کر لیں گے کہ واقعتاً" کسی باپ کے بغیر بھی اولاد پیدا ہو سکتی ہے جیسے آج کل کے نیچری خود ھی پورے دعوے سے کہتے ہیں کہ اگر انجکشن کے ذریعے رحم مادر میں منی منتقل کر دی جائے تو صحیح و سلامت اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ (متاسفانہ) یہ لوگ نیچریوں سے اس قدر مرعوب ہو گئے کہ اول تو انہوں نے قرآنی آیتوں کو اپنی مرضی سے بدل ڈالا۔ مثلاً" آنحضرت ﷺ نے پیشن گوئی فرمائی تھی کہ دجال ایک آنکھ سے کانا ہو گا، گدھے پر سوار ہو گا اور اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام باب لد میں قتل کریں گے (چنانچہ) اس کی تاویل مرزا صاحب نے یوں کی ہے کہ دجال سے مراد اس زمانے کے پادری یا عیسائی مبلغ ہیں اور ان کا گدھا موجودہ ریل گاڑی ہے۔ (کوئی مضائقہ نہیں اگر خود مرزا صاحب بھی ریل گاڑی کی

سواری کا لطف اٹھا چکے ہوں) کانی آنکھ کا مفہوم یہ لیا گیا کہ اس کی دنیائی آنکھ بینا ہو گی لیکن آخرت کی آنکھ اندھی ہو گی۔ (اسی طرح) سرسید مرحوم نے ملائک کے وجود کی تاویل یہ پیش کی کہ کہ وہ خدا کی (مختلف) طاقتیں ہیں۔ مثلاً" انسان کی قوت متخیلہ یا قوت شہوانیہ سب کے سب ملائک ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر یوں کی کہ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام محسوس فرما رہے تھے کہ ان کے پدر بزرگوار اور سارے بھائی ان کی ناز برداری فرماتے تھے تو یہی خیالات جوں کے توں ان (حضرت یوسف) کو خواب میں متشکل ہو گئے۔ پھر بھی سرسید مرحوم نے اسلام کی بڑی خدمت کی اور مسلمانوں کے لئے ایک اسلامی درس گاہ قائم کی۔ تاہم انہوں نے مسلمانوں کے درمیان جھگڑے اور نفاق پیدا کئے۔ قرآن مجید کی آیتوں میں تحریف کی نسبت یہ بات کئی گنا بہتر ہوتی کہ سرسید مرحوم سکوت فرماتے۔ کیونکہ اب تو وہ نیچری بھی قدرت خداوندی کو دیکھ کر حیران ہیں جن کا کہنا تھا کہ بغیر باپ کے اولاد پیدا نہیں ہو سکتی۔ پہلے یہ لوگ اس حقیقت سے انکاری تھے کہ عرب کے ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایران اور روم کے غائبانہ واقعات سے کس طرح باخبر رہ سکتے تھے۔ مگر اب یہی نیچری اس حقیقت کے امکان کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ کیونکہ اب وہ یہ دیکھ کر اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ ہر ایک شخص پشاور شہر میں بیٹھ کر براڈ کاسٹنگ کے ذریعے روس اور لندن کی باتیں سن سکتا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہاں پر یہ اعتراض کرلیں کہ یہ سب کچھ تو مشینی کمالات کے کرشمے ہیں۔ تو آسان الفاظ میں ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ جو انسانی دماغ اس قسم کے محیر العقول ایجادات متعارف کرنے پر قادر ہے تو یہی انسان ریاضت و مجاہدہ کے ذریعے بھی یہی قوت حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہ تو خود نیچری لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ابھی تو مادی ترقی اپنے ابتدائی مرحلہ میں ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ آئندہ ادوار میں ارتقاء کی صورت کیا سے کیا ہو

جائے گی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہی انسانی دماغ مستقبل میں دنیا کو انواع و اقسام کی ایجادات سے روشناس کرائے گا۔

یہاں پر یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ فی الاصل یہ وہی "دماغ" ہے جس کو حق تعالیٰ اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انی جاعل فی الارض خلیفتہ۔ خلق الانسان فی احسن تقویم او خلق اللّٰہ آدم علی صورتہ کی بابرکت اوصاف سے یاد فرمایا ہے اور اس عنایت خداوندی میں مذہب و ملت کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی گئی ہے۔(نکتہ یہ ہے) کہ قرآن حکیم کسی شک و شبے کے بغیر ام الکتاب ہے اور یہ ان لوگوں کو فائدہ دیتا ہے جو اس پر عمل کرتے ہیں۔ اگرچہ دور حاضر کا سائنس دان اپنی زبان سے قرآن حکیم کی حقانیت کا اقرار نہیں کرتا مگر دوسری طرف اس کے ارشادات پر عمل پیرا ہے اور اگرچہ وہ قرآن حکیم کی روحانی تعلیمات سے کوئی استفادہ نہ کر سکا مگر اسی قرآن حکیم سے بے پناہ مادی فائدہ ضرور اٹھایا ہے (اگرچہ) متاسفانہ طور پر مسلمان قرآن حکیم کے ہر دو فوائد سے محروم رہ گئے ہیں۔ مسلمانوں نے و انتم الاعلون ان کنتم صادقین پر عمل نہ کیا چنانچہ خسرۃ الدنیا والاخرۃ کا مصداق ہو گئے۔ لے دے کے ہمارے پاس یہی رہ گیا ہے کہ اپنے علماء اور اولیاء کی توہین اور تذلیل کرتے رہا کریں یا اپنی نفسانی خواہشات کی خاطر قوم و ملت کا بیڑہ غرق کریں۔ (تعجب ہے) کہ منکرین ذات خداوندی نے قرآنی ارشادات پر عمل کیا اور کہاں سے کہاں تک مادی ترقی کی جبکہ مسلمانوں کے دلوں سے اپنے اسلاف کی عزت رخصت ہو گئی۔ طرفہ یہ کہ آج کل جونہی بی۔اے کر کے کالج سے نکلتا ہے تو حالت یہ ہوتی ہے کہ اپنے والدین کو بدتہذیب سمجھتا ہے یہاں تک کہ آسمانی ملائک کے وجود سے انکار کر لیتا ہے اور اسی طرح ہستی باری تعالیٰ کو بھی موہوم سمجھتا ہے۔ اب اگر ان کو الست بربکم قالوا بلیٰ کی آیت اور ساتھ ہی اس

کا مفہوم اور مضمون بھی پیش کیاجائے کہ ابتدائے آفرینش میں حق تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت مبارک سے تمام ارواح کو باہر نکال کر ان سے استفسار فرمایا کہ "کیا میں تمہارا رب نہیں" انہوں نے کہا "ہاں! تو ہی ہمارا رب ہے اور ہم سب گواہ ہیں" تو جدید تعلیم یافتہ اس کو نہ صرف فضول بلکہ خلاف از عقل قرار دے دیتا ہے لیکن اگر سائنس کے کمرہ میں اس کا استاد پانی کے ایک قطرہ کے متعلق یہ سبق پڑھائے کہ اسی ایک قطرہ میں لکھوکھا جراثیم موجود ہیں جو صرف خورد بین کے ذریعے نظر آجاتے ہیں جبکہ ان کے علاوہ لاکھوں جراثیم اسی ایک قطرہ میں اور بھی موجود ہیں مگر ان کو ملاحظہ کرنے کے لئے ایک مخصوص خورد بین کی ضرورت ہے (جو ابھی تک ایجاد نہیں ہوا) تو جدید تعلیم یافتہ فوراً ان باتوں کو تسلیم کرلیتا ہے۔ اگر یہ لوگ کہدیں کہ سائنس کے استاد کے فرمودات کا تو ہم باقاعدہ طور پر خورد بینی شیشہ کے ذریعے مشاہدہ کرتے ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کا معاملہ محض ایک قصہ کہانی ہے کیونکہ اسے تو کسی نے بھی نہیں دیکھا ہے تو یہاں پر ہمارا سوال ہوگا کہ چنار کا درخت جس تخم سے پیدا ہوتا ہے بظاہر تو یہ تخم ایک ذرہ سا دانہ ہوتا ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس ذرہ سے دانے (تخم) سے ایک عظیم درخت پیدا ہو جاتا ہے جس کے لاکھوں پتے، شاخیں اور جڑیں ہوتی ہیں۔ اب بتایا جائے کہ تخم کے ذرہ برابر دانے میں اس قدر کثیر اجسام کہاں سے آگئے۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہدے کہ چنار کا درخت زمینی اثرات سے پرورش حاصل کرلیتا ہے (اور بڑے سے بڑا درخت معرض وجود میں آجاتا ہے) تو ہم یہ جواب دینا پسند کریں گے کہ جس مقام پر چنار کا درخت اگ کر بڑا درخت بن گیا ہے تو اسی محل میں اگر ارہنڈ کا درخت بویا جائے اور اس کا ملاحظہ کیا جائے تو ظاہر ہے کہ روئیدگی اور پرورش کی جس قدر استعداد ارہنڈ کے پودے میں موجود ہو گی اسی اندازے کے مطابق یہ پودا پھلے پھولے گا۔ نہ کم نہ زیادہ۔ تو مراد یہ کہ اس سے یہ امر

ثابت ہو گیا کہ چنار کے تخم اور ارھنڈ کے دانے میں روئیدگی اور بڑھ کر درخت بننے یا پودا بننے کے جملہ اجزاء ایک قادر مطلق نے رکھ دیئے ہیں۔ (جس سے کوئی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا)۔

غرضیکہ نیچریوں کے باطل عقائد سے ہمارے نادان طالب علم مرعوب ہو گئے ہیں جن کے اثرات دور دور تک پھیل گئے ہیں۔ مگر (قدرت خداوندی ملاحظہ فرمایئے) کہ اب تو سائنس دانوں کی اکثریت حق تعالیٰ کے وجود مطلق کے قائل ہو گئی ہے۔ اب تو وہ بھی روح انسانی کو تسلیم کرتے ہیں (کہنے کا مطلب یہ کہ) مرزا صاحب اگر سکوت اختیار کرتے تو وقت اور زمانہ خود ہی دھریوں کے اعتراضاف کا جواب مہیا کرتا۔

ممکن ہے بعض لاہوری مرزائی صاحبان یہ کہدیں کہ "مرزا صاحب نے تو نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو محض مجددیت کے دعویدار تھے باقی انہوں نے جو کچھ کیا ہے قرآنِ مجید کے مطابق کیا ہے" مگر سوال یہ ہے کہ اگر ہم کسی مجدد کے آنے کے متعلق حدیث مبارکہ کو درست تسلیم کرلیں تو سوال یہ ہو گا کہ ایک مجدد کے لئے کونسا رنگ یا اصول اختیار کرنے کی ضرورت ہو گی۔ اگر مجدد کا فرض منصبی یہ مان لیاجائے کہ وہ مسلمہ اصولوں میں بھی گڑ بڑ پیدا کرے یا نص صریح کی مخالفت کرے۔ تو ایسے مجدد اور اس کی مجددیت کی کونسی وقعت اور ضرورت رہ جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مجدد تو زیادہ تر کام روحانیت سے لیتا ہے کیونکہ ظاہری استدلال سے تو قطعاً عوام کی توجہ اس کی طرف مبذول نہیں ہوتی۔ اور دلیل و استدال تو ایسی چیز ہے کہ قیامت تک ختم نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہ کہ مرزا صاحب کے معاملہ میں رمق بھر روحانیت بھی موجود نہیں۔ زمانے کے مطابق جب عقلی دلائل ان کے ہاتھ نہ آئے تو اس کے برعکس قرآن شریف اور احادیث کی تاویلات پیش کیں اور سمجھے کہ چھٹکارا حاصل کرلیا اب اگر ان سے کوئی یہ پوچھے کہ آپ نے دجال کو کیسے قتل کیا۔

تو کہتے ہیں کہ میں نے "دلائل" کے زور سے اس (موجودہ عیسائیت) کو باطل ثابت کر دیا۔ یعنی عیسائیت کے عقائد کو دلائل کے ساتھ "قتل" کر دیا۔ چلو اگر آپ نے دلیل کے ساتھ ان کے عقائد کو قتل کر دیا ہوتا تو پھر لازمی تھا کہ عیسائیت یکسر فنا ہو جاتی یا تھوڑی سی رہ گئی ہوتی۔ (مابقایا ختم ہو جاتی) ذرا غور فرمائیے کہ اس وقت سے اس وقت تک لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے عیسائیت قبول نہیں کی ہے۔ اور کیا اس میں روز بروز اضافہ نہیں ہو رہا۔ اگر صرف زبانی کلامی تردید عیسائیت کی قتل کے مترادف ہو تو تم سے بہت پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احسن اور مکمل طور پر قتل کر دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنھم اور اماماں امت نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی اور آپ کی کوئی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ ظاہرا" آپ کی تاویلات خود غرضی پر مبنی تھیں۔ کیا مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ' شیخ عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ حجتہ الاسلام امام غزالی رحمتہ اللہ علیھم کے زمانوں میں نیچری لوگ موجود نہ تھے۔ خصوصا" امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کے دور میں تو حالت ہی اور تھی تو کیا انہوں نے قرآن مجید کی آیتوں کی تاویلات یوں کی ہیں جس طرح مرزا صاحب نے کی ہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ مندرجہ بالا حضرات کرام کو مرزا صاحب بھی مجّددین تسلیم کرتے ہیں۔ (سوال یہ ہے) کہ کیا اس زمانہ میں نیچریوں کے دلائل کچھ اور تھے اور اب کچھ اور ہیں۔ (ظاہر ہے) کہ نیچری پہلے بھی مادے کے معتقد تھے اور اب بھی ہیں۔ پہلے بھی وجود خداوندی کے منکر تھے اور اسی طرح آج تک منکر ہیں۔ کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ طبعیت ہی سب کچھ خود بخود کرتی ہے۔ مثلا" ڈارون کے معتقدین کا کہنا ہے کہ وجود انسانی کی تمام ضروریات طبعیت خود پورا کرتی ہے اور جس چیز کی ضرورت محسوس نہ کرے اسے چھوڑ دیتی ہے۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ ہم نے چند کتوں کی دمیں کاٹ دیں بعد ازاں ان کے بچوں کی دمیں بھی کٹوا دیں اور اسی طرح

طبعیت نے بھی یہ بات محسوس کر لی کہ بغیر دم کے بھی جسم مکمل ہوتا ہے اور اس کی (دم کی) کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اس کے بعد ان دم کٹے کتوں کے دم کٹے بچے پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ (اور تعجب یہ کہ) عقل کے اندھوں نے فوراً" یہ بات تسلیم کر لی۔ مگر انہوں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ گویا طبعیت اتنی غافل اور جاہل ہے کہ اسے پہلے سے دم کی عدم ضرورت کا احساس ہی نہ تھا۔ مگر جب بار بار دبائی گئی تو کہیں جا کر اسے (طبعیت کو) خیال آیا کہ آئندہ کے لئے دم نہ پیدا کرے گی۔ بالفرض اگر ان لوگوں کے اس مفروضہ کو ہم مان لیں کہ کچھ عرصہ تک قطع و برید کے بعد بغیر دم کے کتے پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ تو دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ یہود اور مسلمان ہزار ہا سالوں سے بچوں کا ختنہ کرتے آ رہے ہیں۔ مگر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان ہزارہا سالوں میں طبعیت نے یہ بات محسوس نہ کی کہ آئندہ کے لئے یہودیوں اور مسلمانوں کے بچے مختون پیدا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ طبعیت نے یہودیوں اور مسلمانوں کی اس ضرورت کو کیوں محسوس نہ کیا۔ دوسری بات یہ کہ ہندوستان (برصغیر پاک وہند) کشمیر اور افغانستان کی عورتیں ہزارہا سالوں سے زیورات ڈالنے کے لئے اپنی ناکوں اور کانوں میں چھید (سوراخیں) ڈالتی ہیں۔ مگر یہاں بھی طبعیت نے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ کہ عورتوں کی ناکوں اور کانوں میں خود بخود سوراخیں پیدا ہوں۔ اگر طبعیت لوگوں کی ضروریات سے اس قدر واقف ہے اور ان کی ضروریات کا متکفل بھی ہے تو آخر وہ کونسی وجہ ہے کہ دھری لوگوں کے کتوں کے لئے تو دم کی عدم ضرورت محسوس کر لی اور باقی دنیا کے لئے محسوس نہ کی۔

دھری لوگ ایک اور ثبوت بھی پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جو خوراک یا کھانا انسان یا حیوان کھاتا ہے۔ تو صرف طبعیت ہی اسے ہضم کراتی ہے۔ اور اسی غذا سے طبعیت ہی خون، صفرا، بلغم اور فضلہ بناتی ہے۔ (حیرت تو یہ ہے کہ) اگر

بعیت اتنی عالم ہو تو وہ اس خوراک سے انسان یا حیوان کو پہلے ہی منع کیوں نہیں کرتی جے اکثر وہ کھا کر سخت بیمار ہو جاتا ہے۔ بلکہ نتیجتاً" کبھی کبھی تو مر بھی جاتا ہے۔ نیچری فرقہ کی مثال ایسے ضرر رساں جراثیم کی طرح ہے کہ اگر وہ دنیا کے دیگر فرقوں پر غالب آگیا تو یہ فرقہ امن عالم کو تہہ و بالا کر دے گا۔ کسی قسم کی حکومت بھی قائم نہ رہ سکے گی۔ وجہ یہ ہے کہ جب باری تعالیٰ کی ہستی کو موہوم ثابت کرنے کی کوشش کی جائے تو سزا و جزا اور قیامت پر ایمان لانے کا سوال بھی نہ رہے گا نہ اس کی ضرورت محسوس ہو گی۔ (مزید برآں) دھریوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ مادے سے بہرحال اور بہر طور فائدہ اٹھانا چاہیے (اور خدا نخواستہ اگر حالت یہ ہو) تو کمزور لوگوں کا تو خدا ہی حافظ ہو گا کیونکہ ہر جگہ لوٹ مار، ظلم و غضب اور زنا کاری وغیرہ شروع ہو جائے گی۔ اس لئے کہ کسی جرم کی سزا کا تو کوئی خوف نہ ہو گا اور کوئی منع کرنے والا بھی نہ ہو گا تو لازماً" اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تھوڑے ہی عرصے میں دنیا کا رنگ ہی بدل جائے گا یعنی پھر تو جس کی لاٹھی ہو گی بھینس بھی اسی کی ہو گی اور اگر کسی شخص کو اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں تامل ہو تو وہ روس، یورپ اور بعض دوسرے مقامات کے اخبارات کا مطالعہ کرے اسے خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ نیچریوں نے نیچریت کو فروغ دینے کے لئے ایسی کمپنیاں بنائیں ہیں جن میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شامل ہیں اور ان میں سے کسی عورت کو معلوم نہیں کہ اس کا خاوند کون ہے۔ اور اگر کسی عورت سے پوچھا جائے کہ تیرا خاوند کون ہے۔ تو وہ کہہ دیتی ہے کہ میرا خاوند "کمپنی" ہے اور جو بچے ایسی عورتیں جنتی ہیں تو وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم "کمپنی" کے بیٹے ہیں۔ اور ان فحشیات میں اضافہ اس لئے ہوا ہے کہ نیچری لوگ مادہ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور حق تعالیٰ کی ہستی سے انکار کرتے ہیں۔ جیسے ہم نے گزشتہ سطور میں کہا ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ سورج، چاند، ستارے اور زمین بلکہ سب کچھ مادہ کی پیداوار ہیں ان کا کہنا

ہے کہ مادہ کی طبیعت سے ہر قسم کی چیزیں خود بخود پیدا ہوتی ہیں اور جب ایک وجود مٹ جاتا ہے تو اس سے دوسرا وجود معرض وجود میں آجاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر مادہ کی ذات فنا نہیں ہوتی۔ یہ لوگ قیامت کو بھی نہیں مانتے۔ مثلاً" کہتے ہیں کہ پہلے پہل مادہ آگ کے ایک تپتے ہوئے گولے کی مانند تھا۔ اور ایک لحاظ سے ہم بھی اس بات کو مانتے ہیں۔ اس طرح کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے چہرہ نور سے نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا فرمایا تو یہی نور ایک جوہر یا ایک نورانی موتی کے مانند تھا جب حق تعالیٰ نے اس نور کو محبت بھری نگاہ سے دیکھا تو وہ جوہر پسینہ پسینہ ہو گیا اور بعد ازاں پسینے کے ان قطروں سے مخلوقات الٰہی کی تخلیق عمل میں آگئی۔ اب عالم وجود کا مکمل طور پر جائزہ لینا چاہیے یعنی ہر وجود کی موزونیت اور مناسبت کو جانچنے کے بعد نیچریوں کے اس دعوے کا بغور تجزیہ کرنا چاہیے کہ بقول ان کے مادہ ایک بے عقل چیز ہے اس میں کوئی عقل یا حس موجود نہیں۔ چنانچہ اب صاحبان عقل کو غور کرنا چاہیے کہ جب ایک چیز کی ذات ہی میں عقل نہ ہو تو ترکیب کے بعد اس میں عقل کہاں سے آگئی۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج

تاثریا مے رود دیوار کج

جواب کے طور پر اگر نیچری لوگ یہ کہدیں کہ جس طرح مقناطیس میں اثر خود بخود ہوتا ہے (اسی طرح مادہ میں بھی اثر پیدا ہو جاتا ہے) مگر حقیقت یہ ہے کہ مقناطیس میں تو اثر خداوند برتر نے پیدا کیا ہے۔ جبکہ مادہ صرف .... ایک جنس ہے اور تب تک چیزوں کو ترکیب نہیں دے سکتی جب تک کوئی دوسری جنس اس کے ساتھ مل نہ جائے۔ کیونکہ ایک شے تو محض ایک شے ہوتی ہے اور اگر اسکی ذات یا جنس سے کسی قسم کا اظہار ہوتا ہو تو وہ محض اس کی اپنی ذات کا اظہار ہو گا۔ مثلاً" اگر ایک گلاس

میں پانی ڈال دیا جائے اور جب تک اس کے ساتھ کوئی دوسری چیز شامل نہ کی جائے تو اس گلاس سے پانی ہی باہر نکلے گا بالفاظ دیگر اس سے دودھ ہرگز نہ نکل سکے گا۔ وجود کے لئے اگر اسی ایک ہی چیز کو لیا جائے تو پھر اس کے لئے علت فاعلی کی ضرورت پیش آئے گی۔ (مطلب یہ کہ) اہل عقل کے نزدیک "اتفاق" کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (یعنی یہ سب کچھ "اتفاقاً" پیدا نہیں ہوا) کیونکہ ہر کام کے لئے چار علتوں کی ضرورت ہے (۱) علت مادی (۲) علت صوری (۳) علت غائی (۴) علت فاعلی۔ اب دیکھئے انسانی وجود کی علت مادی مٹی یا خاک ہے۔ اس کی علت صوری انسانی قدو قامت اور اس کی شکل صورت ہے۔ علت غائی کا تقاضہ ہے کہ انسان مادی اور روحانی دونوں طرح سے عروج و ترقی حاصل کرے اور آخر میں انسانی وجود کی علت فاعلی حق تعالیٰ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی چیز خود بخود ہرگز نہیں بنتی اور ان معنوں میں ہر چیز علت کی محتاج ہوتی ہے۔ (ان حقائق کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو) عقل بلا تامل یہ بات تسلیم کرتی ہے کہ جب پہلے پہل مادہ حرکت پذیر تھا تو یقیناً" ایک محرک (حق تعالیٰ) موجود تھا اور وہی محرک (ذات الٰہی) مادے کو حرکت دے رہا تھا۔ دوسری بات یہ کہ جب مادے نے ترکیب شروع کی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ بغیر عقل کے ترکیب دینے کا مرحلہ کیسے طے کیا۔ (وجہ یہ ہے) کہ ترکیب دینے کے لئے تو علم و عقل دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ (مثال کے طور پر) جب کوئی شخص اپنے لئے مکان تعمیر کرتا ہو۔ تو سب سے پہلے اپنے خیال میں اس مکان کا نقشہ بنا لیتا ہے اور پھر کہیں جا کر مکان تعمیر ہو جاتی ہے۔ مگر اس قسم کی عقل تو سرے سے مادہ میں موجود ہی نہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے نیچری بھی انکار نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر (ہم ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ) انسانی معدہ، دل، گردے، جگر اور دماغ وغیرہ وغیرہ میں سے ہر ایک انسانی جسم میں مخصوص افعال کے لئے پیدا کئے گئے ہیں تو مادے کو کیا علم تھا کہ ان اعضاء کی ساخت

یا فرائض ایسے ہونے چاہییے (جبکہ اس میں عقل ہی نہ تھی) دوسری بات یہ کہ جس
انڈے سے پرندے کا بچہ پیدا ہوتا ہے مثلاً" مرغے کو لے لیجیے تو اس کے بارے میں
مادے کو کونسی معلومات حاصل تھیں کہ ایک مرغے کے لیے ایسی آنکھیں، پنجے، پر اور
کسوڑہ (جورہ) کی ضرورت ہوگی۔

مقصد یہ کہ حکماءٔ وجود انسانی کو جملہ حکمتوں کا مخزن تسلیم کرتے ہیں او ران
کے نزدیک وجود انسانی اتفاقاً" پیدا نہیں ہوا بلکہ ایک زبردست عالم نے اسے ترکیب دی
ہے۔ اب اگر صاحبان عقل وجود انسانی کے متعلق خصوصاً" اور وجود حیوانی کے متعلق
عموماً" غور فرمائیں تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ علم و علمیت کے بغیر کوئی بھی ایسے
وجود تخلیق نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ مادہ جو ایک بے علم اور بے عقل چیز ہے تو وہ کس
طرح حکمت سے بھرپور اور مکمل وجودوں کو پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ دھریوں کی یہ بات
بھی غلط ہے کہ یہ ساری کاروائی مادے کی طبعیت کرتی ہے جو مادے سے خود بخود پیدا
ہوتی ہے۔ لیکن ہم نے ابتدا ہی میں یہ بات ثابت کی ہے کہ طبعیت بھی بجائے خود
ایک جاہل چیز ہے۔

پختون بھائیو! یہ تھے دھریوں کے باطل عقائد جس کا ایک نمونہ ہم نے آپ
کے سامنے پیش کر دیا۔ اب آپ خود ہی غور فرمائیں کہ اس قسم کے عقائد کس حد
تک خطرناک ہیں (کیونکہ) لامذہبیت پوری شدت سے پھیل رہی ہے۔ قیامت کے آثار
نمودار ہو گئے ہیں (اس لئے) کہ مسلمانوں کے دلوں سے محبت اور مروت کے جذبات
رخصت ہو چکے ہیں محبت تو رہی ایک طرف وہ تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے
ہیں۔ بھائی، بھائی سے اور باپ بیٹے سے بیزار ہے۔ علمائے امت ایک دوسرے پر فسق
اور کفر کے فتوے صادر فرما رہے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انہوں نے
طاق نسیان ۔ ۔ حوالے کیا ہے۔ چنانچہ ضرورت ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی آپس میں

اتفاق و محبت سے رہیں اور اپنے مقدس دین اسلام کی مکمل پیروی کریں۔ میں نے یہ کتاب پشتو زبان میں آپ کے لئے لکھی ہے اور اس میں اسلامی تصوف اور چشتیہ مسلک کا ذکر ہے مگر مجھ جیسے بے علم شخص کو وہ قوت حاصل نہیں جو تصوف کے باریک ترین نکات اور ادق ترین مسائل بیان کر سکے۔ میری بے علمی اور کم مائیگی میرے دوستوں سے مخفی نہیں اور اس کتاب کو لکھنے کے متعلق مجھے اپنے مرشد پاک فخر العلماء الاولیا حضرت سید عبد الستار شاہ صاحب قبلہ چشتی' نظامی' نیازی (حال پشاور) قدس سرہ کی طرف سے اشارہ ملا اور اپنی کم علمی کے باوجود یہ کتاب لکھدی۔ میں نے اپنی کم علمی کا اقرار قبل ازیں کیا ہے پھر بھی اگر علمی لحاظ سے یہ کتاب پسند کی گئی اور پختون قوم کو اس سے کچھ علمی فائدہ پہنچ گیا تو یہ محض میرے مرشد پاک (قدس سرہ) کی توجہ اور دعا کا اثر ہو گا کیونکہ تصوف ایک ایسا علم ہے جس کے متعلق امام رازی رحمتہ اللہ علیہ بھی حیرت زدہ تھے۔

فن التصوف ما ادق بیانه

متحیر فیه الامام رازی

تصوف کی حقیقت اور ثبوت کے بارے میں متعدد آیات و احادیث موجود ہیں۔ جن میں سے چند ایک مشتے از نمونہ' خروار پیش کرتا ہوں قال اللہ تبارک و تعالٰی ۔۔ یا ایھاالذین امنوادخلوافی السلم کافته (بقرہ آیت ۲۰۸)

اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو (جاؤ) پورے پورے اسلام کے دو مطالب ہیں یعنی ایک اس کا ظاہری حصہ اور دوسرا باطنی۔ ظاہری حصہ میں کلمہ پڑھنا۔ زکوۃ دینا' روزے رکھنا اور حج کی ادائیگی کو ماننا' اور ان کے متعلق مسائل کو سمجھنا' نماز پڑھنا' حق تعالٰی کی ذات و صفات' فرشتوں' آسمانی کتابوں اور جو شرائط ایمان کی ہیں ۔۔ اپنی زبان سے ان کا اقرار کرنا شامل ہیں۔ جبکہ اس ایت مبارکہ کے باطنی مطالب میں

تزکیہ قلب یعنی دل کو تمام آلائشوں سے پاک کرنا اور اسے حد کمال تک پہنچانا ہے۔
قال اللہ تعالیٰ۔ ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ و لو کرہ المشرکون (۱)(التوبہ) اور اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم ایتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتب والحکمتہ (۲) (آل عمران)

اس ایت مبارک میں "تزکیہ" کا ایک لفظ آیا ہے اور فی الحقیقت یہی تصوف کا اصل الوصول ہے اسی طرح جہاں تک ایت مبارک میں لفظ کتاب کا تعلق ہے

---

(۱) یہ آیت مبارک سورہ مبارکہ الصف میں اسی طرح نازل فرمائی گئی ہے البتہ سورہ مبارک الفتح میں وکفی باللہ شھیدا" کے فرق کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ اس ایت کا ترجمہ یہ ہے۔ وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کر دے گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں (بہ ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ)

(۲) مولانا مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے اس ایت کا ترجمہ یوں کیا ہے:۔ درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے' ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔ سورہ آل عمران ایت (۱۶۴)

اس سے قبل سورہ مبارکہ البقرہ میں ایت (۱۵۱) اور سورتہ مبارک الجمعہ ایت(۲) میں مختلف سیاق و سباق کے ساتھ یہی آیت نازل فرمائی گئی ہے جس کی تفصیل کے لیے تفاسیر قرآن کو دیکھنا چاہیے۔ طاہر بخاری

تو اس سے مراد شریعت ہے اور اس ایت مبارک کی تطبیق قبل ازین ذکر شدہ ایت (یعنی یاایھاالذین امنوا ادخلو فی السلم کافه) سے بھی کی جا سکتی ہے۔ اس ایت میں بھی تزکیہ کتاب اور حکمت کا تذکرہ ہے اور حکمت سے مراد تصوف ہے ایسے کہ حکمت ہر شخص کی قسمت میں نہیں ہوتی بلکہ خاص خاص اشخاص کی نصیب میں ہوتی ہے ذالک فضل اللہ یوتیه من یشاء مولوی ثناء اللہ امرتسری جو اہل حدیث کے قابل اعتبار اور معروف عالم ہیں' انہوں نے اپنے رسالہ "شریعت و طریقت" میں بھی یہ بحث کی ہے اور بعینہ تصوف کو یہی (حکمت) کہا ہے۔اسی طرح انہوں نے وہابی عقیدہ رکھنے والوں کے دامن سے یہ داغ دھو ڈالا ہے کہ جس طرح بعض اہل سنت و الجماعت وہابیوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ تصوف کے منکر ہیں۔ مطلب یہ کہ مولوی ثناء اللہ صاحب نے صوفیائے کرام کی شان اور بلند مرتبہ کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ فالحمد للہ۔ اسی طرح ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق و المغرب و لکن البر من امن باللہ والیوم الاخر والملئکته والکتب والنبین (البقرہ ایت ۱۷۷) ترجمہ ۔ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف' بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملا ئکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے (۱)

---

(۱) حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے بر کے معنے "کمال" بیان فرمائے ہیں جناب مولانا مودودی نے "نیکی" سے کئے ہیں ۔ مولانا محمد عبد الرشید صاحب نعمانی نے اپنی لغات القرآن (ج ۲) میں بھی بر کے معنے نیکی' بھلائی اور نیک کاری بتائے ہیں یہاں میں نے مولانا مودودی کا ترجمہ پسند کیا ہے۔ طاہر بخاری

مراد یہ ہے کہ اپنا رخ مشرق کی طرف کرلے یا مغرب کی طرف، بلکہ اصل نیکی یہ ہے کہ تم لوگ اللہ ، یوم آخرت ، ملائک، کتاب اور خدا کے رسولوں پر دل سے ایمان لے آؤ۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اس وقت تک ظاہری ارکان اتنے منفعت بخش نہیں جب تک باطنی صفائی یعنی اخلاص کا اہتمام نہ کیا جائے۔ یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشہور حدیث مبارک بیان کی جائے جو حدیث جبرائیل علیہ السلام کے نام سے مشہور ہے۔ یہ حدیث مبارک صحیح بخاری اور مسلم سے لی گئی ہے اور مشکوۃ شریف میں نقل کی گئی ہے وہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "کہ ایک روز ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اسی اثناء میں ایک آدمی آگیا جس نے انتہائی سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو قعدہ میں بیٹھ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اسلام کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا، نماز پڑھنا، روزے رکھنا، زکوۃ دینا اور بشرط استطاعت حج ادا کرنا۔ اجنبی شخص نے یہ سن کر کہا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے حق فرمایا اور دوبارہ پوچھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایمان کیا چیز ہے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ، اس کے پیغمبروں، فرشتوں اور اللہ کی کتابوں پر ایقان کے علاوہ اس امر پر یقین رکھنا کہ خیر و شر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ بعد ازیں اجنبی شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسان کیا چیز ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یرک یعنی اللہ کی عبادت اس طرح سے کرو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو (یہ یقین کرنا) کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ پھر جس وقت وہ رخصت ہوگیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ

تم جانتے ہو یہ شخص کون تھا۔ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ جرائیل امین علیہ السلام تھے جو تمہیں دین کی تعلیم سکھانے کے لئے آئے تھے"۔

مطلب یہ کہ یہی احسان ہی اصل تصوف ہے جو ایمان سے بھی بلند درجہ رکھتا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سارا معاملہ باطن سے تعلق رکھتا ہے یہی کچھ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرھندی قدس سرہ العزیز نے بھی اپنے مکتوبات میں بیان فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ جہاں تک ظاہری علما کا تعلق تو وہ ظاہر کو دیکھ کر حکم فرماتے ہیں اور یہی ان کا فرض منصبی ہے۔ مگر اولیاء اللہ ظاہری اور باطنی ہردو قسم کے علوم کے ماہر ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کو ورثہ الانبیاء کہا گیا ہے اور مندرجہ بالا حدیث مبارک کا اطلاق صرف اور صرف صوفیائے کرام پر کیا جاتا ہے اس لئے کہ یہ طبقہ صوفیا اسلام کے ہردو ظاہری اور باطنی امور پر عمل پیرا ہوتا ہے اور یہ قدسی طبقہ اسی ایت مبارک کے مصداق ہیں۔

یاایھاالذین امنوا اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولے الامر منکم

(النساء ایت ۵۹)

ترجمہ:۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ (ترجمہ مودودی)

چنانچہ یہ بات ظاہر ہے کہ مکمل ترین صاحبان امر اس ایت مبارک کے مصداق ہوں گے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے کہ یاایھاالذین امنوا ادخلو فی السلم کافہ یعنی جو اسلام پر مکمل طور پر عمل کرتے ہوں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ بھی اس بات پر اتفاق کرتے ہیں اور اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں "شریعت راسہ جزو ہست علم و عمل و اخلاص تااین ہرسہ متحقق نہ شوند۔ شریعت نیز متحقق نہ شود" یعنی

شریعت کے تین حصے ہیں (۱) علم (۲) عمل (۳) اور اخلاص ۔ اور جب تک یہ تینوں متحقق (پورے) نہ کئے جائیں اسلام بھی متحقق نہیں ہو سکتا" چنانچہ مذکورہ بالاایت کا اطلاق حقیقی طور پر علمائے ظاہر پر نہیں ہوتا اگر چہ مجازاً" ہو سکتا ہے جو علمائے ظاہر صوفی حضرات کی مخالفت کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ علمائے ظاہر ظاہری حالات کو دیکھتے ہیں اور اگر یہ علمائے ظاہر ظن المومنین خیرا کے مصداق اپنے فیصلوں میں ذرا صبر سے کام لیتے تو کسی قسم کے جھگڑے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ حافظ شیرازی نے خوب کہا ہے۔

چوں بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نہ ئی دلبرا خطا ایں جاست

چنانچہ علمائے ظاہر کے لئے مناسب ہے کہ جب صوفیائے کرام کا کوئی ایسا فعل دیکھے یا ان کا کوئی ایسا قول سنے جو ان علما کے ظاہری علم کے خلاف ہو یا ان کی سمجھ سے بالاتر ہو تو اس کی تاویل کرے اور اگر بفرض محال اس کی تاویل پیش کرنا محال ہو تو بہتر یہی ہے کہ سکوت اختیار کریں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا منصب مکمل ترین الوالامر کا نہیں۔ تعجب یہ کہ ان میں سے بعض علما فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں اولیاء اللہ کا نام و نشان ہی نہیں اور بقول ان کے اگر ہوں بھی تو کہیں دور جنگلوں میں چھپے بیٹھے ہوں گے۔ ان حالات میں اگر کوئی شخص ان کو کسی ولی اللہ کی نشاندھی کر دے تو اس سے صاف انکار کر دیتے ہیں اور بحث و مباحثہ شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں غوث صمدانی، قطب ربانی، امام عبدالوہاب شعرانی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب طبقات الکبری میں تحریر فرمایا ہے کہ : "امام ابو تراب بخشی رضی اللہ عنہ جو اس میدان (تصوف) کے ایک شہسوار تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ "جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی عادت پڑ گئی ہو تو وہ اولیاء اللہ کی مخالفت کرنے سے خوش ہوتا ہے" آگے

لکھتے ہیں کہ: "شیخ ابوالحسن شاذلی رحمتہ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جمعیت (صوفیہ) کو جھگڑالو قسم کے لوگوں کے جھگڑوں میں مبتلا کیا ہے چنانچہ کمتر ایسا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دل صوفیہ کے لئے صاف ہوں یا ان کی طرف رجوع کریں۔ طرفہ یہ کہ وہ لوگ تو آپ سے بھی یہی کہیں گے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے برگزیدہ بندے یقیناً" ہوتے تو ہیں مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہوتے ہیں۔ اس موقعہ پر اگر آپ ان سے کسی ولی اللہ کا ذکر کر دیں تو از روئے انکار وہ اس ولی کے عیب گننا شروع کر دیں گے۔ اور اس کے عدم ولایت پر دلائل بھی پیش کریں گے۔ حالانکہ ایسے منکر کو معلوم نہیں ہوتا کہ اولیاء کی صفات کو صرف اولیاء ہی جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے منکر لوگ کسی بھی ولی کی ولایت کو تسلیم نہیں کرتے چنانچہ بے فیض رہ جاتے ہیں"۔

امام شعرانی رحمتہ اللہ علیہ آگے لکھتے ہیں کہ:

"موصلی نے اپنی کتاب مناقب الاسرار میں حضرت فضیل ابن عیاض رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے آپ فرمایا کرتے تھے کہ ایسے ملاؤں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ اگر وہ آپ سے محبت کرنے پر آجائیں تو آپ کی تعریف میں ایسی باتیں کریں گے جو سرے سے آپ میں موجود ہی نہ ہوں گی اور اس طرز عمل سے آپ سے آپ کے معائب چھپالیں گے اور خدا نخواستہ اگر آپ سے دشمنی شروع کر دیں تو آپ کی مذمت میں ایسے عیوب ظاہر کریں گے جو آپ میں موجود ہی نہ ہوں گے۔ اگرچہ عوام الناس اس کو سچ تسلیم کریں گے"۔

اب غور کرنا چاہیے کہ ایسے علماء کس حساب سے مکمل اولی الامر کے مصداق بن سکتے ہیں۔ (اس لئے ہم کہتے ہیں) کہ حق تعالیٰ نے یہ مرتبہ صرف صوفیائے کرامکو عطا فرمایا ہے۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اولی الامر سے مراد ظاہری بادشاہ یا خلیفہ

بھی لیا جا سکتا ہے۔ مگر ہر بادشاہ اور خلیفہ بھی مکمل اولی الامر کے مرتبے پر فائز نہیں تھا۔ اگر چہ خلفائے راشدین سب کے سب مکمل اولی الامر تھے مگر ان کے بعد بنوامیہ کے خاندان میں روحانیت والی بات نہ رہی کیونکہ وہ ظاہری بادشاہی (حکومت) کیا کرتے تھے - یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام نے روحانیت حاصل کرنے کے لئے اپنا سلسلہ اور راستہ جدا کر دیا انھوں نے بیعت کا طریقہ بھی الگ کر دیا اس لئے کہ کسی فاسق وفاجر سے بیعت کرنے کے جو نتائج نکل سکتے ہیں وہ معلوم ہیں عربی کا ایک شعر ہے۔

اذا کان الغراب دلیل قوم سیھدیھم طریق الھالکینا

(جب کوا کسی قوم کا سربراہ بن جائے تو وہ قوم کو ہلاکت کی راہ پر ڈال دیتا ہے)

(اب رہ گیا یہ سوال کہ) تصوف ہے کیا چیز۔ تو اس ضمن میں غوث صمدانی قطب ربانی امام عبد الوہاب شعرانی نے اپنی کتاب طبقات الکبریٰ میں تحریر فرمایا کہ :

”جاننا چاہیے کہ تصوف اس علم کا نام ہے جو اولیاء اللہ کے دلوں سے اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب ان کے قلوب قرآن و سنت پر عمل پیرا ہو کر روشن ہو گئے ہوں (کیونکہ) جو کوئی بھی قرآن و سنت پر تہہ دل سے عمل کرے ان پر ایسے علوم، آداب و اسرار منکشف ہو جاتے ہیں کہ زبان و قلم ان کے بیان کرنے سے معذور ہیں اس کی ایک مثال یوں بھی دی جا سکتی ہے کہ جب علمائے ظاہر شریعت کا علم حاصل کر لیتے ہیں تو احکام شریعت (ظاہری) ان پر روشن ہو جاتے ہیں“۔

حضرت سید عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔ ”تصوف“ اپنے قلب کو ان تمام آلائشوں سے پاک کرنے کا نام ہے جو خدا اور بندے کے درمیان حجاب کا درجہ رکھتے ہیں“ بعض صوفیاء فرماتے ہیں کہ ”تصوف اخلاق حسنہ کا دوسرا نام ہے“ بعض کا قول ہے کہ ”صوفی وہ ہوتا ہے جو حق تعالیٰ سے اپنا معاملہ صاف رکھے“۔

میرے مرشد پاک قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ ”تصوف اخلاق حسنہ ہی کا دوسرا نام

ہے" اور اکثر و بیشتر صوفیاء کا بھی یہی مذہب ہے۔ طبقات الکبری میں حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربی کی تصنیف فتوحات مکیہ کی یہ تحریر لکھی گئی ہے کہ صوفیاء کے علم تک پہنچنے کے لئے ایمان اور تقویٰ اختیار کرنا لازمی ہیں۔ جبکہ ایمان اور تقویٰ کو اخلاق و کردار سے پرکھا جا سکتا ہے اور یہی کمال صوفی کے اخلاق و کردار سے بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ دراصل اخلاق ہی ایک ایسا جوہر ہے جو تصنع سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ (مختصر یہ کہ) جب تک کسی سالک کی باطنی صفائی نہ ہوئی ہو اخلاق حسنہ کا حصول ناممکن ہوتا ہے (۱)

یہاں پر میں علمائے کرام کی خدمت میں عرض کروں گا کہ وہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں اور اگر ان کو اس کتاب میں کوئی تحریر اپنے مسلک کے خلاف نظر آئے تو گرفت سے درگزر فرما کر اصلاح کا اہتمام کریں۔ (مزید برآں) اس کتاب کو پڑھنے یا مطالعہ کرنے کے سلسلے میں یہ بات ضروری ہے کہ قاری تعصب کا چشمہ اتار کر عالمگیر رواداری کا خیال رکھے (کیونکہ) طریقت و شریعت الگ طور پر کوئی چیز نہیں۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے کسی درخت کے پتے اور میوہ اس درخت سے جدا تصور نہیں کئے جا سکتے (اسی طرح شریعت و طریقت) ہر دو لازم و ملزوم ہیں بلکہ دونوں کا وجود ان میں سے کسی ایک کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ مثلاً" اگر ایک شخص شریعت اسلامی پر اعتقاد و ایمان نہ رکھتا ہو تو ایسا آدمی اگر ایک ہزار سال بھی مجاہدہ کرلے۔ ولی نہیں ہو سکتا۔ تاہم قابل غور بات یہ ہے کہ میوہ درخت ہی سے پیدا ہوتا ہے مگر میوے کو درخت نہیں کہا جاتا۔ کیونکہ درخت ایک الگ چیز ہے اور میوہ الگ۔ جبکہ صوفیائے کرام نے میوہ ہی حاصل کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس چیز کی مخالفت کرتے ہیں جس کے حصول سے

---

(۱) یہاں پر کتابت کی غلطی سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے یہی ترجمہ کر لیا (طاہر)

وہ معذور ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں امام شعرانی رحمتہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"اگر کوئی مجتہد اپنی اجتہاد سے کسی ایسی چیز کو واجب ٹھہرا دے جس کی صراحت قرآن شریف میں نہ ہو تو اس کا رتبہ اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ ایک ولی طریقت میں ایک ایسی چیز کو واجب ٹھہرالے جس کی تصریح شرع میں نہ کی گئی ہو۔ جیسے امام یافعی وغیرہ نے صاف طور پر لکھا ہے"۔

(۱) یہاں پر کتابت کی غلطی سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے یہی ترجمہ کر لیا۔ (طاہر)

اس کی توضیح یوں کی جاتی ہے کہ وہ سب کچھ شرع کے کام میں قابل اعتبار ہے جنکو حق تعالیٰ نے اپنے دین کے فروغ کے لئے مختص فرمایا ہے۔ چنانچہ جس نے بھی غور و فکر سے کام لے لیا سب کچھ اس کی سمجھ میں آجائے گا کہ اہل اللہ شریعت سے باہر نہیں۔

آخری عرض یہ ہے کہ یہ کتاب ہم نے پختون بھائیوں کے لئے پشتو میں لکھی ہے تاکہ وہ اس سے استفادہ کریں۔ اگر چہ امید واثق ہے کہ علماء حضرات بھی اس کو گاہ کرم سے مطالعہ فرمائیں گے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خاکسار

حمزہ شنواری (رحمتہ اللہ علیہ)

فصل اول

ذات الٰہی جل مجدہ

الحمد اللہ الذی ھدانا الی سبیل الحق بالفضل والاحسان والسلام علیٰ
رسولہ محمد سید الانس والجان و علیٰ آلہ و اصحابہ وسلم

اے برتراز خیال و قیاس و گمان ووھم
وزھرچہ گفتہ ایم وشنید یم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بہ پایان رسید عمر
ماھچناں در اول و صف تو ماندہ ایم

خداوند تعالیٰ یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کا "ایک" ہونا ہرگز ایسا نہیں جس کا ثانی ہو یہ عددی "ایک" ہو۔ بھی نہیں۔ سبحان اللہ عما یشرکون۔ چاہے کوئی نبی ہو' چاہے کوئی ولی ہو۔۔ کوئی بھی حق تعالیٰ کے ساتھ اس کے کسی وصف میں شریک نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب مخلوق میں شمار ہوتے ہیں جبکہ مخلوق ہر معاملے میں خالق کی محتاج ہوتی ہے چنانچہ سبھی اس ذات والا صفات کے محتاج ہیں۔ اور وہ خود کسی کا محتاج نہیں ہے وہ اپنی ذات سے ایک (یکتا) ہے' اکیلا ہے' بے پرواہ اور بے نیاز ہے' نہ تو وہ کچھ کھاتا ہے' نہ پیتا ہے' نہ اسے بھوک لگتی ہے' نہ اسے

پیاس لگتی ہے' نہ تو وہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ کسی اور نے اس سے جنم لیا ہے
اور نہ ہی اس کی ذات سے ہمسری یا برابری کر سکتا ہے نہ ہی وہ جسم رکھتا ہے اور نہ
ہی اسے لباس کی ضرورت ہے۔ جس طرح کپڑے کا رنگ کپڑا نہیں ہوتا اور رنگ
کہاں۔ بلکہ اس کی ذات اقدس کو پھول کی خوشبو کی طرح قیاس کرنا بھی درست نہیں
کیونکہ خوشبو عرض ہے یعنی جسم پر قائم ہے (پھول کے جسم پر) اور حق تعالیٰ کسی غیر کا
محتاج نہیں۔ نہ وہ غیر سے قائم ہے بلکہ تمام مخلوق اسی سے قائم ہے' نہ ہی وہ قدوس
جوہر ہے مثلاً" کپڑا کہ اگر رنگا ہوا نہ بھی ہو تو کپڑا ہی کہلائے گا۔ مزید برآں پانی بھی
ایک ایسی چیز ہے جس کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ چاہے آپ کوئی بھی رنگ دینا چاہیں وہ
رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ مقصد یہ کہ حق عزاسمہ' جوہریت سے بھی مبرا ہے اس ذات
بے ہمتا کو نیند بھی نہیں آتی' نہ اسے چھینک آتی ہے۔ لا تاخذہ سنتہ ولا نوم
وہ عددی "ایک" ہونے سے بھی پاک ہے کیونکہ عددی ایک ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتا
ہے ہم اس ذات یکتا کو نہ تو ٹکڑے ٹکڑے کہہ سکتے ہیں نہ سالم' نہ آدھا' نہ تیسرا حصہ
نہ چوتھا حصہ ------ نہ وہ بے ہمتا ذات کسی چیز سے مل جل کر حل ہو گیا ہے اور
نہ ہی اس سے جدا ہے اور نہ ہی وہ ذات اقدس کسی چیز میں حل ہو سکتی ہے کوئی شے
بھی اس جیسی نہیں اور نہ ہی وہ ذات کسی شے جیسی ہے۔ نہ ہی وہ ذات کسی مخصوص
مقام پر قائم ہے۔

بے شک قرآن حکیم میں الرحمٰن علی العرش استوی وارد ہے مگر
اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مخلوق کی طرح کسی تخت پر قائم (بیٹھا) ہے۔ اس کی ذات
قطعاً" ایسی نہیں جس کو جوہر کی طرح جان لیا جائے بلکہ اسے لامکان کہنا چاہیے۔ اس
قیام بھی ہم جیسے جانداروں کی طرح نہیں کہ اگر کسی چیز پر قائم نہ ہوں تو گھڑے نہیں

ہو سکتے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ حق تعالیٰ بالیقین عرش پر تو ہے اور تمام اولیاء کا بھی یہی مذہب ہے۔۔ مگر اس کی کیفیت مجہول ہے۔ اولیاء اللہ کا خوبصورت قول کہ الاستواء معلوم والکیفیت مجھول یعنی اس کی استوئی تو معلوم ہے مگر اس کی کیفیت سمجھ سے باہر ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہماری محدود عقل اُس کی کیفیت کو کیسے سمجھ سکتی ہے۔ یہ ناممکنات میں سے ہے۔

ظاہر ہے کہ استوئی علی العرش نص قرانی سے ثابت ہے تو اس پر ایمان لائے بغیر چارہ بھی نہیں مگر ایسا ہے کہ اس کی کیفیت کو بالائے علم یا سمجھ سے باہر کہنا چاہیے۔ (بالفرض) اگر اس ذات اقدس کو عرش پر نہ جانیں تو ظاہر ہے کہ اس کی ذات پاک۔۔ غیر قائم۔۔ یا غیر موجود ٹھہر جائے گی اور یہ کفر ہے مگر یہ کفر نہیں کہ اس کو عرش کے اوپر تسلیم کرلیں کیونکہ نص میں لفظ استوئی موجود ہے چنانچہ کلام الٰہی کے بموجب ہم اس کی استوئی کو اس طور پر مانتے ہیں جس کی کیفیت اور حقیقت کو صرف ذات حق ہی جان سکتی ہے۔ وہ جیسے اور جس طرح بھی ہے اس کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ ہم (احتیاطاً) ایت الٰہی کی تاویلات میں بھی نہیں پڑنا چاہتے۔ ہم نہیں کہتے کہ وہ علمی حیثیت سے عرش پر ہے یعنی منجملہ دیگر مقامات کے عرش تک اس کا علم پہنچ سکتا ہے (خدانخواستہ) اگر ہم یہ کہدیں تو لا محالہ اس سے نفی ذات لازم ہو جائے گی اور یہ نقصان ہو گا اس لئے کہ پھر تو یہ بھی لازم ہو جائے گا کہ (خود) اس کی ذات تو عرش تک نہیں پہنچ سکتی البتہ اس کا علم وہاں پہنچ سکتا ہے۔ بہر نوع عرش پر استواء قرآن حکیم سے ثابت ہے اور وہ جیسے اور جس طرح بھی ہے خود وہی جانتا ہے اس بحث میں ہمیں پڑنا بھی نہیں چاہیے بلکہ یہ منع ہے۔

حق تعالیٰ ہی ہر چیز کا کارساز اور ہر کسی کا مددگار ہے اور اس کا کوئی کارساز یا مدد

گار نہیں ہے جو کچھ سات آسمانوں اور زمینوں میں موجود ہے وہ سب کچھ اسی کا ہے
اور یہ سب کچھ اسی کے لئے ہے .... وہ ذات ہمیشہ سے زندہ ہے۔ اور کبھی نہیں مر
سکتی۔ اس کی حیات بھی ہماری زندگی کی طرح نہیں۔ بلکہ ہماری موت اور زندگی کو بھی
اسی ذات پاک نے پیدا کیاہے وہی ذات اقدس ہست اور نیست کرنے پر پوری قدرت
رکھتی ہے چاہے ملائک ہوں' جنات ہوں'بنی آدم ہوں یا دوسرے جاندار سب کا خالق'
زندہ کرنے والا' مارنے والا اور رزق دینے والا وہی ہے۔ اس کی ذات خود موجود ہے۔
کسی غیر نے اسے موجود نہیں کیا ہے اور اسی طرح اس کی نیستی خارج از امکان ہے۔
البتہ جنت میں اسے سب مومن دیکھیں گے اور یہ بات رسول مقبول صلی اللہ علیہ
وسلم کے فرمان سے ثابت ہے جبکہ میدان حشر میں کفار بھی اسے دیکھ سکیں گے۔

اس کی ذات اقدس ہر قسم کے عیب و نقصان سے پاک ہے۔ ہر صفت کا کمال
اور ہر کمال کی صفت اسی کے لئے مختص ہے۔ اسی طرح صفت و کمال کا خالق بھی وہی
ہے اس کے خوبصورت اسمائے حسنٰی جو قرآن مجید سے ثابت ہیں۔ توفیقی ہیں۔ یعنی
انکے بغیر' ان کے ہم معنی دوسرے نام نہیں بنانا چاہیے۔ مثلاً" اس کا ایک نام "
ملک" ہے تو اس کی جگہ "سلطان" نہیں کہنا چاہیے یا جیسے "رب"
اس کا نام ہے تو بجائے "رب" کے اس کو "مربی" نہیں کہنا چاہیے--- اسی طرح
اس کی ذات پاک قدیم ہے۔ قدیم کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو اس ذات پاک کی کوئی انتہا
ہے اور نہ ہی اس کی کوئی ابتداء بلکہ وہ جیسے تھا ویسے ہی ہے' کمی یا بیشی اس کی ذات
میں نہیں آسکتی۔ وہ ایک ہی شان سے موجود ہے۔ ماضی' مستقبل اور حال تینوں حالتوں
کا تعلق تو فلک کی گردش سے ہے جبکہ حق تعالیٰ کی ذات ان یا ان جیسی دیگر حالتوں
سے قطعی طور پر مبرا ہے۔ وہ شش جہات سے بھی پاک ہے۔ ہم اسے نیچے' اوپر'

دائیں، بائیں، آگے یا پیچھے نہیں کہہ سکتے مگر ایسا بھی تو نہیں کہ وہ شش جہات میں نہ ہو۔ (اگرچہ) اس بات کو سمجھنے کے لئے قدوسی عقل کی ضرورت ہے۔ اس کے باوصف وہ ہر جہت، ہر طرف اور ہر زمانے میں موجود ہے۔۔۔ جس چیز کو خلا کہا جاتا ہے وہاں بھی حق ہی ہے اور اس کے لئے جو "اشارہ" "اوپر" کی طرف کیا جاتا ہے۔ مثلاً" آسمان کی طرف۔ تو وہ اس لئے کہ الرحمٰن علی العرش استوٰی قرآن مجید سے ثابت ہے اور جن لوگوں کو خدا نے سمجھ دے رکھی ہے (جانتے ہیں) کہ اوپر کی طرف اشارہ کرنا منع نہیں ہے اس لئے ظاہری نص سے بھی وجود الٰہی کا استواء عرش پر ثابت ہے (تاہم) اشارہ کرتے وقت نیت یہ ہونی چاہیے کہ اس کی کیفیت مجہول ہے اور اگر یہ نیت نہ کرے تو بھی حق تعالیٰ کے وجود کو تصور میں لانا ممکن ہی نہیں (بات یہ ہے) کہ جب کوئی شخص کسی طرف کسی چیز کو اشارہ کرتا ہے تو (معاً) اس چیز کا تصور اس کے دماغ میں آجاتا ہے اب اگر وہ کسی طرف اشارہ کرے کہ خدا "وہاں" ہے تو ظاہر ہے کہ یہ "محض" اشارہ ہی ہو گا اور "تصور" اس میں شامل نہ ہو گا۔ ہاں! اپنے ارادے کا تصور ضرور ہو گا (علاوہ ازیں) اوپر کی طرف اشارہ کرنے کا ایک مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ خداوند عالم بزرگ و برتر ہے۔ یہ عالم یعنی دنیا و آخرت دونوں حادث ہیں اور ہر دو فنا ہوں گے وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ دونوں پہلے موجود نہ تھے بعد میں پیدا کئے گئے۔ ان دونوں کو خدا نے بنایا ہے۔ دنیا فنا ہو جائے گی۔ آخرت ہمیشہ رہے گی۔ میرے **مرشد پاک** کی اس بارے میں یہ رائے ہے کہ عالم آخرت فانی ہو یا غیرفانی اہم بات یہ ہے کہ ارواح کا آخری مقام ذات الٰہی ہے۔ جس طرح کہا گیا ہے کہ کل شئی یرجع الٰی اصلہ تو اسی لحاظ سے ذات الٰہی ارواح کا مرجع ہے خدائے ذوالجلال کی ذات، اس کا علم، اس کا ارادہ، اس کی قدرت اور اس کی تمام

صفتیں دونوں جہانوں پر محیط ہیں۔ جب تک اس کی رضا نہ ہو کائنات کا ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ اس کے ہاتھ، پاؤں، چہرہ اور رات کے آخری پہر میں دنیا کے آسمان میں نزول اجلال فرمانا اور اسی طرح چند دوسری باتیں جو قرآن اور حدیث میں وارد ہیں۔۔ ان سب باتوں کی حقیقت اور راز ہائے درون پردہ کو ہر شخص نہیں جان سکتا جب تک حق تعالیٰ کسی شخص سے مہربانی نہ فرمالے۔ تاہم ہر مسلمان کے لئے مناسب ہے کہ ان تمام باتوں پر ایمان لائے اور بلاوجہ اپنے آپ کو شک و شبہ میں نہ رکھے۔ وہ یہ نہ سوچے کہ حق تعالیٰ کے ہاتھ کیسے ہوں گے اور اس کے کسی کام میں "کیوں"۔ اور کیسے نہیں کہنا چاہیے۔

جہاں تک صفات خداوندی کا تعلق ہے تو بعض اہل سنت کے نزدیک وہ نہ عین ذات ہیں اور نہ غیر ذات ۔۔۔۔ مثلاً" ناک جو ایک آدمی کے چہرے پر موجود تو ہوتی ہے مگر اس کو "چہرہ" نہیں کہا جاتا اور یہ قول اشاعرہ اہل سنت کا ہے یعنی وہ علماء جو اشعر کے قبیلے سے منسوب ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی اسی قبیلے کے ایک فرد تھے۔ (شرح عقائد نسفی میں یہی کچھ لکھا گیا ہے) بعض محقق اہل سنت صفات کو غیر ذات سمجھتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ ہم نہ ان کو غیر کہتے ہیں نہ عین اور نہ ہی ان دونوں کی نفی اور اثبات سے سروکار رکھتے ہیں بلکہ یہ کہتے ہیں۔ کہ اللہ موجود ہے اور جس طرح اس کی ذات معدوم نہیں ہو سکتی اسی طرح اس کی صفات بھی معدوم نہیں ہو سکتیں حضرت مخدوم سعد قدس سرہ العزیز نے مندرجہ مذکور قول کو حتمی قول قرار دیا ہے فرماتے ہیں" وھذا اسلم یعنی "یہ درست ہے" اور صاحب عقائد نسفی کا قول بھی قریب قریب یہی ہے:۔

ولہ صفات ازلیتہ قائمتہ بذاتہ

یعنی اس کی صفات ازلی ہیں جو قائم بہ ذات ہیں۔ اور ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے کیونکہ "عین وغیر" کی نفی اور اثبات میں یہی معلوم کرنا ملحوظ ہوتا ہے جو ممکن نہیں۔ دوسری بات یہ کہ جب عین اور غیر کہا جاتا ہے تو یہ کیا ہوا اس سے تو کچھ بھی ثابت نہ ہوا۔ مراد یہ کہ اس کی صفات اگر عین ذات بھی نہ ہوں اور غیر ذات بھی نہ ہوں (تو یہ حتمی بات نہ ہوئی) لامحالہ اس عقیدہ سے تو ایک عظیم شبہ پیدا ہوتا ہے اور یہ عقیدہ رکھ کر ناممکن ہے کہ کوئی شخص یقین تک پہنچ سکے ۔۔۔! اشاعرہ کے قول سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بزعم خود اس سے ان کی اپنی تسلی بھی نہیں ہوئی ۔ اور یہاں پر ان کے لئے لازم تھا کہ اپنی بے علمی کا اقرار کر کے سکوت اختیار کر لیتے۔

جہاں تک اہل کلام کا تعلق ہے تو ان کے عقیدے کے مطابق صفات الٰہی تین اقسام پر مشتمل ہیں (۱) جو صفات اس کی ذات میں ثابت ہیں ان کو "ثبوتی" کہتے ہیں جیسے حیٔ، مرید، قادر اور علیم (۲) اور جو صفات ان کی طرف منسوب ہیں ان کو "اضافی" کہتے ہیں جیسے نافع، ضار، معز، اور مذل۔(۳) اور جن صفات سے اس کی ذات پاک سے نقص کی نفی ہوتی ہو ایسی صفات کو "سلبی" کہتے ہیں مثال کے طور پر غنی، قدوس، سلام اور مالک اور اس کی تفصیل رسائل میں دیکھی جا سکتی ہے۔

حضرت مخدوم سعد رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حق تعالٰی کی صفات دو اقسام پر مشتمل ہیں (۱) ذاتی (۲) اور افعالی۔ ! ذاتی صفات سے مراد حق تعالٰی کی وہ صفات ہیں جن کی ضد کے ساتھ اس کو منسوب نہ کیا جا سکے۔ مثلاً حیٔ اس کی صفت ہے اب حیٔ کی ضد "میت" ہے چنانچہ حق تعالٰی کو میت نہیں کہا سکتا۔ یا بصورت دیگر قادر اس کی صفت ہے اور اس کی ضد "عاجز" ہے مگر حق تعالٰی کو "عاجز" نہیں کہا سکتا۔ یا متکلم اس کی صفت ہے۔ اور متکلم کی ضد "ساکت" ہے اور اس تعالٰی کو ساکت نہیں

کہا سکتا۔

جہاں تک حق تعالیٰ جل مجدہ کی افعال کا تعلق ہے تو ان سے مراد وہ صفات ہیں جن کی ضد کے ساتھ بھی خدا کی تعریف ممکن ہو مثلاً" نافع اس کی صفت ہے اور ضار اس کی ضد ہے تو ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ نافع بھی ہے اور ضار بھی۔ اسی طرح معز اور مذل معطی اور مانع کو لے لیجیے۔ اللہ تعالیٰ ہی خیر و شر کا خالق ہے۔ انسان کو بھی پیدا فرمایا خنزیر کو بھی پیدا کیا۔ مگر ملحوظ خاطر رہے کہ حق تعالیٰ کو نجاست' شر یا خنزیر کا خالق کہنا بے ادبی کے زمرے میں آتا ہے۔ اسی طرح جس بات سے اس کی ذات میں نقص کا شائبہ پایا جاتا ہو ایسی ہر بات سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مثلاً" جو صفات انسان کے لیے مختص ہیں۔ حق کی طرف ایسی صفات کی نسبت نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً" اگر کوئی یہ کہہ دے کہ "یہ ساری مخلوق ازل سے حق تعالیٰ کے خیال میں موجود تھی" تو یہ غلط ہو گا کیونکہ قدامت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے اور فی الحقیقت "خیال" کے لئے تو مرکب جسم کی ضرورت ہوتی ہے اور مرکب جسم حادث ہوتا ہے۔ یہی مرکب جسم کئی دیگر مختلف قسم کی ضروریات کا محتاج ہوتا ہے بلکہ خیال کا آنا بھی احتیاج ہی کو ثابت کرتا ہے۔ کیونکہ قوت متخیلہ۔ خیال کو حس مشترک سے اخذ کرتی ہے۔ اور حس مشترک اس کو (خیال کو) حواس خمسہ (باصرہ' سامعہ' شامہ' ذائقہ اور لامسہ) سے اخذ کرتی ہے گویا یہ سب قوتیں ایک دوسرے کی محتاج ہیں۔ اور پھر انسان بھی انہی کا محتاج ہے۔ چنانچہ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہدے کہ مخلوقات خدا کے "خیال" میں ازل سے موجود تھیں تو یہ غلط ہو گا البتہ اس کی جگہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ سب کچھ حق تعالیٰ کے علم یا ارادہ میں موجود تھا۔ درحقیقت "ازل" اس زمانے کو کہتے ہیں جو اس زمانے سے قبل تھا اور "ابد" اس زمانے کو کہتے ہیں جو اس زمانے کے بعد

ہو گا۔۔۔ جبکہ حق تعالیٰ سب کچھ دیکھتا ہے مگر آنکھوں کا محتاج نہیں۔ سب کچھ سنتا ہے مگر کانوں کا محتاج نہیں۔ حق تعالیٰ کلام کرتا ہے، کرتا آیا ہے اور کر سکتا ہے مگروہ زبان، آواز اور حرف یا حروف کا محتاج نہیں۔ بلکہ یہ سب کچھ خود اسی نے پیدا کیے ہیں۔ عقل بھی مخلوق اور حادث ہے۔ حق تعالیٰ کی ہستی کا راز عقل سے بھی معلوم نہیں کیا جا سکتاجہاں تک عقل کام کر سکتی ہے حق تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی حقیقت اس کی (عقل) رسائی سے بہت دور ہے یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

ما عرفنک حق معرفتک

یعنی جس طرح آپ کے پہچاننے کا حق ہے اس طرح میں آپ کو نہ سمجھ سکا۔ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا قول مبارک ہے وراء الوراء ثم وراء الوراء عقل سے چیزوں کو پہچاننا۔ اس کے بعد تھک جانا اور بعد ازاں یہ یقین کرنا کہ اس نے کچھ نہیں پہچانا تو یہ بھی ایک قسم کی معرفت ہے اولیاء اللہ رحمتہ علیہم فرماتے ہیں ۔العجز عن درک الادراک ادراک یعنی حق تعالیٰ کی معرفت سے عاجز آنا ہی اس کی معرفت ہے۔

☆☆☆☆

معرفت الٰہی استدلالی
و
شہودی و ضروری

حضرت قطب الدین دمشقی قدس اللہ سرہ اپنے رسالہ مکیہ میں فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی معرفت کی دو قسمیں ہیں (۱) معرفت استدلالی (۲) معرفت شہودی ضروری

معرفت استدلالی۔

ان میں سے پہلی یعنی معرفت استدلالی وہ معرفت ہے جیسے حق تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے۔سنریھم ایتنا فی الافاق و فی انفسھم حتے یتبین لھم انه الحق شوریٰ ایت ۵۳۔ یعنی ہم عنقریب ان کو اپنی قدرت کی نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ قرآن حق ہے۔ مطلب یہ کہ زمین و آسمان کی عجائبات کو دیکھنا' چاند ' سورج اور ستاروں کی گردش کو دیکھنا' روز و شب کے چکر کو دیکھنا اور ان سب پر غور کرنا۔ اسی طرح اپنی ہستی اور نیستی کو مد نظر رکھنا' اپنے انجام اور آغاز کو خیال میں لانا اور ہر شے کی حقیقت کے پیش نظر حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کی وحدانیت پر یقین رکھنا اور اس کا اقرار کرنا وغیرہ۔

رسالہ مکیہ کے مصنف رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ معرفت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو علم میں راسخ ہوتے ہیں۔ مگر میری ذاتی رائے میں عام مومنین بھی اسی زمرہ میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ دوسری استدلالی معرفت ادنیٰ درجے کی معرفت ہوتی ہے اس لئے کہ اگر ایک جاہل آدمی بھی ایک ایسی جگہ چلا جائے جہاں آثار قدیمہ کے

کھنڈرات ہوں تو ان کو دیکھتے ہی وہ جاہل آدمی بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ یہاں کسی وقت بھرپور آبادی موجود تھی وہ یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ اسی مقام پر کسی زمانے میں چلتے پھرتے لوگ رہتے ہوں گے۔ اسی طرح اگر ایک آدمی دور سے کچھ مکانات دیکھے ' ساتھ ہی گھروں سے اٹھتا ہوا دھواں بھی دیکھ لے تو بڑی آسانی سے وہ یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہاں لوگ موجود ہوں گے۔ مطلب یہ کہ جن لوگوں کے بارے میں راسخون فی العلم فرمایا گیا ہے ان کی استدلالی معرفت عام مومنوں کی معرفت سے بہت بلند ہوتی ہے ایت مبارک میں بھی یہی فرمایا گیا ہے: فی الافاق وفی انفسھم اور اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک فی الافاق کا تعلق ہے تو یہ ادنی درجے کی طرف اشارہ ہے جبکہ انفسھم سے مراد راسخون فی العلم ہے کیونکہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں من عرف نفسہ فقد عرف ربہ فرمایا گیا ہے یا جنہیں عرفان نفس کا درجہ حاصل ہوتا ہے تاہم (میرے نزدیک) ادنی درجے کی استدلالی معرفت حواس خمسہ ظاہری کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ جہاں تک اعلی درجے کی استدلالی معرفت کا تعلق ہے تو (بلاشبہ) اس کے لئے ظاہری حواس خمسہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاہم چونکہ یہ استدلالی معرفت عقلی ہوتی ہے جو ظاہری حواس خمسہ کے علاوہ باطنی حواس کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اگرچہ عقل کی پرواز محدود ہوتی ہے۔ مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود   پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

گر بہ استدلال کار دیں بودے   فخر رازی راز دار دیں بودے

البتہ معرفت استدلالی میں شیطان کسی سالک کے دل میں ہر قسم کا وسوسہ ڈال سکتا ہے اور اس ضمن میں شیطان کا علم ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے اس دوران میں اگر مستدل ہزار دلائل دے دے مگر شیطان پوری مستعدی سے اس کا جواب دیتا

ہے اور اپنے مدعا کے اثبات کے لئے مستدل کے سامنے بھرپور دلائل پیش کرتا ہے نتیجتاً آدمی سخت پریشان ہو جاتا ہے اور فی الاصل یہی پریشانی استدلالی معرفت کی کمزوری ہوتی ہے بصورت دیگر شہودی معرفت و ساوس سے عموماً مبرا ہوتی ہے جس کا بیان آنے والا ہے۔ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی بنایا ہے ان سب کے لئے ایک ظاہر اور ایک باطن مقرر فرمایا ہے تو حق تعالیٰ کی ظاہر نشانیوں کو دیکھنا اور ان کا اقرار کرنااس وقت تک استدلالی معرفت میں شمار نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کے ساتھ باطنی علم حاصل نہ ہو اور جب تک خدا کی طرف سے اسرارات الٰہی جلوہ نما نہ ہوں خصوصاً اس وقت تک جب ایک سالک ان اسرارات کو اپنی ذات میں ملاحظہ نہ کرلے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب تک ایک آدمی ایسا نہ ہو جائے تو اگرچہ اس کی آنکھیں صحیح و سالم اور ٹھیک ٹھاک بھی ہوں تو ایسا شخص اندھا ہی کہلایا جائے گا۔ جیسے ارشاد خداوندی ہے۔من کان فی ھذہ اعمٰی فھو فی الاخرۃ اعمٰی (جو شخص دنیا میں اندھا رہے گا سو وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا) (مراد یہ کہ) استدلالی معرفت کا بلند ترین درجہ ماسوائے اولیاء اللہ کے اور کسی کو حاصل نہیں ہوتا اس لئے کہ امور غیبیہ اور اسراریت الہیہ کے ظہور اور بینائی کے اہل یہی اولیاء ہوتے ہیں۔ نابیناؤں کا یہاں کیا کام۔ بلکہ ایسے لوگوں کے بارے میں تو یہ بھی ارشاد ہوا ہے۔ ولقد ذرانا لجھنم کثیرا من الجن والانس لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھاولھم اذان لا یسمعون بھا اولٰئک کالانعام بل ھم اضل اولٰئک ھم الغفلون اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں جن کے دل ایسے ہیں جن سے نہیں سمجھتے اور جن کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے نہیں دیکھتے اور جن کے کان ایسے ہیں جن سے نہیں سنتے۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ لوگ زیادہ (بے راہ) ہیں اور یہ لوگ غافل

ہیں۔ (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ) الاعراف ایت ۱۷۹

دوسری قسم کی معرفت ضروری ہے جیسے حق تعالیٰ کا ارشاد ہےاولم یکف بربک انہ علی کل شیی شھید مراد یہ کہ حق جل مجدہ کو اس شان سے موجود جان لیا جائے کہ تمام شانوں کے ساتھ اس کا وجود قائم سمجھ لیا جائے۔ یہاں تک کہ آنکھیں اس کے بغیر کسی دوسری چیز کو ہی نہ دیکھ سکیں بلکہ ایسے لوگوں کا خیال بھی کسی دوسری چیز کی طرف مبذول نہیں ہوتا اور ان کو کسی قسم کا شیطانی وسوسہ یا کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا بلکہ ان کی عشق کی گرمی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کی خوشی یا غم اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہ صدیقین کا درجہ ہے اور صدیقت ولایت کی انتہا ہے۔

شمائل الاتقیاء میں تحریر ہے کہ معرفت کی تین قسمیں ہیں (۱) عام (۲) خاص اور (۳) خاص الخاص۔ اسی طرح "مرصاد" میں بھی لکھا ہے کہ معرفت تین قسموں پر مشتمل ہے (۱) عقلی یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کی نشانیوں سے پہچانا جائے (۲) نظری یعنی باطنی طور پر اس کی صفات کا عرفان حاصل ہو جائے اور یہ مرتبہ خواص کو حاصل ہوتا ہے۔(۳) شہودی اور یہ معرفت ذات ہے (کہ ذات کی معرفت حاصل ہو) اور یہی خاص الخاص معرفت کہلاتی ہے میرے مرشد پاک رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ مرصاد کے مصنف رحمتہ اللہ علیہ کا قول علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کے مصداق ہے اور یہ آخری درجہ ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جن کے بارے میں حدیث قدسی میں ارشاد ہوا ہے کہ یسمع بی ویتکلم بی ویمشی بی

میں نے گذشتہ بحث میں ایک مقام پر خاص و عام معرفت کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ استدلالی معرفت ہے تو وہ اس لئے کہ چونکہ استدلالی معرفت کے ہر دو حصے استدلال پر قائم ہیں چنانچہ دونوں کو میں نے ایک ہی چیز سمجھ لیا ہے۔ اور اس کے مابعد

کی بحث سے میرے ماقبل کی مدعا کی تصدیق ہو گئی ہے یعنی یہ کہ معرفت شہودی کا درجہ ہر قسم کی کمزوریوں سے مبرا ہے اب سمجھ لینا چاہیے کہ (جیسے) حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے اربعین کے حاشیہ میں حضرت ذوالنون کا یہ قول نقل کیا ہے کہ استدراج العارفین استغنا ھم بالمعرفته دون المعروف حتی جعلوالھا حدا و غایته وظنوا انھا قد احاطو بھا و کل من کانت منزلته ارفع استدراجه اعظم "یعنی عارفوں کا استدراج یہ ہے کہ جب انہوں نے معرفت حاصل کر لی (تو گمان کرنے لگے) کہ معروف سے مُستغنی یا بے پروا ہو گئے یا وہ اس زعم میں پڑ گئے کہ ہم نے حق کو اس طرح پہچان لیا جیسے اس کے پہچاننے کا حق ہے (یا) وہ یہ گمان کر لیں کہ ہم نے بحیثیت کلی معرفت حاصل کر لی ہے (یہاں یہ بھی یاد رہے کہ) جتنی کسی کی منزل بلند ہو گی اس کا استدراج بھی اسی حساب سے بلند ہو گا مراد یہ کہ جس کسی نے بھی یہ دعویٰ کیا کہ میں نے حق کو ایسے پہچانا جیسے اس کے پہچاننے کا حق ہے تو یہی اس کا استدراج ہو گا اس لئے کہ از روئے: ما عرفنک حق معرفتک اور یہ بھی کہ لا احصی ثناء علیک مطلب یہ کہ جیسے تیرے پہچاننے کا حق ہے میں اس کے مطابق تجھ کو نہ سمجھ سکا یا اے اللہ تیری معرفت کا جو حق ہے وہ میں ادا نہ کر سکا اور میں تیری تعریف کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ تو اس لحاظ سے عارفین کے استدراج کا معاملہ ان احادیث کی روشنی میں برعکس ہے جبکہ مولائے کائنات علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا ارشاد وراء الوراء ثم وراء الوراء ان احادیث کے بالکل مطابق ہے یعنی سوا سے سوا اور پھر بھی سوا سے سوا۔ اور اگر وریٰ کے معنے مخلوق کے جائیں تو معنے یہ ہوں گے کہ مخلوق سے سوا اور پھر بھی مخلوق سے سوا۔ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو ہم سوا یا "دور" کہتے ہیں یا جہاں تک مخلوق کی صفت یا سمجھ باقی ہو تو وہ ان سب سے منزہ ہے۔ ثم وراء الوراء محض تحقیق کے لئے ہے

(کیونکہ) حق تعالیٰ کی ذات اور صفات اور ان کے مظاہر ازل الازال سے ابد الاباد تک بے حد و بے حساب ہیں۔

گر صد ہزار سال ہمہ خلق کائنات　　فکرت کنند در صفت عزت خدا

آخر بعجز معترف آیند کہ اے خدا　　دانستہ شد کہ ہیچ ندانستہ ایم ما

اور مخدوم شیخ سعد رحمتہ اللہ علیہ نے مجمع السلوک میں تحریر فرمایا ہے کہ سلوک کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کو سیروا الی اللہ کہتے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ سالک محنت و مشقت کے ذریعے حق تعالیٰ کو پہچان لے اور اہل توحید کہتے ہیں کہ اس کی حد یہ ہے کہ وجود واحد کے بغیر کوئی دوسرا وجود موجود نہیں اور نہ ہی وہ کسی دوسرے وجود کو "دیکھ" سکتے ہیں چنانچہ اس کے بعد اس کی سیر اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ (اگرچہ) کہنے کو تو یہ اسان بات ہے مگر ہے مشکل کیونکہ حق تعالیٰ کی معرفت بڑی کوشش سے حاصل ہوا کرتی ہے یعنی جب تک ایک سالک فنا اور فناء الفنا کی منزلوں کو طے نہ کرلے۔ حق تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔

دوسری سیر فی اللہ ہے وہ ایسے کہ جب ایک سالک حق تعالیٰ کو پہچان لے تو اس کی تمام صفات اور مظاہر قدرت کی معرفت بھی حاصل کر لیتا اور ان کا مشاہدہ بھی کر لیتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کی عمر بہت قلیل ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کی صفات و مظاہر کی کوئی حد نہیں کیونکہ وہ بے حد و بے حساب ہیں (اس لئے) بعض محقق صوفیاء کا خیال ہے کہ اس سیر کا اختتام خارج از امکان ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ تمام مخلوق کی استعداد ایک جیسی نہیں ہوتی اور اگر خدا کا فضل شامل حال ہو تو ایسا ممکن بھی ہے کہ یہ سیر ختم ہو۔ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کا جو قول میں نے ابتدا میں لکھا ہے وہ اس آخری قول کے خلاف ہے تاہم ذرا تامل کے ساتھ ان دونوں اقوال میں تطابق پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس طرح کہ جب ایک سالک فناء الفنا کی منزل کو پورا

کر لیتا ہے اور "معرفت شہودی ضروری" تک پہنچ جاتا ہے تو عارف، معروف اور معرفت ایک ہی چیز بن جاتی ہے اور یہاں پر سیر فی اللہ بھی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ سالک کا وجود نہیں رہ جاتا اور اب وہ انت کما اثنیت علی نفسک کا مصداق ہو جاتا ہے یا اس کی حالت یسمع بی و یتکلم بی اور و یمشی بی کی ہو جاتی ہے۔ تاہم ان اقوال کی ایک تاویل یہ بھی کی جا سکتی ہے کہ پہلا قول اصحاب "صحو" کا ہے اور دوسرا صاحبانِ "سکر کا"۔ اس ضمن میں کتاب۔ عقاید العزیز کے مصنف کا میلان پہلے قول کی طرف ہے اور خود میرا بھی یہی خیال ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان ہر دو اقوال میں صرف ظاہری اختلاف محسوس کی جاتی ہے اس لئے میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ آخری قول ہی درست ہے مگر اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ جیسے اور جتنا حق سیر فی اللہ کا ہوتا ہے وہ ادا ہو جاتا ہے۔ حاشا وکلا۔ بلکہ مطلب محض یہ ہے کہ سالک کی اپنی استعداد کے مطابق اس کی سیر فی اللہ تمام ہو جاتی ہے اور اس لحاظ سے پہلے اور دوسرے قول میں کوئی تضاد نہیں رہ جاتا۔ پہلا قول قرآن و حدیث کے عین مطابق ہے۔ قرآن مجید کی آیتوں سے یہ ثابت ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت نہ فرمائے معرفت حاصل نہیں کر سکتا نہ ہی یہ ممکن ہے۔ یھدی لنورہ من یشاء پس ہادی بھی وہی ہے اور اسی کا وجود اس کی معرفت کا ایک سبب ہے لیس الھادی الا ھو باقی رہا یہ سوال کہ بقول فقرا مرشد اللہ ہے بالکل درست ہے مگر اس کو سمجھنا اور اس پر یقین کرنا بہت مشکل ہے۔

بے منزل آمد زمن تا بہ تو
نشاید ترا یافت الا بہ تو

فصل نمبر۲

سید الانبیاء فخر اولاد آدم

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

الحمد الله المنفرد باسمه الاسمیٰ المختص بالملک
الاغز الا حمیٰ الذی لیس دونه منتهیٰ والا وراءه مرمیٰ الظاهر
یقینا" لا تخیلا" ولا وهما" ۔ الباطن تقدسا" لا عدما" ۔ وسع
کل شئی رحمته و علما" و اسمع علیٰ اولیائه نعما" عما"
وبعث فیهم رسولا" من انفسهم انفسهم عربا" و عجما" و ازکا
هم محتد متمی وارجحهم عقلا" و حکما" و اوفزهم علما" و
فهما و داقواهم یقینا" و عرفا" ۔ اشد هم بهم رافته ورحما" زکاه
روحا" و جسما" ۔ وحاشاه عیبا و وصما" ۔ و اتاه حکمته و
حکما و فتح به اعیا" عمیا" و قلوبا" غلفا" و اذانا صما فامن به
غزره و نصره من جعل الله له فی مغنم السعادة قسما" و کذب
به و صلق عن آیاته من کتب الله علیه الشقاء حتما" و من کان
فی هذه اعمیٰ فهو فی الاخرة اعمیٰ صلی الله علیه وسلم صلوة
تمنوا و تمنٰی و علیٰی اله تسلیما

نعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم

(ترجمہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نور کائنات کے ذرے ذرے میں نمایاں ہے اور

اس کا (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا) نام ہر بیمار کے لئے شفا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام جو بنی نوع انسان کا باپ تھا اور جسے شیطان نے ورغلا کر جنت سے باہر نکال دیا تب وہ (آدم علیہ السلام) صبح و شام نہایت سوز و گداز کے ساتھ رویا کرتے تھے مگر جب انہوں نے احمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ بنایا تو ان کی دعا میں اثر پیدا ہو گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا آدم علیہ السلام کے لئے عفو و درگذر کا سبب بن گئی (اور) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نور کائنات کے ذرے ذرے میں نمایاں ہے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے ان کو (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو) لعمرک کے خطاب سے نوازا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نے ان کو (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو) قرۃ العین فرما کر یاد کیا ہے۔ اور تو اور شیوجی مہاراج روز و شب ان کی (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی) صفات بیان فرمایا کرتے تھے ان صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا کہنا کیونکہ فرشتوں نے بھی ان (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نسب کی بے حساب تعریفیں کی ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام ان (صلی اللہ علیہ وسلم) کی غلامی پر فخر کیا کرتے تھے۔ (اور) نبی کا نور کائنات کے ذرے ذرے میں نمایاں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے فرمایا کہ اے قوم! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں، اور یہ روایت میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے کرتا ہوں (اور) اے قوم! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں، میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ میں ان کے منکروں سے خصومت رکھتا ہوں۔ (اس لئے کہ) تورایت استثنٰے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی صفت بیان کی گئی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نور کائنات کے ذرے ذرے میں نمایاں ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں جاتا ہوں تاکہ اللہ کی طرف سے تمہارے لئے بشیر آجائے وہ یہودیوں کے لئے نذیر بھی ہو گا اور میری بزرگی بھی بیان

فرمائے گا۔ ان(صلی اللہ علیہ وسلم)کی قدسی عدالت کا کوئی جواب نہ ہو گا (اس لئے تم سب) اپنے آپ کو ان(صلی اللہ علیہ وسلم)کی غلامی کی زنجیر سے باندھ لو (اور)
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہی پیشن گوئی انجیل یوحنا میں کی گئی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نور کائنات کے ذرے ذرے میں نمایاں ہے۔

ہندو دھرم کے چار مشہور وید ہیں (ان میں سے) سام وید نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کے بارے میں بشارت دی ہے (وہ یہ کہ) اندر ان(صلی اللہ علیہ وسلم)کی صفت بیان فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ وہ باطل کو ختم کر دیں گے اور انتہائی حکمت و دانائی سے حجرا اسود کو نصب فرمائیں گے (مزیداً براں ان کے) اصحاب کرام رضی اللہ عنہ مال غنیمت کو حاصل کر لیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نور کائنات کے ذرے ذرے میں نمایاں ہے۔

سام وید' تورایت اور حضرت مسیح علیہ السلام کی بشارتوں کے مطابق حضور اقدس صلی اللہ علیہ پیدا ہو گئے۔ ان(صلی اللہ علیہ وسلم)کی پیدائش کے ساتھ ہی کسریٰ کے محلات میں ایک عظیم الشان زلزلہ آگیا (کیونکہ) گمراہوں کے رہنما اور شاہ لولاک دنیا میں تشریف لے آئے۔ وہ(صلی اللہ علیہ وسلم)

جن کی زلفوں کو واللیل اور جن کی جبین مبارک کو والضحیٰ سے یاد فرمایا گیا ہے اور جن کی زلفوں کی سیاہی سے رات اور جن کے چہرہ مبارک سے سپیدہ صحر نے جنم لیا ہے اور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نور کائنات کے ذرے ذرے میں نمایاں ہے۔

کاش! کہ میرا دل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں دونیم ہو جائے اور خدا کرے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لطف و کرم مجھ پر نازل ہو اور نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد مجھے اپنے ایک غلام کی حیثیت سے قبول فرمالے (اور بے شک) اہل بیت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی شفیق اور صاحبان رحمت ہیں اس لئے (حمزہ رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہے :۔

کہ اے اللہ ! میرے سر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا سودا پیدا فرما

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کائنات کے ذرے ذرے میں نمایاں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نام گرامی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ۲۲۔ اپریل ۵۷۱ عیسوی کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ قبل ازیں جو جو انبیاء علیہم السلام مخصوص زمانوں اور اوطان میں پیدا ہوئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے ان کی تعداد تکمیل تک پہنچ گئی گویا ایک اجمال کی تفصیل کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بی بی آمنہ علیہا السلام کے مبارک گھر میں نزول اجلال فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی وجہ سے شیطان کی آہ و بکا سنی گئی ۔ کسریٰ کے محل کی میناریں زمین بوس ہو گئیں آتش پرستوں کی آگ سرد پڑ گئی ۔ اور کیوں نہ ہو جس حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضرت حق جل مجدہ خود فرماتے ہیں کہ :۔

خلقت نور محمد من نور وجھی

(میں نے نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چہرے کے نور سے پیدا فرمایا)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزول اجلال فرماتے وقت عالم ملکوت میں خوشی کی جشن منائی جا رہی تھی عام قاعدہ ہے کہ جب ایک علاقے کے تصرف کے لئے ایک بادشاہ کسی حاکم کو مقرر کرتا ہے تو ایسے حاکم کے استقبال کے لئے گوناگوں تیاریاں ہوتی ہیں اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے لئے بھی بہت کچھ ہوا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ بھی کم ہے۔

ز محو کاولا تا ابد ہر چہ ہست   بہ آرائش نام او نقش ہست

چراغے کہ تا نیفر وخت نور — زچشم جہاں روشنی بود دور
گزیں کردہ ہر دو عالم توئی — چو تو گر کسے باشد آں ہم توئی

اور ایک دوسرے مصرعہ میں کیا خوب کہا گیا ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

تقدیس و طہارت کے ساتھ ساتھ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک چالیس برس ہوگئی تو حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے اعزاز سے سرفراز فرمایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر مبارک میں نبوت کی ذمہ داریوں کو تکمیل تک پہنچایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ تیئس (۲۳) سالوں پر مشتمل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی حیات مبارک میں نبوت کی ذمہ داریوں کو تکمیل تک پہنچانا اور کل کے اجمال کی تفصیل کو نمایاں کرنا ہی ان کی صداقت کی دلیل ہے۔ (اسی طرح) خداوند ذوالجلال کے "چہرہ مبارک" کے نور سے آپ صلی اللہ کا پیدا ہونا احادیث سے ثابت ہے اور اگر حکماء حضرات عقل اول کو کوئی چیز تسلیم کرتے ہوں تو بلاشبہ۔ وہ یہی نور مبارک ہے جس کو ازل میں ہر چیز سے پہلے تخلیق کیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش حق تعالیٰ کے "چہرہ مبارک" کے نور سے اس لئے ظہور پذیر ہوئی تاکہ آئندہ آنے والے انبیاء علیہم السلام آپ کے نور اقدس سے نورانیت حاصل کر سکیں یعنی حضرت نبینا آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے سیراب ہوں گے اور چونکہ سر انسانی جسم میں باقی تمام اعضاء سے بہتر ہے اور چہرہ سر میں ہوتا ہے۔ اس بنا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت دیگر انبیاء علیہم السلام پر ثابت ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

انا فتحنا لک فتحاً مبینا لیغفر لک اللہ ما

تقدم من ذنبک وما تاخر و یتم نعمتہ علیک و
یھدیک صراطا مستقیما و ینصرک اللہ
نصرا عزیزا (الفتح ایت ۱-۲)

بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی۔ تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرما دے اور آپ پر اپنے احسانات کی تکمیل کر دے اور آپ کو سیدھے راستے پر لے چلے اور اللہ آپ کو ایسا غلبہ دے جس میں عزت ہی عزت ہو۔ (۱)

---

(۱) یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ بعض عیسائی اور آریہ ھندو اعتراض کرتے ہیں کہ جب اللہ نے آپ ﷺ کے اگلے اور پچھلے گنا معاف فرما دئے تو کیا آپ نے پہلے گناہ کئے تھے۔ ایک دوسری ایت مبارک میں بھی ارشاد ہوا ہے۔
واستغفر لذنبک و للمومنین والمومنت (محمد ﷺ آیت نمبر۱۹)
اور اس کے علاوہ و وجدک ضالا فھدیٰ (الضحیٰ ایت نمبر۷) بھی فرمایا گیا ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس کا ازالہ کیا جائے چنانچہ سمجھ لینا چاہیے کہ بعض امور ایسے ہیں جو ہمارے لئے تو حسنات میں شمار کئے جاتے ہیں مگر اولیاء رحمہم اللہ کے لئے وہ سیئات کے زمرے آتی ہیں۔

اسی طرح بعض امور اولیاء رحمہم اللہ کے لئے حسنات مگر انبیاء علیہم السلام کے لئے سیات میں شمار کی جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر جنگ بدر میں حضور اقدس ﷺ نے قیدیوں سے فدیہ وصول کر لیا اور وحی کا انتظار نہیں کیا اگرچہ حضور اقدس ﷺ کا یہ فعل جائز اور درست تھا مگر وحی کا انتظار نہ فرما کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ ہم تمہارے آخرت کا فائدہ پسند فرماتے ہیں دنیا نہیں۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور دوسرے انبیائے پر افضلیت کا ایک

....

یعنی فدیہ نہیں لینا چاہیے تھا بلکہ ان قیدیوں کو قتل کرنا لازمی تھا چنانچہ حضور ﷺ کے اس فیصلے کو "ذنب" کہا گیا جس کے لئے آپ ﷺ استغفار فرمایا کرتے تھے۔ اور استغفار کے ایک معنی کپڑے میں چھپانا بھی ہے اور جو کپڑا سارے بدن کو چھپالے اس کو بھی غفارہ کہتے ہیں۔ لہٰذا حضور اقدس ﷺ کے استغفار کا مطلب یہ تھا کہ آپ ﷺ سے کوئی ایسا فعل صادر نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بن سکے۔ اب غور کرنا چاہیے کہ (یہ تو) آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سیتارتھ پرکاش نے بھی لکھا ہے کہ کسی لفظ یا جملہ کے صحیح معنی وہ ہوتے ہیں۔ جو متکلم کی منشا کے خلاف نہ ہوں۔ بلکہ اس کے مطابق ہوں۔ اور عیسائی تو کیا سب ہی اہل مذاہب یہ اصول تسلیم کرتے ہیں مثلاً" اگر کوئی شخص انجیل کی کسی ایت کی تاویل پیش کرکے یہ ثابت کرلے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے نہ تھے بلکہ ایک انسان تھے تو عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق یہ غلط ہو گا کیونکہ ایسی تاویل موجودہ انجیل کے متکلم کی منشا کے خلاف ہو گا۔ کیونکہ موجودہ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتا ہے۔ چنانچہ اسی طرح قرآن حکیم کے متکلم کی منشا کو دیکھنا چاہیے۔ کہ اس نے طہارت کے بارے میں تمام انبیاء اور خصوصاً" آنحضرت ﷺ کو کیا فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اللہ یصطفی من الملئکتہ رسلا" و من الناس (اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے رسالت کے لئے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے فرشتوں میں سے (جن فرشتوں کو چاہے) احکام پہنچانے والے (مقرر فرما دیتا ہے) (اور اس طرح آدمیوں میں سے۔ سورہ الحج ایت نمبر ۷۵) اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں ارشاد ربانی ہے کہ۔ طٰہٰ یعنی اے پاک۔ اور (بقیہ اگلے صفحے پر)

ثبوت یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ جل مجدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر یا وطن پر قسم کھاتے ہیں لا اقسم بھذا البلد یعنی قسم ہے اس شہر یا وطن کی اور بعض علمائے تو یہاں تک لکھا ہے کہ شہر سے مراد آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاک پا ہے۔ سبحان اللہ! اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب ایک عاشق اپنے معشوق کے سر کی قسم کھاتا ہے تو اس کو ہر چیز پر فوقیت دیتا ہے اس کا پاس رکھتا ہے مطلب یہ کہ قسم کھانے کے لئے اپنے معشوق کی ذات ہی اس کے لئے اہم اور عزیز ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ بھی ایک مقام پر اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی قسم کھاتے ہیں۔

لعمرک انھم فی سکرتھم یعمھون

تیری جان کی قسم وہ اپنے نشے (مستی) میں مدہوش ہیں" سورہ الحجرات ۷۲

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے وما ارسلنک الا رحمتہ اللعلمین

....

یطھرکم تطھیرا" یعنی انتہائی پاکی کے ساتھ تمہیں پاک کرتا ہوں) اور اس میں اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں۔ نیز تمام مسلمانوں کا اس پر بھی اجماع ہے کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کے متکلم کی منشا کے مطابق انبیاء معصوم ہیں اس لئے جہاں کہیں بھی ان کے بارے میں لفظ "ذنب" یا "استغفار" وارد ہو تو چونکہ ان الفاظ کے معانی متکلم کی منشا کے خلاف ہیں لہٰذا ان کی تاویل کی جائے گی۔ چنانچہ استغفار کے اصلی لغوی معنے تو ہم نے بیان کر دیئے یعنی "چھپانا" اور دوسرے معنے یہ کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لغزشوں سے مومن مردوں اور عورتوں کے لئے پناہ مانگو۔ (اسی طرح) و وجدک ضالا" فھدٰی کی تاویل ایسی کی جائے گی کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! تم واقف نہ تھے کہ تم نبی ہو۔ ہم نے تمہیں خبر دی اور نبوت سے سرفراز فرمایا۔ (مؤلف)

یعنی ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

ایک مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے اللہ نور السموت والارض مثل نورہ کمشکوۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجہ الزجاجہ کانھا کوکب دریی یوقد من شجرۃ مبرآکتہ زیتونہ لا شرقیہ و لا غربیۃ یکاد زیتھا یضئی ولو لم تمسسہ نار نور علٰی نور یھدے اللہ لنورہ من یشاء و یضرب اللہ الامثال للناس واللہ بکل شیئی علیم سورہ النور ایت ۳۵

اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا نور ہے اس کے نور کی حالت ایسی ہے جیسے ایک طاق' جس میں ایک چراغ ہو اور وہ چراغ ایک قندیل میں ہو اور وہ قندیل ایسا شفاف ہو جیسے ایک چمکتا ہوا ستارہ اور وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت کے تیل سے روش کیا جاتا ہو اور وہ زیتون کا درخت ہو جس کا رخ نہ مشرق کی طرف ہو نہ مغرب کی طرف اور وہ تیل بغیر آگ دکھاوے روشنی دیتا ہو اور جب وہ جل اٹھے تو نور علی نور ہو اور اللہ تعالیٰ اس نور تک جسے چاہے راہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لئے یہ مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

حضرت کعب بن احبار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دوسرے نور سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یعنی ارشاد خداوندی کے مطابق مثل نورہ کے مثال سے مراد وہ نور ہے جس کو نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے حضرت سہل بن عبد اللہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے زمین و آسمان کی مخلوقات کے لئے ہادی بنا کر پیدا فرمایا ہے پھر فرمایا کہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم جب مختلف پشتوں میں تھا تو اس کی مثال طاق کی ہے اور چراغ سے مطلب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اقدس ہے اور شیشے

(قندیل) سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک ہے۔ گویا وہ ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے کیونکہ وہ سینہ ایمان و حکمت کا سرچشمہ ہے اور وہ جس مبارک درخت سے روشن ہوتا ہے فی الحقیقت وہ حضرت ابراھیم علیہ السلام کا نور ہے جس کو درخت سے تعبیر کیا گیا ہے اور حق تعالٰی کا ارشاد ہے قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین (یعنی تمھیں اللہ کی طرف سے نور اور روشن کتاب آیا ہے) اور خود انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انا اکرم ولد ادم علٰی ربی (میں اللہ تعالٰی کے نزدیک اولاد آدم میں سب بہتر ہوں) ایک اور حدیث مبارک میں فرمایا گیا ہے کہ اول ما خلق اللہ العقل فقال لہ اقبل ثم قال لہ ادبر ثم قال لہ اقعد فقعد ثم قال لہ انطق فنطق ثم قال لہ اصمت فصمت فقال بعزتی و عظمتی و کبریائی و سلطانی و جبروتی ماخلقت خلقاً احب الی منک ولا اکرم علی منک بک اعرف و بک احمد ولک اطاع و بک اخذ و بک اعطی و ایاک اغاثب ولک الثواب و علیک العقاب وما اکرمتک بشئی افضل من البصر (اگر چہ اس حدیث سے صاحب قاموس شیخ مجدد الدین فیروز آبادی رحمتہ اللہ علیہ نے انکار کیا ہے مگر حضرت شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مدارج النبوہ اور مرج البحرین میں اسے تسلیم کیا ہے اور وہاں سے دیگر علما نے نقل کی ہے جبکہ مجمع السلوک میں صرف اس کا ترجمہ لکھا گیا ہے (جس کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے) سب سے پہلے جس چیز کو خدا نے پیدا فرمایا وہ عقل ہے پس اسے کہا کہ آگے آؤ تو وہ آگے آگئی، پھر فرمایا کہ پیچھے ہٹ جاؤ تو وہ پیچھے ہٹ گئی، پھر ارشاد ہوا کہ بیٹھ جاؤ تو وہ بیٹھ گئی بعد ازاں حکم ہوا کہ بولو تو وہ بولنے لگی، اس کے بعد فرمایا گیا خاموش ہو جاؤ تو چپ ہو گئی اور اس کے بعد ارشاد ہوا کہ میں اپنی عزت، جلال، عظمت، کبریائی، سلطانی و جبروت پر قسم کھاتا ہوں

کہ میں نے تمہارے بغیر کسی اور کو زیادہ عزیز و محبوب پیدا نہیں فرمایا یا جو تجھ سے زیادہ بزرگ ہو (کیونکہ) میں تجھ سے پہچانا جاتا ہوں اور تیرے ذریعے میری حمد و صفت اور اطاعت کی جاتی ہے میں مواخذہ بھی تم سے کروں گا اور بخشش بھی تمہاری کروں گا میں غصہ بھی تم پر کروں گا اور تمہیں ثواب بھی عطا کروں گا اور عذاب بھی تمہیں دوں گا اور میں نے تمہیں دوسری چیزوں پر بزرگی نہیں دی مگر صبر کے ساتھ۔

مطلب یہ کہ یہی عقل ہی اول ہے جو حضرت حق کی محبوب ہے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو دنیا و آخرت میں بلند فرمایا۔ ورفعنا لک ذکرک چنانچہ اب جو خطیب یا نماز گذار یا شہادت دینے والا ہو وہ یہی کہتا ہے کہ

اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمد رسول اللہ

قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب شفا میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت ابوخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت جرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا ان ربی و ربک یقول تدری کیف ذکرک' قلت اللہ ورسولہ اعلم' قال ذکرت ذکرت مَعِی یعنی میرا اور آپ کا رب فرماتا ہے کہ آیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہارا ذکر کیسے بلند کیا' تو میں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں تو فرمایا کہ (ایسے کہ) جب میرا ذکر ہو رہا ہوتا ہے تو (ساتھ ہی) تمہارا ذکر بھی ہوتا ہے۔

ابن عطاء رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "جب میں تمہارا ذکر کرتا ہوں تو میرا ایمان پورا ہوتا ہے"۔ آپ رحمتہ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ "میں نے تمہیں اپنا ذکر گردانا ہے پس جس نے تیرا ذکر کیا اس نے گویا میرا ذکر کیا" (ظاہر ہے کہ یہ بات اللہ

کی طرف منسوب ہے: طاہر چشتی) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ جو بھی تیری رسالت کا ذکر کرے وہ گویا میری ربوبیت کا ذکر کرتا ہے۔

اب جب کہ یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ بے حساب محبت فرماتے ہیں تو اس لئے ضروری ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل آنے والے انبیاء علیھم السلام کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری کی اطلاع دی گئی ہو۔ تاکہ وہ اپنی امتوں کو وصیت کر سکیں۔۔ کہ جب اور جس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئیں تو ان کی امتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں اور عذاب سے بچ جائیں چنانچہ حق تعالیٰ نے تورایت اور انجیل میں خبر دی ہے مبشر رسول یاتی من بعدی اسمہ احمد اور فرماتے ہیں۔

الذین یجدونہ مکتوبا عندھم فے التوریت والا انجیل یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تورایت و انجیل میں تو موجود ہے مگر اب میں ہندوؤں کی مذہبی کتابوں (جن کو وہ الہامی کتابیں کہتے ہیں) میں سے بعض اہم پیشن گوئیوں کا ذکر کروں گا۔

سام وید کی پیشن گوئی۔

سام وید میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مندرجہ ذیل پیش گوئیاں موجود ہیں (۱) وہ ہر مقدس رسم کا مربی ہو گا۔(۲) رعد والا (۳) بے حد تعریف کیاہوا (۴) قلعوں کو مسمار کرنے والا جوان' عقلمند اور بے پناہ قوت والا (۵) اے پتھر کو نصب کرنے والے .... یہ دیوتا نہایت اور خوف کے ساتھ تیرے قریب آیا پھر خوف سے آزاد ہو گیا اور تمہاری مدد کی (۶) انہوں نے دعائیہ بھجن کے ساتھ اس اندر کی تعریف بیان کی جو اپنی قوت سے حکومت کرتا ہے اور جس کی جانب سے ہزارہا بلکہ

اس سے زیادہ انعامات و عطیات مقرر ہیں۔ (۱)

اس عبارت میں جن کمالات اور صفات کا تذکرہ ہوا ہے وہ سب کے سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہیں ان کے علاوہ کوئی اور ایسا نہیں جس میں یہ کمالات تمام کے تمام موجود ہوں کیونکہ ایسی ہستی نہ آپ سے پہلے پیدا ہوئی تھی اور نہ بعد میں پیدا ہو سکتی ہے اب ہم ان صفات کو ایک ایک کرکے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قدسی ذات میں ثابت کریں گے۔ اس عبارت میں ممدوح کی پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے۔

ہر مقدس رسم کا مربی:

یہ قدسی وصف پوری کی پوری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے یہاں تک کہ منکرین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر اچھے اور مقدس رسم کی تائید اور اشاعت نہ صرف زبانی طور پر فرمایا کرتے تھے بلکہ عملی طور پر بھی کر دکھایا کرتے تھے اور اس کے مقابلہ میں ہر برے اور خراب رسم کی تردید فرمایا کرتے تھے بلکہ سارے جزیرہ نمائے عرب کو ہر قسم کی خراب رسموں سے پاک کر دیا اور تمام مشرکین کے سر خدائے واحد کے حضور میں جھکا دیئے۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ نیکی کا رکن اعلیٰ توحید ہے (چنانچہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر اونچے پیمانے پر حق تعالیٰ کی ذات و صفات، استحقاق عبادت الٰہی اور اس کے قیام اور خصوصاً اس کے ضد یعنی شرک

---

(۱) سام وید حصہ دوم حصہ پانچ باب نمبر1 فصل پھاٹک نمبر۲۵ صفحہ نمبر۱۲۵ مترجمہ بابو پیارے لال صاحب زمیندار بروٹھا۔ مطبوعہ وویا ساگر پریس بروٹھا۔ ضلع علی گڑھ ۱۸۹۷ء

کو نیست نابود کرنے میں جو کامیابی حاصل کی ہے اس کی نظیر تاریخ عالم بشر پیش کرنے سے معذور ہے اور قرآن حکیم کی تعلیمات سے بھی بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے کیونکہ قرآن مجید میں انتہائی بھرپور انداز سے توحید الٰہی پیش کی گئی ہے اور اسی بھرپور انداز سے شرک کی مذمت کی گئی ہے۔ جہاں تک اس کے عملی ثبوت کا تعلق ہے تو اس ضمن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل طور پر خضوع' خشوع اور اطمینان سے نماز پڑھنے کا عمل ہی کافی ہے اور پھر اسی نماز کے قیام کے بارے میں اپنی امت کو سختی سے تاکید فرمانا بھی قابل غور ہے۔ شرک کو ختم کرنے کا ایک اہم اور عملی ثبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے روز پیش فرمایا کیونکہ عین اسی دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے بتوں کو پاش پاش کرکے بیت اللہ شریف کو ان سے پاک کر دیا۔

نیکی کا رکن ثانی اخلاق فاضلہ ہیں اور یہ یا تو کسی کی ذات میں ہوتے ہیں یا لوگوں کے ساتھ معاملات اور تعلقات سے معلوم کئے جا سکتے ہیں تو اس بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل طور پر تعلیمات دی ہیں اور عملی طور پر بھی اس کے مکمل ترین نمونے بھی پیش فرمائے ہیں۔ مثال کے طور پر صدق و دیانت' عفت وحیا' جود وکرم' حلم و تواضع' شفقت و رحمت' عفو و درگذر' ماتحتوں اور کمزوریوں کے ساتھ نرم سلوک' مظلوموں کی داد رسی' یتیموں کی پرورش' بیوہ گان کی خبر گیری' دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ کھلے دل اور خندہ پیشانی سے ملنا اور گفتگو کرنا' معاملات میں دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ مکمل طور پر عدل و انصاف کا سلوک کرنا' حق کی طرف داری کرنا اور باطل کی مخالفت کرنا' دشمن کے ساتھ اچھا اور شریفانہ سلوک کرنا اور دوستوں کی خاطر مدارت کرنا' بحث و مناظرہ میں صرف اور صرف مخلوق خدا کی

اصلاح اور بھلائی کو مد نظر رکھنا' سخت کلامی اور سخت زبانی سے پرہیز کرنا جبکہ دوسروں کی بد کلامی اور سخت کلامی کو برداشت کرنا' بدی سے فرار اور بے حیائی سے پرہیز اختیار کرنا اسی طرح کسی شخص یا جاندار پر ظلم کرنے سے بھی جان بچانا۔ وغیرہ۔ غرضیکہ سب کے سب اور تمام کے تمام اخلاق فاضلہ کی تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر بھی دی ہے اور زبانی طور پر بھی ۔۔۔ اور یہ بات اتنی سچی اور حقیقی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین بھی اس سے انکار نہیں کرتے۔ بہر نوع سام وید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صفت ہے :۔

رعد والا۔

رعد والے سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر بارعب اور صاحب سیاست ہوں گے کہ مخالفین ہمیشہ آپ سے مرعوب اور خوفزدہ رہیں گے اور نیز جس طرح رعد سے لوگ دور دور تک ہیبت زدہ ہوتے ہیں اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی لوگ ہیبت زدہ ہوں گے۔ چنانچہ یہ وصف بھی کامل طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے تاریخ سے بھی یہ حقیقت ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی درجے کے بہادر' شجاع اور جوانمرد تھے اور مقابلہ کرتے وقت مخالفین پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت چھائی رہتی تھی اور تو اور جو اصحاب ﷺ صبح و شام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم نشین ہوتے تھے وہ بھی آپ کی محفل میں ہیبت زدہ رہتے تھے تعجب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی خوش گفتار اور شیریں زبان تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت مبارک بھی بڑی نرم تھی۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے بہادر انسان بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہیبت زدہ رہتے تھے۔ یورپ کے مصنفین نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔

سام وید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری صفت ہے :۔

بے حد تعریف کیا ہوا۔

اس صفت کی تشریح کے بارے میں لمبی چھوٹی تحریروں کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ صاف طور پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ترجمہ ہے اس لئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مفعول کا صیغہ ہے جس کا مصدر تحمید ہے اور اس کے معنے ہیں بے حد تعریف کرنا۔ سو اسم مفعول "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" کے معنے ہوئے "بے حد تعریف کیا ہوا" غور فرمائیے اس سے زیادہ واضح طور پر کوئی کسی کے اوصاف کیسے بیان کر سکتا ہے۔ خصوصاً جب کسی کی تعریف و تعین کے لئے نہ صرف اس کا اسم گرامی بلکہ اوصاف بھی بیان کئے ہوں اور پھر اگرچہ کوئی اور اس کا ہم نام بھی ہو تاہم ان خصوصی اوصاف کی وجہ سے وہ بہر حال ممتاز ہوتا ہے اور اگر ان صفات میں کوئی اور اس سے کسی ایک صفت میں مطابقت بھی رکھتا ہو تو اس صورت میں اس کے نام سے اصلیت معلوم ہو جائے گی چنانچہ یہاں پر ہم سب ہندوؤں سے نہایت پیار کے ساتھ یہ پوچھنا پسند کریں گے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر کسی دوسری شخصیت کا نام لے سکتے ہیں جس کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم (بے حد تعریف کیا ہوا) ہو اور جس کی ذات میں یہ تمام صفات بیک وقت موجود ہوں جن کا ذکر سام وید نے کیا ہے شعر (ترجمہ)

(نثر) ارے نادان ناصح بلاوجہ مجھے تنگ کیوں کرتے ہو

جا اور جلدی سے مجھے اس جیسا ایک جوان تو دکھادے

اگر کوشش بسیار اور بے پناہ تاریخی مطالعہ کے بعد بھی ان کو کسی ایسی ہی ہستی کا پتہ معلوم نہ ہو سکے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ قطعی ناممکن بھی ہے تو ایسے حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ حق تعالیٰ کے اس برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں جن کا نام نامی اور اسم گرامی وہ اپنی مذہبی کتاب میں پڑھتے اور دیکھتے

ہیں (ا) خصوصاً" اس کتاب میں جس کو ہندو سب سے قدیم منزل من اللہ کتاب سمجھتے ہیں پھر تو لازم آتا ہے کہ اس کتاب کی باتوں کو خوشی سے مان لیں' ان پر صدق دل سے ایمان لے آئیں اور دونوں جہانوں میں سرخروئی حاصل کر لیں۔

مراد ما نصیحت بود گفتم

حوالت باخدا کردیم و رفتیم

اسی سام وید میں اسی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری صفت "اندر" بیان کی گئی ہے۔

(ا) ممکن ہے بعض حضرات یہاں پر اعتراض کر دیں کہ ہندوؤں کے پاس الہامی کتاب کہاں ہے۔ مگر ان کا اعتراض حقیقت پر مبنی نہ ہو گا کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ' لکل قوم ھاد۔ وما من قریہ الاخلا فیہ نذیر اور ایک دوسری جگہ فرماتا ہے ماکنا معذبین حتیٰ نبعث فیھم رسولا" یعنی خدا نے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ کو اپنا ایک نبی علیہ السلام بھیجا ہے گویا اس دنیا میں ایسا کوئی گاؤں نہیں جس کو ایک نبی علیہ السلام کی تبلیغ اور تلقین نہ پہنچائی گئی ہو۔ اسی ضمن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "جب تک کسی قوم میں ایک نبی مبعوث نہ فرمالوں اس وقت تک اس قوم کو (بشرط نافرمانی) عذاب نہیں دیتا۔ چنانچہ ہم کیسے مان سکتے ہیں کہ ہندوستان (پاک و ہند) کے کروڑہا ہندوؤں کو حق تعالیٰ نے کسی نبی کی بعثت اور ہدایت سے محروم رکھا ہو۔ یہ بات اسلام کے بھی خلاف ہے ان کے پاس بھی دوسری اقوام کی طرح انبیاء آئے ہیں جن پر کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے ہیں۔ مگر جس طرح ہوتا آیا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد لوگوں نے ان کتابوں میں تحریفیں اور گڑ بڑ کی ہے اگرچہ زبور' انجیل' تورایت اور وید میں بھی تحریف ہوئی ہے۔ تاہم کچھ نہ کچھ اصلیت اب بھی باقی

اندر۔

اندر کے معنے وہ جو صاحب اقبال ہو۔ اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ صاحب اقبال اور کون ہو سکتا ہے۔ بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے تو رہے ایک طرف' ان کے منکر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے کہ آپ انتہائی درجہ کے صاحب اقبال تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کے حالات ولادت سے لے کر وصال تک مکمل اسناد اور صحت کے ساتھ موجود ہیں۔ ایسی مکمل سوانح عمری کسی کی بھی تحریر نہیں کی گئی ہے۔ یتیمی کی حالت میں آپ کی پرورش' بعد ازاں تبلیغ و رسالت کی وجہ سے اپنوں پرایوں کی طرف سے دشمنی کا سلوک' آپ کو قسم قسم کے دکھ اور تکالیف پہنچانا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا برداشت کرنا اور پھر فتح مکہ کے موقعہ پر ان سب کو بالکل معاف کرنا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس ہی میں شاہان عرب اور سرداران عرب کا ان کا مطیع و فرمان بردار ہونا اور مزید برآں دور دور تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رعب و دبدبہ کا پھیلنا۔ غرضیکہ "اندر" کے تمام صفات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ثابت ہیں۔ سوامی دیانند نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش کے باب اول میں تحریر کیا ہے کہ اندر خدا کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس لئے کہ صرف خدا ہی سب سے زیادہ صاحب حشمت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ھندو یہاں پر یہ کہدے کہ لفظ اندر جو زیر بحث ہے اس سے مراد خدا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کا ازالہ کیا جائے۔ سوامی دیانند نے بھی اس بارے میں اسی سوال کا جواب دیا ہے اور لکھتے ہیں کہ خدا کی صفات کے ضمن میں ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو دوسری اشیاء

کے لئے بھی استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہی الفاظ ہم خدا کی صفات کے لئے کیسے مخصوص کریں گے۔ لکھتے ہیں کہ وہ لفظ جس کے کئی کئی معنے ہوں اس کو کسی ایک خاص معنے میں استعمال کرنے کے لئے سلسلہ کلام اور قرائنوں کو مد نظر رکھنا ضروری ہے نیز موقعہ و محل کو دیکھ کر اس کے معنے بیان کرنا چاہیے۔ سوامی جی کا خیال بالکل صحیح درست ہے اور اسی کلیہ کے مطابق جب ہم سام وید کی عبارات میں لفظ اندر کے معنے پر غور کرتے ہیں۔ تو اس سے مراد حق تعالیٰ نہیں جیسا اور جہاں پہلی بار سام وید میں آیا ہے بلکہ اس سے مراد خدا کی مخلوق میں ایک صاحب اقبال ہستی ہے۔ سام وید میں جہاں دوسری بار لفظ اندر آیا ہے اس سے مراد البتہ خدا تعالیٰ ہے۔ کیونکہ جہاں عبارت کی شروع میں پہلی بار یہ لفظ آیا ہے تو اس کے ساتھ "جوان" بھی لکھا گیا ہے اور "جوان" خدا کی صفت نہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ "جوان" اس کی مخلوق میں ایک آدمی کی صفت ہو سکتی ہے ایک دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ اس ہستی کی صفت کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے کہ :۔ "بے انداز قوت والا خلق شدہ" اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو ہمارے مدعا کو درست ثابت کرتی ہے اور اس کی تفصیل میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کے خدا "خلق شدہ" (پیدا شدہ) نہیں بلکہ وہ تو خالق ہے۔ اللہ خالق کل شیئی وھو علی کل شیئی و کیل یعنی اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے لہٰذا اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس اندر سے مراد خدا کی مخلوق میں سے ایک آدمی ہے اور ہم نے بھی یہی ثابت کیا ہے کہ اس سے مراد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر کوئی اور ہرگز نہیں ہو سکتا۔

سام وید کی عبارت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچویں صفت ہے :۔

قلعوں کو مسمار کرنے والا۔

یہ صفت بھی پوری کی پوری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے وہ مضبوط سے مضبوط قلعے فتح کئے تھے جنہیں کوئی اور فتح نہیں کر سکتا تھا۔ ان قلعوں کے قابضین اور مالکان کا بھی یہی خیال تھا کہ ان کو کوئی بھی فتح نہیں کر سکتا۔ (یہاں پر قلعہ خیبر کا ذکر کرنا ضروری ہے) چنانچہ قلعہ خیبر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

هوالذی اخرج الذین کفروا من اهل لکتاب من دیارهم لاول الحشر ماظننتم ان یخرجوا و ظنوا انهم ما نعتهم حصونهم من الله فاتهم الله من حیث لم یحتسبوا و قذف فیی قلوبهم الرعب یخربون بیوتهم بایدیهم وایدی المومنین فاعتبروا یاولی الابصار سورت الحشر ایت ۲

وہی (اللہ) ہے جس نے ان کفار اہل کتاب (یعنی بنو نضیر) کو روز حشر سے پہلے اکٹھا کر کے ان کے گھروں سے نکال دیا۔ (مسلمانو!) تمہارا تو خیال و گمان بھی نہ تھا کہ وہ کبھی اپنے گھروں سے نکلیں گے اور خود انہوں نے بھی یہ گمان کر رکھا تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ سے بچائیں گے۔ سو ان پر خدا کا عقاب (علی رضی اللہ عنہ) ایسی جگہ سے پہنچا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ وہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی اجاڑ رہے تھے۔ سنو اے دانشمندو (اس حالت کو دیکھ کر) عبرت حاصل کرو۔

سام وید کی اگلی عبارت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چھٹی صفت مندرجہ ذیل ہے۔

جوان۔

اور اس سے مراد جوانمرد ہے۔ اس لئے کہ جوانی کی عمر تک پہنچنا کوئی کمال نہیں بلکہ جوانی کے لوازمات شجاعت، بہادری، جوان مردی، دلاوری، بلند ہمتی، مستقل مزاجی اور انتہائی سنگین حالات اور مصیبت کے وقت میں ہمت نہ ہارنا ہے۔ یہی جوانمردی ہے۔ مثال کے طور پر جب ابتدائے اسلام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف میں تبلیغ اسلام فرما رہے تھے تو لوگوں نے اس شدت سے پتھروں سے مارا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے دم ہو گئے۔ پھر زمین پر بیٹھ گئے مگر تبلیغ سے دستبردار نہ ہوئے اور باقاعدہ تبلیغ فرماتے رہے۔ تو مطلب یہ کہ یہ سب صفات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت کے بارے میں تو صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ آپ بذات خود کئی جنگوں میں شریک ہوئے مگر کسی موقعہ پر کبھی بھی پس پا نہیں ہوئے اور بڑی پامردی اور جوانمردی سے میدان کارزار میں مصروف جنگ رہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقل مزاجی اور بلند ہمتی بھی اتنی مشہور اور معروف ہے کہ اس بارے میں کچھ کہنے یا لکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنی ساری قوم اور اپنے عزیزوں کی بے پناہ مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ اور اس حقیقت کو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین بھی مانتے ہیں اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی حیات مبارک میں اپنے عظیم مقصد میں کامیاب ہونا اور دین اسلام کا بطور احسن پھیلانا اس امر کا متقاضی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین بھی آپ کی شجاعت و جوانمردی سے انکار نہیں کر سکتے۔

سام وید کی عبارت میں نبی علیہ السلام کی ساتویں صفت "عقلمند" بتائی گئی ہے۔

عقلمند۔

عقل اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اپنے بندوں میں جس کو بھی اس نعمت سے نوازے وہ اپنے دوسرے ہم جنسوں میں امتیازی خصوصیات کا حامل شمار کیا جاتا ہے۔ اسی عقل کی دو قوتیں ہیں جن میں سے ایک کو علمی قوت اور دوسری کو عملی قوت کہا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں میں علمی قوت زیادہ ہوتی ہے مگر عملی قوت سے محروم ہوتے ہیں اور بعض لوگوں میں عملی قوت زیادہ ہوتی ہے اور علمی قوت سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں آپ کو دونوں قوتیں بدرجہ اتم حاصل تھیں۔ جن سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ آپ کے مخالفین بھی اس کے قائل ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت سے بھرپور باتیں سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات تاریخ کی کتابوں میں دیئے گئے ہیں۔

سام وید کی عبارت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اٹھویں صفت "بے حد قوت والا پیدا شدہ" ہے۔

بے حد قوت والا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس صفت میں بھی ہر طرح سے کامل تھے۔ کبھی بھی آپ سے بزدلی یا کاہلی دیکھنے میں نہیں آئی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ میں بعض ایسے واقعات بھی رونما ہوئے کہ ایسے موقعوں پر عرب کے بہادروں نے بھی اپنی بے بسی اور عاجزی کا اقرار کر لیا مگر آپ صلی اللہ علیہ نے ایسے کئی سنگین امور اپنے انجام تک پہنچائے۔ چنانچہ غزوہ خندق (جس کا ذکر سام وید میں بھی آیا ہے اور اپنے مقام پر اس کا ذکر کیا جائے گا) کے دوران خندق کھودتے وقت ایک جگہ انتہائی سخت

اور پتھریلی زمین آگئی اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھک کر عاجز آگئے اور جب یہ تذکرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "انا نازل" یعنی میں خود آتا ہوں تو اگرچہ آپ مسلسل تین شب و روز فاقہ سے تھے مگر کدال اٹھا کر ایسے شدید ضربات لگائے کہ پتھر کو ریزہ ریزہ کر لیا اور خندق کھودنے کا کام جو اسی پتھر کی وجہ سے رک گیا تھا آگے چل پڑا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں طوالت کی خاطر اسی ایک واقعے پر اکتفا کرتا ہوں۔

سام وید کی عبارت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور صفت ...... "پتھر کا نصب کرنے والا" تحریر کیا گیا ہے۔

پتھر کا نصب کرنے والا۔

یہ اشارہ صاف طور پر حجر اسود کو نصب کرنے کی طرف ہے۔ یہ واقعہ اس زمانے میں پیش آیا تھا جب آپ کی عمر مبارک ۳۵ برس تھی۔ اس میں حضور اقدس کی انتہائی عقلمندی کا ثبوت بھی موجود ہے۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب کعبۃ اللہ کی عمارت سیلاب اور طوفان کی وجہ سے منہدم ہو گئی تھی۔ اور قریش اس کی تعمیر میں مصروف تھے۔ جب عمارت اس حد تک پہنچ گئی جہاں حجر اسود نصب کرنا تھا تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اب کون اس کو اپنے ہاتھ سے نصب کرے گا۔ چنانچہ اس بات پر جھگڑا شروع ہو گیا کیونکہ اس مبارک کام کے لئے ہر ایک کا دل بے قرار تھا۔ زبانی تکرار سے بات بڑھتے بڑھتے دست اندازی تک پہنچ گئی۔ حتیٰ کہ ایک فریق نے دوسرے کے خلاف اعلان جنگ سے بھی منہ نہ موڑا اور تو اور قبیلہ عبدالدار کے لوگوں نے تو قسم کھالی کہ ہم قتل بھی ہو جائیں تو باک نہیں مگر ہمارے بغیر کوئی اور قوم حجر اسود کو اپنے مقام میں نصب نہیں کر سکے گا آخر کئی جرگوں اور صلاح و مشورہ کے بعد آخری فیصلہ

یہ ہوا کہ ''اچھا کل صبح سویرے جو شخص بھی سب سے پہلے کعبۃ اللہ میں داخل ہو گا بس وہی حجر اسود کو اپنے ہاتھ سے نصب فرمائے گا''۔ سو انتظار کی رات بڑی طویل تھی ہر ایک کی دلی آرزو تھی کہ وہی سب سے پہلے کعبۃ اللہ میں داخل ہو تا کہ حجر اسود کے نصب کرنے کا مقدس فریضہ اسی کے ہاتھوں ادا ہو۔۔۔ کرنا خدا کا کہ اچانک ہی وہ نور ہدایت و برکت (صلی اللہ علیہ وسلم) سب سے پہلے بیت الحرام میں داخل ہوئے۔ اس وقت کائنات کا ذرہ ذرہ ان کے قدسی نور سے منور تھا۔ لوگوں نے دیکھا تو سبھی بے اختیار پکار اٹھے ۔۔۔ ھذا الامین ۔۔۔۔''یہ تو امین ہے''

مرحبا سید مکی مدنی العربی

دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

جن لوگوں کو یہ امید ہی نہ تھی کہ ان کی یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے جب سب نے آپ کو دیکھا تو ان کے زرد چہروں پر بھی سرخی آگئی۔ وجہ یہ ہے کہ سب لوگ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جودو سخا' عفت و حیاء اور دیانت و امانت سے واقف تھے اور سبھی انتہائی عقیدت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''امین'' کہا کرتے تھے اس لئے کہ سب آپ کے پاس اپنی امانتیں رکھا کرتے تھے۔ اس موقعہ پر قریش کی خوشی کی حالت کو ایک انگریز مصنف ولیم میور صاحب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے

Lo it is the faithful one we are Content.

''لوایماندار (امین) آگئے۔ اب ہم مطمئن ہیں'' اس مرحلہ میں بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی زیرکی' فراخ حوصلگی اور بے حد عقلمندی کا ثبوت پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر بچھائی اس میں حجر اسود کو رکھا اور بعد ازاں عرب کے جنگجوں کو دعوت دی کہ ہر قبیلے کا ایک ایک سرکردہ شخص آئے اور چادر کے پلو کو پکڑ کر اسے اٹھا لے۔ چنانچہ سب نے خوشی خوشی آ کے ارشاد پر عمل کیا

اور جب چادر اس مقام تک اونچی کر دی گئی جہاں حجر اسود کو نصب کرنا مقصود تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست ہائے مبارک سے حجر اسود کو اٹھا کر اپنی جگہ پر نصب کر دیا۔ سبحان اللہ

اس روز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلے کعبتہ اللہ تشریف لانا بالکل اتفاقی معاملہ نہ تھا بلکہ یہ وہ مقرر تقدیر تھی جو ہر گز بدلا نہیں کرتی اور فی الحقیقت یہی نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدمہ تھی وجہ یہ تھی کہ قوم کے آپس میں فساد اور جھگڑوں سے ان کی حالت ظاہر تھی۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کعبتہ اللہ میں سب سے پہلے تشریف لانے کا مقصد ہی یہی تھا کہ ان کے علاوہ کوئی اور اس کام کی انجام دہی کا اہل نہیں جو بطور احسن جھگڑوں اور فساد کا خاتمہ کر لے اسی طرح حجر اسود کو نصب فرمانے کے دوران آپ نے قوم کی سربر آوردہ شخصیات کو بھی شامل فرما لیا۔ اس میں راز کی بات یہ تھی کہ آخر کار انہی فساد برپا کرنے والے مشرکین کو اخوت و بھائی چارے کی رسی میں پرو لیا جائے گا۔ اور پھر آپس میں متحد اور متفق ہو کر گھی اور شکر ہو جائیں گے اور نیز تبلیغ اسلام کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ بٹائیں گے۔ اسی طرح حجر اسود کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں تنصیب توحید الٰہی کی بنیادیں قائم کرنے کے مترادف تھی اور اس میں اس جلالی فرمان کی طرف اشارہ موجود تھا۔ انما المشرکون نجس فلا تقربوا مسجد الحرام بعد عامھم ھذا (بہ تحقیق مشرکین نجس ہیں۔ اس سال کے بعد وہ مسجد الحرام نہ آئیں) بہر حال اوپر دیئے ہوئے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی پتھر کے نصیب فرمانے والے تھے اور یہ ایک تاریخی حقیقت بھی ہے جس کو اپنے اور غیر دونوں تسلیم کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور صفت "خندق کا کھودنے والا" بھی ہے۔

خندق کا کھودنے والا۔

اس سے مراد وہ خندق ہے جو دشمنوں کے خلاف حفاظتی اقدام کے طور پر کھودی جاتی ہے۔ شاہی جنگوں میں خندق کھودنے کے متعلق ہر ایک جانتا ہے کہ ایسا ہوتا رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا کیا تھا۔ چنانچہ مورخین کا اتفاق ہے کہ سن ۵ ہجری میں ابوسفیان نے یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر سے ساز باز کرکے دس ہزار فوج لے کر مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا ادھر شہر کے اندر رہنے والے یہودی یعنی بنی قریظہ بھی اپنے عہد پر پشیمان ہو گئے دوسری طرف منافقین کی طرف سے بھی خطرہ پیدا ہو گیا کہ وہ بھی شہر کے فوجی نوعیت کے تمام حفاظتی مقامات کافروں کو بتا دیں گے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کھودنے کا فیصلہ کر لیا۔ جس کا تھوڑا سا ذکر ہم نے گذشتہ اوراق میں بھی کیا ہے۔ حالت یہ تھی کہ کافروں نے پے در پے کئی شدید حملے کئے مگر کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے آخر کار اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے فرشتے نازل فرمائے اور آندھی کے ایک عظیم طوفان نے کفار کو گھیر لیا۔ چنانچہ ابوسفیان نے اسی رات کو اپنا محاصرہ اٹھا لیا اور جب صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو کفار کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔

سام وید میں لکھا ہے کہ "یہ دیوتا خوف زدہ ہو کر ادب کے ساتھ تمہارے پاس آئے اور تمہارا خوف ختم کر دیا جنہوں نے تیری مدد کی۔ انہوں نے دعائیہ بھجن کے ساتھ اس اندر کی شان بیان کی جو اپنی قوت سے حکومت کرتا ہے اور جس کی جانب سے ہزارہا بلکہ اس سے بھی زیادہ عطیئے اور انعامات نازل ہوتے ہیں۔

دیوتا ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو بزرگ اور پاک باطن ہوں۔ یہاں پر دیوتا سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں جنہوں نے میدان میں بے خوف ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی اور تکبیر کے نعروں

اور دعائیہ الفاظ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی تعریف بھی کی۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ جنگی واقعات کے ضمن میں کہا گیا ہے اور اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انعامات سے مراد مال غنیمت ہے۔ جو جنگوں کے بعد فتح کی صورت میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا کرتا تھا۔

تو یہ تھیں سام وید کی پیشن گوئیاں مگر ہم نے اپنی طرف سے ان کی کوئی تاویل وغیرہ نہیں کی ہے بلکہ سام وید کی عبارت من و عن تحریر کی ہے۔ اور بالفرض اگر کسی ہندو کو اس بارے میں تامل ہو تو وہ خود اس کی تفسیر و توضیح کرلے ہم اس پر بھی ضرور غور کریں گے۔ انشاء اللہ

☆☆☆☆
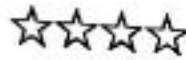
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تورات کی پیشن گوئی۔

تورایت جو موجودہ بائبل میں سب سے پہلے تحریر کی گئی ہے اس کے پانچ حصے ہیں اور ان کو پانچ کتابیں کہا جاتا ہے۔ پانچویں کا نام استثناء ہے۔ جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی قوم سے فرماتے ہیں :

خداوند تمہارا خدا تمہارے درمیان تمہارے ہی بھائیوں میں سے ایک نبی پیدا فرمائے گا تم اس کی بات سنو۔ ان سب کی طرح جو تم نے اپنے خدا سے حورب میں مجمع کے روز طلب کیا تھا اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں اپنے خدا کی آواز پھر سنوں۔ اور ایسی سخت آگ پھر دیکھوں کہ کہیں مرجاؤں۔ اور خدا نے مجھے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا، اچھا کیا۔ میں ان کے لئے انہی کے بھائیوں میں سے تمہاری طرح ایک نبی پیدا کروں گا اور اپنا کلام اس کے دہن پر جاری کروں گا اور جو کچھ میں اسے کہوں گا وہ سب کچھ لوگوں کو بتائے گا۔ ایسا ہے کہ جو باتیں وہ میری طرف سے کرے گا اور جو لوگ ان کو نہ مانے تو میں ان سے اس کا حساب لوں گا۔ (باب ۱۸)

اس عبارت سے چند حقائق سامنے آتے ہیں ان میں پہلی بات یہ کہ وہ نبی ۔۔۔۔ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں پیدا ہو گا۔ دوسری بات یہ کہ وہ رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہو گا۔ تیسری بات یہ کہ جو لوگ اس کی بات نہ مانیں گے ان

سے حساب لیا جائے گا۔

پہلی بات کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی یعنی (۱) بنی اسرائیل اور (۲) بنی اسماعیل۔ ظاہر ہے ان ہر دو قبیلوں کا مورث اعلیٰ ایک تھا۔ اس لئے یہ آپس میں بھائی تھے چنانچہ بنو اسماعیل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اس پیشن گوئی کی صداقت پر دلالت کرتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب شریعت و سیاست نبی تھے اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی صاحب شریعت و سیاست نبی تھے۔

تیسری بات کا ثبوت براہ راست قرآن مجید میں موجود ہے ارشاد خداوندی ہے۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الھدٰی و یتبع غیر سبیل المومنین نوله ما تولٰے و نصله جهنم وساءت مصیرا سورہ النساء ایت نمبر ۱۱۵

ترجمہ :۔ اور جو شخص رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا رستہ چھوڑ کر دوسرے رستہ پر ہو لیا تو ہم س کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ ری جگہ ہے۔

ظاہر ہے تورایت اور قرآن مجید کی اس ایت کا مفہوم ایک ہی ہے۔ بقول سعدی شیرازی

مپندار سعدی کہ راہ خدا
تواں رفت جز در پے مصطفےٰ

اگر عیسائی حضرات کی رائے ہماری رائے کے برخلاف ہو اور وہ تورایت کی عبارت آنحضرات صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہیں سمجھتے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کے حق میں مانتے ہیں تو ان کے ساتھ فیصلہ کی صورت بہت ہی آسان ہے۔ یوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اس دنیا سے اٹھنے کے بعد ان کے شاگرد۔۔۔ پطرس حواری اپنے زمانے کے لوگوں کو نصیحت کے طور پر کہتے ہیں :۔

"پس توبہ کے بعد متوجہ ہو جاؤ تاکہ تمہارے گناہ بخش دیئے جائیں اور خداوند پاک کی جانب سے خوشحالی کے دن آجائیں اور یسوع مسیح دوبارہ تشریف لے آئیں۔ جن کا ڈنڈورہ اس سے قبل ہی تمہارے درمیان ہوا ہے۔ ضروری بات ہے کہ وہ آسمان میں ہوں گے اس وقت تک جب ساری چیزیں' جن کا ذکر خداوند کریم نے اپنے انبیاء کے ذریعے پہلے سے کیا ہے' اپنی اصلی حالت پر آجائیں گے اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام نے باپ' دادا سے فرمایا کہ خداوند تمہارا خدا ہے وہ تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے میری طرح ایک نبی پیدا فرمائے گا۔ جو کچھ وہ کہے اس کو مانو۔ ایسا ہو گا کہ جو کوئی اس نبی کی باتوں کو نہ مانے گا وہ نیست ہو جائے گا۔ بلکہ سموئیل سے لے کر آخر تک تمام نبیوں نے جن جن امور کی باتیں کی ہیں اسے سب دنوں کی خبر دی گئی ہے۔ تم نبیوں کی اولاد اور ان کا اقرار ہو جو خداوند نے (تمہارے) باپ دادا سے کیا تھا جب ابراھیم علیہ السلام سے کہا گیا تھا کہ تمہارے گھر سے تمام گھرانے برکت حاصل کریں گے۔ خداوند نے پہلے یسوع تمہاری طرف بھیجا تاکہ تم میں سے ہر ایک کو بدی سے بچالے اور تمہیں برکت سے نوازے" (اعمال باب

اس عبارت میں اس پیشن گوئی کا ذکر ہے جس کا ذکر توراۃ سے نقل کر کے ہم نے کیا ہے بلکہ اس پیشن گوئی کے انتظار کا بھی ذکر ہے اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ پطرس کہتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی اس دنیامیں دوبارہ تشریف آوری ان واقعات پر منحصر ہے جن کی پیشن گوئی انبیاء علیہم السلام نے فرمائی ہے اور جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس نبی کی خبر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ اور وہ آجائے۔ چنانچہ اس سے ثابت ہو گیا کہ توراۃ کی اس پیشن گوئی سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں نہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام جو حضرت مسیح علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری سے قبل پیدا ہوں گے۔

الھم صل علےٰ محمد و علےٰ ال محمد

☆☆☆☆☆

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں انجیل کی پیشن گوئی۔

عیسائیوں اور یہودیوں کی مجموعی کتاب کو بائبل کہا جاتا ہے اس میں وہ حصہ جس کو عیسائی بھی مانتے ہیں اور یہودی بھی، تو اس حصے کو "پرانا عہد نامہ" کہتے ہیں۔ بائبل کے دوسرے حصے کو جسے صرف عیسائی مانتے ہیں تو اس کو "نیا عہد نامہ" کہا جاتا ہے۔

نئے عہد نامے میں کل چار انجیل ہیں۔

(۱) انجیل متی (۲) انجیل مرقس (۳) انجیل لوقا (۴) انجیل یوحنا۔

عیسائی ان چاروں اناجیل کو الہامی کتابیں کہتے ہیں۔ انمیں سے چوتھے انجیل یوحنا کے سولھویں باب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے کہ:۔

میں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے حق میں میرا چلا جانا ہی بہتر ہے کیونکہ اگر میں نہ گیا تو تمہاری طرف تسلی دینے والا نہیں آسکے گا۔ اور اگر میں چلا گیا تو اسے تمہاری طرف بھیج دوں گا۔ اور جب وہ آجائے تو وہ دنیا کو گناہ سے، راستی سے اور عدالت سے تقصیروار (واپس) گذارے گا گناہ سے اس لئے کہ اس جہاں کے سردار کو (اس کا) حکم دیا گیا ہے۔ میری اور باتیں بھی بہت سی ہیں جو کہنے کی لائق ہیں۔ مگر اب تم میں ان کے سننے کی برداشت نہیں ہے۔ لیکن جس وقت "وہ" یعنی "روح حق"

تشریف لے آئے تو صدق کے سب راستے تمہیں دکھادے گا۔
اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا۔ (بلکہ) جو کچھ وہ
سنے گا وہی کہے گا۔ (یعنی جو کچھ خدا سے سنے گا) اور وہ تمہیں
آئندہ واقعات کی خبردے گا اور میری بزرگی (بھی) بیان کرے گا"
(۱)

انجیل یوحنا باب نمبر۱۶

اس عبارت میں حضرت مسیح علیہ السلام نے جن نشانیوں کا ذکر فرمایا ہے وہ یقیناً" حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہیں۔ کیونکہ یہ کسی اور کے حق میں ہو ہی نہیں سکتیں۔ ظاہراً" اس پیشن گوئی کے تین حصے ہیں:۔

(۱) تسلی دینے والا۔

(۲) جناب مسیح علیہ السلام کے منکرین کو راستی سے تقصیروار گزارنے والا۔

(۳) دنیا کا سردار۔ تو ان میں سے پہلی بات کا مطلب بالکل صاف ہے کیونکہ قرآن مجید میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں متعدد بار "بشیر" کالفظ استعمال ہوا ہے۔ بشیر کے معنی تسلی میں شامل ہیں اور جس کا اصل ترجمہ "خوش خبری دینے والا ہے" اور جو شخصیت تسلی دیتی ہے تو یہ تسلی ایسی ہوتی ہے کہ ایک شخص کو کہا جائے کہ تمہارے نیک اعمال ضائع نہ ہوں گے بلکہ قبول ہوں گے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے منکر یعنی یہودیوں کو کافر سمجھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کی تردید فرمادی بلکہ ان پر بڑی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

تیسری عدالت کی بات ہے۔ تو جیسی عدالت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) بائیبل کے حوالے کا اردو ترجمہ پشتو سے کیا گیا ہے (مترجم)

نے کی ہے آج تک اس کی مثال کوئی اور پیش نہیں کر سکا ہے اور نہ ہی آئندہ پیش کر سکے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قسم کے جرائم کے لئے سزائیں مقرر فرما دیں اور انکو باقاعدہ جاری فرما دیا۔ مثلاً" چوری کی سزا' زانی کی سزا وغیرہ وغیرہ۔

تورایت اور انجیل میں چند دیگر پیش گوئیاں بھی موجود ہیں مگر یہاں پر یہی کافی ہیں۔

در خانہ اگر کس ست یک حرف بس ست

☆☆☆☆

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کو مجموعی طور پر سارے فرق اسلامی مانتے ہیں۔ البتہ جسمانی اور روحانی معراج کے سلسلے میں کچھ اختلافات موجود ہیں کیونکہ بعض لوگ جسمانی معراج کو تسلیم نہیں کرتے جیسے کہ مولانا عبد الرحمان بن جنید شیرازی کی کتاب میں لکھا گیا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"در معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شش طائفہ بکوچۂ ضلالت افتادہ اند۔ و آنرا منکر شدہ اند۔ وبہ مجرد محسوس قناعت کردہ اند۔ وہر شش طائفہ متقصر و بے ادراک اند۔ وے گویند کہ عقل قبول ندارد کہ مخلوق ثلث شب ایں ہمہ را برود و آسمان ہاشگافتہ شود وبہ درجات آنہا گذرد وباز آید باز از شب چیز باقی باشد"

اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ واقعہ معراج کے اس لئے منکر ہیں کہ بقول ان کے یہ بات عقل نہیں مانتی کہ کوئی مخلوق ایک پہر رات گذرنے کے بعد آسمانوں کی وسعتوں اور طویل منزلوں کو طے کر لے اور اسی رات جب واپس آئے تو پھر بھی رات کا کچھ حصہ باقی ہو۔ وہ کہتے ہیں آسمان کس طرح اور کیونکر شق ہو سکتے ہیں جس میں یہ داخل ہو سکے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اعتراض ان لوگوں کی طرف سے کی جاتی ہے جو آسمانوں کو کثیف اجسام سمجھتے ہیں بلکہ بعض مسلمان تو آج تک آسمان کو ایک ٹھوس جسم سمجھتے ہیں مگر ایسے لوگوں کے اعتراض کا جواب نہایت آسان ہے وہ ایسے کہ بالفرض اگر آسمان کثیف جسم بھی رکھتے ہیں مگر اس کے دروازے بھی تو ہیں حدیث

شریف میں صاف طور پر آیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سماعت پاک ان دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنتے تھے۔

دوسری قسم کے لوگ عام طور پر دہریہ سائنسدان ہیں وہ کہتے ہیں کہ اوپر بلندیوں میں ایک ایسا ہوائی کرہ موجود ہے جس سے کوئی جسم بھی نہیں گذر سکتا۔ بالفاظ دیگر اس ہوائی کرہ میں اتنی شدید حرارت موجود ہے کہ کوئی جسم وہاں پہنچتے ہی ختم ہو جاتی ہے وہ چاند تک نہ پہنچنے کی بھی یہی وجہ بتاتے ہیں مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ زمانہ دور نہیں کہ ہم اس شدید گرم ہوائی کرے کے لئے ایسے ہوائی جہاز بنالیں گے جن پر یہ کرہ بالکل اثر انداز نہ ہو گا مزید برآں دہریہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آسمان کوئی خاص چیز نہیں۔ بس فضا ہے اس میں کثیف جسم رکھنے والا کوئی بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

تاہم دنیا کے عقلمندوں اور فلاسفروں کا کہنا ہے کہ جملہ اور تمام کمالات کا سرچشمہ انسان ہے جو اتفاقی طور پر پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ ایک مکمل خالق حقیقی نے ایک مکمل کام کے لئے پیدا کیا ہے اور اسی خالق حقیقی نے انسان کے وجود میں بحیثیت مجموعی جملہ اشیاء کی معرفت اور ان کو باقاعدہ استعمال میں لانے کی قوت و معرفت بھی رکھ دی ہے جس قدر زمانہ گذرتا جائے گا انسان کے علم میں ترقی ہوتی رہے گی اور ڈارون جو دہریوں کا سرخیل ہے' اس کے نظریہ ارتقاء سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جونہی مادہ ارتقاء کی منزل میں بندر کی حالت تک پہنچ گیا۔ تو آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے انسان بن گیا۔ نیز مادہ سے چار بڑی بڑی طاقتیں بھی پیدا ہوئی ہیں اور عالم اجسام کی زندگی اور ترقی کا انحصار بھی انہی قوتوں پر موقوف ہے وہ چار طاقتیں خاک' ہوا' پانی اور آگ ہیں۔ ان چاروں عناصر کی ذات لطیف ہے۔ ان میں سے خاک یعنی مٹی اگرچہ ہمیں ٹھوس (کثیف) معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسی مٹی نے

ترکیب لینے کے بعد یہی صورت اختیار کی ہے اب اگر یہی مٹی باریک کر دی جائے اور اسے پھونک دیا جائے تو پھونکتے ہی اس کے اجزا غائب ہو کر ہوا میں شامل ہو جائیں گے۔ اسی طرح ہوا اور پانی کے اجسام تو ظاہری طور پر لطیف ہیں اور پہلے سے غائب ہیں۔ مگر سائنسدانوں کے نزدیک بادل ٹھنڈا ہونے کے بعد قطرہ قطرہ ہونے کا جسم اختیار کر لیتے ہیں جیسے مٹی متصل ہونے کے بعد ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ کہ جب سانس لینے کی گرم ہوا کسی شیشے پر ڈال دی جائے تو وہ بھی قطرہ قطرہ یا بوند بوند کی شکل اختیار کر کے ظاہر ہو جاتی ہے تو معلوم ہوا کہ پانی بھی ابتدائی درجے میں نہیں دیکھا جا سکتا البتہ ترکیب لینے کے بعد ظاہر ہو جاتا ہے اسی طرح آگ بھی ہے وہ بھی پوشیدہ ہوتی ہے آگ کے جو شعلے لال دکھائی دیتے ہیں تو سائنسدانوں کہتے ہیں کہ یہ سب ذرات ہیں اور جب ان کو آگ کی گرمی پہنچ جاتی تو یہی گرمی ان ذرات کو روشن کرتی ہے ورنہ آگ کی ذات نہیں دیکھی جا سکتی۔ روشنی کے متعلق بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ روشنی کا وجود نہیں دیکھا جا سکتا مگر ایسا ہے کہ یہی روشنی ذرات کو روشن کرتے ہے اور پھر وہی ذرات ہمیں روشنی دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اب غور کرنا چاہیے کہ جب انسان ان چار چیزوں سے مرکب ہے اور یہ چاروں لطیف اجزا ترکیب لینے کے بعد کثیف ہو گئے ہیں اور اسی انسان نے مذکورہ عناصر پر اس قدر قبضہ حاصل کیا ہے کہ ہوا میں اڑتا ہے۔ ہزاروں میل کی دوری سے آواز سنتا ہے بلکہ آج کل تو بعض سائنسدان خود بھی اڑتے ہیں یہاں تک کہ چاند تک رسائی کو بھی ممکن سمجھتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ کیا ان عناصر کا علم پہلے زمانے میں لوگوں کو حاصل تھا اور اب نہیں ہے۔ یہ بات تو بالکل بے معنی ہے اور جب یہ لوگ اس دنیا اور مادہ کو قدیم سمجھتے ہیں تو سوچ لینا چاہیے کہ اس دنیا میں اس قسم کی ترقی کے کتنے دور آئے اور گئے ہوں گے۔ مثلاً" ہندوؤں کی بعض کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ ان کے

بزرگوں نے ہوائی جہاز اور توپیں بنائی تھیں لٰہذا غور طلب بات یہ ہے کہ جب انسان خدا کا خلیفہ ہے اور خدا نے اس دنیا کا سارا نظام اسی انسان کے حوالے کیا ہے دوسری جانب دنیا کے سارے اجسام مذکورہ چار عناصر سے تعلق رکھتے ہیں تو آیا انسان ان تمام عناصر کی خاصیتوں اور ماہتوں سے کام لینے کا علم نہ رکھتا ہو گا ضرور رکھتا ہو گا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کو عناصر پر غلبہ حاصل ہے اور عناصر سے کام بھی لیتا ہے (یعنی یہ تو ایک عام انسان کی بات ہے) جبکہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اس انسان کو کہتے ہیں جس کو عناصر کا علم بھی ہوتا ہے اور اسی نبی کا انہی عناصر پر پورا پورا قبضہ بھی ہوتا ہے پھر یہ بات کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا تو یہ بالکل درست ہے اس لئے کہ ہوا پر انکا قبضہ تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فضا کی طرف تشریف لے جا سکتے تھے لٰہذا گرم کرے کے خطرے کا سوال ہی نہ رہا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اگر ضرر رساں ہے تو کثیف جسم کے لئے ہے یا اس کے متضاد جسم کے لئے مگر ایک انسان جو عناصر سے واقف بھی ہو اور ان پر قابض بھی ہو تو یقیناً" وہ بغیر کسی تکلف یا تکلیف کے اپنے لطیف جسم کے باوصف گرم کرے سے نکل سکتا ہے۔ اور آج کل تو سائنسدانوں نے بھی اپنی عقل سے ایسی تجویز وضع کی ہے (اور کہتے ہیں) کہ ہم گرم کرے سے بغیر کسی تکلیف کے چاند تک پہنچ سکتے ہیں اور یہ تجویز ان ممالک کے لوگوں کے دماغوں نے وضع کی ہے جو اپنے کونسلوں میں نہایت سوچ و بچار کے ساتھ ایک قانون پاس کر لیتے ہیں۔ مگر دو تین سالوں کے بعد وہی قانون غیر افادی اور نامکمل ثابت ہو جاتا ہے تو ایسا قانون وہ افراد خود ہی منسوخ کر دیتے ہیں جنھوں نے اسے بنایا ہوتا ہے اور اس کی جگہ ایک اور قانون بنا لیتے ہیں۔ یا یہ لوگ ایک مشین کو مکمل کرنے کے لئے سالہا سال محنت کرتے ہیں پھر بھی وہ مکمل نہیں ہوتی مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اسی مشین میں جدت پیدا کرنے کا عمل بھی جاری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بندوق کو لے

لیجے پہلے جب لوگوں نے بندوقیں بنوائیں وہ کیسے تھیں مگر آہستہ آہستہ بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ کجا چقماق سے تعلق رکھنے والی بندوق اور کجا خود کار مشین گن اور رائفل جو ایک منٹ میں پانچ سو تک گولے نکال سکتی ہے اب غور کرنا چاہیے کہ جس نبی عربی علیہ التحیتہ والثناء نے جو قانون حق تعالیٰ جل مجدہ کے حکم سے بنایا ہے تو دیکھ لیجے کہ تیرہ سوسال گذرنے کے باوجود بھی اس میں کوئی کمی یا تغیر پیدا نہیں ہوا تعجب یہ کہ اس میں ایک لفظ کی کمی یا زیادتی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس کی حقیقت محض یہ ہے کہ اس قانون کے بارے میں یہ ارشاد ہے کہ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ہم نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم اس کے محافظ و نگہبان ہوں گے۔ (سورہ الحجرات نمبر۹) اور یہ بالکل صحیح ہے۔ دیکھ لیجے اس کے لئے مسلمانوں کے سینوں کو کھول دیا گیا ہے اور اس قرآن عظیم الشان کی حفاظت سینوں میں کی جاتی ہے۔ اب اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ایک ایسے انسان جو اللہ کا نبی ہو، کی عقل کا کیا ٹھکانا ہو گا۔ (چہ جائے کہ) اس دور کے سائینسدان یا وزراء وغیرہ جو ہر سال اپنے وضع کردہ قوانین میں ترامیم کرتے ہیں یا بعض قوانین کو واپس لے کر ختم کردیتے ہیں تو ایسے لوگوں کا ایک نبی اللہ سے کیا مقابلہ؟

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

اب سوچنے اور غور کرنے کا مقام یہ ہیکہ ان سائینسدانوں وغیرہ نے اپنی ناقص عقلوں سے یہ تو ثابت کر دیا کہ وہ گرم کرے سے نکل کر چاند تک پہنچ جائیں گے اور نبی عرب علیہ التحیتہ والثناء جو مکمل انسان، استاد کل بلکہ عقل اول ہیں تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ طاقت حاصل نہ ہو گی کہ اپنی بے پناہ عقل سے گرم کرے کی تسخیر کے لئے کوئی انتظام نہ کر سکیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آج کل تو سبھی یہ مانتے اور تسلیم کرتے ہیں کہ چاند تک پہنچنا ممکن ہے۔ اب سوچنا چاہیے کہ حضور

اقدس کا اپنے مبارک جسم کے ساتھ آسمان پر جانا کیوں اور کیسے ناممکن ہو سکتا ہے۔

بہتر ہو گا کہ اس کا ثبوت قرآن مجید سے بھی دیا جائے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی ....(بنی اسرائیل ایت نمبرا) پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ (محمد ﷺ) کو شب کے وقت مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔ لے گیا۔ تاکہ ہم ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھلا دیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے دیکھنے والے ہیں۔ اب غور کرنا چاہیے کہ جسم دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک حصہ تو وہ ہے جو مادے کی ترکیب سے بنا ہے اور یہ روح حیوانی کے طفیل زندہ ہے۔ عام جاندار یہی مادی جسم رکھتے ہیں۔ جسم کا دوسرا حصہ روح سے تعلق رکھتا ہے (جس کا ذکر بعد میں آنے والا ہے) بہرحال انسان اسی روح کی وجہ سے دوسرے جانداروں کے مقابلے میں ممتاز ہے۔ کیونکہ مادی جسم تو ہر جاندار رکھتا ہے مگر جب تک روح اور مادی جسم مل کر یکجا نہ ہو جائیں اس وقت آدمی مکمل انسان کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہاں پر غور طلب بات یہ ہے کہ لفظ اسریٰ (جس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) کے کیا معانی ہیں۔ اب اگر ہم اس کے یہ معانی کر لیں کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو لے گئے" تو معراج مکمل نہ ہوئی کیونکہ اس صورت میں آپ کا جسم اطہر حق تعالیٰ کے عظیم الشان فیض سے محروم رہ گیا(نعوذ باللہ) یعنی وہ فیض و برکت جس سے آپ کی روح پاک تو فیض یاب ہو گئی مگر (نعوذ باللہ) جسم مبارک محروم رہ گیا اور اگر معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو محض روحانی معراج تسلیم کر لیں تو روحانی معراج تو اکثر دیگر انبیاء علیہ السلام کو بھی حاصل رہی ہے۔ لیکن اس حالت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کیا ہوئی۔ مرزا غلام احمد قادیانی بھی خواب

میں معراج کے قائل ہیں۔ مگر خواب کی حالت میں معراج تو دوسرے انبیاء کو حاصل رہی ہے پھر کیوں قادیانی حضرات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر انبیاء کے مقابلے میں اکمل و مکمل تسلیم کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ خواب میں کسی چیز کی کیفیت حقیقی نہیں ہوتی۔ اس لئے آنحضرت نے دجال و یاجوج ماجوج کے بارے میں جو پیشن گوئیاں کی ہیں اور مرزا صاحب نے ان کی جو حقیقتہ بیان کی ہے یقیناً" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا بالکل مشاہدہ نہ فرمایا تھا۔ بلکہ درست بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دجال اور یاجوج ماجوج کا ایک مثالی نقشہ دکھایا گیا تھا۔ جس طرح مرزا صاحب نے البشریٰ میں اپنا ایک خواب بیان کیا جس میں انہوں کہا ہے کہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ میں اللہ ہوں۔ پھر میں نے تمام کے تمام موجودات کو پیدا کیا۔ پھر بہ تحقیق یہ میرا ہی امر ہے کہ میں جس چیز کو کہہ دیتا ہوں کہ ہو جا۔ تو وہ ہو جاتا ہے ...... یا یہ کہ میں مثالی طور مریم بن گئی اور میں نے عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دیا۔ اس لئے کہ میں مجازی طور پر ابن مریم بھی ہوں۔ اب غور کرنا چاہیے کہ یہ خواب یا الہامات جن کو مرزا صاحب نے دیکھا تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ایسا ہی تھا جیسے انہوں نے دیکھا تھا۔ آیا واقعتاً" مرزا صاحب نے اپنے آپ کو اللہ کی صورت میں دیکھا تھا۔ یا انہوں نے اپنے آپ کو ہو بہو عورتوں کی طرح ایک حاملہ عورت کی شکل میں بھی دیکھا تھا اور پھر جس طرح ایک عورت بچے کو جنتی ہے، جنتے وقت مرزا صاحب بھی ایسے ہی تھے۔ تو اگرچہ مرزائی صاحبان اس کا جواب یہ دیں گے کہ ایسا تو نہ تھا بلکہ ان کو ایک نقشہ سا دکھایا گیا تھا جس سے یہی مطلب نکل سکتا تھا۔ (اگر معاملہ ایسا ہو تو پھر) معراج کی حقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آشکارا نہ ہوئی ہو گی (خاکم بہ دہن) اس لئے ہم اس رائے سے متفق ہیں کہ معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم جیتے جاگتے جسمانی طور پر ہوئی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ معراج النبی کے بارے میں حق تعالٰی نے یہ نہیں فرمایا کہ جاء محمد بلکہ ارشاد ہوا کہ سبحان الذی اسرٰی بعبدہ یعنی حق تعالٰی نے معراج کی بنیاد اپنی قدرت پر رکھی ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج خود نہیں کی ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالٰی نے کرائی ہے اور بمصداق ان اللّٰہ علی کل شئی قدیر حق تعالٰی ہر چیز پر قادر ہے چنانچہ وہ قدرت رکھتا ہے کہ اسی جسم کے ساتھ اپنی مخلوق کو آسمانوں پر لے جائے (ا)

(ا) مرزا صاحب نے حضرت مسیح علیہ السلام کی جسمانی "رفع" سے بھی انکار کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ دھریوں کے سوالوں کا کوئی جوابی ثبوت پیش نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر مرزا صاحب حضرت مسیح علیہ السلام کی جسمانی رفع تسلیم کر لیتے تو اس صورت میں بزعم خود اپنے آپ کو کیسے مسیح ثابت کرتے۔ چونکہ مرزا صاحب کے مذہب میں رفع جسمانی قطعی ناممکن ہے چنانچہ اسی اصول کے پیش نظر اس نے معراج جسمانی سے انکار کیا ہے وجہ یہ ہے کہ اگر وہ جسمانی معراج تسلیم کرتے تو پھر یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی جسمانی طور پر آسمان پر گئے ہیں۔ چونکہ مرزا صاحب روحانی رفع کو درست تسلیم کرتے ہیں اور وہ بھی اس طرح جیسے فوت ہونے کے بعد کسی شخص کی روح جسم سے جدا ہو جاتی ہے مگر اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کو مرزا صاحب روحانی طور پر تسلیم کرتے ہوں تو بقول مرزا صاحب روحانی رفع تو فوت ہونے کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پانے سے قبل روحانی معراج کیسے حاصل کی۔ اور اگر وہ کہدیں کہ یہ خواب کی حالت میں ہوئی تھی تو خواب کے بارے میں ہم نے پہلے تحریر کیا ہے کہ خواب میں کسی چیز کی حالت اصلی نہیں ہوتی اور اہم بات یہ بھی ہے کہ انبیاء علیہ السلام کا کام خواب پر موقوف نہیں ہوتا (مولف)

حضرت ابو عثمان حیری قدس سرہ نے اپنی کتاب تکملہ میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

بعضے گفتہ اند کہ ایں معراج بخواب بود۔ اگر بخواب بودے کرامت نہ بودے ۔ مانیز در خواب مثل ہمیں مے بینم اگر نہ در بیداری بودے ملک (حق) تعالیٰ چند تفضیلہا در قرآن چہ گونہ یاد کردے "یعنی بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ معراج خواب کی حالت میں ہوئی تھی لیکن اگر یہ خواب میں ہوتی تو کوئی بزرگی کی بات نہ ہوتی۔ اس لئے کہ خواب میں تو میں بھی ایسا دیکھ سکتا ہوں۔ مطلب یہ کہ اگر یہ بیداری کی حالت میں نہ ہوتی تو حق تعالیٰ قرآں مجید میں اس کی فضیلتیں بیان نہ فرماتے"۔

غرض یہ کہ جو چیز خواب میں دیکھ لی جاوے اس کی اس قدر تعریف اور پھر قرآن مجید میں۔ ناممکن سی بات ہے کیونکہ خواب تو محض خیال ہوتا ہے۔ اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے خواب بھی ہر قسم کی کمزوریوں سے پاک ہوتے ہیں مگر قابل غور بات یہ ہے کہ پھر بھی حق تعالیٰ نے دین کے واجبات کی بنیاد خواب پر نہیں رکھے ہیں۔ بلکہ اس کے لئے وحی اور الہام پسند فرمایا گیا ہے۔

میرے **مرشد پاک** قدس سرہ کا بھی یہی ارشاد ہے کہ "معراج اگر خواب میں مان لیا جائے تو یہ نہ معجزہ ہو گا اور نہ کرامت کیونکہ اکثر اوقات عام لوگ بھی عرش معلی اور آسمانوں کو خوابوں میں دیکھتے رہتے ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تو انبیاء علیہم السلام کے سردار ہیں تو اگر ان کی معراج مقدس کو بھی خواب کی حالت مان لیا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہو گا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر انبیاء علیہم السلام پر فضیلت کیسے ثابت ہو گی"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج اور اس کے علاوہ دیگر مدح و صفت کے سلسلے میں کئی مبارک آیتیں موجود ہیں مثلاً:-

وھو بالافق الاعلی ثم دنا فتدلی فکان قاب قوسین او ادنٰی سورہ النجم (ایت نمبر ۷ تا ۹

ولقد راہ نزلہ اخرٰی عند سدرۃ المنتھٰی عندھا جنتہ الماوٰی سورہ النجم (ایت نمبر ۱۲ تا ۱۵

سبحان الذی اسرٰی...... بنی اسرائیل (ایت نمبر ۱)

ولقد راہ بالافق المبین۔ التکویر (ایت ۲۳)

نیز معراج شریف کے بارے میں جن اصحاب کرام رضی اللہ عنہم سے احادیث مروی ہیں ان میں بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں:-

پہلے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں اور ان چاروں سے معراج شریف کے بارے میں احادیث مروی ہیں۔ بعد ازاں عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، انس بن مالک رضی اللہ عنہ، ابوھریرہ انصاری رضی اللہ عنہ، ابو سعید حذری رضی اللہ عنہ، مالک ابن عمران ابن حصین رضی اللہ عنہ، عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ، ابوسلمہ رضی اللہ عنہ، حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ، عبد اللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ، ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ، جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ، عباس ابن عبد المطلب رضی اللہ عنہ، عبد اللہ ابو اوفی، ام کلثوم بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بلال حبشی رضی اللہ عنہ، ابوامامہ باھلی رضی اللہ عنہ، اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہ، عبد الرحمٰن ابن عامر رضی اللہ عنہ، ابودرداء رضی اللہ عنہ، عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، بلال ابن سعید رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم اجمعین۔

تاہم غور طلب بات یہ ہے کہ اگر معراج شریف خواب کی حالت میں ہوتی تو

اتنے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اتنی شد و مد سے نشر و اشاعت کیوں فرماتے۔ دوسری بات یہ بھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی دوسرا خواب اتنا مشہور کیوں نہ ہوا۔ اگر چہ مرزائی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک قول نقل کرتے ہیں جس میں آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ معراج شریف خواب کی حالت میں ہوئی تھی۔ مگر چونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا معراج کے واقعہ کے دوران حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سلک ازدواج سے منسلک نہ ہوئی تھیں یا بہ الفاظ دیگر حضور اقدس صلی علیہ وسلم سے ابھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح نہ ہوا تھا۔ چنانچہ اس باب میں اس کی غلطی ظاہر ہے پھر اتنی کثیر تعدا میں اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں ایک یادو افراد کے اقوال کو ترجیح دینا بھی کوئی ضروری امر نہیں۔

فصل نمبر۳ اہل بیت نبوی۔

سلام اللہ علیہم۔

جن کی صفت خود خدا نے قرآن میں کی ہو۔ کوئی اور ان کی صفات کو کیا بیان کرے گا۔

پشتو شعر کا ترجمہ۔

"اہل بیت علیہم السلام وہ قدسی لوگ ہیں جن سے خدائے پاک نے شرک وغیرہ کی ناپاکی دور فرما دی ہے اور بہترین طہارت کے ساتھ ان کو پاک کر دیا ہے"۔ اہل بیت اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی لوگ ہیں۔ اگر چہ بعض لوگ "آل" کو وسیع معنوں میں لیتے ہیں اور اس سے ان کی مراد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت سیدنا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی اولاد لیتے ہیں۔ بہرحال یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس آل کی محبت کو جزو ایمان کہا گیا ہے وہ کون ہیں۔ اس لئے کہ اگر آل وسیع معنوں میں پوری امت کے لئے استعمال ہو تو پھر ہر مسلمان پر دوسرے تمام مسلمانوں کی محبت فرض ہو جاتی ہے اور وہی جزو ایمان تصور کی جائے گی اور ان سے محبت نہ رکھنا گناہ کبیرہ تصور کی جائے گی اور اسی طرح ان سے بغض رکھنا کفر کے مترادف ہو گا حالانکہ یہ بات ممکن نہیں چنانچہ جس "آل محمد" کی محبت جزو ایمان اور فرض ہے وہ ساری کی ساری امت ہو نہیں سکتی بلکہ وہ ایک مخصوص گروہ ہو سکتا ہے جن کو آل نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اولاد علی رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے۔ اس کا عقلی ثبوت یہ ہے کہ یہ بات بنی نوع بشر کی فطرت میں داخل ہے کہ جس کسی خاص شخص سے ایک آدمی محبت رکھتا ہو تو لازمی طور پر محبوب شخص کے بال بچوں سے بھی محبت کرتا ہو گا اور اگر اسی اصول سے قطع نظر کوتاہی واقع ہو تو ایسے شخص کے بارے اس

کے بغیر اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ منافق ہو گا اور اس کی محبت اپنی مطلب براری تک محدود ہو گی۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ محبت کیا چیز ہے جو فرض کے طور پر اہل بیت علیہم السلام سے کی جانی ضروری ہے۔ تو محبت اپنے محبوب کی طرف انتہائی توجہ سے متوجہ ہونے کو کہا جاتا ہے اور یہ ایک ایسا قدسی جذبہ ہے جو مطلب براری کی کدورت سے قطعاً" پاک ہوتا ہے۔ دراصل جس محبت کی بنیاد مطلب پرستی ہو۔ اسے خواہش یا شہوت یا ہوا کہا جائے گا۔ محبت نہ ہو گی۔ دراصل دنیا کی تمام محبتیں مطلب کی بنیاد پر کی جاتی ہیں جنہیں محبت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جس وقت ایک ضعیف العمر اور غریب بھائی کسی مالدار بھائی کے پاس بھوک پیاس کی شکایت لے کر جاتا ہے اس وقت اس کی سفید دھاڑی آنسوؤں سے تر ہوتی ہے اور اس حال میں اپنے بھائی سے مدد مانگتا ہے اور اسی وقت مالدار بھائی اپنے بڑے بھائی کی حالت زار اور رونے کو دیکھ کر اپنے دل میں ایک کرب ناک درد محسوس کر لیتا ہے اور اس کی مدد کر لیتا ہے۔ بس اسی کو محبت کہتے ہیں۔ مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ کچھ عرصہ کے بعد تنگدست بوڑھا بھائی مالدار ہو جاتا ہے اور مالدار چھوٹا بھائی غربت کے پنجے میں گرفتار ہو جاتا ہے چنانچہ اب چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے پاس جا کر اپنی غربت کی شکایت اور مدد کی درخواست کر لیتا ہے مگر بڑے میاں انتہائی خسیس ہوتے ہیں اور چھوٹے کی مدد سے صاف انکار کر لیتا ہے۔۔ عین اسی وقت چھوٹے بھائی کو غصہ آجاتا ہے اور اسے وہ وقت یاد آجاتا ہے جس وقت اس نے اپنے بوڑھے غریب بھائی کی مدد کی تھی۔ مگر اب وقت پڑنے پر وہ چھوٹے کی مدد کرنے سے انتہائی درشتی سے انکار کر لیتا ہے چنانچہ چھوٹا اس کا خون پینے کی حد تک غصہ ہو جاتا ہے اور اس مثال سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دنیا کی ہر محبت مطلب پر مبنی ہوتی ہے۔ یعنی اگر چھوٹے بھائی کی محبت نفسانی نہ

ہوتی بلکہ روحانی ہوتی تو یقیناً" مطلب سے مبرا ہوتی اور بڑے بھائی پر غصہ نہ آتا بلکہ اس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

یہ محض ایک خیالی مثال نہیں بلکہ ہر شخص کو معلوم ہو گا کہ چونکہ محبت ایک روحانی قدر ہے اس لئے یہ صرف خدا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے کی جاتی ہے اور وہ ایسے کہ باقی سب لوگوں سے ان کو دل سے عظیم اور معزز جانیں۔ اس لئے کہ عشق و محبت کی صفت بھی یہی ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ "العشق نار یحرق ما سوی اللّٰہ" یہ حدیث قدسی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ عشق وہ آگ ہے کہ بغیر محبوب کے باقی سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے ۔ فی الحقیقت اصل رضائے الٰہی بھی اسی میں مضمر ہے اور ایمان کی اصل جزو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت علیہم السلام سے روحانی محبت ہے۔ یاد رہے کہ جن لوگوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت علیہم السلام کی محبت کو جزو ایمان تسلیم نہیں کیا ہے وہ گمراہ ہو گئے ہیں اور اسلام میں تہتر (۷۳) فرقوں کا وجود میں آنے کا یہی نقصان ہے کہ یزید پلید اور اس کے تابعداروں نے اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہم وسلم سے دشمنی اختیار کی۔ ان کے عقیدے میں اہل بیت علیہ السلام کسی تعظیم اور کسی عزت کے لائق نہ تھے ایسے لوگوں کی گمراہی اور ضلالت پر یہ عقلی دلیل کافی ہو گی کہ عقل سلیم یہ نہیں مانتی کہ نانا سے تو محبت کا دعویٰ کیا جائے اور اس کی اولاد کو ناحق اور بے گناہ اس ظلم سے قتل کیا جائے جس سے کفار بھی پناہ مانگتے ہوں۔ مگر پھر بھی اسلام اور مسلمانی کا دعویٰ کرتے ہوں۔ نور الابصار میں لکھا گیا ہے کہ جس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کا مبارک سر نیزے کی انی پر بلند کر کے شام روانہ کیا گیا تو ہاتف کی طرف سے یہ شعر سنا گیا۔

اترجوا امتہ و قتلت حسینا

شفاعۃ جدہ یوم الحساب

یعنی یہ امت حضرت امام حسین علیہ السلام کو قتل کرنے کے بعد بھی قیامت کے روز ان کے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی امید رکھتی ہے۔ ممکن ہے یہاں پر کوئی یہ اعتراض کر دے کہ اگر اہل بیت علیہ السلام کوئی گناہ کر دے تو کیا پھر بھی ان کی تعظیم لازمی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب حق تعالیٰ نے ان کی تعظیم فرض کی ہے تو پھر اس قسم کے اعتراضات خدا کے ساتھ جنگ کرنے مترادف نہیں۔ پہلے تو اہل بیت علیہم السلام سے کسی گناہ کا صادر ہونا ہی ناممکن ہے اور بالفرض اگر بشری طور پر ان سے کوئی خطا یا صغیرہ گناہ صادر بھی ہو تو وہ ان کی طہارت کےلئے کوئی نقصانی بات نہیں کقولہ تعالیٰ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا ہ الاحزاب: ایت نمبر ۳۳

یعنی اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ اے اہل بیت تم سے آلودگی (ناپاکی) کو دور رکھے اور تم کو (ہر طرح ظاہرا" اور باطنا") پاک و صاف رکھے۔

نورالابصار (جو ایک مصری چھاپ شدہ کتاب ہے) میں لکھا ہے کہ جس وقت یہ ایت نازل ہو گئی تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علی رضی اللہ عنہ، فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حسنین رضی اللہ عنہم کہاں ہیں۔ تو میں نے ان کو حاضر کر دیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چاروں کو اپنے ساتھ اپنی چادر میں چھپایا اور یہی ایت تلاوت فرما دی انما یرید اللہ .... پھر میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) انا معکم کیا ہم بھی آپ کے ساتھ شامل ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انت علی خیر یعنی تم اپنے مقام میں خوب تر ہو۔

ممکن ہے یہاں پر کوئی یہ کہدے کہ اس ایت سے مراد ازواج مطہرات ہیں۔

(بے شک) میں ازواج مطہرات کو بھی اہل بیت میں شامل سمجھتا ہوں ...... مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایت شریف ان پانچ قدسی افراد کے بارے نازل ہوئی ہے۔ دوسری بات اس آیت میں یہ ہے کہ اس میں لیذھب عنکم جمع کا صیغہ ہے اور جمع مذکر بھی ہے چنانچہ ان پانچ مقدس ترین افراد میں اکثریت مردوں کی ہے اور اس لئے خاتون جنت حضرت فاطمہ ازھریٰ رضی اللہ عنہا کا حساب بھی انہیں میں سے ہو گا کیونکہ اقل، اکثر کی تابع ہوتی ہے۔ (۱) تیسری بات یہ کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا درخواست کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ آپ اپنی جگہ پر خوب تر ہیں سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ ایت مبارک ان پانچ قدسی افراد اور ان کی اولاد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا یہ بھی فرماتی ہیں کہ جس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے ہمراہ اپنی رداء مبارک میں چھپا لیا تو یہ ایت مبارک ایسی تلاوت فرما دی

اللھم ھولاء اھل بیت فجعل سلامک و صلوٰتک علیھم وطھرھم تطھیرا

یا اللہ یہی میرے اہل بیت ہیں انپر اپنا سلام اور صلوٰۃ بھیج اور طہارت کے ساتھ انہیں پاک کر۔

یہاں پر ایک اور عرض بھی کرنا چاہتا ہوں یہ جو آج کل مسلمان عام طور پر فریاد کرتے ہیں کہ مسلمان کمزور ہو گئے ہیں، اسلام تباہی کے دہانے پر پہنچا ہے، قوم کی خدمت کوئی بھی نہیں کرتا اور قومی عصبیت نیست و نابود ہو گئی ہے اور اس تنزل کے

---

(۱) چونکہ خاتون جنت سلام اللہ علیہا حیض و نفاس سے پاک تھی اس لئے عورتوں کی اس صفت سے مبرا تھیں۔ (مولف)

اسباب اپنے اپنے علم اور عقل کے مطابق بیان کرتے ہیں مگر متاسفانہ اس امر کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں ہوتا کہ بزعم خود ہم مسلمانوں نے اسلام کی جڑوں کو کاٹ دیا ہے بلکہ ہم نے ایسا ابتدائے اسلام میں کیا ہے کہ خود مسلمانوں نے اسلام کی جڑوں کو کاٹ دیا وہ ایسے کہ دنیا بھر میں یہ فاسد عقیدہ پھیلا دیا گیا کہ جب تک اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم عابد و زاہد نہ ہوں تو ان کی عزت اور احترام نہ کیا جائے۔ اس کے ثبوت میں دور تک گئے اور حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی مثال ثبوت کے طور پر پیش کر دی۔ مگر تعجب ہے کہ یہ لوگ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تو کافر تھا۔ ایمان نہ لایا تھا۔ تو ہر چند اگر چہ وہ ایک پیغمبر کا بیٹا تھا مگر کفر کی وجہ سے لائق عزت نہ تھا۔ چنانچہ میری گذارش صرف اس قدر ہے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ ایک سید (خدانخواستہ) اگر کافر بھی ہو تو اس کی عزت کی جائے۔ بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ بات ناممکنات میں سے ہے کہ ایک سید کافر ہو گا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سادات کے بارے میں خداوند کریم نے قرآن مجید میں پورا پورا فیصلہ صادر فرما دیا ہے اور قرآن حکیم کوئی دنیاوی کتاب نہیں جس میں مرور ایام کے ساتھ رد و بدل ممکن ہو اللہ تعالیٰ یقیناً" آئندہ آنے والے واقعات سے باخبر ہے اور اگر اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا گمراہ ہونا ممکن ہوتا تو حق تعالیٰ کبھی بھی قرآن مجید میں ان کو "پاک" نہ فرماتا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ یہ تو ایک بے علم آدمی کا کام ہوتا ہے کہ جب کبھی کسی چیز کے بارے میں فیصلہ کر لیتا ہے تو (کچھ عرصہ کے بعد) اسے واپس بھی لے لیتا ہے۔ اسلام کی اصل کمزوری کا اصل سبب بھی یہی ہے اور اگر صرف قوم پرستی سارے کا سارا دین ہو تو ایسے "دین کی روشنی" روس میں سب سے زیادہ ہے۔ مناسب یہ ہے کہ سارے قوم پرست روس تشریف لے جائیں (غرضیکہ) قوم پرستی روحانیت سے کسی

حال میں اعلیٰ و بہتر نہیں اور نہ ہی یہ کوئی ایسی چیز ہے جس پر دین و ایمان کو بھی قربان کیا جائے۔ کیونکہ فی الحقیقت اولیت صرف دین کو حاصل ہے اور اسی دین و ایمان کے اجزاء میں اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و حمیت و مودت ایک خاص جزو بلکہ جزو اعظم ہے اگر یہ قائم رہے اور مسلمان اس پر عمل پیرا ہوں تو ناممکن ہے کہ ان کے دینی اور قومی معاملات درست نہ ہوں۔

امام فخرالدین رازی رحمتہ اللہ علیہ اپنی مشہور زمانہ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت پانچ امور میں برابر مشترک ہیں۔

(۱) پاکی و طہارت۔

(۲) درود میں۔

(۳) سلام میں۔

(۴) نسب میں۔

(۵) حرمت صدقہ میں۔

حق تعالیٰ حضور اقدس سے خطاب فرماتے ہیں کہ "طٰہٰ" یعنی اے طاہر و مطہر! اور اہل بیت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ یطھرکم تطھیرا اسی طرح اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجتے ہیں اور اسی طرح اہل بیت پر بھی سلام علیٰ آل یاسین فرمایا گیا ہے اسی طرح درود شریف میں

اللھم صلی علیٰ محمد و علیٰ آل محمد

بعض لوگ جو محض بغض کی وجہ سے لفظ "آل" کے معانی "امت" سے کرتے ہیں وہ یاد رکھیں کہ سلام و درود سے حق تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشا ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا کہ یزید اور مروان وغیرہ پر سلام و درود بھیج دیا جائے۔

حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے ایسے بغض رکھنے والوں کا حتمی جواب ان دو شعروں میں فرمایا ہے فرماتے ہیں

یاآل بیت رسول حبکم
فرض فی القرآن انزله
کفاکم من عظیم الفضل انه
من لم یصل علیکم لا صلٰوۃ له

یعنی اے اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی محبت فرض ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرمائی ہے۔ آپ کی بزرگی اور فضیلت کے لئے یہی بات کافی ہے کہ جو کوئی آپ پر درود نہ بھیجے انکی نماز قبول نہیں ہوتی۔

حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول ہرگز بے دلیل نہیں۔

انہوں نے یہ ایت شریف پیش کی ہے۔ قل الا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ سورہ الشوریٰ ایت نمبر ۲۳

"آپ ان سے کہیے کہ میں تم سے کچھ اجر (تبلیغ کی) نہیں مانگتا۔ بجزاس کی کہ میرے اہل بیت کی حرمت اور عزت کیا کرو"۔

یاد رہے کہ حق تعالیٰ سے محبت کا راز حضور اقدس سے محبت کرنے میں پوشیدہ ہے کقولہ تعالیٰ ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ آل عمران ایت نمبر ۳۱

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم میرا اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے" اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت آپ کے اہل بیت علیہم السلام سے محبت کرنے پر موقوف ہے۔ ہم نے اوپر ایت مبارک قل الا اَسْئَلُکُمْ ..... تحریر کی ہے تو اب حق تعالیٰ کے حکم

اطیعو اللہ و اطیعو الرسول کے بموجب اہل بیت کی محبت فرض بھی ہو گئی اور سنت بھی۔ اس لئے ایک جگہ تو اللہ کا حکم ہے اور دوسرا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور ایسے احادیث کا ذکر آنے والا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "میں نے آنحضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی جان کی طرح محبت کرتا ہوں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس رب کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ جب تک مجھے اپنی جان اور اولاد سے زیادہ عزیز نہ جانو گے۔ تمہارا ایمان قوی نہ ہو گا۔ تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ علیہ وسلم مجھے قسم ہے کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جان اور (اپنی) سب کچھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں تو (بعد ازاں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب تیرا ایمان کامل ہو گیا" یہ حدیث مبارک کنز العمال میں موجود ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اہل بیت رسول سے محبت کرنے پر منحصر ہے قال اللہ تعالٰی قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربٰی اسی طرح ایک حدیث مبارکہ میں ارشاد ہوا ہے۔

من حب علی و ابناھم و فاطمہ فقد حبنی۔

یعنی جس نے علی رضی اللہ عنہ اس کے بیٹوں اور فاطمہ رضی اللہ عنہا سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی۔ اور تفسیر روح البیان میں لکھا ہے:۔

من اکرم اولادی فقد اکرمنی

و من بغض الاولادی فقد ابغصتنی

یعنی جس نے میری اولاد کی عزت کی اس نے میری عزت کی اور جس نے میری اولاد سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔

ہم نے گذشتہ اوراق میں مسلمانوں کے جمود، افتراق و تشتت کی وجہ بھی یہی بیان کی ہے۔ کہ ان مسلمانوں نے اہل بیت رسول اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھلا دیا بلکہ اہل بیت کی مخالفت کرنے کے لئے کمر باندھی اور اسی طرح دین کی رسی کو بھی جانے دیا حالانکہ ارشاد خداوندی ہے واعتصموا بحبل اللہ جمیعا" و لا تفرقوا یعنی "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنا اور فرقے فرقے مت ہونا یعنی بے اتفاق مت ہونا" اب یہاں پر غور کا مقام یہ ہے کہ حق تعالٰی نے اس ایت مبارک میں جس رسی کا ذکر کیا ہے تو اسلام کی وہ کونسی رسی ہے۔ ظاہر ہے کہ رسی کے دو بل ہوتے ہیں ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی اگر ٹوٹ جائے تو رسی بے کار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حق تعالٰی نے اسلام کی رسی کے جن دو بلوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں سے ایک قرآن مجید اور دوسرے کا مطلب اہل بیت سے ہے۔ اور اس ضمن میں کثرت کے ساتھ احادیث موجود ہیں ایک حدیث صحیحہ میں ارشاد ہوا ہے:۔

ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی وان تمستکم
بهالن تضلوا حتی یرد علی الحوض

یعنی میں تمہارے لئے دو بھاری بھر کم چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک کتاب اللہ اور دوسری اپنی اولاد۔ اگر تم نے ان کو محکم طور پر تھام لیا تو گمراہ نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر تک پہنچ جاؤ گے۔

یہ حدیث مبارک بڑی مشہور ہے اور صاحب نور الابصار نے صحاح ستہ سے نقل کی ہے چنانچہ اس کی صحت میں کوئی شک و شبہ نہیں اور اسی حدیث سے صراحت کے ساتھ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی ذلت، زبون حالی اور خواری کی وجہ محض یہی ہے کہ انہوں نے اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت، احترام اور حرمت سے منہ موڑ لیا ہے۔ رسی کا ایک بل تو کسی نہ کسی طرح سے مسلمانوں نے

پکڑے رکھا ہے مگر ان کی یہ پکڑائی بھی بے معنی ہے اس لئے کہ قرآن ۔ ساکت قرآن ہے جبکہ اہل بیت علیہ السلام ناطق قرآن ہیں۔ اور اس بات پر وہ حدیث ناطق ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے بارے میں فرمایا تھا کہ:۔

هذا قرآن ناطق

تو مطلب یہ کہ جب تک ہم اسلام کی رسی کو پوری طرح نہ تھام لیں تب تک نہ تو ہماری روحانیت درست ہو سکتی ہے نہ قومیت۔ پھر بھی اگر کوئی شخص یہ عذر کرتا ہے کہ اگر اہل بیت گنہگار ہوں تو ان کی عزت نہ کرنا چاہیے تو ایسے حضرات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مبارک غور سے سن لیں۔ ارشاد ہوا ہے

اکرموا اولادی الصالحون للہ و الطالحون لیی:۔

(یعنی میری نیک اولاد کی عزت خدا کے لئے کرو اور گنہگاروں کی میری خاطر)

یہاں پر اگر کوئی یہ کہہ دے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بعض اہل بیت کے لئے خود ہی لفظ "طالحون" استعمال فرمایا ہے تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ گذشتہ بحث میں اہل بیت کی طہارت کے بارے میں یہ بات صاف کی گئی ہے تاہم وہاں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ اہل بیت بشری کمزوریوں سے مبرا نہیں اور عین ممکن ہے کہ ان سے صغیرہ گناہ صادر ہو۔ مگر وہ گناہ جو طہارت کی نقیص ہو جیسے شرک یا کبیرہ گناہ ان سے سرزد نہیں ہوتا حضرت امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایت مبارک وقفوهم انهم مسؤلون ہم اہل بیت کے بارے میں نازل ہوئی ہے یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ لوگوں سے ہمارے ساتھ محبت و حرمت کے بارے میں پوچھیں گے۔ غرضیکہ اہل بیت کی حرمت چاہے نیک ہوں یا گنہگار عقل و نقل دونوں طرح سے ثابت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ الا من سفه نفسه۔

اہل بیت کی حرمت کے سلسلے میں ایک عقلی دلیل پیش کی جاتی ہے۔ غور فرمائیے کہ قرآن مجید ایک انتہائی مقدس اور متبرک کتاب ہے مگر اس کے باوصف اس بے حد متبرک کتاب میں مردار چیزوں' خون اور خنزیر کے الفاظ موجود ہیں یہاں تک کہ اس میں فرعون وغیرہ کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہے کوئی ایسا بدقسمت جوان الفاظ کو قرآن عظیم الشان سے خارج کرنے کی جرات کر سکے۔ یہ کہہ کر کہ یہ ناپاک اور مکروہ الفاظ ہیں۔خدانخواستہ اگر کسی نے ایسی جرات کی تو اس کے کفر میں کوئی شک باقی نہ رہے گا۔ ظاہر ہے جو لوگ قرآن عظیم الشان کی عزت کرتے ہیں تو یہ بسم اللہ سے لے کر والناس تک اس کے حرف حرف اور تمام قرآن مجید کی دل سے ادب اور عزت کرتے ہیں اور قرآن کو سروں پر رکھا جاتا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ کیا خنزیر کا لفظ جو قرآن کریم میں وارد ہے منزل آیتوں میں آنے کی وجہ سے اس کا بھی احترام ہوتا ہے کہ نہیں۔ چنانچہ صاف طور پر واضح ہے کہ قرآن کریم کے ایسے تمام الفاظ ادب و احترام کے ذیل میں آتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کسی مسلمان نے کبھی یا کسی موقعہ پر یہ سوچا بھی ہے کہ جب میں قرآن کریم کو چومتا ہوں یا اسے سر پر رکھتا ہوں اس میں ان ناپاک چیزوں کے نام بھی آئے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے قرآن مجید کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے وجود میں سے ہیں۔ ویسے ہی اہل بیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں سے ہیں گویا ان کا جسم بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم ہے مثال کے طور پر حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے۔ الحسین منی و انا من الحسین یعنی حسین مجھ سے ہے اور میں حسین میں سے ہوں لہٰذا اگر اہل بیت گنہگار بھی ہوں تو پھر بھی ان کی عزت و احترام فرض ہے۔

میں نے جہاں اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم یعنی علی رضی اللہ عنہ' فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حسنین رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں

کہ دیگر اہل بیت کا وجود ہی نہیں۔ اس لئے کہ اہل بیت اور بھی ہیں مگر وہ دوسرے درجے میں شامل ہیں۔ مثلاً" حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اور بیٹے بھی تھے جن کو میں دوسرے درجے کے اہل بیت میں شمار کرتا ہوں مگر اللہ تعالیٰ اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چار حضرات کرام کو منتخب فرمایا ہے اور ان کے ساتھ ان کی اولاد بھی لائق تعظیم ہے۔ (اس کا ثبوت یہ ہے) کہ نجران سے عیسائیوں کا جو وفد حضور صلی اللہ علیہ وسم سے بحث مباحثہ کرنے کے لئے آیا تھا اور بحث کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہ آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ آؤ کہ اب مباہلہ سے فیصلہ کرلیں اور جھوٹے پر خدا کی لعنت بھیج دیں پھر دیکھ لیا جائے گا جو بھی جھوٹا ہو گا اس پر خدا کی لعنت مسلط ہو جائے گی۔ ارشاد خداوندی ہے۔فقل تعالوا ندع ابناء نا و ابناء کم و نساء نا و نساء کم و انفسنا و انفسکم ثم نبتهل و تجعل لعنته اللہ علی الکاذبین آل عمران ایت نمبر ۶۱۔ تو آپ فرما دیجے آجاؤ ہم اور تم بلا لیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور خود تنوں کو اور تمہارے تنوں کو پھر ہم سب مل کر خوب دل سے دعا کریں۔ اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجیں ان پر جو اس بحث میں ناحق پر ہوں۔

چنانچہ عیسائی ڈر کر بھاگ گئے اور مباہلہ نہ کیا۔ یہ وقت تھا کہ حضور اقدس ﷺ کے ہمراہ یہی چار بزرگ (علی علیہ السلام، فاطمہ رضی اللہ عنہا، حسنین علیہم السلام) باہر تشریف لائے تھے اور عیسائیوں کو مباہلہ کی دعوت دی تھی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ان عیسائیوں میں ایک بڑا عیسائی عالم بھی تھا۔ اس نے انجیل وغیرہ کتابوں میں اس واقعہ کے بارے میں پہلے سے پڑھا تھا کہ ایسا ہو گا۔ اس لئے اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ مباہلہ کو چھوڑ کر ہم یہاں سے چلے جائیں ورنہ غرق

ہو جائیں گے (۱) اس ایت شریف میں جن حضرات کا ذکر ہے وہ بھی یہی چار ہستیاں تھیں۔ دوسری خوبصورت بات یہ ہے کہ اس ایت شریف میں حق تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نفس کہا ہے۔ پس امت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نفس مبارک سے بزرگ تر اور کون ہو سکتا ہے۔ چنانچہ امت میں سے جو کوئی بھی ان کا اور ان کی اولاد کا دوست ہو گا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوست ہو گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوست اللہ تبارک و تعالیٰ کا دوست ہو گا۔ اسی طرح ان کا دشمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دشمن ہو گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دشمن خداوند تعالیٰ کا دشمن ہو گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دشمن کافر ہو گا۔

ارشاد خداوندی ہے ۔ان شانئک ھو الابتر ۔ بہ تحقیق تیرا دشمن ہی قاطع النسل اور کافر ہے ثبوت اس کا یہ ہے کہ یزید لعین کی کوئی اولاد اس بھری دنیا میں موجود نہیں۔ سوائے مخلوق خدا اگر کوئی دیدہ بنیاد رکھتا ہو تو دیکھ لے اور دیکھ کر سمجھ لے کہ حق تعالیٰ کا وعدہ کتنا سچا اور برحق ہے۔ اسی طرح بنوامیہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ مگر ان کی اولاد موجود ہے۔

مزید برآں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی 9 ازواج مطہرات تھیں

---

(۱) موجودہ زمانے کے عیسائی اس شکست کا یہ جواب دیتے ہیں کہ نجران کے عیسائیوں نے اس مباہلے کا اس لئے انکار کیا تھا کہ وہ لعنت کا لفظ کسی کے بارے میں بھی استعمال کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ تو بات بری نہیں کہ وہ یہودیوں اور مسلمانوں پر لعنت نہیں بھیجتے اور اگر یہ درست ہو تو پھر رحمت ہی بھیجتے ہوں گے۔ لیکن اگر نہ رحمت بھیجتے ہوں نہ لعنت تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذہب انتہائی درجے تک ناقص ہے۔ جس میں کسی قسم کے احکام نہیں (مولف)

جن میں ام المومنین خدیجتہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کو خصوصی درجات حاصل تھے۔ اسی طرح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، عباس رضی اللہ عنہ، جعفر طیار بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزندان مبارک حضرت قاسم علیہ السلام، ابراھیم علیہ السلام اور طیب علیہ السلام یہ سب اہل بیت میں شامل ہیں۔

اہل بیت کے تیسرے درجے میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور مقداد رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہم بھی اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواج مطہرات رضی اللہ عنہم مندرجہ ذیل ہیں۔

نہ جفت نبی کہ پاک بودند ہمہ   عائشہ و خدیجتہ محترمہ

باام حبیبہ، حفصہ بودوزینب   میمونہ، صفیہ، سودہ، ام سلمہ

دیگر اصحاب پر علی اور اہل بیت کی فضیلت

ہمارا عقیدہ ہے کہ رحمتہ اللعالمین مظہر اتم واکمل محمد رسول اللہ کے بعد نفس پیغمبر مظہر العجائب و الغرائب، وصی رسول الثقلین، اسد اللہ الغالب حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ التحیتہ والتسلیم ہر بشر سے افضل ہیں اور قیامت تک کوئی دوسرا بشر پیدا نہیں ہو سکتا جو حضرت امیر علیہ السلام سے بہتر ہو۔ وجہ یہ ہے کہ فضیلت کی اصل علم ہے۔ حق تعالٰی نے بھی فرمایا ہے والراسخون فی العلم والذین اوتوا العلم درجٰت، ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون اور حضرت امیر المومنین شیر خدا کے بارے میں تو یہ حدیث شریف انتہائی مشہور و معروف ہے۔

انامدینتہ العلم وعلی بابہا

یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔ مزید براں صاحبان دانش و بینش کا اس پر اتفاق ہے کہ بشری فضیلت ۔ علم و ادب اور اخلاق حسنہ پر منحصر ہے اس لئے بھی جناب امیر علیہ السلام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ہیں۔ کیونکہ کچھ تو علم و ادب اور کچھ اخلاق فاضلہ کی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ تمام اصحاب سے بڑھے ہوئے تھے۔ یہ عقیدہ شریعت کے خلاف بھی نہیں ہے اہل سنت والجماعت میں بھی ایسے بے شمار حضرات ہو گزرے ہیں جن کا اس عقیدہ پر اتفاق

تھا انشاء اللہ حق تعالیٰ بھی اس بات پر ہمارا مواخذہ نہیں فرمایا گا کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیھم اھتدیھم

یعنی میرے اصحاب رضی اللہ عنہم ستاروں کی مانند ہیں انمیں سے جس کسی کی بھی تم نے اقتدا کی ہدایت پالو گے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تصوف کی اصل اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ مگر بات دراصل یہ ہے کہ چونکہ از روئے طریقت جناب امیر علیہ السلام ہمارے امام الائمہ ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی باطنی خلافت حضرت امیر علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی مزید برآں حضور اقدس صل اللہ علیہ وسلم نے جناب امیر علیہ السلام ہی کو وصی اور ولی مقرر فرمایا تھا چنانچہ اسی وجہ سے ہم جناب امیر علیہ السلام کو باقی تمام اصحاب کرام سے افضل تسلیم کرتے ہیں۔ کتاب ناسخ التواریخ کے صفحہ نمبر ۹۸ پر لکھا ہے کہ جناب امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ولقد استودعت علم القرون الاولیٰ وما ھو کائن الیٰ یوم القیامہ یعنی روز قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے وہ علم مجھے دیا گیا ہے حضرت امیر المومنین کے اس قول مبارک سے معلوم ہوتا ہے کہ انکو حقیقت و معرفت کے علوم عطا فرمائے گئے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اہل تصوف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو دیگر تمام اصحاب رضی اللہ عنہم سے بہتر جانتے اور مانتے ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ جناب امیر علیہ السلام ہی طریقت کے تمام سلسلوں کے امام اور شاہ اولیاء ہیں۔

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا کہ ملک روم کو فتح کیا جائے اس لئے کہ انہوں نے اسی سلسلہ میں ایک خواب دیکھا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تمام اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا۔ جن میں مہاجرین بھی تھے اور

انصار بھی۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "خداوند تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہمیں بھائی بھائی بنا کر متحد و متفق کر دیا ہے۔ اب میرا خیال ہیکہ روم کی طرف لشکر روانہ کروں۔ فرمائیے اس بارے میں آپ لوگوں کا کیا خیال ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس بارے میں کوئی بھی آپ پر سبقت نہیں رکھتا۔ خدا کا فضل بھی آپ کے ساتھ ہو گا۔ مناسب ہے کہ لشکر بھیج دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس ملک اور چند دیگر ممالک کی فتح کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبد الرحمان رضی اللہ عنہ بن عوف، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی اپنی رائے دی۔ آخر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے مخاطب ہوئے کہ یا ابوالحسن (علیہ السلام) اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ تو حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا کہ خواہ آپ خود جائیں یا صرف لشکر بھیجیں فتح بہرحال مسلمانوں کی ہوگی۔ اس کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب امیر علیہ السلام سے پوچھا کہ اس نوید پر آپ کے پاس دلیل کیا ہے۔ چنانچہ حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میں نے خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ چنانچہ جب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنی تو فرمایا کہ اے لوگو! علی کرم اللہ وجہہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں"۔

مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ دوسرے اصحاب رضی اللہ عنہم حقیقت و معرفت سے بے خبر تھے حاشا وکلا! اکثر حقیقت و معرفت سے واقف تھے بلکہ دیدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ان کی معرفت باقی سب سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ تاہم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بکمال و تمام حاصل تھی اور تا روز قیامت جتنے اولیاء رحمتہ اللہ علیہم مثلاً" اغواث رحمتہ اللہ علیہم، اقطاب رحمتہ اللہ علیہم، ابدال

رحمتہ اللہ علیہم اور اوتاد رحمتہ اللہ علیہم آنے والے ہیں یا جو ان سے قبل گذرے ہیں سب کے لئے فیض کا سرچشمہ جناب مولائے کائنات علی کرم اللہ وجہہ ہی ہیں۔ اسی طرح ایک اور روایت ناسخ التواریخ کے صفحہ ۳۰۶ پر درج ہے جس وقت یرموک فتح ہو گیا اور اسی جنگ میں ایک لاکھ پانچ ہزار کفار مارے گئے اور چالیس ہزار گرفتار ہو گئے چنانچہ کفار کا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا اس لئے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے اپنے ماتحت عسکری افسروں سے مشورہ طلب کیا کہ اب قیساریہ پر حملہ کرنا چاہیے یا بیت المقدس پر۔ سب نے یہ رائے دی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ وقت ہیں اور اس بارے میں ان کو اطلاع دینا ضروری ہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا گیا۔ انہوں نے یہ بات شوریٰ کے سامنے پیش کی۔ اسی موقعہ پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ بعد ازیں سب سے پہلے اسلامی لشکر بیت المقدس بھیجنی چاہیے اور پس ازیں قیساریہ بھی فتح ہو جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی پر عمل کیا اور دونوں مقامات فتح ہو گئے۔

ناسخ التواریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ جس وقت حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایران کو فتح کیا تو اس کے بعد خراسان کو فتح کرنے کا ارادہ کا فرمایا اور اپنے اس ارادے کی اطلاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی دیدی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ بس اتنا ہی ملک کافی ہے خراسان کو فتح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں مگر اس موقعہ پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا یہ کیا لکھ رہے ہیں۔ خراسان کو فتح کر لینا ضروری ہے اور پھر خراسان کے لوگوں' وہاں کے آب وہوا اور ملکی معاملات کے بارے میں ایسی تفصیلات بیان فرمائیں کہ گویا یہ ان کا اپنا وطن ہو چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر کرم اللہ وجہہ کی بات مان لی اور خراسان کی تسخیر کے لئے بارہ ہزار لشکر بھیج دی۔

اسی طرح واقدی رحمتہ اللہ علیہ نے فتوح الشام کے صفحہ ۲۱۵ پر لکھا ہے کہ جب مسلمانوں نے شام کے اکثر شہروں کو فتح کیا۔ تو بادشاہ ہرقل نے اپنے تمام صوبوں کی فوجوں کو یکجا کرکے دس لاکھ کی ایک لشکر جرار مقابلے کے لئے روانہ کر دی۔ مسلمانوں کی فوج کے سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ بن الجراح تھے اور لشکر کی کل تعداد تیس ہزار فوجی تھے۔ چنانچہ کمک کے لئے مدینہ درخواست بھیج دی گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ خلیفہ تھے۔ انہوں نے مشورہ طلب کیا اور اسی موقعہ پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ اس جنگ کی کیفیت میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے اس معرکہ میں بے شمار عیسائی ہلاک ہو جائیں گے اور مسلمان فتح حاصل کریں گے۔ جہاں تک کمک اور امداد کا تعلق ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں یہی تیس ہزار فوج ہی کافی ہو گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایسی اور بھی کئی واقعات اور عجائبات ہیں جو حضرت امیر علیہ السلام سے منسوب ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی باطنی خلافت جناب امیر علیہ السلام کو دی تھی اور ظاہری خلافت باقی تین خلفا کو عطا کی تھی۔ کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا خلیفہ ہونا اور اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کا یکدم ان سے بیعت کرنا حیرانی کی بات ہے باوجودیکہ امیر المومنین علی علیہ السلام اس معاملہ پر ناراض تھے اور ایک مدت تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیعت نہ فرمائی تھی۔ آپ علیہ السلام کا اعتراض تھا کہ آپ لوگ جب بیعت جیسے اہم معاملہ کا فیصلہ کر رہے تھے تو مجھ سے اور میری قوم سے کیوں مشورہ طلب نہ کیا گیا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے میری نسبت اور قربت کو کیسے بھلایا گیا۔ (بات وزن دار تھی) مگر اسی اثنا میں بعض اقوام نے زکواۃ دینا بند کر دیا چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیعت کرلی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دیا لوگ اسی عورت کو سنگسار کرنے کے لئے لے جا رہے تھا کہ راستے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ ملے آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔لوگوں نے عرض کیا کہ یہ "زنا کی مجرم ہے اور حضرت امیرالمومنین عمر رضی اللہ عنہ نے رجم کا حکم دیا ہے"۔ مگر حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے روکا اور عورت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے انہوں نے کاروائی روکنے کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو جناب امیر علیہ السلام نے جواب دیا کہ اس عورت کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ بے گناہ ہے اور اس پر شریعت کی حد جاری نہیں ہو سکتی۔ یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سمجھ میں آگئی اور فرمایا کہ لولا علی فهلک العمر یعنی اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

حضرت مخدوم سعد قدس سرہ العزیز نے حضرت سید محمد گیسو دراز قدس سرہ العزیز کے ملفوظات مجمع السلوک میں ذکر کیا ہے کہ خلافت کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی خلافت صغریٰ جو امور ظاہری سے متعلق ہے اور یہ خلافت خلفائے ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ختم ہوئی ہے۔ دوسری خلافت کبریٰ ہے جو اسرار باطنی سے متعلق ہے اور یہ صرف حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی ذات اقدس پر منحصر ہے۔ قاضی ثناء اللہ نے صحیح مکاشفہ کے ذریعے یہ بات معلوم کی ہے کہ ولایت کا فیض حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے ہی حضرت علی رضی اللہ کی روح مبارک کے سپرد کی گئی ہے۔ اور جس جس کو یہ فیض پہنچی ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی روح سے پہنچی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی فیض ان کے بعد حضرت امام حسن علیہ السلام کی روح کو پہنچی۔ ان کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام اور بعد ازاں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی

مقدس روحوں تک پہنچ گئی۔ شعر

جن کا جھولا حضرت جبرائیل علیہ السلام نے جھلایا ہو۔ ایسی ہستیوں کے مراتب کا کیا پوچھنا ہے (پشتو شعر کا ترجمہ)

اس کے بعد ہوتے ہوتے یہی فیض حضرت غوث پاک اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہم کو پہنچا۔ زمانہ آخر میں جب حضرت امام مہدی علیہ السلام کا ظہور ہو گا تو ان کو مل جائے گا۔

میرے **مرشد پاک** رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ خاص اور اخص علم جو اہل بیت کے علاوہ کسی اور کے لئے ممکن نہیں۔ امامت کا علم ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ معرفت و طریقت کے علوم ہیں اور وہ حضرت خواجہ حسن بصری، حضرت سلمان فارسی اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کو حاصل تھے حضرت امام مہدی علیہ السلام کے پاس اپنا علم بھی ہے مگر چونکہ انہوں نے ابھی تک اس کو ظاہر نہیں فرمایا۔ چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت پیران پیر دستگیران (امام مہدی علیہ السلام) کے نائبین ہیں۔ اس لئے ساری دنیا کے اولیاء پر ان دونوں کی بزرگی اور سرداری قائم ہے۔

فضیلت اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں آیات و احادیث

ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ بعض لوگ اہل بیت کی فضیلت پر یقین رکھنے میں اختلاف رکھتے ہیں مگر ان میں بعض لوگوں کا بغض و عناد بدنیتی پر موقوف ہے ہم نے خیر الامور اوسطہا کے مصداق ازواج مطہرات اور سارے خاندان نبوت کو اہل بیت میں شامل کیا ہے۔ اگرچہ حضرت سیدنا علی علیہ السلام، حضرت سیدۃ النساء فاطمہ زہرا سلام

اللہ علیہا اور حسنین علیہم السلام کو سب سے افضل ثابت کیا ہے۔ کتاب نور الابصار میں لکھا ہے۔

اعلم انه قد اختلف فی اہل البیت فقیل نساء صلی اللہ علیه وسلم لا نهن فی بیته ۔ قال سعید بن جبیر رضی اللہ عنه عن ابن عباس رضی اللہ عنه وهو قول عکرمه مقاتل و قیل علی و فاطمه والحسن والحسین

یعنی اس میں اختلاف ہے کہ اہل بیت کون لوگ ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ہیں کیونکہ وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ہوا کرتی تھیں۔ (لیکن) حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں اور یہی قول حضرات عکرمہ اور مقاتل رضی اللہ عنہم کا بھی ہے کہ اہل بیت علی' فاطمہ' حسن اور حسین علیہم السلام ہیں۔

نور الابصار میں آگے تحریر ہے قال ابوسعید الحذری و جماعته من التابعین منهم مجاهد و قتاده و قیل هم من تحرم علیهم الصدقه بعده آل علی و آل جعفر و آل عباس

یعنی ابوسعید حذری رضی اللہ عنہ اور تابعین کی ایکجماعت کا کہنا ہے جن میں مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں کہ جن (حضرات) پر صدقہ حرام ہے اہل بیت وہی لوگ ہیں ان کے بعد علی رضی اللہ عنہ' عقیل رضی اللہ عنہ' اور عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد ہے۔ ایت مباہلہ کے بارے میں تفسیر خازن میں لکھا ہے۔

فقل تعالوا ندع ابنآءنا و ابنآءکم ونسآءنا و نساء کم و انفسنا و انفسکم۔ وقیل اراد بالابناء الحسن و

الحسین و بالنساء فاطمتہ و بالنفس نفسہ
صلی اللہ علیہ وسلم و علیاً"

یعنی اس ایت مبارکہ میں ابناء (بیٹوں) سے مراد حسن علیہم السلام و حسین علیہم السلام ہیں اور نساء نا (عورتیں) سے مراد فاطمہ علیہا السلام اور نفس سے مراد سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور علی علیہ السلام ہیں۔

تفسیر خازن کیمفسر رحمتہ اللہ علیہ آگے لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر دو امامین علیہم السلام کو ہاتھوں سے پکڑ لیا اور حضرت بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا اور علی علیہ السلام ان کے پیچھے روانہ ہوئے۔ نجران کے عیسائیوں نے جب ان قدسی حضرات کو دیکھا تو مباہلے سے انکار کر دیا۔ مزید بر آں:۔

و فی الخطیب عن عائشتہ ان رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم خرج و علیہ مرط مرجل
من شعر الاسود فجاء الحسن فادخلہ ثم جاء
الحسین فادخلہ ثم فاطمتہ ثم علیؑ ثم قال انما
یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اہل البیت و
فی ذالک دلیل علی نبوتہ صلی اللہ علیہ وسلم
وعلی فضل اہل الکساء رضی اللہ عنہم و عن
بقیتہ صحابتہ اجمعین

یعنی خطیب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے آپ نے سیاہ بالوں کا ایک کمبل اوڑھا تھا۔ اسی اثنا میں حضرت امام حسن علیہ السلام آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو اپنے کمبل میں داخل کیا۔ پھر امام حسین آئے ان کو بھی اسی کمبل میں داخل کیا۔ پھر فاطمہ رضی اللہ

عنہا اور علی علیہ السلام کو بھی۔ پھر آپ نے فرمایا انما یرید...... یعنی بہ تحقیق اللہ نے ارادہ فرمایا ہے کہ اے اہل بیت تم سے ناپاکی دور فرما دے اور اس میں آپ کی نبوت اور ان لوگوں کی باقی تمام اصحاب رضی اللہ عنہم پر فضیلت کی دلیل ہے جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمبل میں چھپایا تھا۔

حضرت امام رازی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر (کبیر) میں اور زمخشری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کشاف میں اس ایت کی یوں تفسیر کی ہے۔قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ روی انہا لما نزلت قیل یا رسول اللہ من قرابتک ھولاء الذین و جبت علینا مودتھم قال علی و فاطمہ و ابناھم

یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت سے فرما دیجیے کہ اس تبلیغ کے بدلے میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا مگر یہ کہ میرے اقربا کی عزت کرو۔ اصحاب رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے قرابت دار کون ہیں جن کی عزت ہم پر فرض کی گئی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علی، فاطمہ اور ان کے دونوں بیٹے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ:۔

و روی من طرق عدیدۃ صحیحتہ ان الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاء ومعہ علی و فاطمہ والحسن والحسین ثم اخذ کل واحد منہما علی فخذہ ثم لف علیھم کساء ثم تلا .... ھٰذِہِ الآیۃ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اہل البیت و یطھرکم تطھیرا و فی روایتہ اللھم

ھولاء آل محمد فاجعل صلوتک و برکاتک

علی آل محمد کما جعلتہا علی ابراھیم انک

حمید مجید۔ و فی روایت ام سلمتہ قالت

فرفعت الکساء لا دخل معھم فخذ بہ من یدی

قلت و انا معکم یا رسول اللہ فقال انک من ازواج

نبی علی خیر۔

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کے ہمراہ علی۔ فاطمہ۔ حسن اور حسین بھی تھے پھر سب کو یکجا کر کے ان پر اپنا کمبل ڈال دیا۔ بعد ازاں یہ ایت تلاوت فرمائی انما یرید اللہ ....اس کے بعد فرمایا کہ یااللہ یہی میرے اہل بیت ہیں ان پر صلوۃ و رحمت نازل فرما(۱)۔

جس طرح آپ نے ابراھیم علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی اور تم ہی صفت و بزرگی کے لائق ہو اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ میں نے بھی کمبل کو اٹھایا تاکہ اس میں داخل ہو سکوں۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمبل میرے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا

---

(۱) جو لوگ درود شریف کو نماز کے دوران ساری اُمّت کے معنوں میں لیتے ہی۔ آنکھیں کھول دیں اور سوچیں کہ حضور ﷺ نے کس کس کے متعلق یہ ارشاد فرمایا تھا۔ کہ صلوٰۃ و برکات کس کس پر نازل ہوں (یعنی صرف اہل بیت علیہم السلام پر) اہل انصاف کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی۔ اور سمجھ گئے ہوں گے کہ آل محمد ﷺ سے مراد صرف اہل بیت علیہم السلام ہیں۔ یعنی سادات کرام اور کوئی نہیں اللہم صل علی محمد و آل محمد (مولف)

میں بھی اس میں شامل ہوں تو ارشاد ہوا کہ تم نبی کی ازواج اور اپنی جگہ پر بہتر ہو۔ گویا کمبل میں کسی اور کے داخل یا شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

اس ضمن میں ایک اور ثبوت یہ بھی ہے:۔

روی احمد و الطبرانی عن ابی سعید الحذری قال قال رسول اللہ انزلت ھذہ الایتہ فی فی خمستہ فی وفی علی و حسن و حسین و فاطمہ

یعنی احمد اور طبرانی حضرت ابو سعید حذری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ آیت (انما یرید) پانچ افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے خود میرے حق میں اور علی علیہ السلام' حسن علیہ السلام' حسین علیہ السلام اور فاطمہ علیہم السلام کے حق میں۔

نیز:۔ و روی ابن ابی شیبتہ و احمد و ترمذی حسنتہ و ابن جریر و ابن المنذر و الطبرانی و الحاکم و صحیحتہ عن انس ان رسول اللہ بعد نزول ھذہ الایتہ کما فی روایتہ ترمذی کان یمر بیت فاطمتہ اذا خرج الی الصلٰوہ الفجر یقول الصلوہ اہل الیبت انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اہل البیت و یطھر کم تطھیرا

یعنی ابن ابی شیبہ' احمد' ترمذی' حسن ابن جریر' ابن المنذر' طبرانی اور حاکم سے جس کی صحت انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے فرمائی ہے کہ اس ایت کے نزول کے وقت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کہ ترمذی میں بھی روایت ہے

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر جاتے اور جب صبح کی نماز کے لئے تشریف لے جاتے تو اپنے اہل بیت پر صلوٰۃ فرماتے اور یہی آیت تلاوت فرماتے نور الابصار میں تحریر ہے:-

وقد جاء فی فضلھم و شر فھم آیات و احادیث فمن الایت زیادہ علی ما سبق ما اخرجہ الثعلبی فی تفسیر قولہ تعالیٰ واعتمصوا بحبل اللہ جمیعا" - عن جعفر صادق انہ قال نحن حبل اللہ و اخرج بعضھم عن محمد الباقر فی قولہ تعالیٰ ام یحسدون الناس علیٰ ما اتھم اللہ من فضلہ۔ انہ قال اہل البیت ھم الناس و اخرج بعضھم عن محمد بن حنفیہ فی قولہ تعالیٰ ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمان ودا۔ انہ قال لایبقی مومن الا و فی قلبہ و دلعلی و اہل بیتہ و ذکر النقاش انھا نزلت فی علی

یعنی اہل بیت علیہم السلام کی فضیلت اور شرافت کے سلسلے میں بے شمار آیتیں اور احادیث آئی ہیں۔ ان آیتوں میں بعض ایسی بھی ہیں جن میں اکثر کا ذکر ثعلبی نے کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں ایت واعتصموا بحبل اللہ (اللہ کی رسی مضبوطی سے تھام لو) کی تفسیر میں حضرت امام جعفر علیہ السلام کی روایت نقل کی ہے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ "اللہ کی رسی" سے مراد ہم (اہل بیت) ہیں بعض نے حضرت امام باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ آپ علیہ السلام نے اس ایت کی تفسیر کے ضمن میں فرمایا کہ آیا لوگ اہل بیت علیہ السلام کے ساتھ خدا کے اس فضل پر حسد کرتے ہیں جو اس نے ان پر کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ایت میں اہل بیت کا ذکر ہے یہ وہی لوگ ہیں جن کے ساتھ بعض لوگ بغض رکھتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے

انپر بڑا فضل اور مہربانی فرمائی ہے(۱)اور بعض نے حضرت حنفیہ رضی اللہ عنہ (فرزند علی) سے روایت کی ہے آپ نے ایت کے بارے میں فرمایا کہ تحقیق جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام سرانجام دیئے تو بہت جلد اللہ تعالیٰ ان سے دوستی فرمائیں گے۔ حضرت حنفیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تک کسی کے دل میں علی اور اہل بیت علیہ السلام کی محبت نہ ہو تو کوئی بھی مومن نہیں رہ سکتا۔ اور نقاش نے ذکر کیاہے کہ یہ ایت علی علیہ السلام کی شان میں اتری ہے۔

و عن انس بن مالک فی قوله تعالیٰ مرج البحرین یلتقیان قال علی و فاطمته یخرج منهما اللولو والمر جان۔ قال الحسن و لحسین رواه کتاب الدرر

---

(۱) اور یہ وہ فضل ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ کے بعد سب لوگوں سے افضل جانا ہے اور ان کی محبت حضور اقدس ﷺ سے محبت کی طرح فرض کی گئی ہے۔ اس لئے کہ ان اہل بیت کو اللہ تعالیٰ نے پاک اور طاہر پیدا کیا ہے۔ صرف انہی کو امامت کا علم عطا ہوا ہے۔ ان کے علاوہ اور کسی کو عطا نہیں ہوا۔ میرے مرشد پاک کے اس قول کے ساتھ کہ صرف اہل بیت ہی کو امامت کا علم عطا ہوا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کا قول بھی مطابقت رکھتا ہے جو انہوں نے اپنے مکتوبات میں تحریر کیا ہے۔ انہوں کے لکھا ہے کہ علم اہل بیت علیہم السلام کا خاصہ ہے یعنی اہل بیت علیہم السلام علم کا سرچشمہ ہیں (مولف)

یعنی کتاب درر کے مصنف نے اپنی تفسیر میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی یہ روایت تحریر کی ہے کہ مرج البحرین یلتقیان سے مراد حضرت علی علیہ السلام اور حضرت فاطمۃ الزہری سلام اللہ علیہا ہیں۔ اور یخرج منھما اللؤلؤ والمرجان سے مراد حضرت امام حسن اور امام حسین علیہم السلام ہیں۔

و عن محمد بن سیرین فی قولہ تعالٰی و ھوالذی خلق من الماء بشرا فجعلہ .... نسبا و صھرا۔ انھا نزلت فی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعلی ابن ابی طالب ھوابن عم النبی صلی اللہ علیہ وسلم و زوج فاطمہ رضی اللہ عنھما فکان نسباً و صھراً

(الفرقان کی ایت نمبر ۵۴ ملاحظہ ہو ملاحظہ ہو)

محمد بن سیرین سے اس ایت کے بارے میں روایت ہے کہ وہ ذات وہی ہے جس نے پانی کی ایک بوند سے بشر کو پیدا فرمایا۔ پھر اس کو خاندان اور سسرال والا بنایا۔ فرماتے ہیں کہ یہ ایت علی رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کہ یہی نسب و صھر ہیں(۱)

....

(۱) مولانا عبد الرشید صاحب نعمانی نے اپنی کتاب لغات القرآن جلد نمبر ۳ میں صھر کے معنے سسرال کے لئے ہیں۔ مولانا نے امام قرطبی' امام زہری اور ابن السکیت کی محققانہ آرا نقل کی ہیں۔ انہوں نے امام زمخشری کا قول بھی نقل کیا ہے مختصر یہ کہ مولانا مذکور نے لکھا ہے کہ نسب اور صھر میں فرق یہ ہے کہ نسب وہ قرابت ہے جس سے خاندانی رشتہ چلتا ہے اور نسل کا سلسلہ قائم ہوتا ہے۔ جبکہ صھر وہ قرابت ہے جو عورتوں کی وجہ سے قائم ہوتا ہے یعنی اس سے سسر اور دامادی کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ مولانا نعمانی نے ابن السکیت کی یہ تحقیق اور تفسیر بھی کی ہے (بقیہ اگلے صفحے پر)

اس لئے کہ علی علیہ السلام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہما کے شوہر بھی ہیں۔ یعنی یہاں نسب اور صہر دونوں موجود ہیں۔

و روی امام ابوالحسین البغوی فی تفسیرہ یرفعہ بسندہ الیٰ ابن عباس رضی اللہ عنہ قال لما نزلت ھذہ الایت قل لا اسئلکم علیہ اجراً الاالمودۃ فی القربیٰ۔ قالو یا رسول اللہ من ھٰولاء الذین امرنا اللہ تعالیٰ بمود تھم قال علی و فاطمتہ و ابناھما

امام ابوالحسین بغوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں مرفوعاً" حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جس وقت ایت قل لا اسئلکم نازل ہوئی تو لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ کون لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کی عزت کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ علی۔ فاطمہ اور ان کے فرزند ہیں۔

اسی طرح حدیث شریف میں آیا ہے کہ :۔

اخرج الحاکم عن ابوھریرہ رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خیرکم خیرکم لاھلی من بعدی

یعنی حاکم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں بہترین وہ ہے جو میرے بعد میری اولاد

کہ شوہر کی طرف کے جو قرابت دار ہیں اس کا بھائی اور چچا یہ سب احماء کہلاتے ہیں اور عورت کی طرف کے جو اہل قرابت ہیں وہ اختان کہلاتے ہیں اور اصھار دونوں صفتوں کو جامع ہے اور ہمارے نزدیک ابن سکیت کی تحقیق بھی انتہائی جامع ہے اور قابل غور بھی (مترجم)

ساتھ اچھا رہے۔

و اخرج ابن سعد و منلا فی سیر تہ انہ صلی اللہ
علیہ وسلم استو صوا باھل بیتی خیرا فانی
اخاصمکم عنھم غدا" و من اکن خصمہ اللہ
دخلہ النار

یعنی ابن سعد اور منلا نے اپنی سیرت کی کتاب میں لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے اہل بیت کے ساتھ نیکی کا اہتمام کرو اور یہی تمہارے لئے سود مند ہو گا۔ اس لئے کہ میں قیامت کے روز ان کی خاطر غصہ ہوں گا ور جس پر میں غصہ ہوا حق تعالیٰ بھی اس پر غصہ ہو گا اور جس کسی پر خدا غصہ ہو ے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

و روی جماعتہ من اصحاب سنن عن عدۃ من
الصحابتہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال مثل
اھل بیتی فیکم کسفینتہ النوح من رکبھا
نجا و من تخلف عنھا ھلک و فی روایتہ غرق و
فی اخریٰ زج فے النار

یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح علیہ السلام کی طرح ہے جو اس میں سوار ہو گیا نجات پا گیا اور جس نے ان کی مخالفت کی ہلاک ہو گیا(اور ایک روایت میں .... غرق ہو گیا) اور آخری روایت میں ہے کہ دوزخ میں غوطے کھائے گا۔

نقل القرطبی عن ابن عباس رضی اللہ عنہ فی
قولہ تعالیٰ فلسوف یعطیک ربک فترضیٰ

فال رضا محمد ان لا یدخل احد من اھل بیتہ

النار

قرطبی نے اس ایت کہ "اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو خدا اتنا کچھ دے دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے" کی تفسیر کے سلسلے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ وسلم کو اس بات پر راضی کیا ہے کہ اس کے اہل بیت دوزخ میں نہیں جائیں گے۔

و فی الکشاف قال رسول اللہ علیہ وسلم من مات علیٰ حب آل محمد مات شھیدا" ۔ الا و من مات علیٰ حب محمد مات مغفور الہ۔ الا و من مات علیٰ حب آل محمد مات تائبا" الا و من مات علیٰ حب آل محمد مات مومنا" مستکمل الایمان۔ الا و من مات علیٰ حب آل محمد بشرہ ملک الموت

بالجنتہ ثم منکر و نکیر۔ الا و من مات علیٰ حب آل محمد یزف الی جنتہ کما تزف العروس الیٰ بیت زوجھا۔ الا و من مات علیٰ حب آل محمد فتح لہ قبرہ بابان الی الجنتہ ۔ الا و من مات علیٰ حب آل محمد جعل اللہ قبرہ مزار ملائکنہ الرحمنہ۔ الا و من مات علیٰ حب آل محمد مات علیٰ السننہ والجماعتہ

الا و من مات بعض آل محمد جاء یوم القیامتہ مکتوبابین عینیہ آیس من رحمتہ اللہ

الا و من مات علیٰ بغض آل محمد مات کافرا" ۔ الا و من مات علیٰ بغض آل محمد لم یشم راحت الجنتہ

یعنی تفسیر کشاف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث تحریر ہے کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبردار:۔

جو کوئی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں مرگیا وہ شہادت کی موت مرگیا اور

جو کوئی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں مرگیا تو بخشش پا کر فوت گیا اور

جو کوئی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں مرگیا تو وہ توبہ تائب ہو کر مرگیا اور

جو کوئی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں مرگیا تو وہ ایمان کامل سمیت مومن مر گیا اور

جو کوئی آل محمد صلی اللہ علی ہ وسلم کی محبت میں مرگیا تو اس کو ملک الموت اور منکر نکیر جنت کی بشارت دیتے ہیں اور

جو کوئی آل محمد صلی اللہ علی ہ وسلم کی محبت میں مرگیا تو اسے اس شان سے جنت لے جایا جائے گا جیسے دلہن دولہا...... کے گھر لے جائی جاتی ہے

جو کوئی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں مرگیا تو اس کی قبر میں جنت کی طرف دو دروازے کھول دیئے جائیں گے اور

جو کوئی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں مرگیا تو اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو فرشتوں کی زیارت گاہ بنا دے گا اور

جو کوئی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں مرگیا تو سنت والجماعت (کے عقیدے) پر فوت ہو گیا

اور

جو کوئی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کے بغض میں مرگیا تو قیامت کے روز اس کے ابرو پر تحریر ہو گا کہ یہ شخص خدا کی رحمت سے محروم ہے۔ اور جو کوئی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بغض میں مرگیا وہ کفر میں (کافر ہو کر) مرگیا اور جو کوئی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بغض میں مرگیا وہ

کبھی بھی جنت کی خوشبو محسوس نہ کرے گا۔

امام فخر رازی نے لکھا ہے کہ:۔

ان اهل بیته صلی الله علیه وسلم ساو وه فی خمسته اشیاء

فی الصلوٰة علیه و علیهم فی التشهد وفی السلام

و الطهارة و فی تحریم صدقته وفی المحبته

یعنی امام فخر رازی کا قول ہے کہ اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پانچ چیزوں میں برابر ہیں۔ درود شریف جو اہل بیت پر تشہد میں کہی جاتی ہے، سلام اور طہارت میں اور حرمت صدقہ میں اور محبت میں۔

حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ جو آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے لئے بہت زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وقت کے ملاؤں نے ان پر رافضی کا حکم صادر کر دیا۔ چنانچہ اسی حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے اشعار میں اس کی پوری پوری وضاحت بیان فرما دی ہے کہ اگر اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا "رفض" ہو تو میں سب سے بڑا "رافضی" ہوں ؎

اذافی مجلس تذکر علیا　　و سبطیه و فاطمته الزاکیه

یقال تجاوزو ایا قوم هذا　　فهذا من حدیث الرافضیه

برئت الیٰ مهیمن من اناس　　یرون الرفض حب الفاطمیه

حضرت اما شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک اور موقعہ پر فرمایا۔

قالوا　اتر　فضت　قلت　کلا

ماالرفض　دینی　ولا　اعتقادی

لکن　تولیت　غیر　شک

خیر امام و خیر هادی

ان کان حب الولی رفضا

فاننی ارفض العبادی

ترجمہ وہ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ تم رفض (شیعیت) کی باتیں کرتے ہو (مگر) میں کہتا ہوں کہ رفض نہ تو میرا دین ہے اور نہ عقیدہ۔ لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ بہترین امام بہترین ہادی علی (علیہ السلام) ہیں۔ اور اگر اس جیسے ولی کی محبت رفض ہو۔ تو میں دنیا کے تمام لوگوں میں سب سے

بڑا

رافضی ہوں ؎

اللہ اکبر! علی علیہ السلام اور اہل بیت علیہ السلام سے محبت کا یہ کونسا عالم تھا۔ یہی حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ ایک اور مقام پر ڈنکے کی چوٹ فرماتے ہیں ؎

ان کان رفضا حب آل محمد

فلیشهد الثقلان انی رافضی

یعنی اگر آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا رفض میں شمار ہوتا ہو تو ہر دو جہان گواہ رہیں کہ

میں رافضی ہوں۔

اب ذرا شیخ اکبر الشیخ محی الدین ابن العربی رضی اللہ عنہ کا قول بھی ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت شیخ اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

الذی اقول به ان زتوب اہل البیت انماھی ذنوب فی الصور؛

به ان ذنوب اهل البیت انما هی ذنوب فی الصورة لا فی

الحقیقتہ لان اللہ تعالیٰ غفر لھم ذنوبھم بسابق العنایتہ :۔ لقولہ تعالیٰ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اہل البیت و یطھرکم تطھیرا۔

"میں کہتا ہوں کہ یہ وہ لوگ ہیں (یعنی اہل بیت) جن کے گناہ کی صورت بظاہر تو ہوتی ہے مگر حقیقت میں نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے ان کے گناہ کو اپنے فضل سے معاف فرمایا ہے جس طرح کہ ارشاد خداوندی ہے کہ اے اہل بیت! اللہ کو یہ منظور ہے کہ تم سے الودگی (گناہ) کو دور رکھے اور تم کو ہر طرح (ظاہر و باطن) پاک و صاف رکھے"

صحابی رسول حضرت ابی ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "ایک روز ظہر کی نماز میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ادا کی۔ اسی اثنا میں ایک سائل آیا اور خیرات مانگی مگر کسی نے بھی کچھ نہیں دیا۔ چنانچہ سائل نے کہا کہ اے اللہ میں نے تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں سوال کیا مگر کسی نے بھی قبول نہ کیا۔ اس وقت حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ نماز پڑھنے میں مصروف تھے اور اسی نماز کی حالت میں اپنی انگلی سے انگشتری نکال کر سائل کی طرف لڑھکا دی۔ چنانچہ اسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ "اے اللہ! تیرے رسول موسیٰ علیہ السلام نے تجھ سے التجا کی تھی کہ میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر مقرر فرما دے" اور اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ نے فرمایا۔

وانی محمد نبیک و صفیک اللھم فاشرح لیٔ صدری و یسرلی امری۔ واجعل لیی وزیرا من اھلی علیا۔

اشدد به ظهری۔ قال ابو ذر رضی اللہ عنہ فما
استتم دعاہ حتی نزلہ جبریل علیہ السلام من
عند اللہ عزوجل و قال یا محمد اقرا انما ولیکم
اللہ ورسول والذین امنو الذین یقیمون الصلوۃ
و یوتون الزکوۃ وھم راکعون (۱) سورہ مائدہ ایت ۵۵
(نقلہ ابواسحاق احمد علی فی تفسیرہ)

یعنی اور میں (بھی) تیرا نبی اور صفی ہوں اے اللہ اور میرا! سینہ فراخ کر دے اور میرا کام (امر) آسان کر دے اور میرے کنبہ میں علی علیہ السلام کو میرا وزیر مقرر فرما دے تا کہ اس کی وجہ سے میری کمر مضبوط رہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ حضرت جرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہو کہ (ایت) تمہارے دوست تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور ایماندار لوگ ہیں جو کہ اس حالت سے نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکواۃ دیتے ہیں کہ ان میں خشوع ہوتا ہے (اس کو ابواسحاق احمد ثعلبی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے)

نوٹ۔ (اس ایت مبارک کا ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی مترجم قرآن مجید سے لیا گیا ہے مگر جب میں نے بابا رحمتہ اللہ علیہ کے پشتو ترجمہ کو پرکھا تو انتہائی مناسب اور عالی قدر جانا جو یہ ہے۔

رسول صلی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان
لائے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں
کتاب نورالابصار میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت
سے تحریر ہے کہ لیس ایہ من کتاب اللہ تعالیٰ

یاایھاالذین آمنو الا و علی اولھا و امیرھا و شریفھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قران مجید میں جہاں کہیں بھی یاایھاالذین امنو آیا ہے تو اس کے اولین مخاطب' امیر اور شریف علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ ہیں۔ یعنی تمام مومنوں سے افضل ہے۔

مزید برآن ابو اسحاق الثلعبی نے اپنی تفسیر میں آیت

سئل سائل بعذب واقع

کے نزول کے بارے میں سفیان بن عینیتہ کی ایک لمبی روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں:۔

ان سفیان بن عینیتہ سئل عن قولہ تعالیٰ سئل سائل بعذاب واقع فیمن نزلت فقال للسائل لقد سالتنی عن مسائلتہ لم یسالنی عنھا احد قبلک حدثنی ابی عن جعفر بن محمد عن آبائہ ان رسول اللہ لما کان بغدیر خم نادی الناس فاجتمعوا فاخذ بید علی و قال من کنت مولاہ فعلی مولاہ فشاع ذالک فطار فی البلاد و بلغ ذالک الحرث بن نعمان الفھری فاتی رسول اللہ ناقتہ لہ فاماخ راحلتہ و نزل عنھا وقال یا محمد امر تنا عن اللہ عزوجل ان

نشھد ان لاالہ اللہ و انک رسول اللہ فقبلنا منک و امر تنا ان نصلی خمسا فقبلنا منک و امر تنا بالزکوۃ فقبلنا و امر تنا ان تصوم رمضان فقبلنا و امر تنا بالحج فقبلنا ثم لم ترضیٰ بھذا حتی رفعت بضعی ابن عمک تفضلہ علینا فقلت من کنت مولاہ فعلی مولاہ فھذا شیئی منک ام من اللہ عز و جل فقال البنی صلی اللہ علیہ وسلم والذی لاالہ الا ھو ان ھذا من اللہ عزوجل فولی الحرث بن نعمان یرید راحلتہ و ھو یقول اللھم ان کان ما یقول محمد حقا فامطر علینا حجارۃ من السماء و آتینا بعذاب الیم فما وصل الیٰ راحلتہ حتی زماہ اللہ عزوجل بحجر سقط علی ھامتہ فخرج من دبرہ فقلتہ فانزل اللہ عزوجل سئل سائل بعذاب واقع للکافرین لیس لہ دافع من اللہ دش المعارج (سورہ معارج ایت نمبر ۱۔۳)

یعنی ابو اسحاق ثعلبی رحمتہ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "سفیان عینیتہ رحمتہ اللہ علیہ سے کسی شخص نے اس ایت شریف کی تفسیر کے بارے میں پوچھا۔ ایک درخواست کرنے والا (براہ انکار) اس عذاب کی درخواست کرتا ہے جو کافروں پر واقع ہونے والا ہے (اور) جس کا کوئی دفع کرنے والا نہیں (اور) جو اللہ کی طرف سے واقع ہو گا جو کہ سیڑھیوں (یعنی آسمانوں کا) مالک ہے" کہ یہ کس کی بابت

نازل ہوئی ہے۔ تو انہوں (سفیان بن عیینہ) نے سائل سے کہا کہ تم نے ایک ایسے مسئلے کے بارے میں پوچھا ہے جو تم سے پہلے کسی نے نہیں پوچھا (چنانچہ) مجھے اپنے والد اور انہوں نے جعفر بن محمد علیہ السلام اور اس نے اپنے والد سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ جس وقت حضور اقدس ﷺ غدیر خم میں تھے تو آپ ﷺ نے لوگوں کو بلایا جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ جس کسی کا میں مولا ہوں علی بھی ان کا مولا ہے۔ اور یہ بات مشہور ہو گئی اور سارے ملک میں پھیل گئی (حتی کہ) یہ بات حرث بن نعمان فہری تک بھی پہنچ گئی۔ سو وہ حضور اقدس ﷺ کے پاس آیا (اس حال میں کہ) وہ ایک اونٹنی پر سوار تھا۔ پھر وہ اپنی سواری سے اترا اور حضور اقدس ﷺ سے کہا کہ اے محمد ﷺ تم نے ہم کو حکم دیا کہ ہم شہادت دیں کہ خدائے واحد کے بغیر کوئی اور لائق پرستش نہیں اور یہ کہ تم اس کے رسول ہو۔ تو یہ ہم نے مان لیا۔ تم نے ہمیں حکم دیا کہ زکوۃ دیا کرو وہ بھی ہم نے قبول کیا۔ تم ہی نے یہ بھی حکم دیا کہ رمضان المبارک کے روزے رکھو ہم نے آپ کا یہ حکم بھی مان لیا۔ تم نے ہمیں حج کا حکم دیا وہ بھی ہم نے قبول کیا۔ بایں ہمہ تم ان سب باتوں پر قانع (راضی) نہ ہوئے (یہاں تک) کہ اب تم نے اپنے چچازاد بھائی کو ہم پر فضیلت دے کر کہا کہ جن کا میں مولا ہوں علی بھی ان کا مولا ہے۔ اس نے (حرث) نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ یہ تم اپنی طرف سے کہتے ہوں یا اللہ تعالیٰ عزوجل کی طرف سے کہہ رہے ہو۔ تو آنحضرت ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی دوسرا اللہ نہیں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بول رہا ہوں۔ چنانچہ حرث بن نعمان اپنی سواری کی طرف پلٹا اور کہا کہ اے اللہ محمد ﷺ نے یہ جو کچھ کہا اگر یہ حق ہو تو مجھ پر آسمان سے پتھر برسا دے یا مجھ پر ایک سخت عذاب نازل کر دے تو

ابھی وہ اپنی سواری تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ حق تعالیٰ نے اس کے سر پر ایک پتھر گرایا جو اس کے سر پر گر کر اس کی دبر سے نکل گیا بعد ازاں یہ ایت مبارک نازل ہوئی۔

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ......"

یہاں پر ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض معترضین جو دیدہ دانستہ جناب مولائے کائنات علی علیہ السلام کی فضیلت کو کم کرنا چاہتے ہیں وہ لفظ "مولا" کو ان معنوں میں نہیں لیتے جس مفہوم کے لئے حضور اقدس ﷺ نے غدیر خم میں استعمال فرمایا تھا۔ مطلب یہ کہ معترضین "مولا" کے معنے "دوست" یا "ہمدرد" کرتے ہیں۔ اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس اعتراض کا معقول جواب دیا جائے۔ چنانچہ ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ لفظ "مولا" کے متعدد معنے ہیں مگر ایسا ہے کہ موقع و محل کے لحاظ سے اس کے معنے بیان کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جس لفظ کے کئی کئی معنے ہوں تو ایک خاص مفہوم کو اجاگر کرنے کے لئے موقع اور قرائن کو دیکھنا ہو گا۔ مثال کے طور پر حضور اقدس ﷺ نے حضرت زید بن حارث رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ

انت مولانا واخونا

(تم ہمارے مولا اور بھائی ہو)

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ مولا "سردار" ...... کو بھی کہتے ہیں۔ لہذا یہ تو قطعی ناممکن ہے کہ زید بن حارث رضی اللہ عنہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "سردار" فرمایا ہو کیونکہ وہ تو آپ ﷺ کے غلام تھے۔ وہ حضور اقدس ﷺ کے "سردار" کیونکر ہو سکتے تھے۔ اس لئے یہاں پر لفظ "مولا" کے معنے سردار نہیں بلکہ "دوست" کہے جائیں گے۔ اس کے برعکس غدیر خم کے مقام پر حضور اقدس ﷺ کے استعمال کردہ لفظ "مولا" کے معنے سردار ہی ہوں گے۔ یعنی جن کا میں

سردار ہوں علی علیہ السلام بھی ان کا سردار ہے۔

اس کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ ایک دوسری روایت کے مطابق حضور اقدس ﷺ نے اس خصوصی اعلان کے لئے ممبلوں سے ایک بلند منبر بنانے کا اہتمام کیا تھا۔ اور بعد ازاں لوگوں کو جمع فرمایا تھا۔ تو اب غور کرنا چاہیے کہ اگر غیر معمولی بات نہ ہوتی اور بات صرف "دوست" یا "ہمدرد" کہنے یا کہلوانے تک محدود ہوتی۔ تو اتنی "معمولی" بات کے لئے اس قدر اہتمام اور ڈھنڈورہ فرمانے کی ضرورت کیا تھی۔ کیا حضور اقدس ﷺ نے قبل ازیں متعدد موقعوں پر لوگوں سے نہ فرمایا تھا کہ علی علیہ السلام کو دوست جانو تو سوال یہ ہے کہ ان مواقع پر آپ ﷺ نے کسی خاص اہتمام کا انتظام فرمایا تھا۔ دوسری بات یہ کہ حرث بن نعمان نے کسی شک وشبہ کے بغیر "مولا" کے معنے "سردار" ہی لئے تھے۔ اس لئے کہ اس نے صاف طور پر "تفضله علينا" کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے یعنی آپ ﷺ اس کو (علی علیہ السلام) ہم پر فضیلت دیتے ہیں۔

قطع نظر اس کے بعض دوسری روایتوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جناب مولائے کائنات کو مبارک دینا بھی خاص اہمیت کی بات ہے اس خاص موقعہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ فرمانا

نج نج لک یا علی (مبارک' مبارک ہو یا علی)

یہ مبارک باد بھی کسی "غیر معمولی" بات کے لئے ہی دی گئی تھی۔ یعنی اگر یہ ایک "معمولی" بات ہوتی تو حرث بن نعمان پر عذاب نازل کا ہونا بھی تو کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ اور اگر کوئی یہ کہدے کہ اس عذاب کا سبب حرث کا انکار تھا۔ تو ہم بھی کہیں گے کہ جناب مولائے کائنات علیہ السلام کے بارے میں حکم حق تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حرث بن نعمان پر عذاب نازل ہوا۔ اس لئے بھی کہ

ہر امر کو نہ ماننے کی اقتضا عذاب ہی ہوتا ہے۔ پھر اس عذاب سے تو بالکل صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حکم فرض تھا۔ ورنہ نزول عذاب کیا معنے رکھتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ (خدانخواستہ) اللہ کے فرض کردہ امور جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ ان کو نہ ماننے کی صورت میں عذاب نازل ہو گا بالکل ایسے جیسے حرث عذاب الٰہی میں گرفتار ہو گیا اور کفر کی حالت میں گذر گیا۔

سب سے آخری جواب یہ ہے کہ اس حدیث شریف کے لفظوں پر خوب غور کرنا چاہیے بالفرض ہم مان لیں کہ مولا سے مراد ہمدرد یا دوست ہے۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ حضور اقدس ﷺ فرماتے ہیں کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" یعنی جس کا میں دوست اور ہمدرد ہوں علی بھی ان کا دوست اور ہمدرد ہے۔ اب یہ دیکھنا ہو گا کہ مومن آنحضرت ﷺ کو کس قسم کا دوست تصور کرتے ہیں۔ کیا وہ آپ ﷺ کو اپنی جان اور اولاد سے زیادہ عزیز نہیں سمجھتے۔ خدانخواستہ اگر وہ آپ ﷺ کو اس سے کم کم جانیں تو ان کا ایمان مکمل نہ ہو گا جیسے کہ گذشتہ بحث میں ہم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں واضح کیا ہے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ مومنین آپ ﷺ کو ہر ایک سے زیادہ دوست اور عزیز جانیں۔ چنانچہ اب قابل غورت بات یہ ہے کہ یہاں حضور اقدس ﷺ کا فرمان ہے کہ جو مجھے اپنا مولا جانے گا۔ علی علیہ السلام کو بھی اپنا مولا جانے گا۔ اب اگر خدانخواستہ علی علیہ السلام کو کم مانا جائے تو اس طرح آنحضرت ﷺ کی حدیث کے معنے اور مفہوم پورا نہ ہو گا۔ مطلب یہ کہ اس حدیث مبارک کے یہ معنے کیونکر درست کئے جائیں گے کہ آنحضرت ﷺ کو تو دوست مانا جائے مگر علی علیہ السلام کو نہ مانا جائے چنانچہ پھر بھی لامحالہ اس حدیث کے معنے یہی ہوں گے کہ جو کوئی مجھے ہر چیز سے زیادہ دوست جانے اسی طرح علی علیہ السلام کو بھی ہر ایک سے زیادہ دوست

جانے گا۔

ایک اور حدیث بھی پیش کی جاتی ہے جس کی روایت حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ نے کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

واخرج الطبرانی والحاکم باسنا دحسن عن ابن
مسعود ؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
قال النظر الیٰ العلیٰ عبادۃ

یعنی طبرانی اور حاکم نے صحیح سند کیساتھ حضرت ابن مسعود ؓ سے روایت کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ "علی علیہم السلام" کو دیکھنا بھی عبادت ہے۔

اسی طرح

واخرج الطبرانی بسند حسن عن ام سلمتہ عن
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من احب
علیاً فقدا حبنی و من احبنی فقد احب اللہ
ومن ابغض علیا فقدا بعضنی و من ابغضنی
فقدابغض اللہ

"حاکم نے بسند صحیح ام المومنین حضرت سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ و سلم نے فرمایا ہے کہ جس نے علی علیہ السلام سے محبت کی اس نے گویا مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی اس نے اللہ تعالیٰ سے محبت کی۔ اور جس نے علی سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا اور جس نے مجھ سے بغض رکھا اس نے اللہ سے

بغض رکھا"

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دونوں کی محبت موجب ایمان ہے اور ان سے بغض رکھنا موجب کفر ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث مبارک میں ارشاد ہوتا ہے:۔

واخرج الطبرانی فی الاوسط عن ام سلمہ قالت
سمعت رسول ﷺ۔ یقول علی مع القرآن
والقرآن مع علی لا یفترقان حتی یردا علی
الحوض

"حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضور اقدس ﷺ کو فرماتے سنا ہے آپ فرما رہے تھے۔ کہ علی علیہ السلام قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علی علیہ السلام کے ساتھ۔ یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوض کوثر تک پہنچ جائیں گے۔"

حضرت ابن عباس ؓ سے بھی روایت ہے:۔

و اخراج الدیلمی عن ابن عباس ؓ ل
النبی ﷺ قال علی منی بمنزلت راسی من
بدنی

"یعنی دیلمی نے حضرت ابن عباس ﷺ سے روایت کی ہے کہ حضور نے فرمایا کہ " میرے نزدیک علی علیہ السلام کی حیثیت ایسی ہے جیسے میرے بدن میں میرا سر ہے" گویا سب سے افضل ہے بالکل اسی طرح جس طرح سارے بدن میں سر افضل ہوتا ہے اسی طرح حضرت ابی السعید خدری کی روایت میں ارشاد ہوا ہے۔

ومن کتاب الال لا بن الخاویہ عن ابی السعید

الخدری رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی علیہ وسلم لعلی حبک ایمان و بغضک نفاق و اول من یدخل الجنتہ محبک و اول من یدخل النار مبغضک

"یعنی حضرت ابو سعید خدری ﷛ روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ تیری محبت ایمان ہے اور تیرے ساتھ بغض باعث نفاق ہے۔ اور جو شخص تجھ سے محبت رکھے گا سب سے پہلے جنت میں داخل ہو گا۔ اور جو تجھ سے بغض رکھے گا وہ سب سے پہلے دوزخ میں داخل ہو گا"

ابن عساکر رحمتہ اللہ علیہ عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بھی نقل کی ہے۔

و اخرج ابن عساکر نے ابن عباس رضی اللہ عنہ قال مانزل فی احد من کتاب اللہ تعالیٰ مانزل فی علی۔ و اخرج منہ ایضا" قال نزلت فی علی ثلثہ مائہ آیتہ و فضائلہ کثیرۃ مشھورۃ و حسبک نہ اخوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالمواخات و صھرہ علی فاطمتہ و احد العلماء الربنیین

ابن عساکر رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ علی علیہ السلام کے حق میں جس قدر آیتیں قرآن شریف میں نازل ہوئی ہیں کسی اور کے حق میں نہیں ہوئیں۔ اور ایضا" انہی سے روایت ہے کہ

علی علیہ السلام کی شان میں تین سو آیتیں نازل ہوئی ہیں اور ان کی فضائل بہت زیادہ ہیں اور مشہور ہیں۔ اور مواخات میں وہ جناب رسول ﷺ کے بھائی تھے اور آپ ﷺ کے داماد تھے اور علمائے ربانی میں ایک بہت بڑے عالم تھے۔

☆☆☆☆☆

شہادت امام حسین علیہ السلام اور اس کا حکم

حضرت امام حسین علیہ السلام کے قاتل یزید بن معاویہ کے متعلق اسلامی فرقوں نے انواع و اقسام کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس فعل سے وہ کافر نہیں ہوا۔ بعض کا کہنا ہے کہ وہ بے حد گنہگار ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ وہ قطعی کافر ہے۔ اور یہ خیالات ان لوگوں کے ہیں جو یزید کے ساتھ کوئی ذاتی بغض نہیں رکھتے۔ بلکہ انہوں نے یہ احکام مطلق شریعت کے ناموس اور تحفظ کے لئے صادر کئے ہیں۔ البتہ بعض ایسے حضرات بھی موجود ہیں جو یزید پلید کے اس فعل کو عین شریعت اسلام کے مطابق بلکہ موجب ثواب مانتے ہیں حد یہ ہے کہ ہمارے پختونوا میں پشتو کے ایک منظوم کتاب المسمی رشید البیان بڑی شہرت رکھتی ہے اس کے مصنف نے ایک جگہ کہا ہے:۔

ترجمہ۔ رفض سے دور رہنے کے لئے یزید پر ہرگز لعنت نہ کر بے شک وہ مسلمان تھا مصلی تھا اور اہل ایمان تھا۔

یہ ایک ایسے ملا کا خیال ہے جو اہل سنت و الجماعت کا دعویٰ کرتا ہے اور تو اور ہمارے قبائلی علاقوں میں ملا لوگ اپنے نوازئیدہ بچوں کے لئے یزید کا نام رکھنا پسند کرتے ہیں۔ تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ اس معاملہ کو شریعت کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا جائے۔ چنانچہ سوال یہ ہے کہ شریعت اسلامی ایک عام مومن کے قتل کے بارے میں کیا کہتی ہے اور کیا حکم دیتی ہے۔ ہم نے محترم ملک سیدا خان شنواری کی مترجمہ کتاب "مسئلہ خلافت" سے چند اقتباسات نقل کئے ہیں ملاحظہ ہوں۔

قال اللہ تعالٰی و من یقتل مومنا متعمدا فجزاؤہ جھنم خالدا فیھا و غضب اللہ علیہ و لعنہ و اعد لہ عذابا عظیما سورہ النساء ایت ۹۳۔

ترجمہ۔ اور جو شخص کسی مسلمان یا مومن کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ کہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہے گا اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔

یہاں پر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس ایت شریف میں کسی مومن کے قاتل کے لئے جو جو سزائیں مقرر ہیں ان کے احکام کی نوعیت کیا ہے۔ ظاہراً اس ایت شریف میں قاتل کے لئے تین باتوں کا ذکر ہے اول غضب الٰہی اور دوئم خلود فے النار (اور لعنت)۔ مگر یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن حکیم میں مسلمانوں کے لئے کہیں بھی ایسا حکم نازل نہیں ہوا ہے۔ اس کے برعکس قرآن حکیم میں جہاں ان تینوں چیزوں کا حکم صادر ہوا ہے وہ صرف کفار کے لئے ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ ناممکن ہے (خصوصاً) جس وقت حضور اقدس ﷺ آخری حج کے موقعہ پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ تو فرمایا۔

لا ترجعوا (وفی روایہ لا ترجعون) بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض

یعنی اے مسلمانو! میرے بعد کافر مت ہونا کہ ایک دوسرے کے گردن مارتے رہو۔ یہ حدیث مبارک بخاری شریف میں موجود ہے۔ حضور اقدس ﷺ کا اپنے آخری خطبہ میں مومن کے قتل سے منع کرنا اور قاتل کو کافر کہنا معمولی نہیں بلکہ غیر معمولی بات ہے (اگر چہ بعض لوگ یہاں لفظ کافر کی تاویل پیش کرتے ہیں۔ تاہم اس کا جواب بھی اپنے موقعہ پر ہم دیں گے) علاوہ ازیں بخاری شریف میں یہ حدیث

مبارک بھی موجود ہے کہ سب المومن فسق وقتالہ کفر یعنی مومن کو برا بھلا کہنا (گالی دینا) فسق ہے اور اس کے ساتھ جنگ کرنا (قتل کرنا) کفر ہے۔ اس حدیث شریف کے پہلے حصے پر غور کیجئے فرمایا ہے کہ "سب المومن فسق" یعنی مومن کو گالی دینا فسق ہے تو جب مومن کو برا بھلا کہنا فسق ہو تو اس کو قتل کرنا تو لامحالہ فسق یا فجور کے زمرے میں شمار نہ ہو گا بلکہ اس کے حکم میں پوری شدت ہو گی چنانچہ فسق سے آگے کفر رہ جاتا ہے چنانچہ مذکورہ بالا حدیث مبارک کے آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کفر ہے "وقتالہ کفر" اس سے آگے ہمیں یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ ایمان اور اسلام کی ستر (۷۰) بلکہ اس سے زیادہ شاخیں ہیں۔ اور اس کی ہر ایک شاخ ایمان اور اسلام ہے۔ الایمان بضع و سبعون شعبتہ اعلھا لا الہ الا اللہ و ادناھا اماطتہ الاذی عن الطریق (رواہ مسلم)

اسی طرح کفر کے بھی کئی شعبے (شاخیں) ہیں اور ان میں بھی چھوٹے بڑے درجے موجود ہیں اسی طرح کفر اور اسلام اعتقادی بھی ہے اور عملی بھی اگر چہ سزا ایک ہے۔ یعنی اعتقاد اور معنوں میں بھی ہے اور عمل میں بھی۔ ظاہری بھی اور فکر میں بھی خدا اور رسول ﷺ پر ایمان لانا اسلام ہے۔ نماز بھی اسلام ہے۔ اسی طرح کفر و نفاق کی بھی دو قسمیں ہیں ایک اعتقادی اور دوسری عملی۔ ایک کفر و نفاق اعتقادی ہے اور دوسرا عملی۔ مثلاً" شرک کفر اعتقادی ہے اور نماز اگر قصداً" قضا کی جائے یہ کفر عملی ہو گا پس یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ :۔

(۱) سب المومن فسق وقتالہ کفر

(۲) فجزاءہ جھنم خالداً فیھا

(۳) لا ترجعوا بعدی کفارا

تو ان اور اسلام کے عام حکموں میں جو کفر اور اسلام کے متعلق ہیں کوئی جھگڑا

ہیں اور نہ ہی ان میں کسی تاویل کی ضرورت ہے آنحضرت ﷺ نے جس چیز کو کفر کہا ہے وہ کفر کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جب تک یہ دنیا قائم رہے گی تو وہ کفر ہے اور رہے گا۔ اگر چہ یہ جدا بات ہے کہ یہ عملی کفر ہے یعنی اگر ایک مومن کسی دوسرے مومن کا قتل کرنا مباح جان لے اور اسے قتل کر دے تو وہ اعتقادی اور عملی دونوں طرح سے کفر کا مرتکب ہو گا۔ لیکن اگر وہ اس قتل پر پشیمان ہو جائے اور اسے حلال نہ جانے تو وہ عملی کفر ہے اعتقادی کفر نہیں۔ چنانچہ یزید پلید تو دونوں لحاظوں سے کافر ہے۔ اس کا یہ حکم کہ "اگر امام حسین علیہ السلام میری بیعت قبول نہ کرے تو انہیں گرفتار کر کے قتل کیا جائے" اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے اور اسے ثابت بھی کرتا ہے کہ وہ قتل حسین علیہ السلام کو مباح اور حلال سمجھتا تھا چنانچہ اس قاتل کے لئے جو ایک مسلمان دوسرے کو قتل کر دے غضب اور لعنت کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہودی بھی جو ملعون اور مغضوب ٹھہرائے گئے تو ہمیشہ کے لئے حکومت سے محروم ہو گئے۔

سورہ احزاب میں منافقوں پر لعنت کی گئی ہے:۔

ان الذین یوذون اللہ و رسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرہ سورہ الاحزاب ایت نمبر ۵۷

یعنی جو لوگ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو ایذا دیتے ہیں ان پر دنیا و آخرت میں اللہ عزوجل کی لعنت ہے" اور ہم نے اہل بیت علیہم السلام کی مناقب مین یہ بات ثابت کی ہے کہ اہل بیت علیہم السلام سے محبت فی الحقیقت رسول اللہ ﷺ سے محبت ہے اور رسول اللہ ﷺ سے محبت اللہ کے ساتھ محبت ہے۔ اسی طرح اہل بیت علیہم السلام کو تکلیف پہنچانا رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچانا ہے اور آنحضرت ﷺ کو تکلیف پہنچانا خداوند تعالیٰ کو تکلیف پہنچانا ہے۔ اور منافقین

بھی تو آنحضرت ﷺ کو تکلیف پہنچاتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو کوئی بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔ مگر آیت شریف میں حق تعالیٰ نے یوذون اللہ و رسولہ فرمایا ہے۔ اور اس طرح آنحضرت کی تکلیف کو خود اپنی تکلیف کہہ کر فرمایا ہے۔ تو کیا یہ انتہائی غور و فکر کا مقام نہیں کہ امام مظلوم کے قتل، آپ کے جوانوں، بیٹوں، بھتیجوں کی تکلیف، قتل اور تقدس ماب بیبیوں کو بے پردہ کرنے پر حضور اقدس ﷺ کو تکلیف پہنچی ہوگی کہ نہیں ...... پھر امام مظلوم علیہ السلام کے معصوم بچے حضرت علی اصغر علیہ السلام۔ جو ابھی دودھ پیتا بچہ تھے اور حرملہ بے دین و ملعون نے تیر مار کر شہید کر دیا۔ اور وہ بھی اس حال میں کہ امام مظلوم علیہ السلام نے اس سے پانی مانگا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ "گنہگار تو تم مجھے کہتے ہیں۔ یہ معصوم تو کسی صورت میں گنہگار نہیں ہو سکتا۔ اسے ایک گھونٹ پانی تو دے دو" مگر پانی تو رہا ایک طرف اس شقی اور ملعون نے تیر مار کر معصوم علی اصغر علیہ السلام کو شہید کر دیا۔

امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ نے مختلف طریقوں سے روایت کی ہے کہ :-

من حمل علینا السلاح فلیس منا

یعنی جس مسلمان نے کسی مسلمان ہی مقابلے میں تلوار (اسلحہ) اٹھایا اس کے ساتھ جنگ کی وہ ہم میں سے (مسلمانوں میں سے) نہیں ہے۔ یہ حدیث شریف بڑی ضروری اور اہمیت کے قابل ہے کیونکہ یہ شریعت کے قواعد اور کلیات میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے کتاب الفتن میں ایک خاص باب کے عنوان کے لئے یہی حدیث مبارک مقرر کیا ہے۔ امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ نے کتاب الایمان میں درج کی ہے۔ تاکہ کفر و ایمان کو پرکھنے اور معلوم کرنے کے لئے اسی حدیث سے مدد لی جا سکے اور حافظ لواری نے بھی ایک جداگانہ باب میں اسی حدیث کو

عنوان بنایا ہے یعنی لیس منا کے معنے ہیں ہم میں سے نہیں۔ یعنی ”مسلمان نہیں“ اب اگر حضور اقدس ﷺ کے خطاب پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ الفاظ ”لیس منا“ غصے کا ہی ایک جملہ ہے اور آپ صلی ﷺ ان کو ایسے موقع پر استعمال فرمایا کرتے تھے جو صریحاً ”کفر کے بہت نزدیک ہوتا تھا۔ اور عملی کفر ہے۔ اور اس کی تاویل ”لیس علی هدینا“ سے کرنا بالکل غلط اور غیر ضروری ہے۔ تو یا تو اس کی ظاہری منطوق کو چھوڑ کر کوئی اور معنے کئے جائیں یا نفی ے کمال بنا دیا جائے۔ مطلب یہ کہ صاحب شریعت ﷺ نے جن امور کے متعلق جو احکام صادر فرمائے ہیں اور ان احکام کو جن الفاظ میں بیان فرمایا ہے تو ہمارے لئے مناسب نہیں کہ تاویل و توجیہہ کے ساتھ ان کا اصلی زور اور لغوی معنے اور مطلب کو گھٹا کر اس کے تاثیر کو کم کرنے کی کوشش کریں اور جن لوگوں نے ایسا کیا ہے انہوں نے مسلمانوں کو ایمان اور اسلام کی اصل زندگی سے محروم رکھنے کی سعی کی ہے۔ بعض لوگ اعتراض کریں گے کہ ”لیس منا“ کے الفاظ بعض احادیث میں اور طرح سے آئے ہیں مثال کے طور پر:۔

النکاح من سنتی فمن رغب عنها فلیس منی

اس جملہ میں بڑا فرق ہے اس لئے کہ ”لیس منا“ میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد ساری امت ہے جبکہ ”لیس منی“ صیغہ واحد ہے اور مراد ترک سنت ہے۔ پس جن احادیث میں ”لیس منی“ کی وعید آئی ہے وہ کفر پر دلالت نہیں کرتیں مگر جہاں کہیں ”لیس منا“ استعمال فرمایا گیا ہے وہ کفر پر دلالت کرتا ہے۔

اسی حدیث مبارک کے بارے میں امام نواری اور حافظ عسقلانی لکھتے ہیں:۔

وکان سفیان بن عینیته یکره قول من یسفره بلیس منا

بلیس علی ھدینا و یقول بئس ھذا القول یعنے بل یمسک عن تاویله (شرح مسلم مطبوعہ احمدی و فتح الباری)

یعنی حضرت سفیان بن عینیته یہ بات مکروہ جانتے تھے کہ "لیس منا" کی تفسیر ایسی کی جائے کہ لیس علی ھدینا وہ اس قسم کی تفسیر کو برا سمجھتے تھے اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ نصوص کی تاویل ہرگز نہ کرنا چاہیے۔

تاہم یزید کی کفر پر کنز العمال کی وہ روایت بھی کافی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے خواب دیکھا "کہ بنی امیہ بندروں کی طرح اچھلتے کودتے ہیں" جب آپ ﷺ بیدار ہوئے تو از روئے بشریت غمگین تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے آپ کی دلجوئی کے لئے یہ آیتیں نازل فرمائیں انا انزلنه فی لیلته القدر .... اور حضور اقدس ﷺ کو بشارت دی گئی کہ ہم نے آپ کو ایک ایسی رات عطا فرمائی ہے جو ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے (لیلته القدر خیر من الف شھر) اور بنی امیہ کی دور حکومت بھی ایک ہزار مہینے تھی۔ اس پر بھی حضور اقدس ﷺ کی دل خفگی دور نہ ہوئی تو کوثر عطا فرمانے کی بھی بشارت دے گئی۔ انا اعطینک الکوثر اور یہ کہ ان شانک ھو الابتر یعنی بے شک ہم نے آپ ﷺ کو کوثر (ایک حوض کا نام ہے اور ہر خیر کثیر بھی اس میں داخل ہے) عطا فرمائی ہے .... اور بالیقین آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہے" ابتر عربی میں قاطع النسل کو کہتے ہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہو گی کہ یزید قاطع النسل تھا۔ اور جب قاطع النسل تھا تو دشمن رسول ﷺ تھا اور دشمن رسول ﷺ متفقہ طور پر کافر ہے۔ عقل بھی اس بات کی متقاضی ہے کہ نانا کی محبت کا دعوی کرنے والے جب اس کے نواسوں کو قتل کر دے تو ان کی ایسی محبت منافقت پر

مبنی ہو گی اصلی کبھی نہ ہو گی۔ اگر ایسے لوگوں کو یقین ہوتا کہ حضور اقدس ﷺ برحق نبی ہیں یا آپ صلی ﷺ سے ان کی محبت ہوتی تو کبھی حضرت امام حسین علیہ السلام کو قتل نہ کرتے۔

اب ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ ایسے لوگوں کی توبہ قبول ہو گی یا نہ ہو گی۔ تو اس سلسلے میں اصحاب کرام ﷺ اور سلف صالحین رحمتہ اللہ علیہم کا اختلاف ہے ان میں سے ایک جماعت کی یہ رائے ہے۔ کہ حق تعالیٰ نے سورہ فرقان میں ارشاد فرمایا ہے۔

والذین لا یدعون من اللہ الھا" آخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق...... الفرقان ایت نمبر ۶۸

اور جو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کی پرستش نہیں کرتے اور جس شخص (کے قتل کرنے) کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اس کو قتل نہیں کرتے ہاں مگر حق پر......... اور اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ الا من تاب و امن و عمل عملا صالحا" فاء لئک یبدل اللہ سیاتھم حسنات " الفرقان ایت نمبر۷۰۔ (مگر جو شرک و معاصی سے توبہ کرلے اور ایمان (بھی) لے آئے اور نیک کام کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گذشتہ گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا) چنانچہ معلوم ہوا کہ دوسرے تمام گناہوں کے ساتھ قاتل کی توبہ بھی قبول ہو سکتی ہے۔ لیکن بخاری، مسلم اور دیگر کتابوں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت بھی موجود ہے کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو قتل کر دے تو اس کی توبہ قبول نہ ہو گی۔ یعنی وہی حکم کہ فجزاءہ جھنم خالدا" فیھا کے یہی معنے کرتے ہیں کہ لا توبہ لہ یعنی اس کے لئے توبے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس

رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے الا من تاب کی نسبت پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ھذہ مکیه نسختها آیته مدینته التی فی النساء یعنی یہ ایت سورہ نساء کی ایت من یقتل مومن کے ساتھ منسوخ ہو گئی ہے۔ چنانچہ یہ ایت (الا من تاب) توبے کی قبولیت پر دلیل نہیں ہو سکتی۔ مسلم کی روایت زیادہ مفصل ہے بما نزلت التی فی القر آن قال مشر کو مکه قد قتلنا النفس و دعونا مع اللّٰہ الھا آخر۔ و اتینا الفواحش فنزلت الا من تاب و امن۔ قال فھذہ لاولئک و اماالتی فی النساء فھو الذی قدعوف الاسلام ثم قتل مومنا متعمدا" فجزاء ہ جھنم لاتوبه له یعنی جب سورہ فرقان کی یہ ایت نازل ہوئی والذین لا یدعون مع اللّٰہ الھا" اخر ولا یقتلون النفس تو مشرکین مکہ نے کہا کہ ہم نے تو یہ سب برے کام کئے ہیں اب اگر ہم اسلام لے بھی آئیں تو اس کا کیا فائدہ ہو گا۔ اور نیز ہم عذاب سے کیسے بچ سکیں گے۔ تو اسی لحاظ سے یہ آیت نازل ہوئی کہ من تاب و امن یعنی بے شک جو توبہ کر لے اور ایمان لے آئے اور نیک اعمال کئے تو اللہ تعالیٰ ان کے برے افعال کی سزا معاف فرما دیں گے۔ لیکن خیال رہے کہ ایت و من یقتل مومنا" مشرکین کے بارے میں نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے یعنی جو شخص اسلام قبول کر لینے کے بعد کسی دوسرے مسلمان کو قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے اور اس کی توبہ قبول نہ ہو گی۔ امام احمد اور طبرانی نے سالم بن ابی لجعد کے طریق اپر اور یحیی الجابر' نسائی اور ابن ماجہ نے عماز دہنی کے طریق پر روایت کی ہے کہ ایک شخص نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ

لقد نزلت فی آخر مانزل وما نسخھا شئی حتی قبض رسول

اللہ

اس پر سوال کرنے والے شخص نے کہا کہ افرایت ان تاب و امن و عملا" صالحا" ثم اهتدی تو فرمایا کہ کہ وانی له التوبه والهدٰی یہ لفظ یحییٰ الجابر کا ہے۔ ابن ماجہ اور نسائی نے قریب قریب ایسا ہی کہا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سورہ فرقان کی یہ آیت منسوخ سمجھتے ہیں اور اسی ضمن میں آخری نازل شدہ آیت سورہ نساء کی ایت یعنی "فجزاءه جهنم خالدا" ہے چنانچہ اسی لئے وہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک مقتول مسلمان کا قاتل بھی مسلمان ہو تو اس کے لئے توبہ کی کوئی رعایت نہیں۔

بلاشبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب اس بارے میں کئی قسم کی دلائل سے قوی ہے اول یہ کہ سورہ نساء کے منطوق کو نہ ماننے کے لئے ظاہر اور نص ہے " خالدا" فیها و غضب الله علیه و لعنه" اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اصول کے مطابق جب تک اس کے برخلاف کوئی قوی سبب موجود نہ ہو تو منطوق مفہوم پر مقدم ہو گی۔

دوسری بات یہ کہ سورہ فرقان کی ایت نے اسے منسوخ کر دیا تو یہ یہ بھی درست نہیں اس لئے کہ سورہ فرقان کی ایت مکمہ معظمہ میں نازل ہوئی تھی اور سورہ نساء کی ایت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی تھی اور بزعم خود اولین مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہادت دیتے ہیں کہ نزلت فی آخر مانزل و نسخها شئی اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ جو ایت منسوخ ہو تو اس سے پہلے ایک ایت ضرور نازل ہوئی ہو گی۔ جس کی وجہ سے وہ منسوخ ہو گئی ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ ان دونوں ایتوں میں حکم مشترکہ نہیں کہ کسی وجہ سے

متاخرین کا مصطلحہ نسخہ مان لیا جائے (اس لئے) کہ جن مواقع پر دونوں آیتیں نازل ہوئی ہیں تو وہ جدا جدا ہیں۔ اور اگر نسخ ہو سکتی ہو تو یہ سلف کی اصطلاح میں ہو گی۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے۔ یعنی عام اور خاص کا نسخ ہونا! سورہ فرقان میں خود کفار کا ذکر ہے اور جو حکم دیا گیا ہے وہ بھی کفار سے متعلق ہے اور عقائد نسفی میں بھی ان پر لعنت کی گئی ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا دی ہے۔ اور آیت "ان الذین یوذون اللہ ورسولہ" کے ساتھ یہ حدیث مبارک عین موافق ہے اور وہ یہ ہے کہ و عن زید بن ابی زیاد قال خرج رسول اللہ من بیت عائشہ فمر علیٰ بیت فاطمتہ فسمع حسینا" یبکی فقال الم تعلمی ان بکاءہ یوءذنی ھکنا فی نور الا بصار "یعنی حضرت زید بن ابی زیاد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک روز حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر سے باہر نکلے اور حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے گھر کی طرف گئے (اسی اثناء میں) آپ نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے رونے کی آواز سنی تو فرمایا کہ آیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس کے رونے سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے" اب غور کرنا چاہیے کہ حضرت امام مظلوم کی قتل حضور اقدس کو کتنی تکلیف پہنچاتی ہو گی۔

☆☆☆☆☆☆
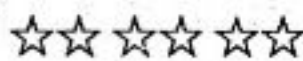
اصحابؓ

رسول ﷺ

جس طرح آنحضرت ﷺ کی اولاد دوسرے انبیاء علیہم السلام کی اولاد کی بہ نسبت بہتر ہے اسی طرح حضور اقدس ﷺ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم دوسرے انبیاء علیہم السلام کے اصحاب سے بہتر ہیں۔ آپ ﷺ کی امت بھی دیگر انبیاء کی امتوں سے بہتر ہے ایت کنتم خیر امتہ اسی امت کی بڑی شان رکھنے کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ (یعنی تم بہترین امت ہو) اور جس طرح آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کی امت بھی اس کی محبوب ہے۔ فاتبعونی یحببکم اللہ اور یحبھم و یحبونہ سے ظاہر ہے۔ یعنی میرے دوست سے محبت اور اس کی پیروی اختیار کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم اس محبت میں جان و تن کی پروا نہیں کرتے تھے۔ میرے مرشد (قدس سرہ) فرماتے ہیں کہ گذشتہ انبیاء کی امتوں میں سے کسی امت نے ایسی قربانیاں نہیں دی ہیں جس طرح کہ حضور اقدس ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے دی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے تو ان کو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ "جاؤ تم اور اللہ کافروں سے لڑو ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔ فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون۔ المائدہ ایت نمبر ۲۴

اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ کہ خیر القرون قرنی یعنی زمانوں میں بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے۔ اور قرآن مجید میں بھی اصحاب رضی اللہ عنہم، رسول ﷺ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اصحاب رسول ﷺ میں اہل بیت علیہم

السلام کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں ان کے بعد طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عوام، ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سعد ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبد الرحمان بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ اجمعین افضل ہیں۔ یہ سب عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا میں ان کو جنت کی بشارت دی ہے۔

اس کے بعد اصحاب بدر (رضی اللہ عنہم) ہیں۔ ان کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :- ان اللہ اطلع علی اہل البدر فقال اعلموا ماشئتم قد غفرت لکم

ظاہر ہے اصحاب بدر رضی اللہ عنہم کو بھی اللہ تعالیٰ نے جیتے جی بخش دیا ہے۔

اصحاب بدر رضی اللہ عنہم کے بعد اصحاب احد رضی اللہ عنہم ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق ہمارا عقیدہ ہے کہ اس زمانے کا کوئی ولی اللہ ان کے درجے تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ الا اہل بیت اور وہ اس لئے کہ بعض احادیث ایسی بھی ہیں جن میں غائبین امت کی فضیلت ثابت ہے مثال کے طور پر یہ حدیث مبارک :-

طوبیٰ لمن رانی و امن بی و طوبیٰ سبع مرات لمن لم یرانی و امن بی۔(یعنی خوش خبری ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے مجھے دیکھا اور ایمان لے آئے اور سات بار خوش خبری ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے مجھے نہیں دیکھا اور مجھ پر ایمان لائے) ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضرت سلمان فارسی، ابوذر غفاری، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہم ایک خاص قسم کی فضیلت رکھنے والے اصحاب کرام ہیں۔ اس لئے ان کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے

لیے اہل بیت سے یاد فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی وجہ سے ان کو دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی بہ نسبت ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ اگر چہ بحیثیت کلی یہ سب دیگر اصحاب کرام رضی اللہ عنہم سے افضل نہ تھے اور خلفائے راشدین تو سب سے افضل تھے۔ کیونکہ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ:۔

انتم بسنتی و سنت خلفائے راشدین

یعنی تم میرے خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرو۔

☆☆ ☆☆ ☆☆

فصل ۴

اولیاء اللہ اور فقرائے کاملین

(قدس اسرارھم)

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ اور اہل بیت علیہم السلام کے بعد اصحاب ﷺ اور ان کے بعد فقرائے کاملین سب سے بہتر ہیں۔ جن کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:۔

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

یعنی اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو خوف اور غمگین ہونے سے مبرا ہیں یہی لوگ اس ایت الہی کی بھی مصداق ہیں:۔

اطیعو اللہ واطیعو الرسول و اولی الامنکم

یعنی اللہ تعالیٰ' رسول ﷺ اور صاحبان امر کا حکم مانو۔ مگر صاحبان امر کی دو قسمیں ہیں۔ یعنی ایک کامل اور دوسری ناقص۔ ان میں سے کامل اولی الامر وہ لوگ ہیں جن کو اولیاء اللہ اور فقرائے کاملین کہا جاتا ہے۔ اور فقرا کے تمام سلسلے جناب مولائے کائنات علی علیہ السلام سے وابستہ ہیں آپ ہی سے ان سلاسل کی ابتداء ہوئی ہے اور جناب رسالت ماب ﷺ کے حکم سے جناب مولائے کائنات علیہ السلام نے یہ فیض دنیا تک پہنچایا ہے۔ جو قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے جن لوگوں کو خلافت سے نوازا تھا وہ یہ

یعنی حضرت امام حسن ، حضرت امام حسین علیہم السلام۔ حضرت خواجہ حسن بصری،
حضرت خواجہ کمیل، قاضی شریح، اویس قرنی اور میراں قلندر، قدس اسرارہم، حضرت
خواجہ حسن بصری قدس سرہ نے دو بزرگوں یعنی حضرت حبیب عجمی اور حضرت عبد
الواحد بن زید قدس اسرارہم کو خلافت دی تھی۔ حضرت حبیب عجمی قدس سرہ سے نو
سلسلے جاری ہوئے جن کے نام یہ ہیں۔

حبیبیہ ، طیفوریہ، کرخیہ، گاذرونیہ، سہروردیہ،
طونیہ، فردوسیہ، اور جنیدیہ حضرت عبد الواحد بن زید قدس سرہ
سے پانچ سلسلے جاری ہوئے جن کے نام یہ ہیں:۔

زیدیہ، عیاضیہ، ہبیریہ، ادھمیہ اور چشتیہ

ان تمام کو چودہ خوانودے کہا جاتا ہے۔ قدیم کتابوں میں ان خانوادوں کے
درمیان کسی قدر اختلاف کا ذکر ہے مگر فی الحقیقت یہ سب متحد اور ایک ہیں۔ مثال
کے طور پر قادریہ سلسلہ در اصل جنیدیہ کی شاخ ہے اور چشتیہ ادھمیہ کی اور یہ سب
حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام تک پہنچتے ہیں اور بارہ اماموں سے بھی ملے ہوئے
ہیں۔ جن کو امامان نبوت کہا جاتا ہے۔ یہ تمام سلاسل برحق ہیں ان کے درمیان اگر کوئی
معمولی اختلاف موجود بھی ہو تو وہ بالکل ایسا ہے جیسے رائج چاروں مذاہب میں ہے۔

اور یہ اختلاف باعث رحمت ہے۔

حضرت خواجہ حسن بصری قدس سرہ نے بلاواسطہ خرقہ خلافت حاصل کیا تھا۔
اگرچہ مولوی ولی اللہ محدث رحمتہ اللہ علیہ نے مبالغے سے کام لے کر اس حقیقت
سے انکار کیا ہے۔ مگر مولانا مولوی فخر الدین قدس سرہ نے اپنے ایک معرکۃ الآرا رسالہ
"فخر الحسن" میں اس کا جواب دیا ہے۔ ویسے اس حقیقت کی کون تردید کر سکتا ہے کہ

ہزار ہا ہزار فقرائے کاملین انہی چودہ خانوادوں میں سے ہو کر گذرے ہیں جن کے اعلیٰ مراتب شک و شبہ سے باہر ہیں اور وہ سب باطنی اور ظاہری علوم کے ماہر تھے اور سب کا سلسلہ بیعت حضرت خواجہ حسن بصری قدس سرہ سے ملا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت حبیب عجمی اور حضرت زید قدس اسرارھم کو اجازت تھی۔ (خدانخواستہ) اگر ان حقائق سے آنکھیں بند کی جائیں تو سارا فیض باطل ہو گا اور یہ مکابرہ ہو گا۔ نعوذ باللہ۔

جس وقت حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاں قدس سرہ نے یہ رسالہ (فخر الحسن) لکھ لیا تو اس کو مولوی ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے پاس بھیج دیا اس وقت وہ بیمار تھے چنانچہ کہہ دیا کہ "میرے سوا اس کا جواب کوئی بھی نہیں لکھ سکتا صحت مند ہو کر میں خود اس کا جواب لکھوں گا" جب اس بات کی اطلاع حضرت مولانا فخر الدین کو ملی تو فرمایا:۔

"کہ اسے کبھی صحت نصیب نہ ہو گی"۔

لہٰذا حضرت محدث رحمتہ اللہ علیہ وفات پا گئے۔

بعض مومن عورتیں بھی اولیاء میں شامل ہیں۔ ان میں سے حضرت رابعہ بصری بہت مشہور ہے۔ دیگر ولی عورتوں کے حالات بھی کتابوں میں موجود ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

تکلیفات شرعیہ

ہمارا عقیدہ ہے کہ فقرائے کاملین کو پہچاننا ایک مشکل کام ہے حدیث قدسی میں وارد ہے۔ اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم غیری "یعنی میں اپنے دوستوں کو اپنی قبا میں چھپا کر رکھتا ہوں اور جو لوگ مجھ سے بیگانہ ہیں تو وہ میرے دوستوں کو نہیں پہچان سکتے" اور جو لوگ انہیں پہچانتے ہیں وہ بھی انہیں اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے پہچانتے ہیں۔ البتہ وہ لوگ جو خواہشات نفس کے لئے فقیروں کا لباس پہن لیتے ہیں۔ فقیروں کی چند باتیں اور کلمات کو دہراتے ہیں اور لوگوں کو دھوکہ دے کر خوب کھاتے پیتے ہیں۔ نہ نماز و طہارت کی پروا کرتے ہیں نہ روزہ کی تو ایسے لوگ سراسر گمراہ ہیں کیونکہ تکلیفات شرعیہ سے کسی کے لئے کوئی مفر نہیں۔ ہاں اگر ریاضت کی وجہ سے کسی درویش کی حالت بدل جائے یا دوسرے الفاظ میں مجذوب ہو جائے تو از روئے شریعت بھی وہ معذور ہوتا ہے۔ اگر صرف حالت بدل جائے اور ظاہری لوگوں کی نظر میں چنگا بھلا ہو مگر اس کی حالت بدل گئی ہو تو اہل طریقت کے نزدیک ایسا درویش بھی معذور سمجھا جاتا ہے۔

حال یا حالت کے بدل جانے سے مراد یہ ہے کہ ایسے شخص کی سمجھ بوجھ میں فرق آجائے اور اپنے دل پر قابو نہیں رکھتا تو ایسے درویشوں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو نماز و روزہ کو ترک کر دیتے ہیں۔ استقلال و اطمینان نہیں رہتا۔ اس قسم کی حالت جس فقیر پر وارد ہوتی ہے۔ تو بالاخر اس کا راز اسے معلوم ہو جاتا ہے خصوصاً وہ جنکو کسی کامل فقیر سے کچھ فیض ملا ہو۔ بہر حال فقراء کی اصطلاح میں ان کو

"منزلہ الاقدام" کہتے ہیں۔ تاہم سالک اور غیر سالک کو شکل و شباہت سے بھی پہچانا جا سکتا ہے اس لئے کہ اصل اور نقل میں فرق تو ہوتا ہے (بالخصوص سالکین چشت کو تو معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے بھی پہچان سکتے ہیں)۔

عاشقان خواجگان چشت را

از قدم تا سر نشانے دیگر ست

بے قابو ہونا بھی ایک قسم کا جذب ہے۔ مگر خیال رہے کہ مجذوب کے لئے گالیاں دینا بکواس کرنا یا ننگا ہونا ضروری نہیں۔ یہ تو جذب کی انتہا ہے اور شریعت میں بے قابو شخص کو معذور نہیں کہا جاتا۔ جب تک کہ وہ مسلوب الحواس نہ ہو۔ یعنی صرف اس قدر بے قابو ہونا کہ وہ مکمل ارادے سے اس حالت پر قبضہ کر سکتا ہو تو ایسا شخص از روئے شریعت معذور نہیں کہلاتا۔ یہاں پر ممکن ہے کہ نئی روش کے خوگر بعض حضرات یہ کہدیں کہ جو لوگ متغیر الحال ہوں۔ بکواس کرتے ہوں' روتے ہوں یا وجد کرتے ہوں تو ایسے لوگ تو معمولی اخلاق بھی نہیں رکھتے۔ پھر معرفت الٰہی تو دور کی بات ہوئی یا یہ کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کو غیب دان' مہذب اور عقلمند تصور کیا جائے گا بلکہ ایسے معترضین کا ایک بنیادی اعتراض یہ ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگ کم عقل تھے اور چونکہ اس زمانے کے فقراء بھی پرانے زمانے کے فقیروں کی طرح لکیر کے فقیر ہیں۔ کیونکہ انہوں نے بھی تو کوئی نئی ایجاد نہیں کی ہے بلکہ جہل کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ تو اس سلسلے میں ہماری گذارش اتنی سی ہے کہ ایسے سالک حق تعالیٰ کی محبت میں جان و جہان سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے کوئی جنٹلمین کسی مس صاحبہ کے دام حسن میں ایسا گرفتار ہو جائے کہ جون جولائی کے گرم ترین مہینوں میں بھی مس کے گھر کا طواف کرتا ہو اور اگر اس عمل میں پتلون وغیرہ بھی جگہ جگہ سے پھٹ جائے تو پروا نہیں کرتا۔ بلکہ وہ گرمی سردی کو بھی

محسوس نہیں کرتا۔ (مثلاً انگلینڈ کے جارج پنجم کے صاحبزادہ نے تو ایک مطلقہ عورت کی خاطر تاج و تخت برطانیہ کو بھی لات مار دی تھی۔ اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب لوگ کہا کرتے تھے۔ کہ برطانوی قلمرو میں سورج نہیں ڈوبتا۔ مگر ڈیوک نے اپنی محبوبہ کو نہ چھوڑا اور تخت برطانیہ سے اتر گیا۔ کیا اس شہزادے کا سودا گھاٹے کا تھا یہی قابل غور ہے (طاہر چشتی)

اب جہاں تک سالکوں کا تعلق ہے تو وہ برا بھلا اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ان کا ہدف شیطان ہوتا ہے کیونکہ یہی نفس و شیطان ان کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے ایک جنٹلمین اپنے علاوہ چند دیگر جنٹلمینوں کو بھی محبوبہ کے بنگلے کا طواف کرتے ہوئے دیکھ لے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سب میرے ہی معشوقہ کے دیوانے ہیں۔ چنانچہ اس کھیل میں جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔ فساد بھی ہوتا ہے اور جس قسم کی بکواس یہ جنٹلمین کرتے ہیں سب کو معلوم ہو گی۔

جہاں تک کسی درویش کے رونے یا گریہ کرنے کا تعلق ہے تو یہ بات مجازی عاشقوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ پھر جنٹلمین طبقہ کا کیا کہنا۔ مثلاً" اگر مس صاحبہ اس سے وعدہ کر لے کہ "فلاں ناچ گھر میں موجود رہنا میں آؤں گی" اور پھر حسب وعدہ نہ آئے تو (ہوس کا شکار) عاشق کسی دوسری مس کو لے کر ناچنا شروع کر دیتا ہے اور اگر واقعی عاشق ہو اور مس نہ آئے تو اکیلے ناچنا شروع فرما دیتا ہے۔ پھر غیب دانی تو دور کی بات ہے اور اس کا بیان اپنے موقع پر کیا جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اگلے وقتوں کے لوگ یا فقراء بے عقل تھے۔ تو فی الاصل ایسا تصور کرنا ان کی سخت ترین غلطی ہے کیونکہ اگر اصلیت کو دیکھا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ قدیم لوگوں کی عقل موجودہ نسل کے لوگوں سے بہت بڑھی ہوئی تھی۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ لکیر کے فقیر تو موجودہ دور کے لوگ ہیں۔ سب سے پہلے تو ان کی یہ بات دور از عقل ہے کہ پرانے زمانے

کے لوگ کم عقل تھے۔ کیونکہ عقل تو ایک ایسی چیز ہے کہ ہر زمانے میں ایک جیسی ہوتی ہے۔ (زمانے سے عقل کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) یہ نہ کم ہوتی ہے نہ زیادہ ہوتی ہے۔ البتہ تجربے کی بات الگ ہے وہ یقیناً" کم و بیش ہوتا ہے۔ اب غور کرنا چاہیے کہ جو ایجادیں اس دور میں متعارف ہوئی ہیں اور جو ایجادات نئی روشنی کے لوگ بڑی عقل یا عقل مندی سے تعبیر کرتے ہیں تو غور کرنا چاہیے کہ کیا ان تمام ایجاوات کی کوئی بنیاد بھی موجود ہے یا نہیں اور یہ کوئی معمہ نہیں اور ہر شخص کو اچھی طرح سے معلوم ہو گا.... کہ ہر چیز کی ایک اصل اور بنیاد ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ موجودہ دور کی تمام ایجاوات کو جب ہم دیکھتے ہیں تو ان کی تکمیل پر صدیاں صرف ہوئی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ ان " مکمل ایجاوات " کی بنیادیں اگلے زمانے کے لوگوں نے رکھی تھیں۔ مثال کے طور پر جس شخص نے ربڑ کا دودھ دریافت کیا تھا تو اس کو یہ معلوم تھا کہ اس دودھ سے ایک چیز ضرور بن سکتی ہے جو بڑی مضبوط اور لچکدار ہو گی اور ممکن ہے کسی انتہائی ضرورت کے وقت کام دے جائے۔ مگر اس شخص کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی وفات کے بعد اسی دودھ سے ہزارہا چیزیں بن جائیں گی یا بن سکیں گی۔ قطع نظر اس کے حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربی رضی اللہ عنہ (جنہیں شاہ صوفیہ کہا جاتا ہے) نے بغیر کسی ایجاد یا آلات کے فرمایا تھا کہ مستقبل (آخری زمانہ) میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ایک سورج چمکتا ہو گا۔ اور کھانا کھاتے وقت تمہارے دسترخوان سینوں تک بلند ہوں گے۔ نیز کھانے کے لئے تمہارے دو عدو الگ "ہاتھ" ہوں گے اور عورتوں کے سروں کے بال اونٹ کے کوہاں کی طرح ہوں گے۔

اب سوچنا چاہیے کہ آج کل سڑکوں پر جگہ جگہ بجلی کے بلب روشن نہیں جو سورج کی طرح روشنی دیتے ہیں اور کھانے کی میزیں خوراک کے دسترخوان کی طرح سینوں تک بلند نہیں۔ اور کھانے کے لئے چھری اور کانٹا ہاتھوں کے علامتی اشارہ۔

نہیں۔ (اور یہ ہاتھ بھی جنٹلمین ہی استعمال میں لاتے ہیں) یہ باتیں حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب فتوحات مکیہ اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔

جس شخص نے ربڑ کا دودھ دریافت کیا تھا وہ اپنی زندگی میں اس سے وہ کام نہیں لے سکا جو آج کل لیا جا رہا ہے مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا دودھ کا موجد یا دریافت کنندہ کم عقل تھا۔ اسی طرح جس شخص نے سب سے پہلے بندوق ایجاد کی تھی تو کیا آج تک مکمل طور پر وہی ایجاد کام میں نہیں لائی جا رہی ہے۔ کیونکہ قدیم زمانے کی بندوق کی علت صوری اور جدید دور کی بندوق کی علت صوری میں کوئی فرق نہیں۔ بلکہ دونوں بندوقوں میں مشترک ہے بٹ، بارود، گولی، ٹریگر۔ صرف چند چیزوں کا اضافہ جدید بندوق میں ہوا ہے۔ جن کی بدولت فائر کرنے میں سہولت ہے۔ پہلے جب بندوق سے ایک منٹ میں دو یا تین فائر ہوتے تھے۔ مقابلتاً آج کل دس پندرہ فائر ایک منٹ میں ہوتے ہیں۔ پہلے صرف نال میں بارود بھر دیا جاتا تھا۔ اور ایک سیخ کے ذریعے ان کو دبا دیا جاتا تھا۔ بعد ازاں ایک چیتھڑے کو نال کے اندر ڈال دیا جاتا تھا تاکہ بارود نال سے باہر نہ نکل سکے۔ اس کے بعد گولی اندر کر دی جاتی تھی۔ پھر نپل پر پٹاخہ رکھ دیا جاتا اور اس کے بعد فائر کی جاتی تھی۔ ان بندوقوں سے پہلے کے بندوق کی حالت یہ ہوتی تھی۔ کہ ان کو سب سے پہلے بارود سے بھر دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد فلیتہ بارود سے تر کیا جاتا اور اسے تیار رکھا جاتا اور بندوق کی نال کے آخری سرے پر بارود کے لئے ایک کھدی ہوئی مخصوص جگہ ہوتی تھی اور پنڈو چقماق کے ذریعے فلیتے تک پہنچا دیا جاتا۔ فلیتہ کو آگ لگ جاتی اور آہستہ آہستہ بارود تک پہنچ جاتی تو فائر ہو جاتی تھی۔ اس قسم کی بندوقوں کے بعد ایسی بندوقیں بن گئیں۔ جن کا ذکر چقماق والی بندوقوں سے پہلے کیا گیا ہے۔ بعد ازاں ان بندوقوں کے لئے ایسے کارتوس ایجاد ہوئے کہ جب فائر مقصود ہوتی تو کارتوس کے سرے پر دانتوں سے ایک حصہ ہٹا دیا جاتا جب

بارود ظاہر ہو جاتا تو بندوق میں ڈال دیا جاتا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دور میں فرنگی فوج کے پاس اسی قسم کی بندوقیں تھیں۔ اور اس کے بعد اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلحے میں کتنی تبدیلی اور ترقی ہوئی ہے۔ تو کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جدید دور کے فرنگی موجد تو عقلمند ہیں اور پرانے دور کے بے عقل تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات یکسر غلط ہے۔ کیونکہ جیسا ہم نے پہلے کہا ہے کہ عقل ایک ایسی چیز ہے جو ہر دور میں ایک جیسی ہوتی ہے۔ بلکہ جتنی خدا نے دی ہوتی ہے اتنی ہی ہوتی ہے۔ نہ کم ہوتی ہے نہ زیادہ۔ قدیم دور میں موجودہ ایجادیں اس لئے تکمیل تک نہ پہنچ سکیں کہ اس زمانے میں دھات یعنی لوہا اور تانبا مکمل طور پر ایجاد نہ ہوئے تھے۔ اگرچہ وقت کے لحاظ سے پرانے زمانے کی ایجادات بھی مکمل تھیں کیونکہ ان کے ذریعے ان کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ مگر چونکہ اس زمانے کی ضروریات پہلے زمانے کی بہ نسبت زیادہ ہیں اس لئے ان لوگوں نے انہیں پرانی ایجادوں کو ترقی دی۔ اور انسانی نفس کی یہی خاصیت ہے کہ جس چیز کی جس قدر ضرورت ہو عقل سے اسی قدر کام لیتا ہے لیکن اگر کسی چیز کی ضرورت محسوس نہ کرے تو اس کے بارے میں بالکل نہیں سوچتا چنانچہ اگر پرانے زمانے کے لوگوں کو موجودہ دور کی ایجادوں کی ضرورت ہوتی تو یقیناً" وہ ضرور ان کو ایجاد کر لیتے۔ جس طرح ہندوؤں کی قدیم کتابوں۔ ویدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے "بوان" یعنی ہوائی جہاز ایجاد کئے تھے۔ کاغذ چین کے لوگوں نے ایجاد کیا تھا مگر جدید دور میں یورپ و امریکہ نے ترقی دی۔ بعد ازاں کاغذ کی ضروریات جتنی زیادہ ہوتی گئیں تو اس سے متعلق ایجادات کو بھی ترقی حاصل ہوتی رہی۔ اگر موجودہ دور کے موجد ہمیں کوئی بھی ایسی ایجاد دکھا سکے جس کی بنیاد اگلے وقتوں کے لوگوں نے نہ رکھ دی ہو تو ہم تسلیم کریں گے کہ پرانے زمانے کے لوگ کم عقل یا بے عقل تھے۔......

تاہم اب ہم اولیاء اللہ کے بارے میں چند معروضات پیش کریں گے۔

ولی کے معنے دوست کے ہیں اور اصل دوست وہ ہوتا ہے کہ اپنے دوست کی اعلیٰ صفات لوگوں پر ظاہر کر دے اور نیز دوست کی جگہ دوست کے کام کو چلائے اور اس ایت قرانی کے معنے بھی یہی ہیں۔

واذ قال ربک للملئکہ انی جاعل فی الارض خلیفہ

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین پر ایک نائب۔

خلیفہ کے معنے ہیں وہ جو بعد یا پیچھے آنے والا ہو یعنی جس نے اسے خلیفہ مقرر کیا ہو اور اس کے بعد آنے والا ہو یا اس کا قائم مقام ہو۔ یہ خلافت خدا ان لوگوں کو دیتا ہے جو علم خداوندی کے بموجب اس کام کے لائق ہوں۔ اسی طرح اس ایت مبارک میں بھی ہے۔

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (الانبیاء ایت ۱۰۵)

اور ہم (آب آسمانی) کتابوں میں لوح محفوظ (میں لکھنے کے بعد) لکھ چکے ہیں کہ اس زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔

صالح دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو ظاہری حکومت و انتظام کی قابلیت رکھتے ہیں اور دنیائی حکومت چلانے کے پوری طرح اہل ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو ظاہری قابلیت کے علاوہ باطنی قوت بھی رکھتے ہیں یعنی صالح کا اطلاق تو دونوں پر ہوتا ہے اور خلافت عام ہے البتہ اگر کوئی دنیائی خلافت چلائے اور باطنی امور کی طرف رغبت پیدا نہ ہو اور نہ ہی اس پر عقیدہ رکھتا ہو تو اس کی روحانیت فوت جاتی ہے کیونکہ وہ صرف مادیت کے کام کو چلا لیتا ہے۔ آگے اللہ جانے اور وہ جانے۔ پھر خدا نے بھی ہر انسان کو ایک خاص کام کے لئے پیدا فرمایا ہے یعنی بحیثیت انسان تو ہر انسان

میں وہ تمام خواص موجود ہیں جو ایک خاص انسان کا طرہ امتیاز ہوتے ہیں۔ مگر ایک خاص صفت یا خاصیت ہر ایک انسان میں ایسی ہوتی ہے کہ وہ باقی تمام صفات پر غالب ہوتی ہے اور سارے انسانی وجود پر اسی صفت کا قبضہ ہوتا ہے۔ وہ صفت نہ تو کسی مجلس کی تاثیر سے مفقود ہوتی ہے اور نہ ہی کسی اور طریقے پر۔ یہی چیز فطرت کہلاتی جس کو حق تعالیٰ نے فطرت اللہ التی فاطر الناس علیہا فرمایا ہے۔ حضرت مولانائے روم قدس سرہ نے بھی فرمایا۔

ہر کسے را بہر ساختند میل او اندر دلش انداختند

چنانچہ حق تعالیٰ نے صالحین کے دو حصے کئے ہیں۔ ایک کو دنیائی حکومت اور مادی ترقی کی طرف راغب فرمایا ہے اور دوسرے کو روحانی امور کے ساتھ ساتھ مادی امور کی طرف بھی راغب فرمایا ہے مگر ان لوگوں پر روحانیت کا غلبہ ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے یورپ کے بعض مادئین ایسے بھی ہیں جن کی توجہ کا مرکز ایجاد و اختراع ہے اور شب و روز مادے کے تحقیق و تجسس میں مشغول ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود روحانیت کے بھی قائل ہوتے ہیں بلکہ انہوں نے روحانی سوسائٹیوں اور محافل کا اہتمام بھی کیا ہوتا ہے۔ پس یہ ایجاد و اختراع بھی اسی روحانی عقل ہی کی ایک صفت ہوتی ہے۔ مگر ان لوگوں نے اپنی روحانی عقل کو بھی مادہ اور مادی امور میں مشغول کیا ہوتا ہے اور روحانیت کو ضروری نہیں جانتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثریت بھی روحانیت سے محروم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ نفس انسانی کی خاصیت یہ ہے کہ بیک وقت محض ایک ہی خیال کر سکتا ہے اب اگر کسی حالت میں کوئی شخص محض ایک ہی خیال یا تصور میں محو ہو تو دوسری چیز کے بارے میں کس طرح تحقیق کر سکتا ہے۔ مگر روحانی لوگوں کی نظروں سے یہ تمام ایجادیں (اور حقائق) کبھی بھی اوجھل نہ تھیں۔ ان کے متعلق روحانی انسانوں کے ارشادات پرانے زمانے سے چلے آرہے ہیں جن کی

حقیقت اب سامنے آ رہی ہے۔ اس ضمن میں ہم حضرت شیخ اکبر محی الدین العربی ﷺ کی چند پیشن گوئیوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ (۱) تاہم روحانی لوگوں کے خیالات مادیت سے بالاتر ہوتے ہیں۔

میرے مرشد پاک قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ ایجاد صرف ایک وقت کے لئے ہوتی ہے کچھ عرصہ کے بعد مفقود ہو جاتی ہے یا اتنی ترقی حاصل کر لیتی ہے کہ اس کی پرانی صورت برقرار نہیں رہتی بلکہ وہ مسخ ہو جاتی ہے جیسے چاروں موسم اور ان کی آب و ہوا یا میوہ جات وغیرہ۔ مگر روحانی لوگوں کی ایجادیں ایسی جامع ہوتی ہیں کہ حاصل ہونے کے بعد نہ تو بدلتی ہیں اور نہ فنا ہوتی ہیں۔ ان کو پہچاننا اپنے نفس اور اللہ کا کام ہے اور اس کا ایک ظاہری ثبوت یہ ہے کہ مادیت کے ماہرین اس حقیقت تک نہ پہنچ سکے کہ "نیند" کیا شے ہے۔ نیز جب ایک آدمی کوئی خواب دیکھ لے تو اس کے اصول کیا ہیں۔ مابقایا باتیں تو اس سے بھی زیادہ دقیق اور مشکل ہیں۔ جبکہ خواب (نیند) کی اصلیت اور حقیقت روحانی لوگ اپنی پہلی منزل میں معلوم کر لیتے ہیں۔

دوسرے درجے کے صالحین یعنی وہ لوگ جو مادیت اور مادی فکر سے ایک قدم

---

(۱) حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربی ﷺ کی ایک پیشن گوئی یہ بھی تھی۔ کہ کوئی آواز فضا میں غائب نہیں ہوتی اسی طرح مولانائے روم قدس سرہ نے بھی فرمایا تھا کہ

ایں جہاں کوہ ست فعل ماصدا   باز می آید صداہا راندا

ظاہر ہے کہ آج زمانے نے مادی طور پر بھی ثابت کر دیا ہے کہ کوئی بھی فعل انسانی یا صدائے انسانی فضا یا خلا میں غائب نہیں ہوتی۔ ریڈیو۔ ٹی وی اور ٹیلیفون اس کے ثبوت ہیں (مترجم)

بھی آگے نہیں رکھ سکتے۔ یہ سب اول درجے کے صالحین (یعنی روحانی انسانوں) کے تابع ہوتے ہیں اور اگر یہ لوگ ہماری اس بات کو نہ بھی مانیں تو کوئی حرج نہیں پھر بھی حقیقت یہی ہے۔ کیونکہ فی الاصل مادئین روحانی لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ یہی روحانی لوگ دنیائی نظام کی خاطر ان لوگوں پر ایجاد کا پرتو ڈالتے ہیں۔ (این سخن کے باور مردم شود)

ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل مسمریزم کا ایک "عامل" لحہ بھر میں اپنے "معمول" پر کیسے اثر ڈال لیتا ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ ساری کاروائی اور اثر روح کا ہوتا ہے کسی اور چیز کا نہیں مثال کے طور پر پشاور شہر میں چھ بجے ایک شخص اپنے کسی دوست کا محبت سے تصور کر لیتا ہے۔ جو دہلی میں ہوتا ہے۔ تو عین اسی وقت دہلی کا دوست بھی اسے یاد کر لیتا ہے کیونکہ پشاور والے دوست کی محبت کا پرتو اس پر پڑ جاتا ہے اور اس حقیقت سے موجودہ دور کا سائینسدان بھی انکار نہیں کرتا۔ جس کو "ول پاور" یا "قوت ارادی" کہتے ہیں مگر خیال رہے کہ ارادہ بذات خود ایک عرض ہے اور عرض جسم کا تقاضہ کرتی ہے یعنی جسم کے بغیر قائم نہیں رہتا پس ارادے کے لئے جسم بمنزلہ روح ہے اور روح ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر چیز کا عکس موجود ہوتا ہے جس وقت روح کسی بھی رخ میں فکر کرے وہی چیز اس میں آموجود ہوتی ہے۔ جس طرح مسمریزم کے عامل کی روح ارادہ کرے کہ اس کا معمول بے ہوش ہو جائے تو فوراً ہی وہ بے خود ہو جاتا ہے۔ ایک شاعر نے کہا ہے۔

دل را بہ دل رہیست دریں گنبد سپہر

اب سوچنا چاہیے کہ جب پشاور والے دوست نے اس دوست کا تصور کیا جو دلی میں تھا اور اس نے پشاور کے دوست کے محبت کے پرتو کو محسوس کیا۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ کونسی چیز تھی جس نے دلی کے دوست کو خبردار کیا۔ اس لئے کہ خارجی طور پر تو

کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی دونوں دوستوں کو اس کی خبر ہو گئی۔ اس حال میں یہ تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ یہ روح کی ایک طاقت ہے جو خارج میں بھی کام کر سکتی ہے۔ چاہے دہلی کے دوست کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ پشاور کے دوست نے مجھے یاد کیا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ بعض لوگوں کا روحانی ارادہ دیگر لوگوں سے زیادہ قوی ہوتا ہے اور نیز یہ بھی ثابت ہو گیا کہ..... ہر ایک روح عکس کو قبول کرتی ہے.... چنانچہ اعلیٰ ترین خلفاء کی ارواح جو ہر دو قسم کی ایجادات کے حامل ہوتی ہیں وہ ان تمام ایجادات کے عکس دوسرے درجے کے خلفاء یعنی ماؤئین پر منعکس کرتے ہیں اور پھر ماذئین ان عکسوں کو خارج میں متعارف کرا لیتے ہیں اور اسی سے یہ دنیا مستفید ہو جاتی ہے۔ جبکہ اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے ذہن میں یہ عکس کہاں سے نازل ہو گیا ممکن ہے یہاں پر کوئی یہ اعتراض کر لے کہ جب تم نے روح کی صفت ایک آئینے کی مثل بتا دیا تو پھر مناسب ہے کہ روحانی خلفاء کا پرتو عام ہو اور عوام بھی اس سے محروم نہ ہوں۔ کیونکہ آخر یہ پرتو خاص تعلیم یافتہ اور صاحبان عقل لوگوں پر ہی کیوں پڑتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے جیسا کہ پہلے بھی ہم نے کہا ہے کہ عام لوگوں کی فطرت حق تعالیٰ نے ایسی نہیں بنائی کہ اس پرتو کو قبول کر سکے اور اگر یہ عکس ان کی ارواح پر پڑ بھی جائے تو وہ اسے قبول ہی نہ کریں گے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام کی تخلیق دیگر امور کے لئے ہوئی ہوتی ہے یعنی ہر شخص کے وجود میں جس خصوصی صفت کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہی صفت اس کی روح پر مستولی ہوتی ہے۔ چنانچہ روحانی خلفاء کے پرتو کو قبول نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر تین قسم کے پانی کو لیجیے ایک وہ جو کسی مصفا اور شفاف تالاب میں ہو اور اس کی فرش پتھر یا سیمنٹ کی بنی ہو تو کوئی شک نہیں کہ اس پانی میں عکس نظر آئے گا اس لئے کہ یہ پانی گندگی اور کدورت سے پاک ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک اور تالاب کو لے لیجیے جس میں شکل تو

دکھائی دیتی ہے مگر مکمل طور پر پوری کی پوری نظر نہیں آتی۔ اسی طرح ایک جوہڑ کی مثال لیجیے یا گندہ نالی کا تصور کیجیے جو شہر میں نکاسی آب کے لئے ہوتی ہے۔ تو اس میں ہرگز عکس نظر نہیں آتا۔ اگرچہ پانی تو یہ بھی ہوتا ہے مگر اس پر گندگی اور کدورت غالب ہوتی ہے اس لئے اس گندے پانی میں عکس قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی چنانچہ روحانی خلفاء' مادی خلفاء اور عوام کی یہی مثال ہے۔ ان میں سے جہاں تک روحانی خلفاء کا تعلق ہے تو ان کے انتہائی تابعدار اور فرمانبردار شاگرد ہوتے ہیں جو ان کے بعد ان کے کام کو آگے چلاتے ہیں۔ اسی طرح خلفاء کے بھی پس ماندگان ہوتے ہیں۔ جو مادی خلفاء کی وفات کے بعد ان کا کام چلاتے ہیں (ان کی خصوصیت یہ ہوتی ہے) کہ کچھ علم تو انہوں نے اپنے مادی اساتذہ سے سیکھا ہوتا ہے۔ اور مزید براں روحانی خلفاء کے شاگردوں کی ارواح کا پرتو بھی ان پر پڑتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مادی اساتذہ کی ایجادوں کو مزید خوبصورت بنا دیتے ہیں اور انہیں ترقی دے کر مکمل کر دیتے ہیں۔

چنانچہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے جو یہ کہہ سکے کہ اس قسم کے شاگرد اپنے استادوں سے زیادہ عقلمند اور دانشمند ہیں۔ ہمارے خیال میں عقل سلیم رکھنے والا کوئی شخص ایسا نہیں کہے گا۔ اس لئے اصل بات یہ ہے کہ جب تک مادی خلفاء زندہ تھے تو زمانے کی ضروریات اور اقتضا کے مطابق ایجادات متعارف کرائے اور بعد از وفات اپنا علم اپنے شاگردوں کے حوالے کر دیا شاگرد اسی راہ پر چلے اور اپنے اساتذہ کے بعد ایجادات کو مزید ترقی دی۔

(مدعا یہ کہ) یہ بات تو عقل سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ بنی نوع بشر میں ایسے انسان بھی ہوتے ہیں جو مکمل طور پر حق تعالٰی کے خلفاء ہوتے ہیں یہ لوگ خدائی طاقتوں کے حامل ہوتے ہیں اور اس کا اندازہ لگانا بھی کوئی مشکل بات نہیں کیونکہ جب

مسمریزم کا ایک عامل کسی انسانی وجود پر اتنا تصرف کر سکتا ہے تو روحانی خلفاء اور فقرائے کاملین کے تصرف کا کیا ٹھکانہ ہو گا۔ اور اگر تصرف کی قوت انسانی وجود میں تسلیم نہ کی جائے تو پھر انسانی خلافت باطل ثابت ہو جائے گی۔

گزشتہ اوراق میں ہم نے کہا تھا کہ "بے قابو" انسان بھی ازروئے شریعت معذور نہیں کہلاتا۔ حتی کہ وہ مسلوب الحواس نہ ہو۔ قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے کہ واعبد ربک حتی یاتیک الیقین یعنی اس وقت تک خدا کی عبادت کر، حتی کہ تمہیں یقین آجائے۔ یہاں پر علمائے ظاہر یقین سے مراد موت لیتے ہیں۔ جناب پیران پیر دستگیر اور مولانا سید عبد الرحمان صاحب قدس سرہ العزیز اس کے معنے عام یقین کے لیتے ہیں۔ میرے مرشد پاک قدس سرہ بھی یقین..... یقین ہی کے معنوں میں لیتے ہیں. یعنی موتوا قبل ان تموتوا (موت سے قبل مرنا)۔ حضرت عبد الرحمان بابا رحمتہ اللہ علیہ نے اسی حدیث مبارک کے مفہوم کو اس شعر میں ادا کیا ہے۔

ترجمہ:۔ "جیتے جی مرجاؤ تاکہ مرنے کے غم سے نجات حاصل ہو۔ یہ کام بہت سہل ہے۔ البتہ تم نے اپنے لئے خود ہی اسے مشکل بنا دیا ہے"

مطلب یہ ہے کہ یقین میں سالک متغیر الحال ہو جاتا ہے یعنی اس کا حال بدل جاتا ہے۔ تو اسی حالت کے دوران اگر وہ حال ہی سے مجبور نہ ہو تو تکلیفات شرعیہ اس پر واجب ہیں اور اگر مجبور ہو تو معذور سمجھا جائے گا۔

☆☆☆☆☆☆

تصوف

تصوف ڈھاڑی رکھنے اور تسبیح کھنکھانے یا احیائے سنت کے طور پر مونچھوں کو ایسا صاف کرنے (کہ مفقود ہو جائیں) کا نام نہیں۔ نہ ہی یہ ظاہری عالمانہ بھاری بھرکم لباس پہننے یا شان و شوکت کی کوئی چیز ہے بلکہ در حقیقت یہ ایک خاص علم ہے جس کا تعلق قلب سے ہے۔ ہم نے مقدمہ میں بھی اس کا کچھ ذکر کیا ہے اور اس کا کچھ ذکر یہاں بھی کریں گے۔

تصوف کی اصل الاصول حدیث جبرئیل علیہ السلام ہے جو مشکوۃ شریف میں بخاری و مسلم سے نقل کی گئی ہے وہ یہ حدیث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ اسی اثناء میں ایک بارعب انسان آیا جس نے سفید کپڑے پہنے تھے اس نے حضور اقدس ﷺ سے ایمان و اسلام کے بارے میں پوچھا اور بعد ازاں یہ سوال کیا کہ احسان کیا چیز ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان تعبدو اللہ کانک تراہ و ان لم تکن تراہ فانہ یراک (یعنی تم اللہ کی ایسی عبادت کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اور اگر تم اسے نہیں (بھی) دیکھتے (پھر بھی) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے جب وہ شخص چلا گیا تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے اور یہاں تم لوگوں کو دین کی تلقین کے لئے ائے تھے۔ اب جہاں تک احسان کا تعلق ہے تو یہ مکمل اخلاص کے ساتھ عبادت کرنے کو کہتے ہیں اور چونکہ اخلاص ایک باطنی صفائی ہے اس لئے اسی باطنی صفائی کے علم کو تصوف کہا جاتا ہے۔ حضور اقدس ﷺ کے بارے میں

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمتہ

یعنی رسول ﷺ لوگوں کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت (دانائی)

سکھاتا ہے اور یہی تزکیہ تصوف کی روح ہے۔ اس کے بغیر معرفت الٰہی حاصل نہیں ہو

سکتی۔ اور اسی تزکیہ کے بارے میں حق تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے۔ قد افلح

من تزکی ہ تحقیق جس نے تزکیہ قلب حاصل کیا اس نے نیکی (فلاح) حاصل کی۔

اور اصل فلاح و بہبود محض حق تعالیٰ عزوجل کی محبت و معرفت ہے۔ حضرت غوث

ثقلین پیران پیر دستگیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دل کو ان تمام کدورتوں سے (جو

حق تعالیٰ اور بندے کے درمیان حجاب کا کام دیتے ہیں) صاف کرنے کا نام تصوف ہے

بعض کا قول ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف رکھنے کا نام تصوف ہے۔ حضرت

جنید بغدادی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ تصوف اخلاق فاضلہ کو کہتے ہیں۔ میرے مرشد

پاک (قدس سرہ) بھی یہی فرماتے ہیں کہ تصوف اخلاق فاضلہ ہی کا دوسرا نام ہے۔

فرماتے ہیں جس قدر اخلاق فاضلہ میں ترقی ہو گی اتنی معرفت الٰہی حاصل ہو گی۔ جس

قدر کسی سالک کے اخلاق اعلیٰ پائے کے ہوں گے اسی قدر اس کی معرفت کا علم بھی

زیادہ ہو گا۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز اپنی مکتوبات میں لکھتے ہیں: "شریعت

راسہ جزو ہست۔ علم و عمل و اخلاص تاایں ھرسہ متحقق نشوند شریعت نیز متحقق

نشود" یعنی شریعت کے تین اجزاء ہیں۔ علم۔ عمل اور اخلاص۔ جب تک یہ تینوں اجزا

تحقیق (تکمیل) تک نہ پہنچ جائیں۔ شریعت بھی متحقق نہیں ہوتی۔ مطلب یہ کہ

"اخلاص" ایک انتہائی ضروری جزو ہے۔

غوث صمدانی قطب ربانی حضرت عبد الوہاب شعرانی رضی اللہ فرماتے ہیں کہ

"تصوف اس علم کا نام ہے جو اولیاء اللہ رحمتہ اللہ علیہم کے دلوں میں اس وقت پیدا

ہوتا ہے جب ان کے قلوب کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونے سے منور ہو جاتے ہیں"
ہم بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ جو کوئی بھی کتاب و سنت پر عمل کرے گا تو ایسے افراد پر
کچھ اس قسم کے اسرار و معانی منکشف ہوں گے کہ زبان و قلم ان کے بیان کرنے سے
لاچار ہیں۔

بعض علماء ایسے بھی ہیں جو تصوف سے قطعی انکار کرتے ہیں بلکہ یہاں تک کہ
وہابی لوگ تو کہتے پھرتے ہیں کہ باطنی علم کوئی چیز ہی نہیں مگر یہ انکی فاش غلطی ہے
حضرت امام **قشیری** کا فرمان ہے کہ ادوار اسلام میں ایسا کوئی دور بھی نہیں گزرا ہے
جس میں اس فرقے (متصوفین) کا کوئی شیخ موجود نہ ہو۔ اور نیز اس زمانے کے ظاہری
علما نے اس کے سامنے گردن نہ جھکائی ہو اور نہایت عاجزی کے ساتھ اس کے سامنے
حاضری دیکر برکت حاصل نہ کی ہو چنانچہ ابو عمران نے حضرت شیخ ابوبکر شبلی رضی اللہ
عنہ سے ازمائش و امتحان کے طور پر فیض کے مسئلے کے بارے میں پوچھا تو شیخ شبلی
رضی اللہ عنہ نے اس ضمن میں ایسی ایسی پر اسرار باتیں بتائیں جو ابو عمران کے مبلغ علم ہی
میں نہ تھیں۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ حضرت بشر حافی رضی اللہ عنہ
کے انتہائی عقید تمند تھے حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ کو جب کبھی کوئی دقیق مسئلہ درپیش
ہوتا تو حضرت بشر حافی رضی اللہ عنہ سے دریافت کرتے۔ (۱) (مگر متاسفانہ) ہمارے دور
کے اکثر علماء نہیں بلکہ ناقلین ہیں۔ ان کو تدریس کے علاوہ علم کی اصلیت قطعی طور پر
معلوم نہیں۔ انہوں نے صرف تحریر شدہ مسائل از بر کئے ہوتے ہیں اور طوطے کی
طرح انہیں رٹتے ہیں ان کو علم ہی نہیں ہوتا کہ میں کہہ

---

(۱) حضرت شیخ فرید الدین عطار رضی اللہ عنہ تذکرہ الاء ولیاء میں لکھتے ہیں کہ امام
احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ بسیار پیش اور رفتی و در حق او (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کیا رہا ہوں چنانچہ ایسے کوتاہ فہم اور تنگ نظر لوگ اگر اولیاء اللہ کے بارے میں کچھ بھی کہیں کم ہو گا۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق امام شعرانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو تراب بخشی رضی اللہ عنہ جو اس میدان کا۔

ارادت بسیار داشت۔ شاگردانش می گفتند تو عالمی در احادیث و فقہ و اجتہاد و در انواع علوم نظیر نہ داری ہر ساعت پیش شوریدہ میروی چہ لائق بود احمد گفت آرے ہمہ علوم کہ بر شمروی من بہ از و دانم۔ اما او خدائیرا بہ از من داند۔ پس پیش او رفتی و گفتی حدثنی عن ربی۔ مرا از خدائی من سخن گوئی۔

ترجمہ: حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ عموماً" حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ عنہ کے پاس جایا کرتے تھے وہ ان سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ ان سے ان کے شاگرد کہا کرتے تھے کہ آپ احادیث' فقہ اور اجتہاد کے علاوہ بے شمار علوم میں جواب نہیں رکھتے تو اس دیوانے کے پاس ہر وقت جانے کا کیا مقصد ہے حضرت امام رحمتہ اللہ فرماتے کہ ہاں تم درست کہتے ہو میں بہت سے علوم حضرت بشر رضی اللہ عنہ سے زیادہ جانتا ہوں مگر وہ حق تعالیٰ کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتا ہے چنانچہ ان کے ہاں تشریف لے جاتے اور کہتے کہ مجھے خدا کی بات سنا۔

حضرت ابراہیم ادھم رضی اللہ عنہ کے حالات میں حضرت شیخ عطار رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں کہ امام حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ حضرت ابراہیم ادھم رضی اللہ عنہ کو سیدنا ابراہیم فرمایا کرتے تھے۔ لکھتے ہیں کہ حضرت امام رحمتہ اللہ سے ان کے بلند ترین مرتبہ کے متعلق پوچھا گیا کہ یہ مرتبہ حضرت ابراہیم ادھم رضی اللہ عنہ نے کیسے حاصل کیا تو حضرت امام رحمتہ اللہ عنہ نے فرمایا " بداں کہ دائم بخدمت خداوند مشغول ست و ما بہ کارہائے دیگر ہم مشغول میشوم " مترجم

ایک شہسوار تھا وہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ "جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر تل جاتا ہے تو اولیاء اللہ کے بارے میں بدگوئی کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے" امام شعرانی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں کہ "میں کہتا ہوں اور میں نے اپنے پیر و مرشد شیخ الاسلام حضرت ابویحییٰ زکریا انصاری رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ جس فقیہہ کو صوفیاء کے احوال و کیفیات کے بارے میں کوئی علم نہ ہو اسے برہنہ پا (یعنی ابلہ) فقیہہ کہنا چاہیے۔ میں نے حضرت شیخ الاسلام سے یہ بھی سماعت کیا ہے کہ خوش اعتقادی سعادت اور بد اعتقادی شقاوت ہے۔ یعنی یہ ظاہری علما اکثر بد اعتقاد ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے چند ظاہری مسائل یاد کئے ہوتے ہیں اور تصوف کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ یعنی طریقت۔ حقیقت اور .... معرفت کے علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اس پہ طرہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کی وراثت کا دعویٰ بھی کرتے رہتے ہیں اور بڑھائی اور بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں" حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مشہور عالم کتاب احیاء العلوم میں ان کی اچھی طرح سے خبر لی ہے اور مجدد الف ثانی قدس سرہ نے اپنی مکتوبات میں فرمایا ہے کہ "علمائے ظاہر پر ورثتہ الانبیاء" کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ یہ ان لوگوں کا حق ہے جو ظاہری علوم کے علاوہ باطنی علوم سے بھی بہرہ ور ہوں۔ اورباطنی علوم طریقت' حقیقت اور معرفت سے تعلق رکھتے ہیں اور صوفیائے کرام علمائے ظاہر سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں" اس کی ایک جھلک ہم شطحیات میں دکھائیں گے۔

حضرت امام عبد الوہاب شعرانی قدس سرہ العزیز اپنی کتاب طبقات الکبریٰ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> "میرے بھائی! حق تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق عطا فرمائے۔ میرے نزدیک کوئی بھی کامل ترین علم کا حامل نہیں ہو سکتا جب تک اسے استاد یا نقل کے بغیر خصوصی طور پر حق تعالیٰ کی طرف سے

علم حاصل نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ جس چیز کا علم استاد یا نقل سے حاصل ہوا ہو وہ نئی پیدا شدہ چیزوں سے لیا جاتا ہے اور اہل اللہ ایسے علم کو علت سے خالی نہیں سمجھتے اور جس کسی نے نئی پیدا شدہ چیزوں اور ان کو سمجھنے پرکھنے پر عمر صرف کی تو گویا اس نے اپنی عمر برباد کی۔ گویا انہوں نے اپنے خدائی علم کا حصہ گم کر دیا۔ اس لئے کہ جب ایک شخص ان علوم کے بارے میں اپنی عمر تمام کر دے جو نئی پیدا شدہ چیزوں سے تعلق رکھتا ہو مگر ان کی اصل حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے"۔ بھائی! اگر اہل اللہ کے طریقے پر آپ نے کسی شیخ سے بیعت کی ہوتی (۱) اور سلوک کا راستہ اختیار کیا ہوتا تو حق تعالیٰ تمہیں یقیناً" اپنی شہود کی درگاہ تک پہنچاتا اور اسی مقام میں تم اس کا صحیح علم الہام کے ذریعے حاصل کر لیتے جس میں نہ تو کوئی مشقت ہوتی ہے۔نہ درماندگی اور تھکاوٹ کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی بے خوابی کو کچھ دخل ہوتا ہے یہ بالکل ایسا ہے جیسے خضر علیہ السلام کو علم حاصل ہے اور علم وہ بہتر ہوتا ہے جو کشف و شہود سے حاصل ہو جائے۔ کیونکہ نظر، فکر، گمان اور قیاس کے ذریعے ؎

---

(۱) اصل کتاب تجلیات محمدیہ ﷺ میں صفحہ ۱۲۲ کی آخری سطر کی عبارت کی چھپائی واضح نہیں میں نے اندازے سے یہی ترجمہ کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہی اس جملے کا مقصد ہے اور صحیح ہے باقی اللہ جانتا ہے کہ میرا مطلب بے جا تصرف کرنا نہیں اللہ معاف کرے۔ طاہر چشتی

حاصل کردہ علم تو کچھ بھی نہیں نہ ہی اس کی کوئی حیثیت ہے۔ شیخ کامل حضرت بایزید بسطامی رضی اللہ عنہ اپنے دور کے علمائے (ظاہر) سے فرمایا کرتے تھے کہ تم مردہ (ظاہری علوم کے ماہر) ہو اور مردوں (ظاہری علوم کے ماہروں) ہی سے تم نے یہ مردہ علوم سیکھے ہیں اور ہم نے اپنا علم اس حیی الذی لایموت سے سیکھا ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا اور کبھی نہیں مرے گا (چنانچہ) اے بھائی! تمہارے لئے مناسب ہے کہ علوم میں اس علم کو تلاش کرو جس کے ذریعے تمہاری ذات مکمل ہو جائے اور نیز جہاں بھی تو جائے یہی علم تمہارے ساتھ ہو یہ وہ علم ہے جس کا تعلق صرف حق تعالیٰ کے ساتھ ہے اور مشاہدے کے طور پر وہبی ذریعے سے حاصل ہوتا ہے۔

اس کے برعکس ظاہری علم طب کی مثال لے لیجیے تو صاف بات ہے کہ اس علم کی ضرورت صرف وہاں ہو گی جہاں بیماری اور تکلیف ہو گی اور یہ دونوں اس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں مگر ذرا سوچئے جب تم اس جہان سے انتقال کر کے دوسرے جہاں چلے جاؤ گے جہاں نہ تو بیماری ہے اور نہ تکلیف تو وہاں تمہارا حاصل کردہ علم طب محض بے کار ہو گا کیونکہ وہاں تم کس کا علاج کرو گے ہ؟ اے بھائی! اس مثال سے تمہیں اچھی طرح سے معلوم ہوا ہو گا کہ صاحبان عقل کے نزدیک اصل علم وہ ہے جو اس کے ہمراہ عالم برزخ میں بھی رہے۔ یہ نہیں کہ سفر آخرت کے وقت علم تو اس جہاں میں رہ جائے۔ اور آدمی دوسرے جہاں انتقال کر جائے تو سمجھ لیجیے کہ ایک شخص کے ہمراہ آخرت تک جانے کے دو علوم ہیں اول حق تعالیٰ عزوجل کا علم اور دوئم آخرت کے معاملات کا علم۔ مقصد یہ ہے کہ اگر عالم آخرت میں حق تعالیٰ کی تجلیات کا ظہور ہو جائے تو تم ان کو پہچان سکو اور ان سے انکار کی نوبت نہ آئے اور تجلی حق کے وقت یہ نہ کہنا پڑے کہ "میں تیری شرف سے پناہ مانگتا ہوں" (نعوذ باللہ منک) جس طرح واقع ہوا ہے۔ اس لئے میرے بھائی! یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ اسی دنیا میں دونوں علوم

تم پر منکشف ہو جائیں اور اس کا ثمر............ تمہیں آخرت میں حاصل ہو جائے"(۱)

حضرت امام شعرانی رضی اللہ عنہ کی تقریر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ علم تصوف ایک وہبی علم ہے جس کا تعلق قلب سے ہے اور کسبی طور پر ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا اگرچہ کسب بھی اس کا ایک وسیلہ ہے اس لئے کہ ریاضت بھی اس کے لئے ضروری ہے سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو چیز اس قدر مشکل ہو کہ بغیر وھب کے حاصل نہ ہو سکتی ہو وہ کتنی باریک اور دقیق ہو گی اسی لئے تو کہا گیا ہے

فن التصواب ما ادق بیانہ

متحیر فیہ امام رازئی

حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ اپنی مکتوبات میں لکھتے ہیں:۔

"تصوف و سلوک کو اختیار کرنا اس لئے ضروری ہے کہ مجمل علم مفصل ہو جائے اور اجمالی معرفت تفصیلی ہو جائے"۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کا صرف علم ظاہر اجمالی ہوتا ہے جب تک اس کے ساتھ باطنی علم کو بھی حاصل نہ کیا جاوے۔ حق تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے کہ یاایھاالذین امنوا ادخلوا فی السلم کافتہ اے لوگو! جو ایمان لے آئے ہو پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ اور پورا اسلام دین اسلام کے ظاہری اور باطنی دونوں حصوں کو کہا جاتا ہے اس لئے کہ ظاہری اسلام تو زبانی اقرار، نماز،

---

(۱) حضرت امام شعرانی رضی اللہ عنہ کے ارشادات اتنے پر مغز، جامع اور مدلل ہیں کہ اگر ایک شخص ان کو دل و ایمان سے بار بار پڑھے تو امید واثق ہے کہ اس کے لئے حقیقت تک پہنچنے کے وہبی راستے کھل جائیں گے اور بیعت و سلوک کا اہتمام کرکے واصل بحق ہو جائے گا۔ الا ماشاء اللہ۔ طاہر چشتی

وضو اور دیگر ظاہری اسلامی شرائط ہیں۔ مگر باطنی اسلام اخلاص و احسان کو کہا جاتا ہے اور اصل اور ضروری چیز بھی یہی ہے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف لطیف کیمیائے سعادت میں لکھا ہے کہ اگر ایک شخص کسی چیز کو ایک گندے کپڑے میں باندھ لے اور پھر اس کو ایک خوبصورت اور بیش قیمت کپڑے کا غلاف چڑھا دے تو اگرچہ بظاہر تو وہ خوبصورت دکھائی دے گا مگر اس کا ظاہر اس کے باطن کے لئے قطعی طور پر مفید نہ ہو گا کیونکہ اس کے اندر (باطن میں) جو غلاظت پڑی ہے۔ وہ بہ ہر حال متعفن غلاظت ہی ہے۔ چنانچہ حق سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب و لکن البر من امن باللہ و الیوم الاخر و الملئکتہ والکتب والنبیین (بقرہ ایت ۱۷۷)

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا مغرب کو لیکن اصل کمال (نیکی) تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر ایمان رکھے۔ قیامت کے دن پر۔ فرشتوں پر اور سب کتب سماوی اور پیغمبروں پر۔ مختصر الفاظ میں یہ کہ مکمل اخلاص کے ساتھ نماز پڑھے۔ حدیث شریف میں بھی ارشاد ہوا ہے کہ لاصلوٰۃ الابحضور القلب وہ نماز۔ نماز ہی نہیں جو حضور قلب کے ساتھ نہ پڑھی گئی ہو اور اگر اخلاص ہو تو اخلاص کے اکمال کے بعد سالک پر ایسے علوم منکشف ہو جاتے ہیں جو علمائے ظاہر کے وھم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ظاہری علماء اہل اللہ سے انکار کرتے ہیں مگر فی الحقیقت یہ ان کے علم کی کوتاہی ہے۔ اسی سلسلے میں امام ربانی حضرت عبد الوہاب شعرانی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:۔

"کتاب و سنت کے جو معنے و مفاہیم صوفیہ حضرات بیان کرتے ہیں
تو ان کے متعلق اس وھم میں مبتلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں

کہ وہ یہ ظاہر نہیں گردانتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی آیت
کے معانی اور مطالب ان لوگوں کے علم اور عقل کے مطابق
تفاوت سے ہوتے ہیں بعض معنے ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے
ایت و حدیث موجود ہوتی ہیں اور زبان اور عام بول چال کے
روسے بھی ان پر دلالت کرتے ہیں تاہم اس کے (ایت کے)
دوسرے باطنی معنے اور باطنی مطلب بھی ہوتا ہے چنانچہ جب
(صوفیہ) کسی ایسی حدیث یا ایت کو پڑھتے ہیں تو یہی باطنی معنے
ان پر منکشف ہوتے ہیں۔ اور یہ انکشاف ان لوگوں پر خدا کی
طرف سے ہوتا ہے۔ کیونکہ حدیث نبوی ﷺ میں وارد
ہے کہ ہر ایت کا ظاہر' باطن' حد اور مطلع۔ سات سے لے کر
ستر تک ہے (یعنی ایک بطن سے لے کر سات اور سات سے لے
کر ستر باطنی معانی و مطالب سے مراد ہے -طاہر) پس ظاہر تو وہ
ہے جس کو ایک شخص یکدم قبول کرلے اور اسے سمجھ بھی لے
اور یہ وہ مفید علوم ہیں جن کے ذریعے نیک اعمال کئے جاتے ہیں
اور باطنی معارف ایسے حاصل ہوتے ہیں اور مطلع کا مفہوم یہ ہے
کہ جن کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہو۔ اور یہ شہود کلی ذاتی کی راہ
ہے چنانچہ اے بھائی! سمجھ لو کہ کسی ایت و حدیث کے ایسے
مطالب و مفاہیم جو عام لوگوں کے احاطہ علم سے باہر ہوں تو وہ تم
اس گروہ (صوفیہ) سے حاصل کرلو اور اپنے آپ کو کج بحثوں کی
طرح کج بحثی کے وجہ سے محروم نہ رکھو کیونکہ ان کج بحثوں کے
اس قسم کے معارضے بلاوجہ اور غلط ہوتے ہیں"۔

لہٰذا تصوف ایک ضروری علم ہے جو آخرت کے معاملات اور حق تعالیٰ عزوجل کی معرفت کی کلید ہے ہر ایک مسلمان کے لئے لازمی ہے کہ تصوف اختیار کرے اور اگر اسے اختیار نہیں کر سکتا تو اس صورت میں مناسب یہ ہے کہ اس علم اور اس علم کے علماء کی نسبت نیک گمان رکھے معا" یہ خیال بھی رکھے کہ امت کے تمام اولیاء اللہ رحمتہ اللہ علیہم اسی برگزیدہ گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے یہی مفید علم حاصل کیا تھا۔ اور جو لوگ اس علم کا انکار کرتے ہیں وہ اولیاء کی روش پر نہیں۔

فصل

مرشد سے بیعت لینا

کسی رہبر کامل کے بغیر محبوب تک رسائی ایک مشکل ترین کام ہے۔ اسی لئے تو چاند جیسا چہرہ رکھنے والے حسینوں کی گلی میں رہبر کی ضرورت ہوتی ہے (اور) مرشد کے بغیر مرید کی خبر کوئی بھی نہیں لیتا۔ (بالکل اسی طرح) جیسے فرزندوں کی حالت پر باپ کا دل چاک ہوتا ہے (رحمان بابا کے پشتو کے اشعار کا ترجمہ) تصوف ایک انتہائی لطیف و باریک اور مشکل ترین علم ہے اور گزشتہ اوراق میں ہم نے لکھا ہے کہ بغیر کسی کامل مرشد کے حاصل نہیں ہو سکتا لہٰذا ہر مسلمان پر واجب ہے کہ ایک کامل مرشد سے بیعت حاصل کرلے۔ حضور اقدس ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے من لا شیخ لہ فشیخہ الشیطن یعنی جس کسی کا مرشد (شیخ یا پیر) نہ ہو تو اس کا مرشد شیطان ہوتا ہے۔ (۱)

---

(۱) شیخ طریقت سے انکار ناممکن ہے اس سلسلے میں حضرت العلامہ مولانا سید گل حسن شاہ قلندر قادری قدس سرہ نے اپنی مایہ ناز کتاب تعلیم غوثیہ میں مسلم و مشکوۃ شریف سے حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہم کی یہ حدیث نقل کی ہے عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ من مات و لیس فی عنقہ بیعتہ مات میتتہ جاھلیتہ و من خلع یداً من طاعتہ لقی اللہ یوم القیامتہ ولا حجتہ لہ جو شخص ایسا مر گیا کہ اس کی گردن میں بیعت کی طوق نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مر گیا اور جس نے اطاعت الٰہی سے ہاتھ اٹھائے تو بروز قیامت اللہ سے اس طرح ملے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہ ہو گی۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ہر مسلمان سے بیعت لی جاتی تھی۔ اور یہ سنت نبوی ﷺ میں سے ایک اہم سنت ہے علمائے ظاہر دیگر سنتوں پر تو زور دیتے ہیں مگر بھولے سے بھی بیعت کا ذکر تک نہیں کرتے کہ جو بھی سنت نبوی ﷺ میں شامل ہے۔ (طاہر چشتی)

چنانچہ طالب حق کے لئے کسی کامل سے بیعت حاصل کرنا فرض ہے اور عوام کے لئے سنت موکد ہے۔ خط و کتابت کے ذریعے بھی بیعت درست ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے۔ یاایھاالذین امنوا اتقوالله وابتغوا الیه الوسیلته اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ پیدا کرو۔

مگر بہ ایں ہمہ بعض لوگ مرشد اور اس سے بیعت لینے کے خلاف ہیں اور اس ایت شریف کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ یہاں وسیلہ سے مراد اعمال صالحہ ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کا یہ خیال سراسر غلط ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ اس ایت مبارک میں کافروں سے مخاطب نہیں بلکہ مومنوں سے ارشاد ہوتا ہے کہ اے مومنو! ایمان تو بے شک تم لے آئے ہو مگر ایمان لانے کے بعد اب اللہ سے ڈرو یعنی اعمال نیک کا اہتمام کرو۔ ظاہر ہے کہ برے کاموں سے اپنے آپ کو بچانا ہی خوف خداوندی ہے اس لئے کہ بات تو بالکل صاف ہے کہ جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ عزاسمہ سے ڈرتا ہے وہ ہرگز بدی، برائی یا بد اعمالی نہیں کرتا۔ پس حق تعالیٰ ان کو برے افعال سے بچنے اور نیک اعمال کی بجا آوری کی ہدایت فرماتا ہے بلکہ حکم دیتا ہے کہ میری طرف ایک وسیلہ پیدا کرو۔ لفظ الیہ کی اضافت حق تعالیٰ کی طرف ہے اور اس سے مراد معرفت الٰہی ہے اور انسان بھی اسی معرفت ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے وما خلقت الجن والانس الالیبعلون ۔۔۔اے لیعرفون یعنی اللہ تعالیٰ عزوجل نے جنات و بنی آدم کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے اور عبادت سے مراد معرفت ہے اور معرفت ایک ایسا علم ہے کہ بغیر کسی کامل استاد (مرشد) کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب اس دنیا کا ایک معمولی فن بغیر کسی ماہر استاد کے حاصل نہیں ہو سکتا تو معرفت الٰہی جو ایک مادی علم نہیں۔ یونہی کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ ایسا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے

فرض کیجیے "وسیلہ" سے مراد نیک اعمال ہوں تو ذرا غور سے کام لینا چاہیے کہ

تمام اعمال کا مدار نیت پر ہوتا ہے الاعمال بالنیات یعنی اعمال نیت پر موقوف ہیں اور جب تک نیت میں مکمل اخلاص نہ ہو کوئی عمل قبول نہیں ہو سکتا۔ حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے کیمیائے سعادت میں لکھا ہے کہ ظاہر باطن کا غلاف ہے اور غلاف چاہے کتنا بھی خوبصورت ہو یا پاکیزہ ہو لیکن اگر غلاف کے اندر گندگی بھری ہو تو ایسے خوبصورت غلاف کا کیا فائدہ۔ یہ مثال ہم نے تصوف کے بیان میں دی ہے اب جب اعمال کے لئے اخلاص ضروری ہے اور اخلاص بغیر تصوف کے حاصل نہیں ہوتا تو تصوف کے لئے ایک مرشد کی ضرورت ایک لازمی امر ہے اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

یسئلونک عن الاھلتہ قل ھی مواقیت للناس والحج ولیس البر بان تاتوا البیوت من ظھورھا والکن البر من اتقٰے واتوا البیوت من ابوابھا واتقو اللہ لعلکم تفلحون (البقرہ ایت ۱۸۹)

آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلہ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے (اختیاری معاملات مثل عدت اور مطالبہ حقوق کے لئے اور غیر اختیاری عبادات مثل حج اور زکوۃ وغیرہ کے لئے) اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں پشت کی طرف سے آیا کرو لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام چیزوں سے بچے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آئے اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو امید ہے کہ تم کامیاب ہو۔

مراد یہ کہ جہاں بھی جانا ہو بغیر وسیلہ کے مت جاؤ یعنی ہر ایک کام وسیلے سے شروع کرو۔ اور حق تعالیٰ کی معرفت کا مقام ایک گھر فرض کر لو اور دروازہ مرشد سمجھ لو اس لئے کہ یہی مرشد ہی اپنے مرید کو باطنی علوم سکھاتا ہے جو معرفت کے لئے ضروری ہوتے ہیں مولوی ثناء اللہ امرتسری صاحب نے جو وہابیوں کے ایک مانے ہوئے عالم ہیں اپنے رسالہ "شریعت و طریقت" میں بھی یہی کیا ہے کہ اخلاص کے بغیر تصوف

حاصل نہیں ہو سکتا

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا پیر قرآن ہے اور ہمیں کسی دوسرے پیر کی ضرورت نہیں۔ مگر ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کہتا پھرے کہ ہمیں صرف قانون (کتاب) کی ضرورت ہے، بادشاہ (نافذ کرنے والے) کی ضرورت نہیں، نہ ہی ہمیں بادشاہ کے نائب کی ضرورت ہے اور نہ ہی نائب کے نائب کی۔ (ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ) قرآن ایک مکمل کتاب ہے اور اس میں صرف او امرو نواہی کا ذکر نہیں بلکہ بحیثیت کلی سب کچھ موجود ہے۔

(ولا رطب و لا یابس الا فی کتب مبین خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے) اب جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے جو اسلام کا اصل الاصول ہے وہ اس میں کیوں نہ ہو گی پھر تصوف کا علم جو معرفت الٰہی کی بنیاد ہے اس کا ذکر تو قرآن حکیم میں ضروری طور پر ہونا چاہیے اور یقیناً" قرآن حکیم میں موجود بھی ہے۔

علم تصوف وہ علم ہے جس کے متعلق میرے مرشد پاک (قدس سرہ) کا ارشاد ہے کہ "جن لوگوں کا یہ عندیہ ہو کہ اسی قرآن مجید میں باطنی علم موجود ہے تو وہ مندرجہ ذیل چند باتوں کا صحیح جواب دے اور جو لوگ فقر کا دعوئ کرتے ہوں اگر ان کو یہ معلومات حاصل نہ ہوں وہ مدعی ہوں گے (تاہم) وہ لوگ جو علم باطنی یا فقر کا علم قرآن مجید کی ایتوں میں تسلیم نہیں کرتے (ان پر ہمیں حیرت ہوتی ہے) وہ یہ خیال نہیں کرتے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے۔

جمیع العلم فی القرآن لکن
تقاصر عنہ افہام الرجال

بہر حال فقیر وہ ہے جس کو ان باتوں کا علم ہو۔

اول یہ کہ موجودہ پنج وقتہ فرض نمازیں ابتدا میں پانچ رسولوں نے نفل شکرانہ کے طور پر ادا فرمائی تھیں جو اب ہم پر فرض کی گئی ہیں ان کا معاملہ تفصیلاً" یوں ہے کہ صبح کی نماز حضرت آدم علیہ السلام نے، ظہر کی نماز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے، عصر کی نماز حضرت یونس علیہ السلام نے، شام کی نماز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اور عشاء کی نماز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ادا فرمائی ہیں (اور اس امت پر فرض کی گئی ہیں)

مگر ۔۔۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پانچوں وقتوں کی پانچ نمازیں تو دیگر انبیاء علیہم السلام نے ادا فرمائی تھیں۔ خود حضور اقدس ﷺ نے کونسی نماز ادا فرمائی تھی۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ حضور اقدس ﷺ نے نماز وتر ادا فرمائی تھی۔ تو پھر ہمیں یہ بتایا جائے کہ آپ ﷺ نے یہ نماز کہاں ادا فرمائی تھی۔ نیز یہ کہ یہ وتر فرض نماز ہے، سنت ہے یا واجب ہے۔ یا (اسی وتر نماز کا معاملہ یوں ہے) کہ اسی وتر نماز کی ایک رکعت فرض ایک واجب اور ایک سنت ہے (اگر معاملہ یہ ہو) تو اس سے تو یہ ثابت ہو گیا کہ صرف ایک رکعت نماز بھی مشروع ہے۔

(اسی طرح) قرآن حکیم میں چودہ سجدے ہیں۔ (انفرادی سجدہ) ایک ہی کیا جاتا ہے یثاق کے روز بھی تمام ارواح کو ایک ہی سجدے کا حکم ہوا تھا نہ کہ دو سجدوں کا۔ اب اگر صرف ایک ہی سجدے کا حکم ثابت ہو جائے جیسا کہ فی الحقیقت ثابت ہے۔ تو معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے سولہ مواضعات میں ایک ایک رکعت نماز بھی نازل فرمائی ہے جہاں تک سترہ رکعت نماز کا تعلق ہے تو وہ موقتی نماز ہے۔ مگر (تعجب یہ ہے کہ) ان میں صلوٰۃ الوسطیٰ یا درمیانی نماز معلوم نہیں جس کے بارے میں حکم خداوندی ہے۔

حٰفظوا علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطٰے

البقرہ۔ حفاظت کرو سب نمازوں کی (عموماً) اور درمیان والی نماز کی (خصوصاً) (۱)

مگر چونکہ صلوٰۃ الوسطیٰ کے متعلق اختلاف موجود ہے تاہم بعض فقرا یہ فرماتے ہیں۔ "ہم صرف ایک رکعت نماز بھی ادا کرتے ہیں"

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آیا یہ ایک رکعت نماز جائز بھی ہے یا نہیں۔ اگر یہ جائز نہ ہو تو پھر سولہ مواضعات پر سولہ رکعت نمازوں میں ایک ایک رکعت کیونکر

---

(۱) اگر علمائے کرام صلوۃ الوسطیٰ انہی معلوم فرض نمازوں میں سے ایک نماز کو کہتے ہوں۔ تو ہم عرض کریں گے کہ وہ تو پہلے ہی سے فرض کی گئی ہیں۔ یہاں پر حفظوا صیغہ امر ہے (جو قابل غور ہے)۔ دوسری طرف علماء حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ الوسطیٰ معلوم ہی نہیں اگرچہ اس سلسلے میں کثرت سے احادیث موجود ہیں تاہم علماء ان سے صلوٰۃ الوسطیٰ کا تعین ثابت نہیں کر سکے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جو چیز اختلافی ہو جائے اس کا تعین تو ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ایک عظیم شبہ نے جنم لیا اور وہ بھی "فرض" میں اور جب فرض میں شک و شبہ جنم لے لے تو اس کو ترک کرنے میں کتنا بڑا گناہ ہو گا۔ سوچنے کی اصل بات یہ ہے کہ حفظوا (صیغہ امر) کا صاف مطلب تو یہ ہے کہ "حفاظت کرو" اس نماز کی ادائیگی کی۔ مگر دوسری جانب وہ کسی شک و شبہ کے بغیر "معلوم" ہی نہیں کہ آخر وہ ہے کونسی نماز جس کو ایک بندہ خدا انتہائی خضوع اور خشوع کے ساتھ ادا کر دے۔ چنانچہ صاف طور پر یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ امر الٰہی کے بموجب اس کی "حفاظت" نہ ہو سکی۔ جو انتہائی غم و اندوہ کے علاوہ بے حد افسوس کی بات ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ نماز ان پانچ نمازوں کے علاوہ کوئی اور نماز ہے جو فرض بھی ہے تو یہ اصول کے خلاف ہے۔

(مولف)

جائز ہوئی۔ بس اصل سوچنے کی بات یہی ہے۔

دوسری بات یہ کہ علمائے ظاہر فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام نے "فقر" کو کس کونے میں چھپا رکھا ہے۔ مطلب ان کا یہ ہے کہ کوئی چیز چھپی نہیں ہے۔ لیکن ذرا خالی الذہن ہو کر سوچئے کہ حق تعالیٰ جل مجدہ نے ابتدا میں بسم اللہ شریف نازل فرمائی ہے اور اس کے انیس حروف ہیں۔ اگرچہ بیسواں حرف محذوف ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ لفظ دراصل "باسم" ہے مگر سارے علماء حضرات "بسم" پڑھتے ہیں لیکن اگر انتہائی غور و فکر کے ساتھ یہ لفظ ادا ہو تو یہی ... "الف"... ہی فقر کی رمز ہے اور بسم اللہ شریف کے معنے ہیں کہ :۔

شروع کرتا ہوں یہ کتاب اللہ کے نام سے (جو رحمان و رحیم ہے) لیکن سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ خود بسم اللہ شریف (جس کی عظمت کی کوئی حد نہیں) کیسے اور کن الفاظ سے شروع ہو گی۔ اور سنیئے اور غور کیجئے کہ الحمد شریف سے میم (م) محذوف ہے چونکہ سورہ بقرہ الم سے شروع ہوتی ہے اور فاتحہ شریف میں الف لام (ال) تو موجود ہے۔ اور فاتحہ میں بھی "الم" ہوتا مگر وہاں میم (م) محذوف ہے بس یہی فقر کی رمز ہے۔ بلکہ قرآن میں حروف مقطعات الم سے لے کر والناس تک فقر کے رموز ہیں نون اور سین کی گولائی کے حصے، نون کی قطنی اور میم کا ضمہ سب فقر کی رمزیں ہیں حروف مقطعات کے معنے کسی کتاب میں موجود نہیں اور اگر کسی مفسر قرآن نے لکھے بھی ہوں تو وہ اس کی اپنی رائے ہے۔ اسی لئے ان معنوں میں بھی بہت سارا اختلاف ہے۔ مگر خیال رہے کہ یہی حروف فقر اور علم باطنی کا خزینہ ہیں اور فقراء انہی میں محو ہوتے ہیں بلکہ جو فقیر ان میں محو نہ ہو اور معاً اس کا علم نہ رکھتا ہو فقیر کہلانے کا حق نہیں رکھتا۔

تیسری بات ہے کہ راتوں میں لیلتہ القدر ساعتوں میں ساعت جمعہ،

پیغمبروں میں ایک پیغمبر، قرآن مجید میں ایک اسم اعظم۔ نمازوں میں صلوٰۃ الوسطیٰ بنی آدم میں ایک بنی آدم (خضر علیہ السلام) فرشتوں میں ایک فرشتہ۔ آسمانوں میں ایک آسمان زمینوں میں ایک زمین اور پتھروں میں ایک پتھر (سنگ پارس) سب مخفی ہیں اور یہ سبھی فقر کے اسراروں میں شامل ہیں اور جو فقیر ان سے واقف اور باخبر نہ ہو اس کے فقر کا دعویٰ جھوٹا ہو گا۔

چوتھی یہ کہ:۔

مرج البحرین یلتقیٰن بینھما برزخ لا یبغین فبائی آلاء ربکما تکذبٰن یخرج منھما اللؤلؤ والمرجان

ان آیات کے ایسے معنے ہونے چاہیے جن میں اختلاف کا کوئی دخل نہ ہو۔ کہ وہ دونوں دریا کہاں اور کس موقعہ پر موجود ہیں۔

پانچویں بات یہ کہ حروف ھجاء میں سے حرف غین (غ) قرآن مجید میں کہیں بھی مشدد نہیں۔ آخر کیوں۔ اور اس کی وجہ کیا ہے۔ اسی طرح حروف مقطعات میں سے جہاں جہاں الم، طسم، وعلیٰ حذاالقیاس میں حرف میم (م) مشدد ہیں اور اس تشدید کا تلفظ اور ادائیگی کیسی ہو گی۔ اور ان کی ادائیگی کے علاوہ ترتیل کا طریقہ کیا ہو گا۔

یہ چند ایک باتیں اسرار باطنی میں سے ہیں۔ اور یہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اسی لئے اس علم باطنی کو حاصل کرنے کے لئے ایک مرشد کامل کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ یہ علم سالک باصفا کے آئینہ قلب میں منعکس کرکے نقش کرلے۔ کیونکہ قرآن حکیم میں تو سب کچھ موجود ہے لیکن وہ سب کچھ حاصل کرنا ہر شخص کا کام نہیں کیونکہ عقل و روحانیت میں فرق تو ظاہری بات ہے اب غور فرمایئے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی موجودگی میں پیر کی ضرورت نہیں تو ہمارے نزدیک ایسے لوگوں کی مثال ان اندھوں کی طرح ہے جو ایک ہاتھی کو سمجھنے اور معلوم کرنے کے لئے اکٹھے

ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک اندھے نے ہاتھی کے پاؤں پر ہاتھ رکھا تو کہنے لگا "ہاتھی ستون کی طرح ہوتا ہے" دوسرے اندھے نے ہاتھی کے کان پر ہاتھ رکھا تو اعلان کیا کہ "ہاتھی پنکھے کی طرح ہوتا ہے" انہوں نے جب اپنے ظاہری علم کے مطابق جس چیز کو قرآن حکیم میں دیکھا تو اپنی بساط کے مطابق اسی قدر سمجھ گئے کہ قرآن مجید کے اصلی معنے اور مدعا یہی ہے ما بقایا اس سے پرے کچھ بھی نہیں۔ گویا قرآن مجید نے اکمال دین کا جو دعویٰ یوم القیامت تک کیا ہے اور نیز یہ کہ روز حشر تک انسانی ضروریات کے تقاضوں کے مطابق سب کچھ اس میں موجود ہے تو خدا نخواستہ وہ درست نہیں۔

افسوس تو یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن حکیم میں تدبر اور غور کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ لوگ دل کی آنکھوں سے محروم ہیں (ا) کیونکہ اگر انہوں نے دل کی آنکھوں سے دیکھا تو یہ قرآن عظیم الشان کا اعجاز ہے کہ یہ ہر روز ایسے نئے نئے اور نادر معانی اور مفاہیم دے گا جنہیں دیکھ کر انسان حیرت کی ایک عجیب دنیا میں داخل ہو جائے گا۔

اسی طرح ظاہر بین یہودیوں نے بھی حضور اقدس ﷺ سے "روح" کے بارے میں پوچھا

تو حضور اقدس ﷺ نے حق تعالیٰ عزاسمہ کی طرف سے یہ جواب دیا تھا۔

قل الروح من امر ربی

اور یہ لوگ آپ سے (امتحاناً) روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ ﷺ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کا امر ہے

(ا) یہاں پر حضرت علامہ محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ کا یہ شعر قابل غور ہے

دل بینا بھی کر خدا سے طلب

آنکھ کا نور دل کا نور نہیں (مترجم)

اور آگے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (بنی اسرائیل ایت نمبر۸۵)

"اور ہم نے تم کو بہت تھوڑا علم دیا ہے"۔

یعنی روح کی حقیقت کو سمجھنا تم لوگوں کے عقل و ادراک سے بہت دور ہے جسے تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ تو یہ ناسمجھ کہنے لگے کہ محمد ﷺ کو روح کا علم نہیں ہے اور یہ خیال نہ کیا کہ روح کی معرفت کا علم اتنا آسان کام نہیں جو ہر کہہ و مہہ کی سمجھ میں آسکے۔

اس ضمن میں کافر تو کافر ہے ایک کامل الایمان کے احاطہ علم سے بھی باہر ہے کہ اس کی سمجھ میں آسکے ۔۔ جب تک کہ وہ موتوا قبل ان تموتوا کی منزل طے نہ کر لے وجہ اسکی یہ ہے کہ روح و نفس کی معرفت ہی معرفت الٰہی کی کنجی ہے (یہاں پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض لوگ روح اور نفس کو دو عدد جدا جدا چیزیں مانتے ہیں مگر میرے **مرشد پاک** (قدس سرہ) کا ارشاد ہے کہ "روح اور نفس ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ البتہ اس کی خاصتیں بدلتی رہتی ہیں جس وقت یہی نفس مطمئن اور قدسی ہو جاتی ہے تو اس حالت میں اس پر روح کی اطلاق ہو جاتی ہے ورنہ بصورت دیگر نفس کہلاتی ہے) بہر حال ان یہودیوں کی مثال بھی ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی ہے جن کو اگر حکومت کے تدابیر اور فوائد بیان کئے جائیں تو لامحالہ یہ باتیں ان کی سمجھ میں نہ آئیں گی کیونکہ وہ تو صرف کھیل اور کھلونوں کی حد تک ہی سوچ سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کہ اگر کسی ایک اجڈ اور جاہل شخص کو فلسفے کے نکات بیان کئے جائیں تو اس کی سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔ چنانچہ یہی مثال ظاہر بینوں کی ہے یہ لوگ جس ظاہری کام کو سمجھ لیتے ہیں تو اس کا اقرار کرتے ہیں مگر چونکہ باطنی بات کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ تو اس کا انکار کر لیتے ہیں اور یہی بات ان کے لئے باعث عذاب ہے۔

بلاشبہ قرآن کریم میں ہر ایک علم موجود ہے۔ مگر صرف قانون کی کتاب کی موجودگی سے کیا بنتا ہے۔ جب تک اس پر عمل نہ ہوتا ہو۔ اور قرآن عظیم الشان کے بارے میں تو ہم نے گذشتہ اوراق میں واضح طور پر کہا ہے کہ ہر ایک آیت کے سات سے لے کر ستر تک معانی ہیں یہاں تک کہ اسی قرآن مجید میں ایسے حقائق بھی موجود ہیں جن کا علم ماسوائے آنحضرت ﷺ اور کاملین اولیاء کے علاوہ کسی کو بھی حاصل نہیں۔ حروف مقطعات کو لے لیجیے۔ کہ بکثرت لوگوں نے اپنی رائے اور فہم کے مطابق ان کے معانی بیان کئے ہیں جیسے مرزا علام احمد صاحب قادیانی نے یہ معنے کئے ہیں کہ ان اللہ اعلم(۱) یعنی خدا عالم ہے یا "انا اللہ اعلم" یعنی میں اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ مگر ایک جاہل سے جاہل آدمی بھی یہ معنے قبول نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ حروف مقطعات ایک بھید کی طرح ہیں۔ اور اگر یہ راز کی صورت میں نہ ہوتے تو حق تعالیٰ ان کو مقطعات کی صورت میں کیونکر نازل فرماتے۔ جس طرح بادشاہ لوگ تار و ٹیلیگراف میں ایک خاص کوڈ کے طور پر الفاظ و اشیاء کے ناموں کا استعمال کرتے ہیں اور جنگ وغیرہ کی حالت میں صرف وہی لوگ ان کے اصلی مفہوم سے واقف ہوتے ہیں جن کو ان کے متبادل معنے پہلے سے بتائے جا چکے ہوتے ہیں کیونکہ وہ ہمراز ہوتے ہیں چنانچہ ان کو سمجھ لیتے ہیں۔ اور ان اللہ یعلم کے معنے تو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آئے ہیں۔ و یعلم ما فی الارحام
یا یعلم ما فی السمٰوٰت والارض و یعلم ماتسرون وما تعلنون وغیرہ

بہر حال حروف مقطعات میں جہاں تک الم کا تعلق ہے تو اہل سنت میں سے

---

(۱): یہ ان اللہ یعلم ہونا چاہیے۔ یعنی اعلم نہیں بلکہ یعلم درست ہو گا

بعض حضرات اس کے یہ معنے بیان کرتے ہیں کہ الف ۰ بمعنی اللہ لام ۰ بمعنی جرائیل علیہ السلام اور میم ۰ بمعنی محمد ﷺ پھر ان کو بڑھا پھیلا کر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن جرائیل علیہ السلام کے ذریعے محمد ﷺ پر نازل فرمایا مگر فی الاصل ان مقطعات کے یہ معنی بھی حقیقت سے دور و دراز ہیں۔ اور اس کی معقول وجہ ہے کیونکہ قرآن حکیم میں اکثر مقامات پر صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن شریف جرائیل علیہ السلام کے ذریعے نازل ہوا ہے۔ سورت مبارک الشعراء میں حق تعالیٰ عزاسمہ کا ارشاد ہے

وانہ لتنزیل رب العلمین ۔نزل بہ
الروح الامین ۔علٰے قلبک لتکون من المنذرین ۔

اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے (یعنی جرائیل امین علیہ السلام) آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں تاکہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں۔ سورہ شعراء ایت نمبر ۱۹۴۔۱۹۲

مدعا یہ کہ یہ تو کوئی راز کی بات نہ ہوئی حق تعالیٰ کا ارشاد واضح ہے چنانچہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے مستقل معنی مخفی ہیں اور ان کو سمجھنا ان لوگوں کا حصہ ہے جن کو الراسخون فی العلم فرمایا گیا ہے۔ مزید برآں قرآن حکیم میں متشابہات بھی ہیں علاوہ ازیں الرحمان علی العرش استوٰی ---اور--- یداہ مبسوطتان وغیرہ آیتوں کے معنی کیونکر ہوں گے۔ ان حقائق کے پیش نظر جب یہ بات ہو گئی کہ قرآن مجید میں ایسے حقائق بھی موجود ہیں جو عام لوگوں کے علم و عقل سے دور و دراز ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم تو حق تعالیٰ جل مجدہ نے ہدایت کے لئے نازل فرمایا ہے تو ایسی باتوں کا کیا فائدہ جس کو عوام ہی نہ سمجھ سکے (ا)

تاہم اس ضمن میں میرے **مرشد پاک** (قدس سرہ) کا ارشاد ہے کہ ”بنی آدم

چار حصوں منقسم ہیں:۔اول عام لوگ، دوسرے خاص لوگ، تیسرے خاص الخاص لوگ اور چوتھے اخص لوگ۔ اسی طرح قرآنی آیات و احکام بھی چار قسم کی ہیں بعض آیتیں عام لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ علمائے ظاہران کو بھی خاص لوگوں پر محمول کرتے ہیں۔ یا خاص لوگ ان آیتوں کو جو خالصتاً" ان کے لئے نازل ہوئی ہوتی ہیں۔ خاص الخاص لوگوں پر محمول کرتے ہیں۔

اسی طرح احادیث نبوی ﷺ بھی چار حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ اس صورت حال میں علماء کے لئے ضروری ہے کہ ہر ایت اور حدیث کے موقعہ کو پہچان سکیں۔ نیز وہ یہ بھی جان سکیں کہ یہ ایک ایت یا حدیث کس قسم کے لوگوں کے لئے نازل ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے ظاہر صوفیائے کرام کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے۔ امام الموحدین حضرت ابوبکر واسطی رضی اللہ عنہ نے اس ایت شریف ولو شاء ربک لامن من فے الارض کلھم جمیعا" (سورہ یونس ایت ۹۹

---

(۱) یہاں پر یہ سوال ہی غلط ہے قرآن عظیم الشان تو خیر اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، یہاں تو بشری کلاموں کی تشریحات و توضیحات کا حق بھی آج تک پوری طرح ادا نہیں ہو سکا ہے۔ مثال کے طور پر آپ حضرت شیخ اکبر رضی اللہ عنہ کی تصنیفات فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم مولانا جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ کی مثنوی شریف، دیوان حافظ اور شیخ فرید الدین عطار رحمتہ اللہ علیہ کی منطق الطیر یا بصورت دیگر شکسپیئر کے ڈراموں، سقراط و افلاطون کے افکار کو لے لیجیے۔ یہ سب کتابیں عوام کے لئے عوام ہی کی زبانوں میں لکھی گئی ہیں مگر ان پر تحقیقات تادم تحریر جاری ہیں جب انسانوں کے کلام کا یہ حال ہو تو اللہ کے کلام کا کیا کہنا۔ دوسری بات یہ کہ ماہر استادوں کے علاوہ عوام ان کتابوں کی ابجد کو بھی نہیں سمجھتے۔ (مترجم)

اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے کی تفسیریں کی ہے "کہ حق تعالیٰ جل مجدہ نے اس ایت کریمہ میں مدح و ذم یکسر رفع فرمائی ہے تو اس لحاظ سے نہ تو کوئی معذور رہا اور نہ غیر معذور، نہ نیک بخت اور نہ بدبخت۔ اب اگر علمائے ظاہر اس ایت کی یہ تفسیر نہ تسلیم کر لیں تو ان کی مرضی۔ تاہم ابوبکر واسطی رضی اللہ عنہ عظیم الشان ولی اللہ ہو گذرے ہیں۔

مراد یہ کہ ایسی باتیں خواص سے متعلق ہیں۔ ایک قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ " ایک تو یہ ظاہری علم ہے جو میں تمہیں بیان کر رہا ہوں مگر حضور اقدس ﷺ نے مجھے ایک اور دوسرا ایسا علم بھی سکھایا ہے اور اگر میں اس کو ظاہر کروں تو تم مجھے قتل کر دو گے " تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو ایک ایسا علم بھی سکھایا گیا تھا جس سے اکثر اصحاب رضی اللہ عنہم بھی بے خبر تھے۔ گویا وہ شریعت کے خلاف بھی تھا۔ ورنہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یہ کیوں فرماتے کہ تم مجھے قتل کر دو گے۔ یعنی ان کے قتل کا ارادہ اس وقت کے صحابہ رضی اللہ عنہم اس لئے کرتے کہ وہ علم ظاہری شریعت کے خلاف ہو گا۔ ورنہ ان کی یہ بات بے معنی ہوتی کہ "تم میری گردن مار دو گے"۔

بہرحال اسی باطنی علم کو حاصل کرنے کے لئے ایک کامل مرشد کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ یہاں پر اگر کوئی یہ کہدے کہ اپنے کسی پچھلے بیان میں تم نے کہا تھا کہ ہر ایک انسان کے اندر ایک وصف ایسی بھی ہوتی ہے جو بدلتی نہیں اور وہ فطری ہوتی ہے چنانچہ بالفرض ایک آدمی کی فطرت میں غرور موجود ہو تو ایسے شخص کو مرشد سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو روئی ہم کسی جولاہے پر فروخت کرتے ہیں اور پھر وہ اسی روئی سے کھدر بنا لیتا ہے اور ہم اسی کھدر کو چار آنے فی گز کے حساب سے خریدتے ہیں لیکن اگر یہی روئی ہم کسی جدید اور اعلیٰ کارخانے کے مالک

کے ہاتھ فروخت کریں تو وہ اپنی مشینوں کے ذریعے بہترین اور خوشنما رنگوں کے آمیزش کے ساتھ اسی روئی سے خوبصورت کپڑا تیار کرے گا جو چار روپے گز کے حساب سے فروخت ہو گا۔ ظاہر ہے کہ کپڑوں کی اصل تو یہی روئی ہو گی مگر ہنر مندی اور کوشش کے ذریعے ایک کپڑا چار روپے فی گز اور دوسرا صرف چار آنے گز فروخت ہوتا ہو گا تو مطلب یہ ہے غرور تو غرور ہی رہے گا مگر اس کی حالت کی نوعیت بدل جائے گی اور ایسا انسان مغرور نہیں بلکہ ۔۔ "غیور"۔۔ ہو جائے گا۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ انگریزی رائفل ہماری دیسی رائفل کے مقابلے میں انتہائی اعلیٰ مضبوط اور پائیدار ہوتی ہے (حالانکہ) ان کی بنیادی وصف تو ایک ہوتی ہے مگر پھر بھی دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے)۔

ہم نے گذشتہ بیان میں لکھا ہے کہ بیعت عام لوگوں کے لئے سنت موکدہ ہے(۱)

---

(۱)یہاں پر علمائے ظاہر اور علمائے باطن کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے عجیب بات ہے کہ ظاہری دینی تسلط تو ظاہری علما کو حاصل ہے مگر شائد کسی نے بھی یہ نہ سنا ہو گا کہ کسی عالم ظاہری نے ارشاد فرمایا ہو کہ سنتوں میں ۔۔ بیعت بھی سنت ہے۔ ویسے تو وہ ہزار ہا سنتوں کی تلقین فرماتے رہتے ہیں مگر بیعت کے سلسلے میں منقار زیر پر ہیں سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ جبکہ صوفیاء میں یہ سنت ۔۔ سنت موکدہ کے طور پر تا حال جاری و ساری ہے اور اس کی اہمیت اسی ایت اور متعدد احادیث نبوی ﷺ سے بخوبی ظاہر ہے۔

اس ایت کریمہ میں حضور اقدس ﷺ کی شان بھی بیان فرما دی گئی ہے کتنی محبت کی بات ہے کہ یہاں پر حق تعالیٰ جل مجدہ (بقیہ اگلے صفحے پر)

اور یہ فرمان الٰہی اسی بیعت کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم (سورہ الفتح ایت نمبر ۱۰)

جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں تو وہ (واقع میں) اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے"

بیعت کے سلسلے میں میرے **مرشد پاک** (قدس سرہ) فرماتے ہیں کہ "فقر

نے اپنے پیارے رسول ﷺ کو ۔۔اللہ۔۔۔ یعنی اپنے ذاتی نام سے بھی سرفراز فرما لیا۔ غور فرمائیے۔ بیعت حضور اقدس ﷺ سے ہو رہی ہے۔ مگر حضرت حق جل مجدہٗ اتنے خوش ہیں کہ ارشاد ہوتا ہے۔انما یبایعون اللہ یعنی وہ اللہ سے بیعت ہو رہے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ بیعت لینے والوں کے ہاتھوں کے اوپر والا ہاتھ حضور اقدس ﷺ کا دست مقدس تھا مگر اس اعزاز کا کیا کہنا جو حضرت حق عز اسمہ کی جانب اقدس سے عطا ہوا۔ اور فرمایا گیا کہ ید اللہ فوق ایدیھم یعنی اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے حالانکہ وہ ہاتھ حضور اقدس ﷺ کا دست مبارک تھا۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ویسے تو حق تعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ کو متعدد مقامات پر اپنے اسماء و صفات سے یاد فرمایا ہے یعنی رؤف و رحیم وغیرہ ناموں سے یاد فرمایا گیا ہے یہاں پر اور خصوصا" جنگ بدر کے موقعہ پر وما رمیت اذ رمیت و لکن اللہ رمٰی (اور اے رسول ﷺ وہ کنکر تم نے نہیں اللہ نے پھینکے تھے) یعنی یہاں بھی حضور اقدس ﷺ کو اسم ذات ۔۔ اللہ ۔۔ سے یاد فرمایا گیا ہے۔ یہی نور محمدی ﷺ ہے یہی مقام وحدت یا تعین اول ہے۔ طاہر چشتی

درویشی کا راستہ انتہائی سخت اور دشوار گذار ہے اگر پختہ ارادہ، مکمل عزم اور اشتیاق نہیں رکھتے تو اس راہ میں قدم نہ رکھنا" اسی طرح تمام اولیاء اللہ کا یہ مذہب ہے کہ یہ راستہ بغیر مرشد کامل کے قطع کرنا ناممکن ہے۔ اور مجمع السلوک میں حضرت ابوعلی دقاق رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان درج ہے:۔

"جو کوئی کسی شیخ کا مرید نہیں
اور اللہ تعالیٰ کو طلب کرتا ہے وہ صراط مستقیم
پر نہیں ہے بلکہ اپنی خواہشات کی غلامی میں مبتلا ہے۔"

حضرت مولانائے روم قدس سرہ فرماتے ہیں:۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون یعنی اگر تم نہیں سمجھتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو اور اہل ذکر کامل اولیاء ہیں جو ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہوتے ہیں یہ اللہ کے تابعدار بندے ہوتے ہیں جیسے فرمان الٰہی ہے واتبع سبيل من اناب الی (لقمان ایت نمبر۱۵) اور اس شخص کی پیروی کرنا جو میری طرف رجوع ہو" ظاہر بات ہے کہ ہر کامل مرشد کی رجوع الا اللہ ہوتی ہے۔ بلکہ وہ اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک ہر چیز سے زیادہ راجع الی اللہ نہ ہو اور اس سے محبت نہ کرتا ہو۔ والذين امنوا اشد حبا" لله اور حدیث مبارک میں ہے۔

اطلبو الرفيق ثم الطريق

پہلے ساتھی تلاش کرو بعد ازاں منزل پر روانہ ہو اور اس سے بھی مراد مرشد کامل ہے۔ آنحضرت ﷺ کا یہ بھی ارشادہ ہے۔

من مات و لم یعرف امام زمانہ مات میتتہ جاھلیتہ

جو شخص اس حالت میں مرگیا کہ اس نے امام زمانہ کو نہ پہچانا ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرگیا۔ میرے خیال میں اس سے ظاہری علم کا امام مراد نہیں اس لئے کہ ظاہری علم کے امام اپنے علم و اجتہاد کی وجہ سے مشہور و معروف ہوتے ہیں ان کا پہچاننا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ اور بالفرض اگر ہوتا تو" لم یعرف کی بجائے "لم یدرک" فرماتے۔ یعنی جس شخص نے اپنے زمانے کے امام کو دریافت نہ کیا یا اس تک نہ پہنچ سکا" امام زمانہ وہ ہوتا ہے کہ زمانہ اس کا محکوم ہو وہ حاکم ہوتا ہے اور جو زمانہ گذرتا ہو یا جو زمانہ آنے والا ہو مثلاً" صبح سے شام ہوتی ہے اور شام سے صبح ہوتی ہے تو وہ زمانے کی مقتضیات کا پابند ہو اور بلا روک ٹوک ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہو اور اس کا کوئی لمحہ حیات یاد الہی سے خالی نہ ہو اور فے الحقیقت یہ فقیروں کی شان ہوتی ہے جیسے ارشاد ربانی ہے

الذین یذکرون اللہ قیماً" و قعوداً" و علی جنوبھم(آل عمران) ایت نمبر۱۹۱۔

(وہ لوگ) جن کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی اور لیٹے بھی۔

اور جو طالب صادق خلوص نیت سے کامل فقراء کی خدمت کرے تو انہیں ضرور پہچان بھی لیتا ہے ممکن ہے کوئی یہ اعتراض کرے کہ سارے پیر تو وقت کے امام نہیں ہو سکتے۔ تو پھر ان سب کی بیعت کیا ضروری ہے۔ کیونکہ بیعت تو امام زمانہ کی ضروری ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام زمانہ اگر کسی کا اپنا مرشد نہ ہو تو اس کا مرشد ضرور امام زمانہ کو پہچانے گا۔ اور اس کا مرشد ضرور اس زمانے کے امام کے مذہب پر ہو گا۔ مثلاً" ایک بادشاہ کی مثال لے لیجیے جس نے فرداً" فرداً" ساری رعیت کو نہیں دیکھا

ہوتا ہے نہ فرداً" رعیت نے بادشاہ کو دیکھا ہوتا ہے مگر ساری رعیت اس کو بادشاہ تسلیم کرتی ہے اور ساری رعیت اس کے نائبین کے ذریعے بادشاہ کی بیعت میں شامل تصور کئے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں فرق یہ ہوتا ہے کہ کسی مرشد سے بیعت ہونے میں طالب حق کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ تسلی کرادے کہ اس کا مسلک صحیح ہو۔ یعنی جس طرح احادیث نبوی ﷺ کی سند مختلف راویوں کی وساطت سے صحیح طور پر حضور اقدس ﷺ تک پہنچتی ہے۔ بعینہ اسی طرح کسی مرشد کا سلسلہ بیعت بھی جناب محمد رسول ﷺ تک پہنچنا بہت ہی ضروری ہے اور خصوصاً" یہ زمانہ انتہائی نازک ہے اس دور میں زاہد' عامل اور حافظ تو آسانی سے مل سکتے ہیں مگر مرشد کامل کا ملنا دشوار ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آج کل دھوکہ باز اور مکار لوگ صوفیاء کے لباس میں لوگوں کو اپنے دنیائی مقاصد اور عیش و عشرت کے لئے لوٹتے ہیں مریدوں کی جیبوں پر ڈاکے ڈالتے ہیں ایسے لوگوں کا مطمع نظر صرف اور صرف دنیائی منفعت اور عیش ہوتا ہے چنانچہ ایسے ظالموں سے بچنا چاہیے دوسری طرف کامل ترین پیران طریقت نے مرشدان کامل کو پہچاننے کے طریقے بیان فرمائے ہیں مثلاً" یہ کہ ان کا مسلک صحیح ہو' پابند شریعت ہوں اور اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتے ہوں۔ میرے مرشد پاک (قدس سرہ) کا بھی یہی قول ہے مگر ان کا ایک ارشاد یہ بھی ہے کہ کامل مرشد وہ ہو گا جو اخلاق نبوی ﷺ کا نمونہ ہو' بالکل بے تعصب ہو۔ اور شمائل الاتقیاء میں لکھا ہے کہ حضرت جنید رضی اللہ عنہ سے پہلے طالبان حق مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جب حضرت جنید رضی اللہ عنہ مجتہد ہو گئے اور سید الطائفہ کہلانے لگے تو انہوں نے خلافت و خرقہ دینا شروع کیا۔ تو جب کسی کو ایسا شیخ مل جائے جو پابند شریعت ہو' اخلاق نبوی ﷺ کا مکمل نمونہ ہو' صحیح مسلک رکھتا ہو یعنی اس کے مشائخ کا سلسلہ حضور اقدس ﷺ تک پہنچتا ہو تو ایسے مرشد کو

غنیمت جان لینا چاہیے۔ کشف کرامت یا دوسرے قسم کے ناپ تول کی کوئی ضرورت نہیں۔ کشف و کرامت اس لئے بھی ضروری نہیں کہ ایک مستدرج اور مداری بھی مافوق العادت تماشے دکھا سکتا ہے (ا) اور اگر وحدۃ الوجود کا قائل اور صاحب سماع بھی ہو تو از روئے شریعت یہ بھی جائز ہیں۔ اور انشاء اللہ ان کا ذکر بھی ہم اپنے موقعہ پر کریں گے۔

دوسری بات یہ کہ اگر طالب صادق مرشد سے کوئی ایسی بات سن لے یا شیخ کا کوئی ایسا فعل دیکھ لے جو طالب کی عقل کے خلاف ہو تو دل میں کسی قسم کا وسوسہ لانے سے گریز کیا جائے حضرت امام غزالی رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب کیمیائے سعادت میں تحریر فرمایا ہے کہ :۔

"اب طالب صادق کے لئے ایک امام کی ضرورت ہے تاکہ اس کی اقتداء کر لے۔ اور اس کا مطلب پیر طریقت ہے۔ کیونکہ بغیر پیر کے اس راستے پر چلنا مشکل ہے۔

(ا) حمزہ بابا رحمتہ اللہ علیہ کی بات انتہائی وزن دار ہے۔ اسی بارے میں ایک موقعہ پر حضرت ابوسعید ابوالخیر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا تھا کہ حضور! فلانے شیخ پانی کے اوپر زمین کی طرح چلتا ہے۔ تو حضرت ابوسعید ابوالخیر نے جواب دیا کہ "ہاں" ایک خس (تنکا) بھی پانی کے اوپر ہی چلتا پھرتا ہے" پھر کہا گیا کہ حضرت فلانے شیخ ہوا میں اڑتے ہیں تو حضرت نے جواب دیا کہ "بھئی" مکھی اور مچھر بھی اڑتے رہتے ہیں" آخر میں کہا گیا کہ حضور فلانے شیخ ہر جگہ حاضر ہوتے ہیں تو فرمایا گیا کہ "شیطان بھی اسی طرح ہر جگہ آدمی کے ساتھ ہی حاضر ہوتا ہے" مدعا یہ کہ معیار وہی ہونا چاہیے جس کا ذکر بابا نے بار بار کیا ہے یعنی مسلک۔ سلسلہ کی صحت، شریعت کی پابندی اور اخلاق نبوی ﷺ کا نمونہ ہونا چاہیے سب سے بڑی کرامتیں یہی ہیں۔ (طاہر چشتی)

اس لئے کہ یہ باطنی اور خفیہ راستہ ہے اور اس کے ساتھ شیطان کے بھی کئی راستے ملے ہوئے ہیں۔ اگر چہ فے الاصل حق کا راستہ تو ایک ہی ہے جبکہ باطل کے راستے ہزاروں ہیں۔ چنانچہ بغیر رہبر یہ راستہ طے کرنا محال ہے۔ تو جب طالب حق کسی شیخ سے بیعت حاصل کر لے تو مناسب ہے کہ اپنا اختیار وغیرہ سب کچھ شیخ طریقت کے حوالے کر دے اور اپنا

تصرف قطعاً" باقی نہ رکھے سالک طریقت یہ خیال بھی رکھے کہ میری مکمل بات مرشد کی نامکمل بات کے برابر نہیں۔ اگر مرشد سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو طالب صادق کی سمجھ میں نہ آتی ہو یا اسے معلوم ہی نہ ہو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے قصے کو یاد کرے کیونکہ یہ قصہ بھی پیر و مرید کے سلسلے میں ہے۔ اس لئے کہ مشائخ ایسا علم بھی رکھتے ہیں جن کا علم مریدوں کو نہیں ہوتا۔"

یہ تو حضرت امام غزالی رضی اللہ عنہ نے پیر طریقت کی تابعداری کے متعلق فرمایا ہے مگر انہوں نے پیرو مرشد کی سمجھ بوجھ اور عقل و ذہانت کے بارے میں بھی ایک مثال دی ہے۔ وہ بھی پڑھنے کے قابل ہے لکھتے ہیں:۔

حکیم جالینوس کے زمانے میں ایک شخص کے داہنے انگوٹھے میں درد پیدا ہوا۔ بہت سے ناقص طبیبوں سے علاج کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر کار وہ مریض حکیم جالینوس کے پاس گیا۔ چنانچہ حکیم نے مریض کے بائیں کندھے پر دوائی لگا دی لوگوں نے کہا کہ بے وقوف ہے درد کہاں ہے۔ اور دوائی کہاں لگا دی مگر چند ایام کے بعد مریض بالکل شفا یاب ہو گیا۔ اصل بات یہ تھی کہ ان لوگوں کو علم نہ تھا۔ کہ اصل میں سارا فساد ایک رگ کی جڑ میں تھا۔ اور انسان کے بدن میں جتنی بھی رگیں ہیں وہ

سب کمر اور دماغ کے ساتھ ملی ہوئی ہیں اور جو مادہ بائیں طرف نکلتا ہے وہ دائیں طرف کو آجاتا ہے اور اسی طرح دائیں سے بائیں جانب آتا ہے -- چنانچہ اس مثال سے مراد یہ ہے کہ مرید اپنے باطن میں تصرف نہ کرے ۔ یعنی سارا کام مرشد کے صواب دید پر چھوڑ دے"

مرشد کے آداب

یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ پیران طریقت چار قسم کے ہوتے ہیں:۔

(۱) پیر بیعت

(۲) پیر خرقہ

(۳) پیر ارشاد

(۴) پیر محبت

پیر محبت وہ ہے جو بغیر خرقہ اور بیعت کے کسی سالک کو اس کی مجلس میں روحانی لطف حاصل ہوتا ہو پیر ارشاد وہ ہے کہ جس کی طرف سے چند اشغال و اور اذکار ارشاد ہوا ہو۔ پیر خرقہ وہ ہے جس کی طرف سے خرقہ یعنی لباس تقویٰ جسکو گدڑی بھی کہتے ہیں حاصل ہو۔ اور پیر بیعت وہ ہوتا ہے جس سے چاروں برکتیں حاصل ہوں۔ اسی لئے ان چاروں میں پیر بیعت کا حق مقدم ہے اور فرض ہے اور اس کے حق سے انکار کرنا کفر ہے یہ سب کچھ عجائب الاخبار میں لکھا ہے۔ یہ باقی تین پیر بھی پیر بیعت ہی کے طفیل ملتے ہیں تاہم پیر بیعت میں یہ چاروں صفات موجود ہوتی ہیں جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔

جس وقت مرید اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوتا ہو تو مناسب یہ ہے کہ خالی ہاتھ حاضر نہ ہو۔ حسب توفیق کچھ نہ کچھ اپنے ساتھ لے جایا کرے اور مرشد کی خدمت میں پیش کرتا رہے۔ خواہ وہ نقد روپے ہوں یا کوئی اور چیز ہو اور یہ سنت ہے اصحاب رسول ﷺ بھی ایسا کیا کرتے تھے۔ اگر چہ یہ فرض نہیں ہے لیکن

واجب ہے اور اگر ایسا ہو سکے تو اس میں بہتری ہو گی۔

جس وقت مرید مرشد کی خدمت میں حاضر ہو تو مرشد کے ہاتھ پاؤں چوم لے اور اگر زمین ادب کو بوسہ بھی دے تو کوئی حرج نہیں پھر جب رخصت ہوتا ہو تو مرشد کی طرف رخ کرکے سات قدم لے کر مرشد کی طرف پیٹھ کرکے راستہ لے اور چلا جائے۔ اگر ایک مرید پیر کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے پیر کی خدمت میں چلا جائے اور "شاورھم فی الامر" کو بھول جائے تو اس میں بڑی قباحتیں ہیں۔ یا تو ایسے مرید کو نفس نے اشتعال دیا ہوتا ہے جو اس کا اندرونی "معبود" ہوتا ہے جیسے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

افرءیت من اتخذ الٰھہ ھواہ (الجاثیہ ایت نمبر ۲۳)

کیا تم نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی ہے جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے۔

یا کوئی مرید مرشد سے ناراض ہو کر اسے ایذا دینے کی غرض سے ایسا کر لے تو اس صورت میں بالکل عہد کو توڑنے والا اور نافرمان ہو گا۔ حق تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے شخص سے اپنی امان میں رکھے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مرید اپنے شیخ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے پیر کے پاس چلا جائے تو مرید کا یہ فعل اس کی ارادت کی نفی ظاہر کرتا ہے۔ حضرت یحییٰ منیری قدس سرہ نے اپنی مکتوبات کی پانچویں مکتوب میں لکھا ہے کہ جو مرید اپنے مرشد کی بے عزتی یا اس کو خفہ کرنے کے لئے کسی دوسرے شیخ کے پاس چلا جائے وہ مردود طریقت اور طریقت کا عاق شدہ ہو جاتا ہے۔

عجائب الاخبار میں تحریر ہے:۔

حق الاستاد فرض فمن انکر من الفرض فقد کفر

یعنی استاد کا حق فرض ہے اور جو شخص فرض سے انکار کرے کفر کرتا ہے (کافر ہو جاتا ہے)

ایک اور حدیث میں ہے :۔

من استخف استاده ابتلاه الله تعالیٰ بثلثته بلیات الاول نسی منه العلم والثانی اقل رزقه والثالث یخرج من الدنیا کافرا۔ ذکر فی بھریه یعنی جس نے استاد کی بے عزتی کی اللہ تعالیٰ اسے تین بلاؤں میں گرفتار کر لیتا ہے پہلی یہ کہ حاصل کردہ علم بھول جاتا ہے دوسری یہ کہ اس کے رزق میں کمی آجاتی ہے تیسری یہ کہ دنیا سے کافر ہو کر گزر جاتا ہے یہ ذکر بھریہ میں آیا ہے

منہاج العابدین میں آیا ہے کہ :۔

ولو کان استاده قاتل النفس او ذنبا" لایجوز اظهار فعله الی الغیر و من اظهر لواحد او قال غیبته صار عاقا" فی الاصل لا یقبل الله طاعته کالکافر

"یعنی اگر چہ اس کا استاد کسی نفس کا قاتل یا گنہگار ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اس کا فعل کسی غیر پر ظاہر کرنا جائز نہیں اور اگر ظاہر کیا یا اپنے استاد کی غیبت کی تو وہ اصل میں عاق ہو جاتا ہے اور خداوند تعالیٰ اس کی اطاعت کسی کافر کی طرح قبول نہیں فرماتا"

اور زجر المرتاض میں یہ حدیث مبارک نقل کی گئی ہے :۔

المرتد علیٰ نوعین مرتد عن الدین و مرتد عن الحق الاستاد فانه یقین المرتد عن الدین بالفوز ان تاب و مال عن کفره صار مسلما" والا فیقتل والمرتد عن حق الاستاد فلا یصلح بالتوبته اصلا" کالبیضه المنتنته ولا یقبل الله تعالیٰ کل عبادته بالاتفاق۔ الا یرض استاده عنه

"یعنی مرتد کی دو قسمیں ہیں ایک دین کا مرتد اور دوسرا استاد کے حق کا مرتد۔ پس دین کا مرتد توبہ کے بعد نجات حاصل کر سکتا ہے اور (دوبارہ) مسلمان ہو جاتا ہے اور اگر توبہ نہ نکالے تو قتل کرنے کے لائق ہے (لیکن) استاد کے حق کا مرتد توبے سے بھی خلاصی حاصل نہیں کر سکتا یہ گندے انڈے کی طرح ہو جاتا ہے۔ حق تعالیٰ اس کی کوئی عبادت قبول نہیں فرماتا۔ جب تک کہ اپنے استاد کو راضی نہ کر لے"

اسی طرح ایک سالک کا اپنے مرشد کی صلاح اور مشورہ کے بغیر کسی دوسرے شیخ کی ارادتمندی قبول کرنا بھی جائز نہیں۔ حدیث مبارک میں وارد ہے کہ "الشیخ فی قومه کالنبی فی امته کسی قوم میں ایک شیخ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک نبی کی اس کی امت میں۔ چنانچہ پیر کی مرضی کے بغیر دوسرے پیر کی ارادتمندی کو قبول نہیں کرنا چاہیے اور اگر بغیر مشورہ کے کسی دوسرے پیر کو قبول کر لے تو اس سے مرید نا انکار اور تذبذب ثابت ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

مذبذبین بین ذلک لاالی هٰؤلاء ولاالیٰ هٰؤلاء و من یضلل اللہ فلن تجد له سبیلا" سورہ النساء ایت نمبر ۱۴۳

مذبذب (معلق) ہو رہے ہیں دونوں کے درمیان میں نہ ادھر ہوتے ہیں نہ ادھر اور جس کو خدا گمراہی میں ڈال دے ایسے شخص کے لئے کوئی سبیل نہ پاؤ گے (۱)

طالب صادق کے لئے ضروری ہے کہ وہ یہ خیال نہ کرے کہ مرشد مجھے کچھ دیدے لیکن اگر وہ خود بخود کچھ عنایت فرمائے تو لے لے اور خوش ہو جائے اور جہاں تک مرشد کی خدمت میں حاضر ہونے کا تعلق ہے تو جب تک وہ مرشد کی

---

(۱) رحمان بابا کا ایک شعر ہے (ترجمہ):۔

نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے اور تذبذب کی حالت میں دریا کے اندر ڈوب گئے

خدمت میں حاضر ہو تو مرشد کے جمال کا نظارہ اس طور پر کرے کہ گویا وہ مرشد کا عاشق ہے اور اگر عاشق نہ بھی ہو تو بھی ایسا کرے اور اگر بفضل خدا مرشد کا عاشق ہو تو یہ انتہائی خوش بختی اور سعادت مندی کی بات ہے اسی طرح جتنی دیر تک طالب صادق مرشد کی خدمت میں حاضر ہو تو ذکر و تسبیح نہ کرے لیکن اگر مرشد حکم دے کہ فلاں چیز پڑھو تو پڑھ کر سنا دے۔ مچھناں جب طالب صادق اپنے شیخ کے پاس حاضر ہونے کے لئے جا رہا ہو تو نہ زیادہ تیز رفتاری سے جائے اور نہ ست رفتاری سے بلکہ درمیانی انداز اختیار کرے اسی طرح شیخ کی مجلس میں کچھ بھی نہ کھائے البتہ اگر شیخ کھانے کے لئے کچھ عنایت کر دے تو غنیمت و تبرک سمجھ کر کھالے۔ نیز مرشد پر یقین رکھنا چاہیے۔ کہ جو کچھ وہ ارشاد فرماتا ہو یا کوئی عمل کرتا ہو سب خدا کی طرف سے ہے اور جو فائدہ مجھے (سالک کو) پہنچتا ہو وہ خالصتاً" مرشد کامل کے ذریعے پہنچ رہا ہے یا یہ سارا فائدہ مجھے مرشد کی برکت سے حاصل ہو رہا ہے۔ اسی طرح مرید ہر وقت اپنے مرشد کا تصور کرتا رہے یعنی ہر وقت مرشد کے مراقبے میں رہے کیونکہ دراصل اللہ تعالیٰ کا مراقبہ بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے۔

اگر طالب صادق اپنے کسی خواب میں مرشد کو کسی بدلے ہوئے صورت میں دیکھ لے۔ جس سے کراہت آتی ہو تو طالب جان اور سمجھ لے کہ یہ سب کچھ میری اپنی خطاؤں اور گناہوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ کیونکہ شیخ اپنے مرید کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور اسی آئینہ میں مرید اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ چنانچہ مناسب ہے کہ مرید اپنی خطاؤں اور گناہوں کو یاد کر کے توبہ و استغفار میں مشغول ہو۔

مناسب ہے کہ طالب صادق اپنے مرشد کا نام ایک سو بار ورد کے طور پر استعمال کرے پچاس بار ایسا کہے کہ "یا شیخ فلاں" اور پچاس بار "یا مولانا فلاں" مزید برآں اگر مرشد وفات پا گیا ہو تو اس کی قبر کی تعظیم کرے۔ مرشد کے لباس کا بھی

منجملہ شیخ طریقت کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ شیخ کے حضور میں شیخ کا ادب کرے۔ نیز اپنے مرشد کو نماز میں بھی اپنے قریب تصور کرے۔ مراقبہ ایسا کرے۔ جیسے گود کا بچہ انتہائی محبت سے اپنی ماں کی طرف دیکھتا ہے چنانچہ مرید بھی اپنے شیخ کو اسی والہانہ محبت سے دیکھتا رہے۔ مزید برآں طالب صادق کے لئے ضروری ہے کہ شیخ کے علاوہ کسی اور کی کوئی پروا نہ کرے اور اپنے مرشد کو زمانہ بھر کے شیوخ سے کامل و اکمل تصور کرے۔ مناسب ہے کہ مرید اپنے شیخ سے کشف و کرامت کے اظہار کی خواہش نہ کرے۔ بلکہ اس اظہار کے بغیر بالا بالا ہی شیخ پر مکمل یقین رکھے اور دوران سماع طالب صادق جو بھی بڑے بڑے خطابات و القابات سنتا ہے ان سب کو اپنے مرشد سے منسوب کرے اور مرشد کے سامنے ایسا آنا چاہیے جیسے پہلی بار اس کی خدمت میں سامنے آرہا ہو۔ اور مرشد کے سامنے اپنے علم، زھد اور تقویٰ کی لاف زنی قطعاً نہ کرے بلکہ مرشد کی اجازت کے بغیر بات بھی نہ کرے (خاموش رہے) اور یہ بات بے حد ضروری ہے کہ کسی کام میں بھی شیخ سے گلہ یا شکوہ نہ کرے اور ہر روز اللہ تعالیٰ سے سوال کرے کہ

"اے اللہ! میرے مرشد کی مدد فرما اور اس کے درجات کو بلند کر دے"

اسی طرح اگر مرشد اپنے مریدوں میں سے کسی ایک کو اہمیت دے کر "سردار" مقرر کر دے یا اسے اپنا محبوب اور ہمراز بنالے اور اس کو ایسے مرید پر ہر طرح سے اعتماد ہو اور ایسے مرید کو خلیفہ بنا دے تو ما بقایا سب مریدوں کو چاہیے کہ اس کا ادب کرے۔ مختصر یہ کہ جو مرید شیخ کی خدمت کر سکتا ہو تو اسے نفل عبادت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ چند ایک باتیں ہم نے انتباہ المریدین وغیرہ کتابوں سے نقل کی ہیں انشاء اللہ یہ طالبان صادق کے لئے مفید ہوں گی۔

مرشد کا برزخ
یا
تصور

طریقت کے مرشد اپنے مریدوں کو اپنی صورت کے تصور کی تلقین فرماتے ہیں اور اصطلاح میں اسی طریقے کو برزخ کہا جاتا ہے اور یہ حق ہے۔ اور بلا شبہ شرع شریف کی شان کے خلاف نہیں۔ جو لوگ اسے شرع کے خلاف کہتے ہیں ان کو اس کی حقیقت کا شعور اور علم ہی نہیں۔ اس لئے کہ ایک فعل دو وجوہات کی بنا پر برا سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً" یہ کہ اللہ اور رسول ﷺ نے ایک کام سے منع کیا ہو یا یہ کہ عقلاً" وہ کام برا ثابت ہوتا ہو۔ چنانچہ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حق تعالیٰ عزاسمہ نے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رحمتہ اللہ علیہم کے تصور سے منع فرمایا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مشرکین بھی اپنے بتوں کا تصور کرتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ شرک کے مترادف ہے تو اس قسم کے لوگوں کا جواب یہ ہے کہ

تو اشنائے حقیقت نہ ئی خطا اینجاست

حق تعالیٰ کے نزدیک مشرک وہ ہوتا ہے جو حق تعالیٰ کے ساتھ ذات و صفات اور استحقاق عبادت میں کسی "دوسرے" کو شریک کر دے مثلاً" کوئی یہ کہدے کہ فلاں شخص خدا ہے اور خدا کی طرح ہے۔ وہ یہ بھی عقیدہ رکھے کہ فلاں آدمی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور یہ نہیں کہتا کہ ایسا اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ "و تحی الموتٰی باذن اللّٰہ" یعنی وہ اللہ

کے حکم سے مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے (ا)

(ا) قادیانی مرزا غلام احمد صاحب اس آیت کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ احیائے موتی سے مراد کافروں اور گنہگاروں کو کفر و گناہ سے پاک کروانا ہے ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی بھی کسی مردہ کو زندہ نہیں کیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس دنیا میں حق تعالیٰ نے جو نبی علیہ السلام بھی مبعوث فرمایا ہے اس کو حق تعالیٰ نے لازمی طور پر ایک ایسی نشانی عطا فرمائی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ دیگر انبیاء کی نسبت ممتاز ہوتا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصاء یا ید بیضاء اور حضرت یوسف علیہ السلام کا حُسن و جمال اور حضرت داؤد علیہ السلام کی لحن و خوش اوازی۔ یعنی نشانات کی حیثیت سے ہر نبی علیہ السلام بہت سے دیگر نشانیوں کا بھی حامل ہوتا ہے مگر ان میں سے ایک خصوصی نشانی ایسی بھی ہوتی ہے جو دوسرے کو حاصل نہیں ہوتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم مرزا صاحب کی یہ تاویل درست تسلیم کرلیں کہ گنہگار مومنوں کو پاک کرنا یا کفار کو مسلمان کروانا یا ان کی ان ارواح کو جو شرک اور معصیت کی وجہ سے مردہ ہو گئے تھے تو ایسے لوگوں کو کیا صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے "زندہ" کیا تھا۔ کیونکہ یہی فریضہ اور کارنامہ تو دوسرے نبی علیہم السلام بھی کرتے رہے ہیں یعنی اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ اسی امر تک ہی محدود تھا تو پھر تو سارے نبی علیہم السلام اس میں برابر کے شریک ہیں بلکہ ہر نبی علیہ السلام اسی لئے تو مبعوث ہوتا رہا ہے کہ لوگوں کی مردہ روحوں کو زندہ کردے۔ چنانچہ (بقول مرزا صاحب) اس میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کوئی تخصیص نظر نہیں آتی۔ اسی طرح اگر مرزائی لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصاء و ید بیضاء یا حسن یوسف اور حضرت دواؤد علیہ السلام کی خوش آوازی کی کوئی بھی تاویل کریں وہ مفید مطلب نہیں ہوگی کیونکہ اگر یہ لوگ تاویل کرتے پھریں گے تو نبی علیہ السلام کی شان امتیاز کا معاملہ تشنہ ہی رہے گا (مولف)

یا یہ کہ کسی ولی یا پیغمبر کو سجدہ کرو۔ یا یہ کہے کہ میں اس ولی کی عبادت کرتا ہوں۔ تو یہ شرک اور کفر ہو گا۔ تاہم سجدہ بذاتہ شرک نہیں ہے۔

اس لئے کہ یہ تعظیمی بھی ہوتا ہے۔ ہاں اگر عبادت کی نیت سے کسی غیر اللہ کو سجدہ کیا جائے تو یہ بلا شک و شبہ شرک ہے۔ کیونکہ اگر سجدہ فی ذاتہ شرک ہوتا تو بجز خدائے پاک حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں حق تعالیٰ فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم کیوں فرماتے۔ اور اسی طرح فرشتے کیونکر غیر اللہ (حضرت آدم علیہ السلام) کو سجدہ کرتے۔ خیر یہ تو فرشتوں کو بھی بخوبی معلوم تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام ہماری طرح ایک مخلوق ہیں مگر چونکہ حکم حق تعالیٰ کا تھا اور سجدہ۔ تعظیم کا سجدہ تھا تو انہوں نے خوشی خوشی سجدہ کر لیا۔ اس کے علاوہ ہر فعل نیت پر موقوف ہوتا ہے انما الاعمال بالنیات تو اب غور کرنا چاہیے کہ طریقت کے مرشد کیوں اپنی صورت کے تصور کی تعلیم دیتے ہیں۔ چنانچہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں ایک عظیم فائدہ ہے بلکہ ایک نہیں بے شمار فائدے ہیں جن کا بیان آنے والا ہے۔

اب جبکہ یہ ظاہر ہو گیا کہ "تصور شیخ" شرک نہیں۔ کیونکہ اگر یہ شرک ہوتا تو تمام انبیاء اور اولیاء کی تعظیم شرک کے زمرے میں آجائے گی۔ کیونکہ تعظیم کے لائق تو خدا ہے اور اس میں انبیاء اور اولیاء اس کے ساتھ کیوں کر شریک کئے جائیں۔ لہٰذا اب عقل کے رو سے دیکھنا چاہیے کہ تصور شیخ مفید ہے یا غیر مفید۔ تو یہ بات ہم نے اپنے گذشتہ بیان میں کہی ہے کہ جو کوئی بھی کسی کو خیال میں لے آئے تو وہ بھی اسے اپنے خیال میں محسوس کر لیتا ہے کیونکہ ایک روح کا عکس دوسری روح پر ضرور پڑتا ہے اور یہ بات بالکل صاف اور تسلیم شدہ ہے کہ مرشد کامل جناب رسول ﷺ کے اخلاق کا مکمل نمونہ ہوتا ہے اور ہر وقت حق تعالیٰ کی محبت میں محو ہوتا ہے تو جس وقت مرید ایسے کامل شیخ کا تصور کرتا ہو تو مرید کے آئینہ پر اسی مرشد کامل کے اخلاق و

خیالات کا عکس پڑتا ہے اور یہی مرید بھی آہستہ آہستہ اخلاق نبوی ﷺ اور محبت کا آماجگاہ بن جاتا ہے اور بالفرض اگر تصور شیخ اور کچھ بھی نہ کر سکے تو پھر بھی اتنا اثر تو دکھا دیتا ہے کہ مرید بے شمار برے افعال سے بچ جاتا ہے جو بہت بڑی بات ہے۔

یہاں پر ہم شریعت و طریقت کے بارے میں چند دیگر معروضات بھی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ اعمال جوارح کا نام شریعت ہے اور قلب کے اعمال کا نام طریقت ہے اور اس حقیقت پر یہ حدیث شریف گواہ ہے کہ الا۔ لا ایمان لمن لا محبتہ لہ یعنی اس شخص کا ایمان مکمل نہیں جس میں محبت نہ ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو اعمال جوارح اسلام سے تعلق رکھتے ہیں وہ بغیر محبت بھی کئے جا سکتے ہیں مگر قلب کے اعمال یقیناً" ایمان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے کہ محبت دل سے کی جاتی ہے اور جوارح سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ اور ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک محبت نہ کی جائے حضرت داتا گنج بخش نے اپنی مشہور کتاب کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

ذرۃ من الاعمال القلوب افضل من جبال اعمال جوارح

یعنی قلب کے اعمال کا ایک ذرہ جوارح کے اعمال کے پہاڑوں سے افضل ہے

لہٰذا طریقت ان اعمال کا نام ہے جن سے محبت حاصل ہوتی ہے۔ یہ محبت اپنے مرشد سے ہوتی ہے یا رسول ﷺ سے ہوتی ہے۔ اور یا اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے یہ سب ایک چیز ہے۔ پھر محبت بھی دو طریقوں سے حاصل ہوتی ہے ایک وہبی طریقے سے اور اس میں کسی کے عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی یہ حق تعالیٰ کا انعام ہوتا ہے ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء دوسری کسب کے ذریعے بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کسب کے لئے نفس کی مخالفت بہت ضروری ہے اور نفس کی مخالفت اس وقت تک

مکمل نہیں ہوتی جب تک مرشد کامل کی توجہ شامل حال نہ ہو۔ اس لئے کہ یہی مرشد کامل حق تعالیٰ کا مظہر ہوتا ہے اور حدیث مبارک خلق آدم علیٰ صورتہ (بنی آدم کو خدا نے اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے) اس حقیقت پر گواہ ہے اور خدا کی محبت اور اس کا نور کامل مرشد میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ مراد یہ کہ سب سے پہلے مصنوع کو پہچاننا ہوتا ہے اور بعد ازاں صانع کو۔ دوسری بات یہ کہ اس ارشاد رسول ﷺ :۔

قلب المومن عرش اللہ تعالیٰ

کے مطابق اور ارشاد ربانی:۔

الرحمان علی العرش استویٰ

سے صاف ظاہر ہے کہ مومن کا قلب عرش الٰہی ہے اور اسی قلب مومن میں وہ بلاکیف موجود ہے تو جو مومن ایسا ہو اس کا تصور کرنا عین عبادت ہے۔ حضرت مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں

تانہ افتد بر تو مردے را نظر　　از وجود خویش کے یابی خبر

ہیچ نہ کشد نفس راجز ظل پیر　　دامن آن نفس کش را سخت گیر

چونکہ تصور ایک کسب ہے اور اس کے ساتھ محبت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے میرے مرشد پاک (قدس سرہ) فرماتے ہیں کہ یہ اعلیٰ ترین کسب ہے کیونکہ جس وقت مرید اپنے شیخ کا تصور کرتا ہے تو اس سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس آیت کے مصداق سالک میں یہ اوصاف پیدا ہوتی ہیں۔

واطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم یعنی فنا فے اللہ، فنا فے الرسول اور فنا فے الشیخ (النساء ایت ۵۹)

تو جس وقت مرید وہبی طور پر اس راہ پر چلنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور کسی قدر محبت بھی اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے تو ذکر محبوب کے بغیر اسے آرام نہیں

آتا اور جس طرح حدیث پاک میں ہے من احب شیئاً اکثر ذکرہ یعنی ہر شخص جس چیز سے محبت کرتا ہے اکثر اس کا ذکر کرتا ہے اور ذکر کے ساتھ فکر بھی لازمی ہے اور فکر کا قاعدہ یہ ہے کہ جو کوئی شخص کسی نے دیکھا ہوتا ہے اور جب کسی محفل میں اس کا تذکرہ ہوتا ہے تو ضروری طور پر اس کی مثالی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے خدانخواستہ اگر سالک کے سامنے اپنے شیخ کی یہی مثالی صورت موجود نہ ہو تو اسے غفلت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور غفلت کے ساتھ ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس کی فکر بھی مفید مطلب نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ یہ قانون فطرت ہے کہ جب بھی کوئی شخص کسی اور کا ذکر کرتا ہے تو مذکورہ شخص کا مثالی ناک نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے یہاں تک اگر ایسے شخص کو نہ بھی دیکھا ہو تو قوت متفکرہ اس کی کوئی نہ کوئی صورت بنا لیتی ہے ۔۔۔ صرف ذات الٰہی عزوجل اس سے مبرا ہے ۔۔ اس کے علاوہ مخلوقات میں سے کسی کا بھی ذکر کرتے وقت کوئی نہ کوئی نقشہ آموجود ہو جاتا ہے۔ البتہ جہاں تک سالک راہ کا تعلق ہے تو اسے اپنے شیخ سے محبت ہوتی ہے اور اس محبت کا تقاضہ ہے کہ وہ ہر وقت اپنے مرشد کی یاد میں مگن ہو گا اور اس کی مثالی صورت بھی ہر وقت اس کے سامنے ہو گی۔ اور اسی کو عرف عام میں تصور شیخ کہتے ہیں یہ قطعی طور پر ایک فطری چیز ہے ور جو لوگ تصور شیخ کے خلاف ہیں اگر وہ غور فرمائیں تو یہ بات ان کی سمجھ میں آجائے گی کہ وہ بھی ہر وقت یہی عمل کرتے ہیں اس لئے کہ انکا کوئی نہ کوئی دوست تو ضرور ہو گا (اور جب اسی دوست کا ذکر ہو گا تو اس کی مثالی صورت ان کے سامنے ہو گی) تاہم تصور شیخ (میں کوئی قباحت نہیں بلکہ) از روئے شریعت مباح ہے اور جب اس میں روحانی فائدہ بھی ہے تو عبادت ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ چونکہ ہم نے حضور اقدس ﷺ کو نہیں دیکھا ہے ۔ اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو۔ تو ان کا تصور میں لانا محال ہے۔ ہاں! ایسا ہو سکتا ہے کہ

بس کسی کے قلب میں وہبی یا کسبی محبت نے جنم لیا ہو تو اسی محبت کی وجہ سے وہ تھوڑا یا بہت اللہ اور رسول ﷺ کا بھی محبوب ہو جاتا ہے جیسے کہ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے یحبھم و یحبونہ اور نیز یہ کہ وفی انفسکم افلا تبصرون (گویا سالک اسی کا مصداق ہو جاتا ہے) اور سنریھم آیتنا فی الافاق و فی انفسھم کا مضمون اس پر ظاہر ہوا ہوتا ہے حق تعالیٰ اس کی آنکھیں' کان' ہاتھ اور پاؤں ہو جاتا ہے جس طرح حدیث قدسی سے ثابت ہے اور وہ صحیح بخاری میں موجود ہے (اشارہ کثرت نوافل کی حدیث مبارک کی طرف ہے۔ مترجم) تو جب سالک اسی نقشہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے (یعنی تصور شیخ) اور ذکر میں مصروف ہو تو اسی تصور شیخ کی برکات' فیوضات اور انوار کی وجہ سے اس کی فکر (ماسوی اللہ سے) معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور اسی شیخ کی فنائیت کا عکس سالک کے دل پر پڑتا رہتا ہے اور ذکر کا نتیجہ سامنے آتا رہتا ہے اور یہی تصور شیخ۔ اللہ تعالیٰ جل مجدہ اور رسول پاک ﷺ کی محبت کے لئے ایک واسطہ ہو جاتا ہے۔ اور۔ یہ صورت پرستی نہیں بلکہ عین حق پرستی ہے اس کو ہم اس لئے مفید اور اچھا کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لا یسعنی ارضی ولاسمائی الا قلب عبد المومن (حدیث قدسی) یعنی میں زمین و آسمان میں نہیں سما سکتا مگر صرف اپنے بندہ مومن کے قلب میں (سما سکتا ہوں) اب اگر کوئی ایسا مومن ہو جس کے قلب میں "وہ" بزعم خود رہائش فرماتا ہو تو ایسے مومن کے تصور سے اور کونسا تصور اور فکر بہتر ہو سکتا ہے۔ اگر چہ فکر کے راستے انتہائی کٹھن ہیں اور انکے روبرو ہونا عین خدا کے روبرو ہونے کے مترادف ہے تاہم جہاں تک تصور کا تعلق ہے تو یہ ہر محبوب اور محب کے درمیان ضرور .ضرور قائم رہتا ہے۔ چاہے یہ محبت مجازی ہی کیوں نہ ہو۔ مثال

کے طور پر مجنون کا حال سب کو معلوم ہے کہ وہ انا لیلیٰ (میں لیلی ہوں) کا نعرہ مستانہ لگاتا رہتا تھا۔ مطلب یہ کہ مجازی محبت بھی محبوب و محب کو "ایک" کر دیتی ہے۔

میرے مرشد پاک (قدس سرہ) کا ارشاد ہے کہ "تصور شیخ مرید کے لئے ایک سنگین حصار کا درجہ رکھتا ہے اور یہ سالک کے لئے ہر قسم کے شیطانی اور نفسانی وساوس کے مقابلے میں ایک ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے" نیز میرے مرشد پاک (قدس سرہ) یہ بھی فرماتے تھے۔ کہ جب تک ایک مرید اپنے مرشد کا عاشق صادق نہیں ہو جاتا تو کبھی بھی عاشق رسول ﷺ نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک حضور اقدس ﷺ کا عاشق نہیں ہو جاتا تو ہرگز عاشق الٰہی نہیں ہو سکتا۔ اور حضرت مخدوم شیخ سعد قدس سرہ نے مجمع السلوک میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"چونکہ ربط مرید با پیر بسیار مے شود۔ حق تعالیٰ کہ مقلب القلوب است۔ دل شیخ و روحانیت شیخ مائل بہ سوئے وے مے دارد۔ و مشہور ست ہر کہ باکسے بود اوباوے بود و ہرکہ بخیال کسے باشد وے بہ خیال وے باشد القلوب مع القلوب تشاھد"

(یعنی جب مرید کا اپنے شیخ کے ساتھ رابطہ محبت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے تو حق تعالیٰ جو دلوں کو پھیرنے والا ہے مرشد کا دل اس کی روحانیت سمیت مرید کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اور یہ بات تو مشہور ہے کہ جو کوئی بھی جس کے ساتھ ہو وہ بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے اور جو کوئی بھی جس کسی کا خیال کرے گا۔ وہ بھی اس کے خیال میں مگن ہو گا۔ دل دل کے ساتھ ہوتے ہیں۔ "القلوب مع القلوب اسی پر گواہ ہے) اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے تاہم یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شیخ ہی کی روحانیت سے مرید باصفا کو ہر قسم کی امداد اور فتوح حاصل ہوتی ہیں۔ اور شمائل الاتقیاء نے رسالہ شمیہ سے یہ عبارت نقل کی ہے:۔

"برائے محبت خدائے تعالٰی طریق بسیار است اما بہتر و اسان تر آن ست کہ محبت شیخ در دل جائے یابد۔ ازاں محبت۔ محبت (الٰہی) نیز زود میل گردد"

"خدا سے محبت کرنے کے بہت سے طریقے ہیں مگر سب سے بہتر اور آسان طریقہ یہ ہے کہ (سالک کے دل میں) مرشد کی محبت گھر کر لے۔ پھر اسی محبت کے طفیل بہت جلد محبت الٰہی پیدا ہو جاتی ہے" اسی طرح رسالہ عین القضاۃ ہمدانی میں لکھا ہے:۔

"اتفاق جمیع مشائخ ست کہ ہیچ عبادتے و عملے افضل تر از مراقبہ شیخ نیست"

"جملہ مشائخ عظام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ تصور شیخ کے علاوہ کوئی اور عبادت اور عمل بہتر نہیں ہے۔

اور رسالہ غریب میں تحریر ہے:۔

"مراقبہ بہ انواع ست۔ مراقبہ شیخ برخود لازم و واجب بیند بہ دیدہ دل ہم۔ بہ بیٹنے کہ شیخ را در خصور و حیات دیدہ است۔ ہر کہ پیوستہ دل خود بادل شیخ بمراقبہ دارد و مدد طلبد فتوحات غیبی و نفخات ربانی از درون شیخ نصیب دل اوشود۔ القلوب مع القلوب۔ و دریں سرے ست چہ مرید اول توجہ بہ حضرت عزت نہ تواند کرد۔ کہ مرید راجعت بسیار ست و خوگرفتہ عالم شہادت ست و باغیر آشنائی وارد و دل شیخ متوجہ حضرت (عزت) ست۔ ہرچہ ازاں جا بہ دل شیخ ے رسد بہ دل مرید ہم برسد۔ وسقٰھم ربھم شرابا" طھورا" اور جام ولایت شیخ بدو دہندو یسقونہ فیھا کاسا" کان مراجھا زنجبیلا" بعدہ دور و در جام نبوت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم از ساقی حق بے واسطہ بدو دہند۔ چوں ایں معانی استقامت یافت اگر ہر بار خواہد کہ شیخ را بچشم ظاہر بیند تواند دید و این سرے ست عجیب و غریب۔"

"یعنی مراقبہ کے کئی اقسام ہیں لیکن سالک کے لئے لازم ہے کہ اپنے مرشد

کے مراقبہ کو واجب جانے اور جس طور پر اس نے دوران حیات میں اپنے مرشد کو اور اپنے آپ کو اس کے حضور میں دیکھا ہو بعینہ اسی طرح کا تصور کرنا لازمی ہے اور جو سالک بھی اپنے دل کو اپنے شیخ کے دل سے مراقبہ کے طور پر پیوستہ اور وابستہ رکھے اور اس سے مدد طلب کرے تو شیخ کے قلب کی طرف سے مرید کو فتوحات غیبی اور فیوضات روحانی پہنچتی ہیں۔ القلوب مع القلوب یعنی دل را بہ دل رہیت۔ اور اس میں راز کی بات یہ ہے کہ مرید کے لئے ابتداء میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا دشوار ہوتا ہے اس لئے کہ عالم ناسوت میں ماسوی اللہ اور خواہشات میں گرفتار ہوتا ہے وہ غیر کی اشنائی کا خوگر ہوتا ہے لیکن مرشد کا دل ہر آن حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور جو فیوضات و برکات اور انوار حضرت حق کی طرف سے مرشد کے قلب پر وارد ہوتی ہیں۔ مرید کے دل پر بھی ان کا نزول ہوتا ہے۔ بمصداق ایت "اور حق تعالیٰ ان کو شراب طہور سے سیراب فرمائے گا" پس یہی شراب مرشد کی ولایت کے جام سے مرید کو دی جاتی ہے۔ بمصداق ایت اور وہاں ان کو (علاوہ جام شراب مذکورہ) ایسا جام شراب پلایا جائے گا جس میں سونٹھ کی آمیزش ہو اس کے بعد ساقی حق کی جانب سے بلاواسطہ (یہی کچھ) جام نبوت کے ذریعے عطا ہوتا ہے اور جب یہ حالت قوی ہوتی ہے تو بعد ازاں جس وقت چاہے کہ شیخ کو اپنی ظاہری آنکھوں سے بھی دیکھے تو دیکھ سکتا ہے اور یہ ایک عجیب و غریب راز ہے"

عین القضاۃ میں تحریر ہے کہ:۔

خدائے تعالیٰ را در آئینہ جان پیر دیدن آنست کہ مرید در دل خود تصور کند۔ پیر آنجا حاضر آید"

یعنی پیر کے وجود کے آئینے میں خدا کے دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ مرید اپنے دل میں پیر کا تصور کرے تو وہ اسی وقت حاضر ہو جاتا ہے" اور مسعود بیک نے کتاب مراۃ

العارفین میں فرمایا ہے کہ:۔

مرید درجان پیر خدارا بیند۔ در صحبتش باحق نشیند و پیر درجان خود مرید را بیند۔ اورا از خود ببرد۔ خود دیدن پیر درجان مرید خود را بیند و این سرے بزرگ ست"

یعنی مرید اپنے مرشد کے وجود کے آئینے میں حق تعالیٰ کو دیکھتا ہے اور اسی پیر کی صحبت میں خدا کی ہم نشینی محسوس کرتا ہے۔ مرشد اپنے وجود میں مرید کو دیکھتا ہے۔ اور اس کو اپنی ذات میں فنا کر دیتا ہے خود پیر بھی اپنے آپ کو مرید کے وجود کے آئینے میں دیکھتا ہے اور یہ ایک عظیم الشان راز ہے یعنی پیر جب اپنی جان مرید کے وجود میں دیکھتا ہے گویا مرید حق کو دیکھتا ہے۔ یہ ایک عجیب سر ہے کہ اس کی جان ۔ جان الٰہی میں محو ہے اور وہ (پیر) اپنے مرید کے وجود کے آئینے میں خود اپنے آپ کو دیکھتا ہے (تو یہ ایسا ہے) کہ گویا مرید بھی اپنے وجود میں خدا کو دیکھتا ہو گا اور یہ ایک انتہائی قیمتی راز ہے۔

آخری زمانے کے علماء کے گروہ میں سے مولوی ولی اللہ محدث دہلوی نے قول الجمیل میں تحریر کیا ہے۔

والرکن الاعظم ربط القلب بالشیخ علی وصف المحبتہ والتعظیم و ملاحظتہ صورۃ

"یعنی (سلوک کے ارکان میں) سب سے بڑا رکن سالک کا اپنے شیخ کی صورت کے ساتھ قلبی رابطہ' اس کے ساتھ والہانہ محبت اور اس کی تعظیم ہے۔

اور مولانا عبد الحی رحمتہ اللہ علیہ (جو اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے) سے کسی نے پوچھا کہ مولوی ولی اللہ محدث رحمتہ اللہ علیہ کے متذکرہ بالا عبادت کا کیا مطلب ہے۔ تو انہوں نے بھی تسلیم کیا ہے اور شافی جواب دیا ہے اور وہ ان کی کتاب الفتوٰی

میں چھپ چکا ہے اگر چہ مولوی اسمٰعیل وہابی نے اپنی کتاب صراط مستقیم میں اس سے انکار کیا ہے مگر انکا گروہ اولیاء کے گروہ سے بالکل الگ ہے۔ انکا گروہ اولیاء کے گروہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا علاوہ ازیں مولوی عبد الحق دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی مولوی ولی اللہ صاحب محدث رحمتہ اللہ علیہ دہلوی کی طرف اپنی بعض کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے (تصور شیخ کا) مولانا عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر عزیزی میں بھی سحر کے اقسام کے ذکر میں تصور شیخ پر بحث کی ہے ایک جگہ پر وہ لکھتے ہیں:۔

اقسام سحر را ازلیائے است۔ مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ و التحیتہ۔ اصلاح نمودہ و کفر و شرک را زاں دور کردہ اند۔"

اس کے بعد اس کے اقسام بیان کئے ہیں اور لکھتے ہیں:۔

قسم سوم ربط با ارواح طیبہ' بہ صلحا و اولیاء ست کہ اکثر اویسی مشربان بعمل سے آرندو در حوائج خود و دیگر خلق بہ آں متنفع شوند۔ و در طریق تحصیل آں نیز طہارت و تلاوت و ارسال ثواب صدقات برائے آں ارواح منظور میدارند"

یعنی تیسری قسم قدسی ارواح' صلحاء اور اولیاء سے رابطہ رکھنا ہے۔ اور یہ طریقہ عموماً" اویسی مشرب رکھنے والوں کا ہوتا ہے اور اسی طرح خود اپنی ضروریات اور دیگر لوگوں کی ضروریات کے سلسلے میں ان ارواح سے مستفید ہوتے ہیں اور اس کی تحصیل کے بارے میں طہارت' تلاوت اور صدقات کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کا ثواب ان ارواح مقدسہ' صلحاء اور اولیاء کو بخش دیا جاتا ہے"۔

چونکہ مولانا علیہ الرحمتہ نے ارواح مقدسہ کے رابطے کا ذکر سحر کے اقسام کے ذیل میں کیا ہے اس لئے اکثریت کا خیال اس طرف مبذول نہیں ہوتا۔ اگر چہ تصور بھی اسی ربط کے معلوم کرنے کا طریقہ ہے۔ تاہم جو لوگ اس (تصور شیخ) کو خلاف شرع سمجھتے ہیں وہ سب علم' عقل اور انصاف سے عاری ہوتے ہیں اور یہ وہی لوگ

ہیں جو اولیاء رحمتہ اللہ علیہ سے دشمنی رکھتے ہیں۔

ملحوظ خاطر رہے کہ "تصور شیخ" کے بارے میں چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ سلسلوں کے جملہ حضرات متفق ہیں بلکہ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے لئے تصور شیخ ایک سہل ترین طریقہ ہے۔ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس سرہ نے اسی تصور شیخ کے بارے میں فرمایا ہے۔" وھو تعلق المرید بالشیخ"یعنی یہ مرید کا شیخ کے ساتھ قلبی تعلق رکھنے کا نام ہے" جہاں تک نقشبندیہ سلسلے کے حضرات کا تعلق ہے تو وہ اس کو "نسبت" کہتے ہیں معمولات مظہریہ وغیرہ میں بھی اس کا ذکر موجود ہے اور تقریباً" تمام مشائخ کی تصانیف میں بھی اس کا تذکرہ ہوا ہے۔ اور یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہر خانوادہ تصوف میں بڑے بڑے جید عالم گذرے ہیں جن کی تبحر علمی کی مثال اس زمانے میں ملنا مشکل ہے اب اگر وہ سب نیک و خدا پرست نہ تھے تو (خدانخواستہ) ہوا پرست ہوں گے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ والے تھے اور اسی بنا پر انکی مخالفت خدا کی مخالفت ہے حدیث قدسی میں ارشاد ہوا ہے:۔من عادی بی ولیا" فقد اذنتہ بالحرب حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ہے

اذا قاتل احدکم فیتجنب الوجہ

فان اللہ خلق آدم علی صورتہ

یعنی جس وقت تم میں سے کوئی شخص کسی دوسرے کو قتل کرتا ہو تو اسے چہرے پر نہ مارے اس لئے کہ اللہ نے آدم کو اپنی صورت میں پیدا فرمایا ہے۔

مولوی محمد قطب الدین خان نے لکھا ہے کہ "اپنی صورت" سے مراد یہ ہے کہ وہ (آدم) حق تعالیٰ کے جمالی اور جلالی صفات کا مظہر ہے جب مذکور مولوی صاحب نے علم ظاہری کے باوجود ایسا کہا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ صورت محمدی ﷺ ہے

اور اہل دوزخ کی صورتیں مسخ کی جائیں گی۔ یعنی انسان کی صورت میں کوئی بھی دوزخ نہیں جائے گا۔(۱)

---

(۱) بعض ہندو حضرت مولانا روم قدس سرہ کے مندرجہ ذیل شعر سے اواگوان یا تناسخ ثابت کرتے ہیں۔

ہفت صدو ہفتاد قالب دیدہ ام ہمچو مثل سبزہ بارو ئیدہ ام

اور ممکن ہے کہ دوزخیوں کے مسخ ہونے سے بھی یہی مراد لیں کہ گویا گنہگار چارپایوں کی صورت میں اپنی گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں جیسا کہ آریہ اور دوسرے ھندوؤں کا عقیدہ ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ روح جن قالبوں میں ظاہر ہوتی ہے وہ اعمال کے نتائج ہوتے ہیں۔ تو موجودہ وجود میں وہ جو بھی عمل کرے اور اگر وہ نیک ہو۔ تو (آخر کار) اسے انسان کا وجود مل جاتا ہے

لیکن اگر برے اعمال کرے تو کسی حیوانی وجود میں جنم لے گی۔ ہندو اس دنیائی سلسلے کو بھی قدیم سمجھتے ہیں اور اگر دنیائی سلسلے کو باطل ٹھرایا جائے تو پھر ہندوؤں کے سارے اصول درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ان کا مذہبی ڈھانچہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ مگر عقلمند کہتے ہیں کہ ہر چیز کے لئے چار علتیں ہوتی ہیں۔ یعنی علت فاعلی(۱)۔ علت غائی (۲)۔ علت مادی ۔(۳) او رعلت صوری (۴)۔ اس لئے اصولاً" علت فاعلی (۱) تو خود اللہ تعالیٰ ہے۔ جہاں تک علت غائی (۲) کا تعلق ہے تو وہ انسانی نجات اور معرفت نفس کا حصول ہے۔ ہندو بھی یہی کہتے ہیں کہ تناسخ سے مراد "مکتی" (نجات) ہے اور علت مادی (۳) تو ظاہری طور پر یہی مادہ ہے اور علت صوری اسی مادے کی ترکیب سے بنی ہوئی شکلیں ہیں۔ اب قابل غور بات یہ ہے کہ علت فاعلی کا وجود ضروری طور پر علت صوری سے پہلے ہونا چاہیے (بقیہ اگلے صفحے پر)

خیر تو جب حق تعالیٰ نے علی العموم ہر کافر و مسلم کی صورت کو یہ بزرگی بخشی ہے تو پھر وہ متبرک ہستیاں جو فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کا درجہ رکھتی ہیں ان کی صورتوں کا تصور فیض و برکت سے کیوں خالی ہو گا۔ اور حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے

....

اس لئے کہ اگر علت فاعلی کو اولیت حاصل نہ ہو تو علت غائی کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ مراد یہ کہ یہ کام علت فاعلی ہی کا ہے کہ وہ کسی ضرورت کے تحت ایک چیز کو پیدا کرے اور پھر اگر علت غائی نہ ہو تو کسی چیز کے تخلیق کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر اگر علت مادی نہ ہو تو علت صوری بھی نہ ہو گی۔

اب صورت حال یہ ہے کہ آریہ کہتے ہیں کہ مادے کی اصلی صورت احساس و ادراک سے باہر ہے اور یہ کہ یہ موجودہ صورتیں مادے کی ترکیب پانے کے بعد وجود میں آئی ہیں۔ مگر یہاں پر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اجسام کی ترکیب کے لئے سب سے ضروری چیز علت مادی ہے یعنی جب تک مادہ موجود نہ ہو علت صوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ علت مادی ذاتی طور پر علت صوری سے مقدم ہے اور علت صوری کی ذات "عرض" کی مثل ہے۔ یعنی اگر علت مادی نہ ہو تو علت صوری بھی نہ ہوگی اور اگر یہ نہ ہو تو علت مادی کا ہونا محال ہو گا۔ مثال کے طور پر اگر ایک کپڑا رنگین نہ بھی ہو تو پھر بھی اس کا وجود ہو گا۔ (یعنی کپڑا ہی کہلایا جائے گا)

چنانچہ اگر ہم دنیا کی قدامت کا سلسلہ تسلیم کرلیں تو پھر بھی عقل اہل اس بات کا تقاضا کرے گی کہ جس طرح علت صوری کا وجود علت مادی سے قبل تسلیم نہیں کیا جا سکتا اسی طرح علت غائی اور علت مادی دونوں کو علت فاعلی سے مقدم نہیں مانا

کہ خیار عباد اللہ الذین اذاراو ذکر اللہ یعنی اللہ کے نیک بندے وہ لوگ ہیں جس وقت ان کو دیکھا جائے تو دیکھنے والے کو اللہ یاد آجاتا ہے۔ اور مولوی قطب خان نے مشکوۃ کی شرح میں لکھا ہے کہ جونہی ان کے جمال پر نظر پڑتی ہے تو خدا یاد آجاتا ہے اور ان کو دیکھنا بھی ذکر کی صفت رکھتا ہے۔ اور دیکھنے والے کے دل میں نور ایمان موجزن ہو جاتا ہے۔

اور اگر مان لی جائیں تو فضول بات ہو گی اور دنیائی سلسلہ جو مرکب اجسام پر مشتمل ہے ان کی علت صوری علت مادی سے ترکیب پا چکی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی۔ کہ ایک وقت ایسا بھی تھا۔ کہ اجسام کی "ابتداء" شروع ہو گئی۔ اس لئے کہ جسم علت صوری ضرور رکھتا ہے۔ بہر حال یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ علت صوری علت مادی کے مابعد ہے اور اگر ہم علت مادی اور صوری دونوں کو قدیم مان لیں تو پھر مجبوراً" ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نہ ترکیب ہے نہ اس کی ضرورت' نہ جسم ہے نہ علت مادی ہے اور نہ ہی علت صوری۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ہم علت مادی علت صوری سے قبل تسلیم نہ کر لیں تو پھر ترکیب کہاں اور کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ جبکہ آریہ ترکیب کے قائل ہیں اور یہی ترکیب ہی علت صوری کو علت مادی سے جدا بھی ثابت کرتی ہے اور مابعد بھی۔ چنانچہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ علت صوری (اجسام) مادے سے بعد میں پیدا ہوئی ہے تو تناسخ کا سارا معاملہ بے نقاب ہو جاتا ہے اور هندوؤں کا مذہب کلی طور پر باطل ٹھہر جاتا ہے اس لئے کہ سرے سے مادہ ہی حادث ثابت ہو گیا اور جب مادہ حادث ثابت ہو جاتا ہے تو لامحالہ دنیا کی قدامت اور تناسخ دونوں باطل ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ جب "ابتداء" ثابت ہو گئی تو جن لوگوں کو نیکی اور بدی کی وجہ سے مختلف ڈھانچوں میں ڈالا گیا ہے وہ باطل ثابت ہو جاتا ہے (غور فرمایئے) (بقیہ اگلے صفحے پر)

غور کا مقام ہے کہ جن لوگوں کو صرف ایک نظر دیکھنے سے ایمان کی ترقی کی یہ حالت ہوتی ہے تو جو لوگ ہر وقت ان کے قدسی چہروں کا تصور کرتے ہوں تو ان کی ایمانی اور روحانی خوشی کا کیا حال ہو گا اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو پھر بھی اتنا تو ضرور ہو گا کہ بہت سے برے اعمال سے بچ جائے گا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف یوں فرمائی ہے:۔

النظر الٰی وجهه علی عبادة (نور الابصار)

"علی علیہ السلام کو دیکھنا عبادت ہے"

اور مولوی قطب الدین خان صاحب نے بھی لکھا ہے کہ جب لوگ حضرت علی علیہ السلام کو دیکھتے تو کہتے کہ:۔ لا اله الا اللّٰه ما اشرف هذا الفتیٰ۔ لا اله الا اللّٰه ما اکرم هذا الفتیٰ لا الٰه الا اللّٰه ما اعلم هذا الفتیٰ۔ لا الٰه الا اللّٰه

جب روحوں نے ابتدا میں کوئی نیک یا بد عمل نہیں کیا تھا تو سوال یہ ہے انہوں نے یہ مختلف وجود و اشکال کیسے اختیار کئے اور کیوں۔ اور مادہ (جو علت مادی ہے) علت فاعلی (حق تعالیٰ) سے کیسے اور کیونکر پہلے یا اس کے ساتھ ساتھ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ بالفرض اگر حق تعالیٰ کی طرح مادہ کو بھی قدیم تسلیم کیا جائے تو پھر ترکیب کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جب روح چوراسی (۸۴) لاکھ اجسام میں عمل نہ کرے تو مکتی حاصل نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر صورت حال یہی ہو تو پھر تو لازم ہے کہ تناسخ ختم ہو۔ اس لئے کہ نجات پانے کے بعد جسموں کے چکر کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ جس وقت ارواح مکتی یا نجات حاصل کر لیں تو یہ دنیا بھی "ختم" ہو جائے گی۔ اس لئے اجسام کو ارواح کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اب آخری قابل غور بات یہ ہے کہ جو چیز اختتام پذیر ہوتی ہو تو اس کی ابتداء بھی ہو گی (مؤلف)

ما اشجع ھذا لفتی۔ یعنی، الاالہ الا اللہ کتنا بڑا شریف ہے یہ جوان' کس قدر سخی ہے یہ جوان' کتنا بڑا عالم ہے یہ جوان اور کس قدر بہادر اور شجاع ہے یہ جوان۔ یہ حدیث گویا حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کی شان میں ایک پیش گوئی ہے اس لئے کہ فقراء کے سارے سلسلے حضرتِ امیر علیہ السلام ہی سے ملے ہوئے ہیں۔ اور حدیث میں تصور کی پوری پوری تعلیم موجود ہے اس لئے کہ وہاں "عبادت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں قابل غور بات یہ ہے کہ جب ایسی قدسی ہستیوں کے چہروں کو دیکھنا عبادت ہو تو کیا یہ کام (عبادت) ترک کرنا چاہیے یا اس کو مداومت کے ساتھ جاری رکھنا چاہیے۔

اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ من رانی فقدرء الحق یعنی جس نے مجھے دیکھا اس نے اللہ کو دیکھا" اور نیز یہ کہ:۔

من رانی فے المنام من فقدر الحق لان الشیطٰن لا یتمثل بی"
جس کسی نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھے حق دیکھا اس لئے کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا۔

علمائے ظاہر ان دونوں احادیث کے ایک ہی معنے کرتے ہیں یہ حضرات پہلی حدیث کو ایک جدا حدیث سمجھتے ہیں اور معنے یہ بتاتے ہیں کہ جس نے مجھے دیکھا اس نے خدائے پاک کو دیکھا اکثر علمائے حق اس کے یہی معنے کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کے دیکھنے سے مراد یہ نہیں جیسا ظاہری آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے ایسے تو آپ ﷺ کو ابوجہل نے بھی دیکھا تھا۔ اور حق تعالیٰ بھی آنحضرت کو مخاطب فرماکر ارشاد فرماتے ہیں کہ "یہ لوگ تمہیں دیکھتے تو ہیں مگر کچھ بھی نہیں دیکھ پاتے" مطلب یہ ہے کہ فے الاصل حضور اقدس ﷺ کو صحیح معنوں میں دیکھنا تو یقیناً" وسیلہ معرفت و وسیلہ نجات ہے وہ تو دیکھنے کی ایک جداگانہ صورت ہے۔ مولوی سلامت اللہ نے اپنے

(حاشیہ اگلے صفحے پر)

جاتی ہے۔ مگر حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے حرمت غنا کی احادیث ان امور، اعمال یا محمول کی ہیں جو حرامکاری کے لئے سنی پائی جاتی ہو اور اس سے فتنے بپا ہونے کا خوف ہو۔ لیکن انہوں نے (امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ) نے حلال خواہشات (وہ) مثلاً اعلان نکاح یا محبت الٰہی کے لئے جائز تسلیم کیا ہے جہاں تک امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے قول میں "ابتلاء" کا تعلق ہے اور جس طرح اس کی تاویل کی گئی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ صاحب ہدایہ کی اپنی ذاتی رائے ہے اور ان کی یہ رائے غلط ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ نے بیٹھ کر بہرحال سرود و سماع کو سنا ضرور ہے (جس کا بیان آگے آنے والا ہے) اور ملحوظ خاطر رہے کہ سماع و سرود کے عمل کو منع نہیں فرمایا ہے۔ بلکہ اس کی حمایت و شفاعت فرمائی ہے اور اپنے مذہب کی کتابوں میں اس کا جواز پیش کیا ہے اور بالفرض صاحب ہدایہ کا یہی قول اگر ہم صحیح تسلیم کریں تو پھر لازم آتا ہے کہ جب امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس بات کا علم رکھتے تھے کہ یہ فعل حرام ہے اور اس وقت وہ اتنے مجبور و معذور بھی نہ تھے بلکہ خدا کا فرمان وتعاونوا علی البر والتقوٰی ولا تعاونوا علی الاثم و العدوان (یعنی نیکی و پاکیزگی کے امور میں ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو اور گناہ و زیادتی کرنے میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو) بھی ان کے پیش نظر ہو گا۔ مگر اس کے باوجود حضرت امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ بیٹھے رہے اور سرود و سماع سماعت فرماتے رہے (فواخواستہ) کیا حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ نے ایک حرام کام پر اتفاق کیا۔ (معاذ اللہ ایسی بات نہیں) بلکہ یہاں صاحب ہدایہ کا قول غلط ہے اس لئے کہ ابتلاء تو حرام امور میں ہوتی ہے اللہ تعالیٰ بھی مومنوں سے فرماتا ہے۔

ولنبلونکم بشیئی من الخوف والجوع و نقص من

کہ "مومن" خدائے پاک کا نام بھی ہے تو مطلب یہ ہے کہ "وہ مومن جو پورے کا پورہ صاحب ایمان ہو تو وہ حق تعالیٰ کی ذات کا آئینہ ہوتا ہے" جیسا کہ عین القضاۃ ہمدانی کی عبارت سے ظاہر ہے اور ہم نے گذشتہ صفحات میں تحریر کیا ہے۔ تو (مفہوم یہ کہ) ایسے لوگوں کو دیکھنا خدا ہی کو دیکھنا ہے۔

چوں مرا دیدی خدا را دیدہ

اور اگر دونوں مقامات پر لفظ "مومن" کے معنے "صاحب ایمان" لئے جائیں تو پھر بھی مطلب صاف ہے کہ مرید اپنے دل کے آئینے میں مرشد یا حضور اقدس ﷺ کی صورت کا نظارہ کرے تاکہ اسے معرفت الٰہی حاصل ہو۔ (اسی طرح) قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ فرمان موجود ہے۔انی وجهت وجهی للذی فطر السموت والارض حنیفا" و ما انا من المشرکین (سورہ انعام۔ ایت ۷۹) "میں اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا (یکسوئی کے ساتھ) اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں" نیز حق تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ:۔

وجوہ یومئذ ناضرۃ الٰی ربها ناظرۃ

بہت سے چہرے تو اس روز بارونق ہوں گے اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے (یہ مومنین ہوں گے) سورہ القیمہ ایت ۲۲۔۲۳

تو جن قدسی چہروں میں یہ قابلتیں پیدا ہوں گی تو ظاہر ہے ان کی طرف رخ کرنا خدا کی طرف رخ کرنا ہے۔ جیسے ایک آئینہ کسی چیز کے سامنے ہو اور دوسرا کسی ترکیب سے اس کے سامنے رکھا جائے تو بالمقابل رکھنے کی وجہ سے وہی چیز دوسرے آئینے میں بھی نظر آئے گی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اولیاء اللہ فنا فے الرسول کی صفت سے موصوف ہو کر جمال محمدی ﷺ کا ائینہ ہوتے ہیں اور اگر فنا فے

اللہ ہوں تو پھر ان کا تصور ۔۔۔ عین خدائے پاک کے جمال و جلال کا تصور ہوتا ہے اسی لئے پیر کی محبت خدا اور رسول ﷺ کی محبت ہے اور پیر کا ذکر اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کا ذکر ہے اور اس کا فکر خدا اور رسول ﷺ کا فکر ہے۔

ہر کہ او عاشق نہ شد بر روئے پیر　　از خدا ہرگز نہ شد نعمت پذیر

چوں تو ذات پیر را کردی قبول　　ہم خدا در ذاتت آمد ہم رسول

اس سے آگے لکھنا قرین مصلحت نہیں تاہم مرید کے لئے لازی ہے کہ چاہے بیٹھا ہو، لیٹا ہو، کھڑا ہو جیسے اور جس حالت میں ہو ہر طرح سے مرشد کے تصور میں محو رہے خدا کو نہ بھولے اور جہاں بھی ہو اس خیال کو نہ جانے دے تاکہ فاینما تولوا فثم وجه اللہ ۔۔ کے مصداق ہو جائے (یعنی سالک کی حالت یہ ہو جائے کہ جس طرف نگاہ اٹھائے حق تعالیٰ کے انوار قدسیہ کا جلوہ نظر آئے)

اب جبکہ صحیح احادیث سے صراحتاً" اور کنایتاً" تصور شیخ ثابت ہو گیا تو اس کے باوجود بھی اگر کسی کو شک یا شبہ ہو۔ تو ان کا کوئی علاج نہیں:۔

در جہل مرکب ابدالدھر بماند

☆☆☆☆

فصل نمبر ۶
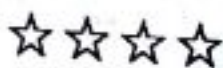
علم لدنی

علم غیب اور علم لدنی کو اکثر لوگ جدا جدا علوم سمجھتے ہیں مگر اس بارے میں جہاں تک ہم سمجھتے ہیں تو دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی یہ کہ آیا رسول ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کے اولیاء اللہ کو علم غیب حاصل تھا یا نہیں۔ تو اس بارے میں صاف بات یہ ہے کہ بلاواسطہ اور مستقل علم غیب نہ تو کسی نبی علیہ السلام کو حاصل ہے اور نہ ہی کسی ولی کو البتہ جس قدر اللہ تعالیٰ انہیں عطا فرما دے بس اسی قدر انہیں ضرور علم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مجاہدہ اور ریاضت کے نتیجے میں کشف و الہام کے ذریعے ان پر ایسے امور ظاہر کئے جاتے ہیں جن کا دوسرے لوگوں کو کوئی علم نہیں ہوتا۔ ایسے میں ان کو آنے والے واقعات کا علم بھی ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کام کا حکم "مخفی خزانے" سے صادر ہوتا ہے تو وہ اس کو سمجھتے ہیں۔ میرے مرشد پاک (قدس سرہ) حق تعالیٰ ہی کو "مخفی خزانہ" کہتے ہیں اور اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ بندے کو یہ علم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیا کرتا ہے اور کیا کرے گا۔ تو یہ علم کسی کو بھی حاصل نہیں (نہ کسی ولی کو نہ نبی علیہ السلام کو) البتہ صرف حق تعالیٰ ہی کو علم ہوتا ہے (اور ہونا بھی چاہیے) مگر ایسا ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو خبر کر دیتا ہے کہ کل یہ کام ہوگا یا بیس سالوں کے بعد یہ واقعہ پیش آئے گا۔ اور آنحضرت ﷺ کو اولین و آخرین علم عطا فرمایا گیا تھا۔ یعنی ازل سے لے کر ابد تک جو کچھ ہوا ہے یا ہوگا سب کا علم آنحضرت ﷺ کو عطا ہوا تھا۔ جیسا کہ

روایت میں ہے کہ ایک روز حضور اقدس ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے اور قیامت تک ہونے والے واقعات بیان فرما دیئے۔ ان میں سے جو کچھ کسی کو یاد رہا وہ باتیں رہ گئیں اور جو باتیں لوگ بھول گئے وہ بھلا دی گئیں۔

شیخ عبد الحق محدث رحمتہ اللہ علیہ نے مدارج میں لکھا ہے کہ معراج کی رات حضور اقدس ﷺ کو تین قسم کے علوم عطا ہوئے تھے ایک علم وہ تھا جس کا دوسروں کو دکھانے کا بھی حکم تھا۔ دوسرے قسم کا علم وہ تھا کہ حضور اقدس ﷺ اپنے صوابدید سے جن لوگوں کو اس کا اہل جانتے تو ان کو عطا فرما دے۔ تیسرے قسم کا علم وہ تھا جو حضور ﷺ کے لئے مخصوص تھا اور اس میں کسی اور کو شریک کرنے کا حکم نہ تھا' نہ ہے اور فے الحقیقت آپ ﷺ کے علاوہ کوئی اور اس کے بار کو برداشت بھی نہیں کر سکتا۔ (ان تینوں علوم میں سے) ہمارے عقیدے کے مطابق پہلا علم علم شریعت ہے۔ دوسرا علم' علم طریقت ہے جس کے طفیل ایک بندۂ خدا حقیقت و معرفت حاصل کرتا ہے اور ذات و صفات الٰہی کی حقیقت کو پالیتا ہے۔ تیسرا علم' وہ علم ہے جو ازل و ابد پر محیط ہے اور بحیثیت کلی اسرار غیب کا جامع ہے۔ یہی وہ علم ہے جو ایجاد و تکوین کا منشا ہے یہ ایسا ہے کہ ان علوم میں پہلا علم من حیث الرسالت ہے۔ دوسرا علم من حیث الولایت ہے اور تیسرا علم من حیث الوحدت اور من حیث الحقیقت ہے اور حضور انور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

علمی بعد وفاتی کعلمی فی حیاتی

(وفات کے بعد (بھی) میرا علم میری حیات کی طرح ہے) (مختصر یہ کہ) بہت سی باتیں حضور اقدس ﷺ نے ظاہر نہیں فرمائی ہیں اور ان کو مخفی رکھا ہے جن کا کچھ نہ کچھ ذکر ہم نے گذشتہ بیان میں بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر حروف مقطعات'

متشابہات۔ ساعت جمعہ یا لیلۃ القدر کی تخصیص، روح کا اسرار یا حقیقت، اسم اعظم اور صلوۃ الوسطی۔۔! حضور انور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تسئلونی عن الساعۃ و علمھا عند اللہ یعنی تم مجھ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہو اور اس کا علم حق تعالیٰ کو ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ آنحضرت ﷺ کو قیام حشر کا علم نہ تھا۔ (آپ ﷺ کو علم تھا) مگر اس کے ظاہر کرنے کا حکم نہ تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے لیلۃ القدر ایک قدسی رات ہے مگر آپ نے اس کو ظاہر نہ فرمایا۔ تو ظاہر ہے کہ قیامت کے دن کو کیسے ظاہر فرماتے۔ البتہ قیامت کی جو جو نشانیاں آپ ﷺ نے ظاہر فرما دی ہیں تو اس ضمن میں بے شمار احادیث موجود ہیں۔ چنانچہ غور کیا جا سکتا ہے کہ حضور انور ﷺ کو قیامت کی نشانیوں کا تو یقیناً" علم تھا مگر "یوم قیامت" کا علم نہ تھا؟ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک شخص کو کسی گاؤں کی گلی گلی اور ہر گھر اور گھرانے کا مکمل علم ہو اور اس گاؤں کے مالک کا ایک ایسا محبوب ہو جو کوئی راز بھی اس سے پوشیدہ نہ رکھتا ہو تو کیا گاؤں کے مالک نے اسی گاؤں کی تعمیر اور منشائے تعمیر کا راز اسے نہ بتایا ہو گا۔ مراد یہ کہ جب تک وہ گاؤں کو آباد رکھنا چاہتا ہو تو آباد رہے گا اور جب اس کی آبادی کی منشا پوری ہو گی تو اسے ختم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ سوچا جا سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ راز حضور اقدس ﷺ سے کیونکر پوشیدہ رکھا ہو گا؟ جبکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر چیز سے پہلے حق تعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ (کے نور) کو پیدا فرمایا ہے جیسے فرمایا گیا ہے کہ "اول ما خلق اللہ نوری" اور بعد ازاں تمام موجودات حضور اقدس ﷺ کے سامنے (ہوتے ہوئے) پیدا کی گئیں اور جو چیز جس مدعا کے لئے پیدا کی گئی حضور اقدس ﷺ کے علم میں تھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حضور انور ﷺ ہی حق

سبحانہ و تعالیٰ کے اولین شاگرد ہیں اور یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی استاد کا پہلا شاگرد ہی اس کا قائم مقام اور اس کے علم سے واقف ہوتا ہے۔ یہاں پر ملحوظ خاطر رہے کہ جس "عقل اول" کو حکماء مانتے ہیں وہ یقیناً" حضور اقدس ﷺ کی ذات مقدس ہے۔ لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کہ حضور انور ﷺ کو قیامت کا سارا علم ضرور حاصل تھا مگر یہ الگ بات ہے کہ اس کے ظاہر کرنے کا حکم نہ تھا۔

جہاں تک اس ایت کا تعلق ہے۔

یسئلونک عن الساعۃ ایان مرسٰہا قل انما علمہا عند ربی

(الاعراف ایت ۱۸۷)

"یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہو گا۔ آپ ﷺ فرما دیجیے کہ اس کا علم صرف میرے رب ہی کے پاس ہے" تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ یہ پردہ بھی حائل نہ فرماتے تو الٰہیت اور عبدیت "ایک" ہو جاتی اور رسالت کا وجود نہ رہتا۔ مابقایا عبدیت کے مرتبے کا جو کمال حضور اقدس ﷺ کے لئے مخصوص فرمایا گیا تھا۔ وہ بھی نہ رہتا۔ تو چونکہ حضور اقدس ﷺ اس پر من حیث الرسالت مامور تھے اس لئے آپ نے سکوت فرمایا اگرچہ من حیث الوحدت رسول ﷺ (فداہ امی و ابی) اور حق تعالیٰ جل شانہ کا علم - ایک - ہے اور اسی لئے فرمایا کہ انما علمہا عند اللہ اور حضرت امیر المومنین شیر خدا علی المرتضیٰ علیہ السلام جو سرگروہ اولیاء ہیں تو ان کے بارے میں کنز العمال میں لکھا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ "میں نے علی کو ایک ایسا علم سکھایا ہے جو کسی اور کو نہیں سکھایا" اور اسی کنزالعمال میں لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ "کبھی کبھی حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام بر سر منبر فرمایا کرتے تھے کہ :-

"سلونی"

یعنی جو کچھ تم مجھ سے پوچھنا چاہو پوچھ لو کیونکہ مجھے سب علم دیا گیا ہے چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کا علمی درجہ سب سے بلند و ارفع ہے اور ان کا علم لدنی بھی تمام اولیاء رحمتہ اللہ علیہم سے بدر جہاز زیادہ ہے (وہ اس سے ظاہر ہے کہ) جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک زناکار عورت پر رجم کا حکم دیا اور حضرت امیر علیہ السلام کا یہ معلوم کرنا کہ وہ حاملہ ہے اور بچے کی پیدائش تک رجم کا حکم معطل کروانا اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ :۔

لولا علی فهلک العمر

(اگر علی علیہ السلام نہ ہوتا تو عمر رضی اللہ ھلاک ہوتا)

مشہور بات ہے۔

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے بعد تمام اولیاء اپنی اپنی استعداد کے مطابق علم لدنی رکھتے ہیں اور یہ فیض قیامت تک جاری رہے گا اور امام شعرانیؒ نے طبقات الکبریٰ میں تحریر فرمایا ہے:۔

"عبدی یتقریب الی بالنوافل حتی احبہ فاذا احبہ کنت لہ سمعا و بصرا (الحدیث قدسی)

اور اہل طریقت کے نزدیک نوافل کے معنے ہی یہی ہیں کہ بندہ حق تعالیٰ کے شہود کے وقت اپنے نفس کے شہود سے فانی ہو جائے۔ تو جب ایک بندہ خدا کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اس کا علم خدا کا علم ہو' اس کا دیکھنا اور سننا خدا ہی کا دیکھنا اور سننا ہو (تو سبحان اللہ) حق تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ:

وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس الانعام ایت ۱۲۲

"اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور دے دیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے"

مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو ایک ایسا نور عطا فرما دیتا ہے جس کے ذریعے وہ لوگوں (کے دلوں کی) باطنی سیر کرتے ہیں یعنی دلوں کی خبر پاتے ہیں اور جناب امیرالمومنین علیہ السلام کے بارے میں تو ایسی عجائب باتیں بکثرت موجود ہیں۔ جو بہت مشہور بھی ہیں اور ان کی کوئی حد نہیں۔ مثلاً" ایک روز جب عبد الرحمان ابن ملجم خارجی آپ کے سامنے سے گذرا تو حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا "بخدا یہ میرا قاتل ہے"۔ لوگوں نے عرض کیا کہ جب "یہ بات آپ کو معلوم ہے تو اسے قتل کیوں نہیں کرتے"۔ جواباً" جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا کہ ابھی " تو اس نے بھی مجھے قتل نہیں کیا ہے"۔ یعنی قتل کرنے کے فعل سے قبل میں کیوں کر سزا دے سکتا ہوں۔ اور جنگ صفین کے دنوں میں جب آپ کربلا پہنچے تو فرمایا کہ میرے فرزندوں اور اہل بیت علیہم السلام کو یہاں قتل کیا جائے گا اور بعد ازاں الگ الگ مقامات کی نشاندہی کی کہ اس مقام پر فلاں شہید ہو گا اور اس مقام پر فلاں۔

حضرت عمرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ ایک روز خطبہ دے رہے تھے اور دوران خطبہ فرمایا کہ یا ساریتہ الی الجبل۔ یا ساریہ الی الجبل یعنی اے ساریہ پہاڑ کی طرف ہو جا۔ اے ساریہ پہاڑ کی طرف ہو جا۔ سننے والے حیران تھے کہ حضرت عمرؓ نے یہ کیا فرمایا۔ اور اس کا مطلب کیا ہے۔ مگر ایک ماہ کے بعد کچھ مسلمان غازی جہاد سے واپس آئے تو انہوں بتایا کہ ایک مقام پر کافروں کی فوج ہم پر حملہ کرنے والی تھی اور قریب تھا کہ ہم قتل بھی ہوتے اور قیدی بھی بن جاتے جبکہ ہم کفار کے حملہ سے بالکل بے خبر تھے تو اسی اثنا میں حضرت عمرؓ کی آواز سنی گئی کہ اے ساریہ! پہاڑ

کی طرف ہو جا" اور ساریہ ہمارے سالار تھے چنانچہ ہم ایک طرف ہو گئے۔ اور کفار بھی سمجھے ہوں گے کہ ان کو پیشگی اطلاع مل چکی ہے جنگ ہوئی۔ اور کفار کو شکست ہو گئی۔ الغرض ایسی باتیں حقیقت پر مبنی ہیں ایک ولی اللہ اگر زندہ ہو یا وفات پاچکا ہو اس سے ایسی باتوں کا اظہار ہوتا رہتا ہے بلکہ وفات کے بعد تو اس کی کرامت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے حضرت غوث ثقلین دستگیرؒ فرماتے ہیں کہ وفات شدہ ولی اللہ کی مثال بغیر نیام کے تلوار کی ہوتی ہے۔ یعنی جب وہ زندہ ہوتا ہے تو جیسے تلوار نیام میں ہوتی ہے۔ مراد یہ کہ بعد از وفات اولیاء اللہ کی کرامات میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے اولیاء اللہ کی کرامت کے بارے میں ہم بخاری کی حدیث قدسی گذشتہ اوراق میں نقل کر چکے ہیں جو ہم نے طبقات الکبریٰ سے لی ہے اور ثبوت کے لئے وہی کافی ہے۔

اگر چہ بعض اہل حدیث اس بارے میں جھگڑتے ہیں وہ یہ نہیں مانتے کہ اولیاء بھی کسی کا کوئی کام کر سکتے ہیں۔ نیز جو لوگ اولیاء سے مدد طلب کرتے ہیں۔ یہ لوگ ان کو مشرک کہتے ہیں۔ تاہم ان اہل حدیث میں بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو طریقت کے قائل ہیں اور بعض مخالف ہیں۔ جب ہم ان لوگوں کی تصانیف کو دیکھتے ہیں تو یہ لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ غیر اللہ سے مدد مانگنا حرام ہے اس لئے مناسب ہے کہ یہاں پر چند باتیں اس ضمن میں بھی کی جائیں۔

وباللہ التوفیق

☆☆☆☆☆

استمداد از انبیاء و اولیاء

ہم نے گذشتہ اوراق میں عرض کیا ہے کہ "انسان" خدا کا خلیفہ ہے اور خلیفہ اسے کہا جاتا ہے جو بادشاہ کی جگہ کام کرتا ہے یا بادشاہ ہو' یعنی جس نے اسے خلیفہ مقرر کیا ہو اس کے بعد بادشاہ بنے۔ لفظ خلیفہ۔ "خلف" سے ہے یعنی "مابعد" یا پیچھے آنے والا (تو خدا نے) دنیا میں ہر وہ کام اس انسان کے حوالے کر دیا جس کا وہ اہل تھا۔ مگر چونکہ "خلق آدم علی صورته" بھی فرمایا گیا ہے اس لئے حق تعالیٰ نے اپنی صفات کا مجمل ساخاکہ اور طاقت اسی انسان کی روح میں رکھ دیا چنانچہ انسان کو حاکم اور ماتقیا مخلوق کو محکوم بنایا گیا۔ اس لئے کہ اگر انسان (خلیفہ) میں حق تعالیٰ عزاسمہ کی وہ قوتیں مثلاً" رحم۔ کرم' قہر' عفو' عطا' علم اور تصرف فے القلوب وغیرہ نہ ہوتیں تو سوچنا چاہیے۔ کہ وہ زمین پر خلافت کا کاروبار کیسے چلاتا۔ رہی یہ بات ہے کہ انسان دوسروں کے قلوب پر متصرف ہو سکتا ہے کہ نہیں۔ تو سچی بات یہ ہے کہ اس سے انکار کرنا صریح جہل کی وجہ سے ہوتا ہے (اولیاء اللہ کی تو خیر بات ہی الگ ہے) جادوگر اور مسمریزم کے عامل بھی دلوں پر تصرف کرتے ہیں اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ وہ حاضر تصرف بھی کرتے ہیں اور غائب بھی تو مقابلتاً" اولیائے اللہ تو حق تعالیٰ کے لاڈلے ہوتے ہیں کیا وہ کالے جادوگروں سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں کہ وہ اس قسم کے تصرف سے لاچار ہوں۔ کیونکہ۔۔۔۔۔ بخدا وہ تو ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ (خدا کے حکم سے) جس کام کی نیت یا ارادہ کر لیں تو وہ ہو جاتا ہے اور اس میں حیات و وفات کا بھی کوئی سوال نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس دنیا میں اور وفات کے بعد دوسری دنیا میں بھی

تصرف کو کام میں لا سکتے ہیں اگر چہ یہ تصرف اکثر ان کی ذاتی (صفت) نہیں ہوتی اور نہ ہر وقت کار آمد ہوتی ہے کیونکہ بعض وقت (چاہتے ہوئے) بھی کچھ نہیں کر سکتے نہ ہی کچھ دیکھ سکتے ہیں بقول حضرت شیخ سعدی شیرازی رحمتہ اللہ علیہ۔

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم

گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وہی قدسی لوگ ہوتے ہیں جن کے بارے میں کسی اور نے نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے متکلم کے طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

"میں ان کا ہاتھ ہو جاتا ہوں پس وہ اسی کے ذریعے کام کرتے ہیں" اب یہاں پر غور کا مقام یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کا ہاتھ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ (ظاہر ہے کہ دست قدرت تو ہر چیز پر قادر و بالا ہے۔ تو جن بندوں کا حق تعالیٰ خود ہاتھ' آنکھیں اور کان ہو جائے تو ان کے تصرف اور عظمت شان کا کیا ٹھکانہ ہو گا۔) یہاں پر ایک اہم بات اور بھی ہے وہ یہ کہ خود حق تعالیٰ بھی ہم کو حکم دیتا ہے کہ وہ "غیر اللہ" جو مدد دینے کے اہل ہیں انہی سے بھی مدد مانگ لیا کرو۔ چنانچہ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ہم خداوند عالم کی مانیں یا وہابیوں کی۔ دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

واستعینوا بالصبر والصلٰوۃ (البقرہ ایت نمبر ۴۵)

(تم) مدد لو صبر اور نماز سے

"یعنی جب کبھی آفت و مصیبت درپیش ہو تو صبر اور نماز سے مدد لو اب فرمایئے اور انصاف کیجیے کہ صبر اور نماز۔۔ غیر اللہ نہیں۔ اور کیا یہ "غیر اللہ" پر تکیہ نہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس قسم کے "غیر اللہ" سے استمداد طلب کرنا جائز ہے۔ البتہ اگر کوئی یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ انبیاء علیہ السلام اور اولیاء رحمتہ اللہ حضرت حق جل مجدہ کے وسیلے کے بغیر (اپنی قوت سے) کسی کی مدد کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں تو یہ

مرہا" غلط ہو گا اس لئے کہ جس تصرف اور طاقت کو کام میں لا کر وہ کسی کے مشکل کو دور کرتے ہیں تو وہ تصرف اور طاقت ان کو خدا نے دی ہوتی ہے (بہرحال) ان لوگوں (وہابیوں) میں وہ بے ادب بھی شامل ہیں۔ جن کے بارے میں صحیح بخاری میں ایک حدیث مبارک موجود ہے "ایک روز حضور ﷺ کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے تو قبیلہ بنی تمیم کا ایک شخص آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ انصاف سے کام لو۔ تو اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کے خدا تجھ سے سمجھے اگر میں عدل و انصاف نہ کروں گا تو اور کون کرے گا۔ (چنانچہ) حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول ﷺ! اجازت دیجیے کہ اس شخص کی گردن کاٹ لوں۔ مگر حضور انور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عمرؓ! رہنے دو اگر تم نے ان لوگوں کو دیکھا اور خصوصاً" ان کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو تمہیں اپنی نمازیں ان کے مقابلے میں کمتر نظر آئیں گی۔ (اسی طرح) یہ لوگ قرآن کی تلاوت بھی کرتے ہیں مگر ان کے گلے کے نیچے نہیں سے اترتی"۔ اسی طرح کنز العمال میں ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ عدل کرو۔ تو حضور اقدس ﷺ نے مندرجہ بالا جواب دیا اور نیز ارشاد فرمایا کہ اس قوم کو قوت ملے گی اور یہ مسلمانوں کو قتل کریں گے اسی طرح قرآن کی تلاوت کریں گے مگر وہ ان کے گلوں سے نیچے (دل کی طرف) انہیں اترے گی۔ یہ لوگ دین سے ایسے نکلے ہوں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ یہ لوگ سر کے بال منڈوائیں گے اور انتہائی زاہد و عابد دکھائی دیں گے انہی میں سے ایک آدمی ہو گا جس کے دائیں ہاتھ کی جگہ خالی گوشت کا ایک ٹکڑا لٹکتا ہو گا جو بالوں سے ڈھکا ہو گا۔ تم (اصحابؓ) جہاں کہیں بھی ایسے لوگوں کو پاؤ تو ان کو قتل کرنا۔ چنانچہ جب ایسے لوگوں نے خوارج کی شکل میں بغاوت کی۔ تو امیر المومنین علی کرام اللہ وجہہ نے ان کو قتل کیا۔ صرف چند ایک زندہ نکل گئے۔ خدا کی قدرت کہ وہ شخص جس کے داہنے ہاتھ کی جگہ گوشت کا لوتھڑا لٹک رہا

وہ مقتولین میں پایا گیا۔ دراصل حضرت امیر علیہ السلام کی لشکر کو یہ تردد تھا کہ ایسا نہ ہو زاہد و عابد مسلمان قتل کئے گئے ہوں۔ مگر جب لوتھڑے والے شخص کی لاش ملی تو ساری لشکر نے شکر کا سجدہ ادا کیا۔ اور وہ مطمئن ہو گئے کہ انہوں نے کافروں کو قتل کیا ہے۔ بہرحال وہ چند ایک جو زندہ بچ گئے وہ نجد کی طرف بھاگ گئے اور وہاں پر اپنے "مذھب" کو فروغ دیا جو ایک زمانہ گذرنے کے بعد عبدالوہاب نجدی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ انہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا اور جو مسلمان بھی "یا رسول اللہ" کہتا اسے قتل کرتے۔ انہوں نے لوگوں کو درود شریف پڑھنے سے بھی منع کیا اور حکم دیا کہ صرف قرآن پڑھا جائے۔ یہ لوگ سروں کے بال منڈواتے اور اس شدت سے منڈواتے کہ عبد الوہاب نجدی نے عورتوں کو بھی معاف نہ کیا۔ عورتوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ بھی سروں کے بال منڈوائیں۔ ایک لڑکی نے سر کے بال نہ منڈوائے تھے۔ (اس کی پیشی ہوئی) تو عبد الوہاب نجدی نے اس سے پوچھا کہ "میرے حکم کے بموجب تم نے سر کے بالوں پر استرہ کیوں نہیں پھیرا ہے"۔ تو دوشیزہ نے جواب دیا کہ "مردوں میں جو مرتبہ دھاڑی کو حاصل ہے وہی مرتبہ عورتوں کے سر کے بالوں کو حاصل ہے چنانچہ تم ڈھاڑی منڈوالو اور میں سر کے بال منڈوا لوں گی" کہتے ہیں کہ عبد الوہاب چپ ہو گیا اور کوئی جواب نہ دیا

اب یہ فتنہ سلطان ابن سعود نجدی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے اور عبد الوہاب کا فتنہ بھی اسی نجد سے ظاہر ہوا تھا یہ لوگ کلمہ طیبہ لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں:۔

لاالہ الا اللہ مالک یوم الدین۔ عبد الوہاب نجدی بھی ایسا ہی کہا کرتا تھا اور اسی فتنے کی خبر خاص طور پر حضور اقدس ﷺ نے (امت) کو دی تھی۔ بخاری شریف میں ایک اور حدیث ہے حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہمارے

(ملک) شام کو برکت دے۔ یمن کو برکت دے وغیرہ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہمارے نجد کو۔ تو آپ ﷺ نے پھر اپنے الفاظ دھرائے اور نجد کا نام نہ لیا۔ صحابہؓ نے پھر عرض کیا کہ ہمارے نجد کو۔ الغرض صحابہؓ نے تین بار تکرار کیا تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ نجد سے فتنے اٹھیں گے اور شیطان کے سینگ نمودار ہوں گے۔ چنانچہ یہی بات ہے کہ سلطان ابن سعود اور اس کے گروہ نے اصحابؓ رسول ﷺ کی زیارتوں کو منہدم کر دیا اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا کی قبر مبارک پر فائرنگ کرتے وقت ایک نجدی یہ بھی کہتا جا رہا تھا کہ:۔

"بہت عرصے تک تم نے بادشاہی کی مگر اب تمہاری بادشاہی مزید نہیں چلے گی۔(۱)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ (خاکم بدہن) رسول اللہ (ﷺ) سے ایک لاٹھی (لکڑی) بھی بہتر ہے جس سے جانور ہانکے جا سکتے ہیں رسول اللہ ﷺ تو اب وفات پا چکے ہیں اس سے خیر کی کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ اور تعجب یہ کہ اپنی اس قسم کی ساری باتیں وہ عین ۔ "اسلام" ۔ سمجھتے ہیں یہ لوگ حضور سرور کونین ﷺ کو ایک بڑے بھائی کی طرح سمجھتے ہیں یہ لوگ حب رسول ﷺ کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اور اس

---

(۱) اس کا ایک نفسیاتی مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ نجدی (وہابی) لوگ قبر والوں کو تو چھوڑیئے ان کی قبروں کو بھی زندہ و تابندہ سمجھتے ہیں ورنہ قبر پر فائر کرنا' اس کو مخاطب کرنا اور قبر والی (ام المومنین علیہا السلام) کو مخاطب کرنے کے اور کیا معنے ہیں۔ اس سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وفات شدہ لوگ بھی بادشاہت کے مزے لوٹتے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے اور سب کے لئے قابل غور ہے (مترجم)

کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو گا یعنی اگر ان کو حضور اقدس ﷺ سے محبت ہوتی تو آپ ﷺ کے اہل بیت کی مطہر قبروں کو ملیا میٹ کر کے کیوں منہدم کرتے۔ حالانکہ یہ امر احادیث مبارکہ سے بھی ثابت ہے کہ مرنے کے بعد بھی مرحوم کی "حرمت" باقی ہوتی ہے۔ نیز یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی صرف اتباع ضروری ہے آپ ﷺ کی محبت ضروری نہیں۔

یعنی اگر ایک آدمی راستہ طے رہا ہو اور کسی دیکھنے والے کو یہ یقین ہو کہ یہ آدمی صحیح راستے پر جا رہا ہے اور وہ بھی اس کے عقب میں روانہ ہو جائے تو گویا منزل مقصود تک پہنچ جائے گا ان کے اس عقیدے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ چاہے آگے جانے والے شخص سے بغض اور دشمنی ہی کیوں نہ ہو۔ منزل پالے گا (۱)

---

(۱) یہاں پر بھی ایک نفسیاتی نکتہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ انسانی نفسیات کے قطعی خلاف ہے کہ اگر ایک شخص میں خامیاں موجود ہوں یا اس سے بغض اور دشمنی ہو تو کوئی پاگل بھی اس کی اتباع نہ کرے گا کیونکہ اتباع تو اس صورت میں کی جائے گی جب ہادی یا شارع سے قلبی لگاؤ اور انتہائی محبت ہو۔ تاریخ مذاہب عالم میں ہمیں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی مذہب یا عقیدے کے معتقدین نے اپنے مذہب کے بانی یا پیغمبر سے محبت نہ کی ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، جناب گوتم بدھ، جناب رام، جناب زرتشت اور جناب کنفیوشس وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں اور فی الحقیقت یہ محبت ہی کا کرشمہ تھا کہ جناب گوتم بدھ کی وفات کے ڈھائی تین سو سال بعد دور دور تک پھیل گیا تھا۔ جہاں تک حضور اقدس ﷺ سے محبت رکھنے کا تعلق تو سیرت النبی ﷺ سیر الصحابہؓ، احادیث نبوی ﷺ اور خود قرآن عظیم الشان گواہ ہے کہ آپ ﷺ سے کتنی محبت کی جاتی رہی ہے۔ میرے خیال میں ہر سنت نبوی ﷺ آپ سے بے پناہ محبت کی دلیل ہے اور خدانخواستہ یہ محبت (جو اکسیر اعظم کا درجہ رکھتی ہے) درمیان سے نکل جائے تو پھر اسلام، یہودیت یا نصرانیت میں کونسا فرق رہ جائے گا۔ خدا سے تو سب "محبت کرتے ہیں یہی سوچنے کی بات ہے (طاہر چشتی)

چونکہ ان کے پرانے خارجی "بھائیوں" نے (جن کو حضرت امیر المومنین علی نے قتل کیا تھا) ان کے دلوں میں خارجیت کا تخم بویا تھا تو شیطان نے بھی معمولی سی کوشش کر کے اس تخم کی آبیاری کی اور اسے سرسبز بنا دیا۔ وہ اس طرح کہ وہابی نماز و روزہ کی پابندی تو کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو خوبصورت بنا کر دکھاتے ہیں لہٰذا زہد و تقویٰ کی نفی کی وجہ سے تو شیطان ان کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا چنانچہ دوسری طرف سے حملہ کر دیا اور ان لوگوں کے دلوں میں شرک کی مذمت اور توحید کی حمایت کچھ اس ترکیب سے ڈال دی کہ ساری دنیا جہان میں تم جیسے موحد، عابد اور زاہد کہیں بھی موجود نہیں اور نیز یہ کہ تمہارے بغیر ہر مسلمان مشرک ہے۔ اسی طرح یا رسول اللہ ﷺ کہنا شرک ہے اور کسی زندہ ولی اللہ یا وفات شدہ اولیاء کی ارواح سے مدد مانگنا شرک عظیم ہے اور اگر شیطان ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈال دیتا کہ زیادہ نمازیں وغیرہ نہ پڑھو یا قرآن حق نہیں تو یہ باتیں کب وہ مانتے۔ چنانچہ دوسری طرح سے انہیں پکڑ لیا اور اس عمل میں یہ لوگ اتنی دور تک چلے گئے کہ حضور اقدس ﷺ کی ہتک سے بھی منہ نہ موڑا۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ اگر ایسے لوگ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رحمتہ اللہ علیہم کی مافوق العادۃ قوت سے انکار کر دیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ان کے دلوں پر شیطان نے زبردست قبضہ جما لیا ہے۔

خیر تو وسیلے اور کامل مرشد کے بارے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے آیت یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ کے بارے میں لکھا ہے کہ وسیلے سے مراد کامل مرشد ہے۔ امام یافعی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی فرمایا ہے کہ جس نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کو اپنا وسیلہ بنایا تو مراد پالے گا۔ اور فتاویٰ زاد للبیب میں تحریر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ :۔ اذا تحیر

تم فے الامور واستعینوا من اہل القبور یعنی جب تم کسی مشکل میں گرفتار ہو جاؤ تو اہل قبور سے مدد طلب کرو اور ملا علی قاری رحمتہ اللہ علیہ حنفی لکھتے ہیں کہ جنگل میں اگر کوئی کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو مناسب ہے کہ یہ الفاظ دہرائے

اعیونی یا عباداللہ

تو کوئی شک نہیں کہ کہ اولیاء اس کی مدد کریں گے۔ اور یہ اشارہ چالیس ابدالوں کی طرف ہے۔ احادیث میں بھی ایسا اشارہ موجود ہے۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ ستر اشخاص میری امت میں قائم ہوں گے اور ان کا وظیفہ اللہ کے بندوں کی مدد کرنا ہو گی۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ:۔الدال فی ثبات الابدال میں لکھا ہے کہ مندرجہ بالا روایت درست ہے ایک اور کتاب اثبات الاستمداد اور سماع میں تحریر ہے کہ:۔

"امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ گفتہ است۔ قبر امام کاظم علیہ السلام تریاق مجرب است مر اجابت و دعارا۔ وحجتہ الاسلام غزالی رحمتہ اللہ علیہ گفتہ است کہ استمداد کردہ شود درحیات و استمداد کردہ شود بعد از وفات"

"حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ نے کہا ہے کہ دعا اور اجابت دعا کے لئے امام کاظم علیہ السلام کی قبر تریاق مجرب ہے اور حجتہ الاسلام امام غزالی کا کہنا ہے کہ استمداد جیتے جی بھی ہوتی ہے اور وفات کے بعد بھی ہوتی ہے"۔

مولوی اسماعیل جو وہابیوں کے سرگروہ ہیں اپنی کتاب "صراط مستقیم" میں لکھتے ہیں کہ سید احمد جو شاہ عبد العزیز کے خلیفہ تھے کی روح کو حضرت غوث الاعظم دستگیر (قدس سرہ) اور حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند (قدس سرہ) کی ارواح پاک نے صبح تک توجہ کی (اور اسی طرح کتاب اغیاث الاستمداد و السماع صفحہ نمبر۶۱ سے صفحہ ۷۳ تک اس عنوان پر مطالعہ فرمائیں)

"به تحقیق ثابت شده است به آیات و احادیث که روح
باقی ست واورا علم و شعور بر زائران و احوال ایشاں ثابت است و
ارواح کاملاں را قربے و مکانے درجناب حق تعالیٰ ثابت است
چنانچه که درحیات بود و بیشترازاں و اولیاء "را" (۱)
کرامات و تصرف در اکوان حاصل ست و اں نیست مگر ارواح ایشانرا۔ و ارواح باقی
ست"

آیات و احادیث سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ روح باقی رہتی ہے (نہیں مرتی) اور بعد از وفات زائرین کے حال احوال سے باخبر ہوتی ہے کیونکہ فی الحقیقت کاملوں کی ارواح کو حق تعالیٰ کے حضور میں قرب و مقام حاصل ہوتا ہے اور یہ بالکل اس طرح ہوتے ہیں جیسے حین حیات میں ہوتے ہیں بلکہ وفات کے بعد تو کاملین کا تصرف مزید نکھر جاتا ہے جن اولیاء کو اس دنیا جہاں میں کرامات و تصرفات حاصل ہوتے ہیں تو در اصل یہ بھی ان کی ارواح کا کمال ہوتا ہے۔

علامہ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ "اگر بہ نیت حصول مدد از وے ناکامل شود۔ ثواب عبادت بہ برکت قبر و مجاورت مرایں روح را حرجے نیست" اس کے بعد مشکوۃ کی یہ حدیث شریف نقل کی ہے:۔

عن عائشةؓ قالت کنت ادخل بیتی الذی فیه رسول اللہ ﷺ وانی واضع ثوبی و اقول انما ھو زوجی

....

میرے خیال میں یہاں "را" کتابت کی غلطی سے نہیں لکھا گیا ہے مصیبت یہ ہے کہ جن کتب سے یہ حوالہ جات لئے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی میرے پاس نہیں۔ خدا معاف فرمائے مترجم

و ابی۔ فلم دفن عمرؓ ما ادخلته الا و انا مشدده علیٰ ثیابی حیاء من عمرؓ

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں حضور ﷺ کے روضہ پر حاضر ہوتی جو میرے حجرے (کمرے) میں واقع تھا اس حال میں کہ میرے سر پر چادر نہ ہوتی تھی۔ میں کہتی کہ (ایک) صاحب قبر میرا شوہر اور دوسرا میرا والد ہے لیکن جب حضرت عمرؓ یہاں دفن کئے گئے تو پھر میں ننگے سر نہ جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ سے حیا کی وجہ سے۔

علامہ قسطلانی رحمتہ اللہ علیہ اور علامہ عینی رحمتہ اللہ علیہ اور علامہ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح میں تحریر کیا ہے کہ یہ حدیث انبیاء اور اولیاء کی حیات بعد الممات پر دلالت کرتی ہے اور اس سے صاحب قبر کی حرمت بھی ثابت ہوتی ہے۔ مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں۔

از خدا خواہیم توفیق ادب
بے ادب محروم ماند از فضل رب

مراد یہ کہ انبیاء اور صلحاء کی حیات (بعد از وفات) اتفاق کے ساتھ ثابت ہے۔ تو اگر زندگی میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا تو اس میں جھگڑے کی کیا گنجائش ہے۔ ہم لوگ بھی زندہ لوگوں سے مدد مانگتے ہیں مگر حیرت ہے جو "مردہ" ہیں' ان کو تو لوگ زندہ کہتے ہیں اور جو ابد الا باد تک زندہ ہیں انکو مردہ کہتے ہیں اسی لئے تو ہم ان لوگوں کی عقل و فکر کا ماتم کرتے ہیں۔ کیونکہ علمائے ظاہر اور خصوصاً وہابی موت و حیات کے فلسفہ سے قطعی بے خبر ہیں۔ یہ کیا جانیں کہ موت کیا ہوتی ہے۔ اور حیات کیا شے ہوتی ہے۔ شاہ صوفیہ شیخ محی الدین ابن العربی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ "دنیا میں فوت ہو جانا آخرت میں پیدائش ہوتی ہے اور آخرت میں فوت ہونا دنیا میں پیدا ہونا ہوتا ہے" اگر کسی کے دل کی آنکھیں بینا ہوں اور قدسی عقل بھی رکھتے ہوں تو وہ جان لیں گے۔

(کہ اس کا مطلب کیا ہے۔) اسی لئے تو قاضی عیاض مالکی نے اپنی کتاب شفا اور قسطلانی رحمتہ اللہ علیہ شافعی نے کتاب مواہیب الدنیہ میں اور ابن حاج نے مدخل میں اور امام غزالی نے احیاء العلوم میں ذکر کیا ہے کہ توسل انبیاء علیہ السلام اور توسل اولیاء بالکل درست ہے زندگی میں بھی اور بعد از وفات بھی علامہ شعرانیؒ فرماتے ہیں:۔

ان ائمه الفقهاء و و الصوفيه يشفعون
فی معلاهم و يلا حظون اقوالهم
عند طلوع روحه وعند سوال
منكر و نكير و الميزان والحساب
......الخ

اور حضرت امیر خسرو قدس سرہ فرماتے ہیں۔

قصہ پیران ما چوں قصص الانبیاست
ذکر مریدان او تذکرہ اولیاست

آخر میں صرف اسی قدر عرض کیا جاتا ہے کہ طالبان حق ہرگز ہرگز وہابیوں اور بعض علمائے ظاہر کی مخالفتوں کی وجہ سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ یہ لوگ حسب عادت زمانہ قدیم سے اہل اللہ کی مخالفت کرتے آئے ہیں لہٰذا ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔

یہاں پر میں اپنے برادران طریقت کی خدمت میں سلسلہ چشتیہ اور قادریہ کا شجرہ مبارک پیش کرنا چاہتا ہوں اس وضاحت کے ساتھ کہ اوقات مصیبت میں ان کا پڑھنا بے حد مفید ہے بلکہ بہتر یہی ہو گا کہ ہر روز نماز فجر کے اذکار و اوراد سے فارغ ہونے کے بعد باقاعدہ پڑھے جائیں:۔

☆☆☆☆☆☆

شجرہ عالیہ چشتیہ' نظامیہ نیازیہ

فضل کر ہم پر الٰہی' اپنی ذات کبریا کے واسطے

رکھ ماسوٰی سے ہمیں کنارا' محمد مصطفٰی کے واسطے

علی جو باب علم نبی ہے' نور ہدایت حسن بصری ہے

شیخ عبد الواحد بڑا ولی ہے' ابن عیاض صفا کے واسطے

غوث ابراہیم شہہ ادھم کی خاطر' پیر بو حذیفہ صفی کی خاطر

ہبیرہ بصری سخی کی خاطر' ممشاد اہل بقا کے واسطے

خواجہ بو اسحاق کفیل میرا' ابدال احمد خلیل میرا

ہے بو محمد وکیل میرا' بو یوسف مقتدا کے واسطے

ہمارا خواجہ مودود چشتی' حاجی شریف اور عثمان بہشتی

معین الدین خواجہ لگا دے کشتی' کنارے پر تو خدا کے واسطے

خواجہ قطب دیں ہے قطب دوران فرید گنج خواجہ ہے دوست سبحان

نظام الدین و الحق محبوب یزداں' نصیر الدین مہ لقا کے واسطے

کمال الدین جو کمال دیں ہے' ضیائے دیں جو سراج الدیں ہے

خواجہ بر حق جو علم الدین ہے' محمود راجن صفا کے واسطے

جمال دیں وونی جمن ہے' گل حقیقت شیخ حسن ہے

شیخ محمد بوئے چمن ہے، یحییٰ مدنی ولا کے واسطے
بحق شاہ کلیم اللہ تو، نظام الدین و فخر الدین شہا تو
مدد مدد کرمری سدا تو، نیاز احمد خدا کے واسطے
مست و رند مولوی ہے کتنا پیارا، عبید اللہ جی ہے مرشد ہمارا
محمد عظیم پیاروں کا پیارا، قافلہ اصفیاء کے واسطے
بحق فخر علم خفی تو، عبدالستار شہہ باچہ سخی تو
رحم وکرم کر ہم پہ غنی تو، سید بے نوا کے واسطے
حمزہ ہمیشہ ہے محوزاری، خلق عطا ہو خدائے باری
چشمہ، چشت ہو مدام جاری، بحق انبیاء و اولیاء کے واسطے
بہ لطف وحدت و احدیت، بحق برزخ و احدیت
طاہر کمتر کو قابلیت، عطا ہو صل علا کے واسطے

شجرہ عالیہ امامیہ قادریہ

میرے اللہ تیری ذات کبریا کے لئے
فضل کر ہم پہ محمد خیر الوریٰ کے لئے
بے وسیلہ نہ رہیں روز قیامت ہم سب
حضرت علی امام حسن زین العبا کے لئے
امام باقر و جعفر صادق امام ہیں تیرے
موسیٰ کاظم امام کل موسیٰ رضا کے لئے
اسداللہ معروف کرخی صفاء الدین کی خاطر
سری سقطی حضرت جنید باصفا کے لئے
شیخ شبلی عبد الواحد ابو الفتح طرطوسی
ابوالحسن ابوسعید رہنما کے لئے
غوث صمد قطب سبحان عبد القادر جیلانی
عبد العزیز سید حتاک اہل بقا کے لئے
آل نبی ہیں شمس الدین شرف الدین زین الدین
ولی الدین و نورالدین آل عبا کے لئے
حضرت سید عبد الجلیل با صفا کی خاطر
شاہ عبد اللہ' شاہ عرب عجم ولا کے لئے

خواجہ نیاز بے نیاز بریلی کی خاطر
عبید اللہ' مولوی شاہ اتقیا کے لئے
مولا و مرشد و خواجہ محمد عظیم کی خاطر
سیدنا عبد الستار بے نوا کے لئے
میں فخر علم کا خادم ہوں وہ آقا میرا
بخش دے مجھ کو غنی آل مصطفیٰ کے لئے
میں ہوں خورسند کہ رہوں در پہ سوالی تیرے
میں وہ گھائل ہوں جو ہوتا ہو واویلا لئے ہے
سوختگان نار معصیت ہیں حمزہ و طاہر
بھیج یخ سایہ تو بردا" وسلاما کے لئے

(یادشت :۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں شاعر نہیں۔ البتہ ضرورت کے وقت کچھ نہ کچھ تک بندی کر سکتا ہوں۔ مندرجہ بالا دونوں شجرہ ہائے مبارکہ کا میں نے اردو نظم مں ترجمہ کیا ہے جبکہ اردو میری مادری زبان بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اگر میں نے شاعرانہ اصولوں کے خلاف کوئی غلطی کی ہو تو معافی کا خواستگار ہوں۔ مترجم)

☆☆☆☆

اقسام فقراء

فقراء کی چار قسمیں ہیں اس ضمن میں حضرت شیخ سعد قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ فقراء کی پہلی قسم کو "سالک محض" کہا جاتا ہے یہ وہ فقیر ہوتا ہے جس کو ابتدائے سلوک سے لے کر انتہا تک جذبہ حاصل نہیں ہوتا۔ یعنی جذبة من جذبات الحق خير من عبادة الثقلين (جذبات الٰہی میں سے صرف ایک جذبہ ہی جن و انس کی عبادت سے بہتر ہے) یہاں ثقلین کی جگہ ستین سنتہ بھی مشہور ہے یعنی ساٹھ برس۔

فقراء کی دوسری قسم کو "مجذوب محض" کہا جاتا ہے اور مجذوب محض اپنے ابتدائی حال سے انتہا تک جذب میں ہوتا ہے اور طریقہ سلوک سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا نہ اس سے واقف ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ "سالک محض" اور مجذوب محض ہر دو تعلیم و تلقین یا مشیخت کے اہل نہیں ہوتے۔

فقراء کی تیسری قسم کو "سالک مجذوب" کہا جاتا ہے یہ فقیر آخر میں مجذوب ہو جاتا ہے یعنی شروع تو سلوک سے کرتا ہے مگر آخر میں اس پر جذب غالب ہو جاتا ہے۔

فقراء کی چوتھی قسم کو مجذوب سالک کہتے ہیں یہ فقیر ابتدائے سلوک سے مجذوب ہوتا ہے مگر اپنے سلوک کے آخر میں سالک ہو جاتا ہے۔

ملحوظ خاطر رہے کہ یہ دونوں یعنی سالک مجذوب اور مجذوب سالک مشیخت کے اہل ہوتے ہیں البتہ اسی منصب (مشیخت) کے لئے "مجذوب

سالک " لاجواب ہوتا ہے تاہم سارے اولیاء انہی چہار اقسام پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک' ایک مرتبہ پر فائز ہوتا ہے اور ان کے مراتب بے شمار ہیں۔ میرے مرشد پاک (قدس سرہ) کا ارشاد ہے کہ چاروں اقسام کے یہ اولیاء دو حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ جن میں سے ایک حصہ کو " عاشق " اور دوسرے کو " محبوب کہتے ہیں۔ بہر حال ان اولیاء اللہ میں جو جو اپنے سلوک کی منزل مکمل کرلے اور مقام فنا سے گزر کر بقا اور سکر سے نکل کر صحو کی طرف واپس آگئے ہوں۔ تو ایسے فقراء کو "صاحبان مقام " کہتے ہیں۔ مابقایا جو فقراء سلوک میں رہ جاتے ہیں ان کو صاحبان منزل کہا جاتا ہے۔ جو فقراء منزل ہی میں رہ جاتے ہیں ان کو " واقف " کہتے ہیں اور جو لوگ سلوک کو ترک کرکے چھوڑ دیتے ہیں ان کو " راجع " کہا جاتا ہے (اس سے خدا ہر سالک کو بچائے رکھے آمین۔)

الھم

احفظنا من کل بلاء الدنیا

والاخرۃ

طریقہ ملامتیہ

فقراء میں ایک فرقہ ملامتیہ کہلاتا ہے اور ان کے سرگروہ حضرت سید موسیٰ سہاگ رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ کیونکہ یہ روش سب سے پہلے انہوں نے اختیار کی تھی۔ حضرت سید رحمتہ اللہ علیہ نے ایسے طریقے اختراع کئے تھے جن سے عام لوگ احتراز کیا کرتے تھے اور ان کی ملاقات کے لئے نہیں آیا کرتے تھے۔ اس طریقے کے لوگ ہاتھوں میں چوڑیاں اور پیروں میں گھنگروں ڈالتے ہیں۔ مزید برآں انگلیوں میں انگوٹھیاں اور چلے پہنتے ہیں۔ لال سرخ لباس پہنتے ہیں اور ہاتھوں پر مہندی بھی لگاتے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ یہ بے کار لوگ نہیں ہوتے۔ خدا کی محبت اور طلب سے یہ لوگ بے خبر نہیں ہوتے کیونکہ ان باتوں سے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

البتہ اس زمانہ میں بعض لوگوں نے ایسے طریقے اختیار کئے ہیں جن سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ در اصل ایسے لوگ عوام کو دھوکہ دیتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ایسے لوگ خدا اور رسول ﷺ کے ادب کا کوئی لحاظ نہیں رکھتے۔ چنانچہ اصل اور نقل میں فرق کرنا ضروری ہے۔ حضرت شیخ عطارؒ کی مشہور عالم کتاب " تذکرۃ الاولیاءؒ" میں طریقہ ملامتیہ کے ایک ولی اللہ کا ذکر موجود ہے۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ امارد کی صحبت میں رہتا ہے اور شراب بھی پیتا ہے چنانچہ لوگ اس کو برا سمجھتے تھے اور اس کی ملاقات کے لئے نہیں جاتے تھے۔ اس عظیم ولی اللہ کا نام حضرت یوسف بن الحسینؒ تھا۔ تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ نیشا پور میں ایک تاجر نے ایک ہزار دینار کے عوض ایک ترکی کنیز خرید لی۔ مگر اچانک اسے ایک دوسرے شہر ایک انتہائی ضروری کام کے لئے چلے جانے کی ضرورت پیش آئی۔ مگر نیشا پور میں ایسا

کوئی با اعتماد آدمی اس کے حلقہ دوستاں میں نہ تھا۔ کہ کنیز اس کے حوالے چھوڑ کر خود اپنے ضروری کام کے لئے دوسرے شہر دوڑ پڑے۔ آخر کار وقت کے مشہور بزرگ حضرت ابوعثمان حیری رحمتہ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوا۔ مختصر یہ کہ حضرت ابوعثمان حیری قدس سرہ کنیز کو اپنے زنانخانے میں امانت رکھنے پر راضی ہوئے اور تاجر بے فکر ہو کر اپنے کام پر چلا گیا ایک روز حضرت ابوعثمان قدس سرہ کی نظر کنیز پر پڑ گئی چونکہ وہ بے حد صاحب جمال اور خوبصورت تھی چنانچہ حضرت ابوعثمان قدس سرہ کو پسند آ گئی۔ اور اس چکر میں گرفتاری کوئی معمولی بات نہ تھی وہ حیران تھا کہ نجات کی صورت کیا ہو گی۔ چنانچہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنے شیخ حضرت ابو حفص حداد رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو۔ وہاں پہنچ کر حضرت ابو حفصؒ سمجھ گئے اور چھوٹتے ہی مشورہ دیا کہ تمہیں حضرت یوسف بن حسین رضی اللہ عنہ کے پاس جانا چاہیے۔ حضرت ابو عثمان رحمتہ اللہ نے کمر ہمت باندھی اور حضرت یوسف بن حسین رحمتہ اللہ علیہ کے شہر چلا گیا۔ جب لوگوں سے ان کا پتہ معلوم کرنا چاہا تو شہر کے لوگوں نے سمجھایا کہ " دیکھو تم صوفی بزرگ آدمی ہو تمہیں وہاں اس ملحد' زندیق اباحتی اور لوطی کے پاس جانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ وہاں تمہیں نقصان ہو گا " حضرت ابوعثمانؒ نے یہ باتیں سنیں تو پشیمان ہوا اور واپس نیشا پور چلا گیا جب اپنے عظیم القدر شیخ حضرت ابو حفص حدادؒ کے روبرو ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ "کہو یوسف حسین کو دیکھا"۔ تو حضرت ابوعثمان حیری رحمتہ اللہ علیہ نے مایوس اور بے نیل و مرام لوٹنے کا سارا قصہ سنا دیا کہ حضور " لوگ کہتے ہیں کہ یوسف بہت برا آدمی ہے"۔ مگر حضرت شیخؒ نے دوبارہ فرمایا کہ " اس سے ملنا ضروری ہے تم دوبارہ اس کے ہاں چلے جاؤ"۔ چنانچہ لاچار دوبارہ چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر لوگوں نے پہلے سے زیادہ باتیں بنائیں کہ وہ تو حد سے زیادہ خراب آدمی ہے مگر چونکہ شیخ کا حکم تھا۔ مجبوراً" اس کے ہاں چلا گیا۔ اور دیکھا کہ اس کے

ڈیرے کا دروازہ کھلا ہے سامنے ایک بزرگ بیٹھے ہیں اس کے سامنے ایک خوبرو لڑکا بیٹھا ہے اور قریب ہی شراب کی صراحی پڑی ہے تاہم بزرگ کا چہرہ بے حد نورانی تھا۔ حضرت ابو عثمان رحمتہ اللہ علیہ نے سلام کیا اور باتیں شروع ہوئیں۔ حضرت یوسف رحمتہ اللہ علیہ نے ایسی باتیں کیں کہ ابو عثمان رحمتہ اللہ علیہ کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ جب ذرا ہوش میں آئے تو عرض کیا کہ "اے خواجہ! بہ ایں منزلت و مشاہدہ آپ نے یہ شیوہ کیوں اختیار کیا ہے ۔کہ ایک طرف خوبصورت لڑکا بٹھا رکھا ہے اور دوسری طرف شراب کی صراحی۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے"۔ تو حضرت یوسف بن الحسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "یہ بچہ میرا فرزند ہے اور میں اسے قرآن مجید پڑھاتا ہوں اور یہ جو شراب کی صراحی ہے یہ مجھے ایک باغ میں ملی تھی اور وہاں سے یہاں لایا ہوں۔ مگر اس میں پانی ہوتا ہے تاکہ اگر کوئی پیاسا آجائے تو سیراب ہو کر پی لے"۔ حضرت ابو عثمان حیری رحمتہ اللہ علیہ نے بے تاب ہو کر عرض کیا کہ "اے شیخ! خدا کے لئے بتایئے یہ سب کچھ آپ کیوں کر رہے ہیں۔ جبکہ لوگ آپ کے بارے میں وہ کچھ کہتے ہیں کہ پناہ بخدا"! اس کے جواب میں حضرت یوسف بن الحسینؒ نے حضرت ابو عثمان رحمتہ اللہ علیہ سے فرمایا:۔

"ایسا اس لئے کرتا ہوں کہ کوئی شخص بھی اپنی ترک کنیز امانت کے طور پر میرے گھر نہ بھیجے" چنانچہ ـــ ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی اور فوراً" اس کی دست بوسی اور پا بوسی کی (۱)

---

(۱) حضرت ابو عثمانؒ حضرت شیخ کبیر ابو حفص حدادؒ کے مرید تھے اور حضرت یوسف بن الحسین پیشوائے اہل ملامت حضرت ذوالنون مصریؒ کے مرید تھے میں نے یہ واقعہ تفصیل سے لکھا ہے بابا رحمتہ اللہ علیہ نے مختصر طور پر لکھا ہے (مترجم)

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ بھی ملامتی طبقہ فقرا سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ جب تک زندہ رہے علمائے ظاہر اس کو زندیق ہی کہتے رہے۔ ایک روز اسرافیل رحمتہ اللہ علیہ (۲) آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا تو آپ نے اس سے کہا کہ اگر تم اولین و آخرین علم حاصل کرنے کے لئے آئے ہو تو بشریت اس علم کی متحمل نہیں ہو سکتی اور اگر اس لئے آئے ہو کہ اسے (حق کو) پالو تو جہاں سے تم نے پہلا قدم اٹھایا ہے وہ (حق) بھی وہیں تھا۔ یعنی طالب اور مطلوب ہمیشہ ذکر کی حالت میں ہوتے ہیں۔ حضرت ذوالنون رحمتہ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں نے تین سفر کئے۔ پہلے سفر میں ایک ایسا علم حاصل کیا جو خواص و عوام دونوں طبقوں نے قبول کیا۔ دوسرے سفر میں ایک ایسا علم حاصل کیا جس کو عوام نے تو قبول نہ کیا مگر خواص نے قبول کر لیا۔ تیسرے سفر کے بعد ایک ایسا علم حاصل کیا جس کو نہ تو عوام نے قبول کیا اور نہ خواص نے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ جب تک ایک ہزار صدیقین ...ب زندیق نہ کہیں تب تک تم صدیقیت کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکتے....... (۲) نے یوسف بن حسین رحمتہ اللہ علیہ سے کہا کہ "ہمیشہ کے لئے وظیفہ

---

(۱) بابا رحمتہ اللہ علیہ نے یہی نام (اسرافیل) لکھا ہے ہو سکتا یہ بھی اولیاء میں سے کوئی ولی ہو۔ (مترجم)

(۲) جہاں پر میں نے یہ نکتے لگائے ہیں اصل کتاب "تجلیات محمدیہ" میں تحریر شدہ لفظ کتابت کی خرابی کی وجہ سے سمجھ میں نہ آیا۔ میرے خیال میں یہ "ذوالنون رحمتہ اللہ علیہ" ہو سکتے ہیں کیونکہ حضرت یوسف بن الحسین ان کے مرید تھے۔ واللہ اعلم

نہ پڑھو اس لئے کہ تیرا نفس اس سے مانوس نہیں (۱) ہوتا۔ ذوالنونؒ سے کسی نے پوچھا کہ حق تعالیٰ کسی بندے کو کن باتوں سے (کیسے) "ورغلاتا ہے"۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ "پر لطف کیفیت بے شمار کرامات اور خوارق عادت امور سے۔ کیونکہ یہ سب چیزیں خود بینی اور خود فریبی کا سبب ہوتی ہیں جبکہ خود بینی اور خدا بینی میں بے انتہا فرق ہے"۔

سخن ما و من مگو با او
یا تو باشی دریں میان یا او
من و تو عین شرک تقلید است
چہ مناسب بہ اہل توحید است

---

(۱) اس جملے کا ترجمہ بھی اصل کے مطابق کر دیا گیا ہے اگر چہ میرے خیال میں یہ جملہ ایسا ہونا چاہیے تھا "ہمیشہ کے لئے وظیفہ نہ پڑھ تاکہ تیرا نفس اس سے مانوس نہ ہو" در اصل حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ ایک کبیر الشان ملامتی فقیر تھے (مترجم)

معجزہ اور کرامت

معجزہ اور کرامت اس کام یا عمل کو کہتے ہیں جو عام انسانی عادت میں نہ پایا جاتا ہو۔ مثلاً” کسی انسان کا اڑنا‘ پانی کے اوپر چلنا‘ کسی کے دل کا حال معلوم کرنا‘ مردہ کو زندہ کرنا اور آگے اور پیچھے ایک طرح سے دیکھنا وغیرہ۔ ان کاموں میں جو کام کسی نبی سے صادر ہوتا ہے اس کو معجزہ کہتے ہیں اور جو کام کسی ولی اللہ سے صادر ہو اس کو کرامت کہتے ہیں۔ جادوگر بھی بعض ایسے کام کرتے ہیں جو عام انسانی طاقت سے باہر ہوتے ہیں جسے اصطلاح میں استدراج کہتے ہیں۔ مگر دہریہ لوگ عام طور پر ان باتوں کو نہیں مانتے۔ اور ہم نے کتاب کے مقدمے میں بھی لکھا ہے کہ سرسید احمد خان بانی علی گڑھ کالج اور مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے جو نبوت اور مجددیت کے مدعی تھے ایسی خارق العادۃ چیزوں سے انکار کیا ہے۔ ان کا انکار ایک تو اس وجہ سے تھا کہ وہ ان باتوں کے اثبات میں کوئی عقلی ثبوت دہری لوگوں کے جواب میں پیش نہیں کر سکتے تھے۔ اور اس میں ان کی اپنی خود غرضی بھی شامل تھی۔ سوائے سرسید احمد خان کے کیونکہ ان کے پیش نظر مسلمانوں کی تعلیم و ترقی تھی۔ تاہم اگر مرزا صاحب یہ بات تسلیم کرتے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عنصری وجود کے ساتھ آسمان پر اٹھایا ہے جو آخری زمانہ میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو پھر اس کے دعوے کی کوئی ضرورت نہ رہتی اسی طرح اگر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ احیاء الموتی کو تسلیم کرتے تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا درجہ ان سے بلند ثابت ہوتا اس لئے کہ لوگ مرزا صاحب سے بھی اسی قسم کے معجزے کا مطالبہ کرتے جبکہ یہاں تو باتیں ہی باتیں تھیں اس لئے مرزا

صاحب نے اس قسم کے معجزات کی تاویلیں پیش کیں اور بہانہ یہ بنایا کہ اس سے رسول اللہ ﷺ کی کسر شان کا پہلو نکلتا ہے یعنی حضور اقدس ﷺ نے تو کسی مردہ کو زندہ نہ کیا تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مردوں کو زندہ کیا تو اس سے حضور اقدس ﷺ کے مقابلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی افضلیت ثابت ہو جائے گی۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس سے حضرت مسیح علیہ السلام کی افضلیت کیسے ثابت ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں ہم نے گذشتہ اوراق میں صراحت کی ہے کہ ہر نبی ﷺ کو ایک خاص معجزہ اور نشان عطا فرما دی گئی تھی جس کے ذریعے وہ دوسرے انبیاء سے ممتاز ہوا کرتا تھا۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ فضیلت تو علم کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور علم کا عطیہ خصوصی طور پر حضور اقدس ﷺ کو عطا فرمایا گیا تھا اگر چہ حضور اقدس ﷺ کے لئے مردوں کو زندہ کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا مگر حضور اقدس ﷺ کامل شریعت لائے تھے۔ اور کامل شریعت کی منشا معجزہ دکھانا نہیں بلکہ تا روز قیامت ایک ایسے روحانی اور مادی قانون اور تہذیب، تمدن کو قائم کرنا تھا جو ہر ایک شعبہ زندگی میں کامل اور غیر فانی ہو نہ صرف یہ بلکہ عملی رنگ میں بھی ہر لحاظ سے مکمل ہو اور تمام دنیا کے لئے قیامت تک ایک مکمل ترین دستور العمل ہو۔ جس کی تکمیل خدا کے حکم سے حضور اقدس ﷺ نے فرمائی:۔

اليوم اكملت لكم دينكم و اتممت عليكم نعمتى

آج میں نے تمہارا دین مکمل کیا اور اپنی نعمتیں تم پر تمام کر دیں

اس ایت شریف میں اسی تکمیل دین کا تذکرہ ہے اور عیسیٰ علیہ السلام یا دوسرے انبیاء علیہم السلام اپنے زمانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے ان کا کام ہنگامی تھا دوامی نہ تھا۔ اس لئے ان کو اس قسم کے معجزات دیئے گئے تھے۔ معجزہ ایک ہنگامی چیز ہے۔ دوامی چیز صرف علمی معجزہ ہی ہو سکتا ہے جو بکمال تمام حضور اقدس ﷺ کو

عطا ہوا۔

مطلب یہ کہ عیسی علیہ السلام نے فقط مردوں کو زندہ کیا تھا اور آنحضرت ﷺ نے ہزارہا مسیحوں کو بنایا ہے۔ دہلی کے بابا تاج الدین رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کا تھوڑا عرصہ ہوا ہے ان کی یہ کرامت مشہور ہے انہوں نے ایک عورت اور ایک کتیا کو زندہ کیا تھا۔ اس کو اگر کوئی نہ مانے تو ان کی مرضی تاہم باشندگان دہلی اس کے گواہ ہیں۔

مرزا صاحب کی طرح ہم بھی مانتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے لوگوں کی مردہ روحوں کو زندہ کیا تھا۔ مگر یہ کہنا کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے مردوں کو زندہ نہ کیا تھا' ہم نہیں مانتے۔ بلکہ مرزا صاحب بھی کبھی یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے احیائے موتی سے مراد مردہ روحوں کو زندہ کرنا ہے۔ مگر کبھی یہ بھی لکھ دیتے ہیں مثلاً" اخبار " بدر " میں مرزا صاحب نے ایک بار لکھا تھا کہ " حضرت عیسی علیہ السلام جب صرف ایک بار دنیا میں آئے تو دنیا میں کروڑہا مشرکین پیدا ہو گئے اب اگر دوبارہ آئیں تو کیا کریں گے۔ آخر میں یہ لوگ ان کے دوبارہ آمد کی خواہش کس لئے کرتے ہیں ؟"

مطلب یہ کہ ایک طرف مرزا صاحب احیائے موتی کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے مردہ اور گندہ روحوں کو پاک کیا تھا اور دوسری جانب یہ بھی فرماتے ہیں کہ انہوں نے کسی کو بھی پاک نہیں کیا۔ بلکہ ان کی تعلیمات کو شرک سے تعبیر کرتے ہیں لہٰذا مرزا صاحب کا وہ قول جو انہوں نے " ست بچن " میں لکھا ہے بالکل درست ہے کہ:۔

" ایک منہ سے دو متضاد باتیں نہیں نکل سکتیں کیونکہ اس طرح کرنے والا ایک آدمی یا تو منافق ہوتا ہے یا پاگل ہوتا ہے "۔

مگر مرزا صاحب کی خود غرضی اس بات سے ظاہر ہے کہ جب عیسائیوں سے بحث کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شرک (پھیلانے) میں اضافہ کیا تھا اور ان کی ماسیاں (تر ور یانسے) نابینا تھیں وغیرہ وغیرہ۔ اور ان کی شان میں احیائے موتی کا جو ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اس کو مرزا صاحب علم ترب یا مسمریزم سمجھتے ہیں جس پر مرزا صاحب کے خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عبور حاصل تھا۔ مگر جب مسلمانوں سے بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ احیائے موتی سے مطلب وہ مشرکین اور گناہگار لوگ ہیں جن کی ارواح کو حضرت مسیح علیہ السلام نے پاک کیا تھا غور فرمایئے یہ کس قدر افسوس اور حیرانی کی بات ہے کہ ایک آدمی (حضرت مسیح علیہ السلام) کو شرک کی تعلیم دینے کا ذمہ دار بھی مانا جائے اور موحدانہ تعلیم کا حامی اور ناشر بھی گردانا جائے۔ (اس پر طرہ یہ کہ) احمدی لوگ کہتے ہیں کہ "اس قسم کی باتیں مرزا صاحب نے اس یسوع کے بارے میں کی ہیں جس کو عیسائی لوگ خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور نیز جس مسیح یا یسوع کو ہم مانتے ہیں تو اس کو مرزا صاحب روحوں کا صاف کنندہ کہتے ہیں"۔ مگر یہاں ایک اور بات بھی موجود ہے اونٹ کی طرح جس کا کوئی کل سیدھا نہیں۔ مثلاً "تحفہ قیصریہ" میں مرزا صاحب نے جس یسوع کو عابد' زاہد اور پرہیز گار کہا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ انہیں خدا کا نیک بندہ اور رسول بھی کہا ہے تو ہم حیران ہیں کہ یہ کونسا یسوع تھا۔ ہم یہ اس لئے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ "تحفہ قیصریہ" کو مرزا صاحب نے آنجہانی ملکہ وکٹوریہ کو پیش کیا تھا۔ چنانچہ احمدیوں کا یہ بہانہ سراسر غلط ہے کہ مرزا صاحب عیسائیوں کے یسوع کو مشرکانہ تعلیم کا معلم سمجھتے ہیں حالانکہ یہی "تحفہ قیصریہ" (کتاب) عیسائیوں کے لئے لکھی گئی تھی تو کیا وجہ ہے کہ اسی کتاب میں اس (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو خدا کا نیک بندہ اور رسول کہا ہے جس (عیسیٰ علیہ السلام) کی ماسیوں کے متعلق مرزا صاحب نے کہا تھا کہ وہ "

ڈومنیاں " تھیں۔ بخدا میرا مطلب مرزا صاحب کا بطلان یا بحث مباحثہ نہیں بلکہ صرف یہ کہ مرزا صاحب نے اپنی نفسانی مطلب براری کے لئے انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے بھی انکار کر دیا۔ البتہ اگر کوئی یہ پوچھ لے۔ کہ آج کل ایسے معجزات کیوں ظہور پذیر نہیں ہوتے۔ تو یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ معجزات کا اظہار انبیاء علیہ السلام سے متعلق ہے تو جب انبیاء علیہ السلام کا سلسلہ اختتام پذیر ہوا' معجزات کا اظہار بھی ممکن نہ رہا باقی رہی کرامت تو اولیاء اللہ قیامت تک ان کا اظہار فرماتے رہا کریں گے البتہ یہ طے ہے کہ کوئی ولی اللہ بھی معجزہ دکھانے کا مجاز نہیں ہوتا۔

البتہ اگر کوئی یہ پوچھے کہ اس دور میں ایک ولی اللہ کیوں نہیں اڑتا یا پانی کے اوپر کیوں نہیں چلتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں پہلے زمانے میں کمال سمجھی جاتی تھیں کیونکہ گذشتہ زمانے میں ہوائی جہاز ایجاد نہ ہوا تھا۔ بالفرض اگر ایک ولی آج ہوا میں آڑ جائے تو لوگ یہی کہیں گے کہ کم از کم یہ بھی ایک سائنسدان ہے اور اس کا بیان جنے خلفاء کے اثبات میں کیا ہے کہ جہازوں یا دوسری ایجادات کا ہنر بھی ان کے موجدین اولیاء اللہ کی ارواح سے حاصل کرتے ہیں (۱) لہٰذا اب وہ

---

(۱) ہو سکتا ہے کہ جدید " تعلیم یافتہ " لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے۔ مگر ذرا سوچنا چاہیے کہ جب ایک موجد کے ذہن میں ایجاد کا ایک خاکہ' یا ایک شاعر کی تخیل میں ایک نادر شعر یا ایک افسانہ نگار کے ذہن میں افسانے کا پلاٹ آتا ہے تو آخر یہ آتا کہاں سے ہے۔ نیز یہ کہ خود یہ ذہن کیا چیز ہے۔ اور پھر نادر خیالات و ایجادات اس میں کہاں سے آتی ہیں۔ یہ بحث دلچسپ ہے میں بات لمبی نہیں کرنا چاہتا ہمارا مشاہدہ ہے کہ اوپر سے کسی نادر خیال و ایجاد کا نزول اولیاء کی ارواح پر ہوتا ہے وہاں سے نکل کر کسی دوسرے کو پہنچتا ہے (طاہر چشتی)

ضروری نہیں سمجھتے کہ ہوا میں اڑیں یا پانی کے اوپر چلتے پھریں۔ آج کل اولیاء علمی رنگ میں ہوتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی ان سے کرامت کا ظہور بھی ہوتا ہے۔ ان کا وظیفہ اور ڈیوٹی خاص طور پر یہ ہوتی ہے کہ خدا کے یہ قدسی بندے لوگوں کو خیر اور خدا کی طرف بلاتے ہیں اور اس وظیفہ میں بھی یہ لوگ " حکمت اور نصیحت " سے بھرپور کام لیتے ہیں اس ضمن میں حق سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

ادعوا الیٰ سبیل ربک بالحکمتہ و الموعظتہ الحسنتہ

لوگوں کو حکمت اور اچھی اچھی نصیحتوں کے ساتھ دعوت دو

سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ عقل سے ماوراء قرآن مجید میں کچھ بھی نہیں یعنی قرآن مجید عقل کے مطابق نازل ہوا ہے اور اس میں ایسا کچھ بھی نہیں جو عقل کے خلاف ہو۔ سرسید احمد خان نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصاء مارنے اور اس سے بارہ عدد چشموں کے جاری ہونے وغیرہ باتوں کی تاویلیں کی ہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ باتیں ناممکنات میں سے تھیں مگر ہم نے اس کتاب کے شروع میں اشارہ کیا ہے کہ یہ سب باتیں بالیقین ممکنات میں سے ہیں ۱۹۱۴ء کا ذکر ہے جنگ عظیم میں جہازوں سے بم گرانے کو لوگوں کی اکثریت نہیں مانتی تھی اسی طرح جب براڈ کاسٹنگ ایجاد ہوئی تو جب تک لوگوں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے یورپ کے لوگ آج کل کہتے ہیں کہ ہم چاند تک پہنچیں گے اور عنقریب ہی ہم ایسا جہاز بنالیں گے جو ہوا کے گرم کرہ سے بخیر و عافیت نکل کر چاند میں داخل ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں یورپ والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آئندہ دور میں ہم موت و حیات کا حال معلوم کرلیں گے پھر یہ راز عام ہو جائے گا اور بعد ازاں جس شخص کی مرضی ہو وہ ہمیشہ زندہ رہے گا (مرے گا نہیں) بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس ضمن میں ہم نے ایک آدمی پر تجربہ کیا تھا مگر اس نے صرف آنکھیں جھپکائیں اور ایک حرکت کے

بعد ساکت ہو گیا۔ یعنی یہ تجربہ ابھی مکمل نہیں ہوا اور کچھ عرصہ کے بعد کامیاب ہو جائے گا۔ یہ سب باتیں دھریت کی طرف مائل لوگ درست مانتے ہیں مگر ممکن نہیں۔ یہ ان لوگوں کے غرق ہونے کی نشانی ہے۔ بنی نوع آدم نے ابتداء میں بھی اسی طرح ترقی کی تھی۔ پھر جو انہوں نے موت و حیات کے راز کو پانے اور آسمان پر جانے وغیرہ کی کوشش شروع کی تو خدا نے انہیں تباہ کر دیا۔ مراد یہ کہ جس قدر بھی یہ مادی ترقی کرتے جائیں گے اسی قدر ہلاکت و بربادی کے قریب ہوتے جائیں گے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی ساری توجہ مادی ترقی کے لئے وقف کی ہے اور جب یہ ترقی انتہا تک پہنچ جائے گی۔۔ تو (تباہی کے بعد) نئے سرے سے پھر شروع ہو گی (ا)

(ا) خیال رہے کہ بابا مادی ترقی کے منکر نہیں۔ ان کا مطلب صاف ہے کہ انسانی مشکلات کا حل یہ ایجادات یا مادی ترقی ہرگز نہیں۔ اور یہ بالکل درست ہے مثال کے طور پر صنعتی انقلاب کے بعد یورپ نے بھاری صنعتوں کے بے شمار کارخانے بنائے۔ ان کارخانوں کی زمینی اور فضائی غلاظتوں نے نہ صرف زمین کو اور زمین میں دریاؤں کے پانی تک کو آلودہ کر دیا ہے بلکہ فضا کو بھی گندگی کا ڈھیر بنا دیا ہے یہاں تک کہ یہ لوگ خود کہتے ہیں کہ اوزون میں " سوراخ " ہو گیا ہے چنانچہ زمینی، فضائی اور آبی مخلوق کی حیات کے راستے ختم ہو رہے ہیں تو غور کا مقام ہے کہ کیا دنیا نے ترقی کی ہے یا تنزل پر گامزن ہے۔ یہ کارخانے اور نت نئے ایجادات کس کام کے۔ تعجب یہ ہے کہ دنیا کی حکومتیں اور نام نہاد اقوام متحدہ چلا چلا کر کہتا ہے کہ آبادی کو کم کیا جائے اور غذائی اجناس وغیرہ میں اضافہ کیا جائے اور اس ضمن میں جدید زرعی طریقوں اور ادویات کو استعمال میں لایا جائے تو جہاں تک ان زہریلی ادویات کا تعلق ہے وہ تو بلا شک زہریلی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ فضا کو آلودہ کرنے میں (باقی اگلے صفحے)

میرا مطلب صرف یہ بتانا تھا کہ سرسید صاحب نے کہا تھا کہ قرآن مجید میں ایسی کوئی چیز نہیں جو عقل کے خلاف ہو یا اس کے غیر ہو۔ لیکن اگر سرسید آج زندہ ہوتے تو وہ بھی اس بات کو ماننے پر مجبور ہوتے کہ قرآن مجید تو فرماتا ہے کہ کل نفس ذائقتہ الموت یعنی ہر چیز موت کا مزہ چکھے گی اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی موت کو زندگی میں بدلا سکے مگر اب سائنس دان کہتے ہیں کہ عنقریب ہم موت پر قبضہ جمالیں گے۔ ایک اور ایت شریف میں ہے ولا تجد لسنتہ اللّٰہ تبدیلا یعنی تم اللہ کی سنت میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔ مثال یہ ہے کہ اگر ایک شخص کو خدا نے بدشکل پیدا کیا ہے تو اس کی شکل کوئی تبدیل نہ کر سکے یعنی چھوٹی آنکھیں بڑی اور بڑی ناک چھوٹی نہیں کر سکتا مگر سا۔ئنسدان کہتا ہے کہ یہ معمولی بات ہے ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اور ہمارے تجربے اس ضمن میں بھی کامیاب ہو جائیں گے (بابا کا اشارہ غالباً پلاسٹک سرجری کی طرف یا دوسرے اعضاء کی تبدیلی (Transplantation) کی طرف ہے۔ مترجم) اسی طرح خدا نے کفار کے متعلق فرمایا ہے:۔

ان کا بھی بھرپور ہاتھ ہے دوسری بات یہ کہ اگر یہ زہریلی ادویات بے حس کیڑوں کو جان سے مار کر ختم کر دیتی ہیں تو "حساس انسان" کے لئے کس قدر ضرر رساں ہوں گی۔ مگر یہ کوئی بھی نہیں سوچتا بلکہ ہماری حکومت پاکستان کے ارباب بست و کشاد تو یورپی لوگوں کی منتیں کرتے ہیں کہ یہاں آئیں اور صنعتی کارخانے چالو کریں یعنی ایک طرف کارخانوں کی مخالفت اور دوسری طرف ان کے قیام پر زور۔ مطلب یہ کہ موجودہ دور کی صنعتی، زرعی، مواصلاتی اور ایٹمی تجربات وغیرہ کی وجہ سے زمین تو زمین بلکہ ہر جاندار اور ساری فضا میں تباہی پھیل رہی ہے۔ یہ یقیناً" ترقی معکوس ہے اور دیکھا جا سکتا ہے کہ سب کچھ تباہی کی طرف گامزن ہے (مترجم)

کہ کونوا قردۃ خاسئین یعنی تم بندر ہو جاؤ تو مرزا صاحب اور سرسید احمد خان مرحوم اور چند دیگر حضرات نے اس کی تاویل کر کے کہا کہ ان لوگوں کے خصائل بندروں کی طرح ہو گئے تھے۔ مگر خود بندر نہ ہوئے تھے۔ چنانچہ اگر یہ لوگ اس دور میں زندہ ہوتے تو ان کو قرآن مجید میں تحریف اور تاویل کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی۔ کہ جس چیز کے امکان کو دہری لوگ رد کرتے تھے اور جس کا جواب ان لوگوں سے نہ بن پڑتا تھا (حالانکہ جن لوگوں کی نسبت آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا خیر القرون قرنی تو وہ مسخ کے قائل تھے) تاہم ان کی تاویلات بھی اسلام کی کوئی دفاع نہ کر سکیں۔ اس لئے کہ وہ تو اپنے خیال میں ان باتوں کو ثابت کر چکے تھے۔ کہ قرآن میں ایسی کوئی چیز نہیں جو عقل کے غیر ہو۔ مگر اب بھی ان کے تاویلوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں بقول ان کے کئی باتیں غیر عقلی بھی موجود ہیں۔ مثلاً" زلزلہ جو قانون فطرت کے مطابق آتا ہے تو آیا سائنسدان کوئی ایسی تجویز پیش کر سکتا ہے کہ زلزلہ نہ آئے۔ ان سب باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن شریف میں ایسی کئی باتیں موجود ہیں کہ وہ عام لوگوں کی عقول سے بہت دور و دراز ہیں۔ مگر خواص کی عقلوں سے دور نہیں۔ چنانچہ معجزہ اور کرامت بھی ایسے امور ہیں جو عام انسانی عادت میں نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً" جس نے وائرلس ایجاد کی تھی تو اس کی عقل اور عوام کی عقلوں میں کتنا فرق ہے۔ پس جس کی عقل وائرلس کے موجد کی عقل کے برابر ہو تو وہ فوراً" اس کو مان لے گا اور اس ایجاد پر کوئی تعجب نہ کرے گا۔ مگر اسکے برعکس جس کی عقل کم ہو گی تو وہ اس کو نہ مانے گا بلکہ وہ تو کہے گا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بغیر وسیلے کے پشاور کا ایک آدمی لندن میں ایک دوسرے آدمی سے ہمکلام ہو۔ علاوہ ازیں جن لوگوں نے معجزہ اور کرامت کے الفاظ مروج کئے ہیں تو ان کے معانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ امور عام انسانی عادت کا خاصہ نہیں اور ہم نے گذشتہ اوراق میں لکھا ہے کہ

انسان ۔۔۔ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اور خلافت کی دو اقسام ہیں۔ ایک کامل اور دوسری ناقص۔ کامل یا اعلیٰ خلافت یہ ہے کہ مادی اور روحانی دونوں علوم پر حاوی ہو اور ناقص یہ کہ صرف مادی ہو۔ چنانچہ یہ موجدین اعلیٰ خلفا کی ارواح سے ایجادات کے عکس اخذ کرتے ہیں اور پھر ان کو ظاہر کرتے ہیں یہ بھی ایک طرح کی "کرامت" ہے جو عام انسانی عادت میں موجود نہیں اور میں نے اس سے قبل بھی اس بات کی وضاحت کی ہے یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کی عقول براڈ کاسٹنگ کی ایجاد کو نہ مانتی تھیں مگر سایسنسدانوں نے مشینوں کے ذریعے ان کا بھرپور اظہار کر دیا (اگرچہ) یہ لوگ روحانی طاقت نہیں رکھتے۔

مگر یہ نہ بھولئے کہ ایسی باتیں (کرامات، معجزات) اعلیٰ خلفاء کی طرف سے مشینوں کے بغیر ظہور پذیر ہوئی ہیں (خصوصاً" کرامات تو ظاہر ہوتی رہا کریں گی) بلکہ اس دنیا میں اب بھی ایسے بے شمار لوگ موجود ہیں یہاں تک کہ مسمریزم کے عامل بھی اپنے کسی دوست سے دور و دراز مقام پر روحانی طور پر بات چیت کر سکتا ہے (عجیب بات یہ ہے) کہ دھری لوگ اس کو مانتے ہیں۔ اس لئے کہ مسمریزم کے ذریعے "معمول" متاثر ہوتا ہے تو اسی معمول کو ہر قسم کی اطلاع وغیرہ دے سکتا ہے۔ یعنی جب مسمریزم کا عامل کسی معمول کو توجہ سے بے ہوش کر دیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے تو جس چیز کی طرف عامل اشارہ کرے کہ "یہ کیا چیز ہے۔" تو معمول فوراً" بتا دیتا ہے کہ یہ فلاں چیز ہے اگرچہ یہ تماشہ بعض ٹھگ قسم کے لوگ بھی دکھاتے ہیں مگر وہ محض چالاکی ہوتی ہے اور مسمریزم کے اصل عاملوں کی نقل ہوتی ہے۔ خیر تو اصل بات یہ ہے کہ مسمریزم کا معمول اپنی بند آنکھوں کے باوجود کسی چیز کی نشاندہی اس لئے کرتا ہے کہ عامل اس چیز کا عکس یا تصویر بے ہوش معمول کے ذہن کو روحانی طور پر منتقل کر دیتا ہے اور اپنی قوت ارادی سے اس کی روح پر نقش کر دیتا ہے

میں نے "روح" اس لئے کہا کہ اس وقت دماغ کی طاقت بے ہوش ہونے کی وجہ سے معطل ہوتی ہے اور صرف اس کی روحانی طاقت موجود ہوتی ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب معمول ہوش میں آتا ہے تو اسے کچھ بھی یاد نہیں ہوتا کہ اس نے کیا کچھ کہا ہے۔ جبکہ دماغ سارا کام حواس ظاہری اور حواس باطنی وغیرہ سے لیتا ہے۔ مگر حواس خمسہ بے ہوشی کے دوران معطل ہوتے ہیں۔ صاف بات ہے کہ اگر یہ حواس معطل نہ ہوتیں تو معمول بے ہوش کیوں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عامل ہر چیز کا نقش یا تصویر معمول کی روح کو منتقل کرتا ہے اور معمول اس کا نام لیتا ہے اگر کوئی یہ کہہ دے کہ وہ کیفیت یا وہ اشیاء جو بے ہوشی کی حالت میں معمول نے بیان کی ہوتی ہیں تو ہوش میں آنے کے بعد اس کو کیوں یاد نہیں ہوتیں۔ حالانکہ بے ہوشی میں وہ ان کے نام ٹھیک لیتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ معمول کی بے ہوشی کی یہ حالت خواب کی طرح ہوتی ہے یہ حالت کسی صدمے یا تکلیف کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ عامل کی قوت ارادی کیوجہ سے ہوتی ہے اس حالت میں معمول کا دماغ عامل کے دماغ کا ایسے تابع ہوتا ہے کہ عامل کے ارادے کے بغیر معمول اپنا ارادہ قطعا" استعمال نہیں کر سکتا۔ بالکل حالت خواب کی طرح کہ خواب میں جو خیال کسی پر غلبہ حاصل کرلے تو اس آدمی کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا کہ اس خیال یا نقشہ کو بدل دے۔ اس لئے کہ اسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ سو رہا ہے بلکہ وہ خیال اس کے دماغ پر ایسا چھایا ہوتا ہے کہ اُسے وہ واقعہ بالکل اصل معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہاں یہ اعتراض نہ کرنا چاہیے کہ جب ہم نیند سے بیدار ہوتے ہیں تو ہمارے اکثر دیکھے ہوئے خواب ہمیں یاد رہتے ہیں مگر معمول کو وہ سب کچھ یاد نہیں ہوتا۔ تو عرض یہ ہے کہ خواب میں دماغ اپنے خیال اور ارادے کا تابع ہوتا ہے اس لئے خواب اسے یاد رہتا ہے اور معمول تو کسی اور (عامل) کا تابع ہوتا ہے، یعنی وہ وہی کرتا ہے جو عامل کے ارادہ میں ہوتا ہے اور

چونکہ روح اور دماغ یا عقل دونوں مل نہیں جاتے تو خیال کا نقشہ یا تصویر دماغ میں نقش نہیں رہتااس لئے معمول کو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ یعنی اس کا دماغ معطل ہوتا ہےالبتہ اس کی روح کام کرتی ہے روز ازل میں ”الست“ کا وعدہ بھی روحانی تھا جو ”بلیٰ“ کی صورت میں روحوں نے کیا تھامگریاد کسی کو بھی نہیں۔

خیالات کے نقوش روح پر نقش ہونے کی مثال موجودہ کیمرے جیسی ہے اور ہم نے خلفاء کے باب میں لکھا ہے کہ یہ خلفاء کی ارواح سے عکس لیتے ہیں۔ یہ کیمرہ مادی خلفاء نے بالکل روحانی خلفاء کی نقل کے طور پر ایجاد کیا ہے۔ فرض کیجیے ایک آدمی تصویر کھنچواتا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ کیمرے کے سامنے کھڑا ہو۔ کیمرہ مین اپنی ترکیب سے اپنا کیمرہ اس کے روبرو کر لیتا ہے چنانچہ اس شخص کا عکس کیمرے کی باریک جھلی پر پڑ جاتا ہے جو پہلے سے کیمرہ مین نے اسی غرض سے کیمرہ میں رکھا ہوتا ہے۔ پھر جب اسے مصالحہ اور رنگ دیتا ہے تو تصویر بن جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح مسمریزم کا عامل بھی ہر چیز کا عکس معمول کے شیشے پر منعکس کرتا ہے۔ مگر مسمریزم کے عاملوں کا درجہ روحانیت میں ایسا ہے جیسے متبحر عالموں کے درمیان ایک چھوٹا سا بچہ ہوتا ہے۔

سرسید نے کہا تھا کہ قرآن شریف میں ایسی کوئی چیز نہیں جو عقل کے غیر ہو۔ تو یہ بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ کل نفس ذائقہ الموت نیچری لوگوں کی عقلوں سے آج کل غیر ہے۔ اور نیچری لوگوں کا یہ عقیدہ کہ اب ایک ایسی دوائی ایجاد ہو جائے گی جس کے استعمال سے ایک آدمی دوبارہ زندہ ہو گا۔ یا یہ کہ زندگی اور موت پر اختیار حاصل ہو جائے گا۔ سب ہماری عقلوں کے غیر ہیں اور اگر کوئی شخص ایسی کسی بات کو مان لے جو عقل کے غیر ہو تو اس کا ایمان و کمال کہاں گیا۔ اس لئے کہ عقل سے مطابقت رکھنے والی بات کو تو ہر کوئی مانتا ہے۔ کامل الایمان شخص تو وہ ہے جو اس

بات کو بھی مان لے جو عقل سے ماورا ہو۔ کیوں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی تعریف کرتا ہے جو یؤمنون بالغیب پر ایمان رکھتے ہوں اور دین کے معاملے میں عقل کا کیا کام۔ یہاں پر عقل سے مراد عرضی عقل نہیں بلکہ قدسی عقل جو روح کی صفت ہے۔ تاہم عقل کے متعلق تفصیلات اپنے موقع پر بیان کی جائیں گی۔ (بہرحال) جن لوگوں کے حواس سلامت نہ ہوں ان لوگوں میں عقل نہیں ہوتی کیونکہ عقل ناقص حواس پر مبنی ہے اور ابھی تک انسان کو (اور خصوصاً" اس مغرور انسان کو جو ذات خداوندی سے انکار کرتا ہے اور عقل ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا عدم ثابت کرتا ہے) یہ پتہ نہیں کہ جس عقل کے ذریعے میں یہ سب کام انجام دینے کی سعی کرتا ہوں تو یہ عقل ہے کیا چیز۔ اس لئے کہ انسان اپنے وجود میں عقل ایک قائم چیز سمجھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں ایک کام یا بات عقل کے ذریعے کرتا ہوں مگر سوال یہ ہے کہ کیا اسے یہ معلوم بھی ہے کہ عقل ہوتی کیا ہے۔ اور کتنے کان، آنکھیں یا ناک رکھتی ہے۔

(یہاں پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں) ایک بار ایک نیچری سے اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں بحث شروع ہو گئی۔ دوران گفتگو اس نے مادے کی یہ تشریح بیان کی کہ "ابتداء میں یہی مادہ آگ کے ایک گولے کے مانند تھا اور یہ گولہ محو چکر تھا اور بعد ازاں اسی مادے سے یہ تمام موجودات پیدا ہو گئیں"۔ میں نے کہا کہ "تم تو اس وقت موجود نہ تھے تو یہ باتیں تمہیں کیسے معلوم ہوگئیں۔ اس کا جواب یوں ملا کہ "عقل سے"۔ اب میری باری تھی تو میں نے اسے کہا کہ "عقل تو یہ تقاضہ بھی کرتی ہے کہ کوئی چیز بھی کسی محرک کے بغیر حرکت نہیں کر سکتی تو فرمائیے کہ آگ کے اس گولے کو کون حرکت دے رہا تھا۔ جواباً" اس نے کہا کہ "ہاں! یہاں پر ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ البتہ ہم تمہیں مادہ دکھا سکتے ہیں مگر تم ہمیں وہ خدا نہیں دکھا سکتے (جس

کو تم مانتے ہو) میں نے سمجھایا کہ "عدم علم سے عدم شے لازم نہیں آتا۔ فرمایئے تم سائنسدان روشنائی کا وجود ثابت کر سکتے ہو مگر روشنی دکھا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ تم لوگ کہتے ہو کہ روشنی کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا البتہ روشنی ذرات پر اثر پذیر ہوتی ہے اور یہی ذرات ہی روشن ہوتے ہیں۔ اب جب تک تم مجھے روشنی کا وجود نہیں دکھاؤ گے میں کیسے خدا کا وجود دکھا سکتا ہوں۔ اس لئے کہ تم دلائل سے تو روشنی ثابت کرتے ہو مگر اس کا وجود نہیں دکھا سکتے"۔ اس کے جواب میں نیچری نے کہا کہ "ہم روشنی کے اثر کو دیکھتے ہیں اور یہی اس کے وجود کا ثبوت ہے"۔ چنانچہ میں نے کہا کہ "ہم بھی خدا کے فعل کے اثر کو دیکھتے ہیں اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ مادے کو حرکت دینے کے لئے ایک محرک کی ضرورت تھی تو یہی احساس ہی اس محرک کے وجود کی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ کیوں بات ایسی نہیں۔ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ "مادہ مقناطیس کی ذاتی طاقت کی طرح خود چکر میں تھا"۔ جواباً" میں نے کہا کہ "اچھا تو یہ بتاؤ کہ "مادہ میں عقل تھی"۔ تو اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے کہا کہ یہ تو ہم بھی کہتے ہیں کہ ہم سب بھی تو مادے کی پیداوار ہیں تو پھر ہم میں عقل کہاں سے آگئی۔ اس لئے کہ جب ہماری علت مادی میں ہی عقل نہ تھی تو ہمارے اندر کیسے آدھمکی۔ اس نے کہا کہ "جب مادے نے ترکیب اختیار کی تو ترکیب پانے کے بعد عقل اس میں خود بخود آگئی جیسے مقاطیس کی طاقت اس میں خود بخود ہوتی ہے"۔ اس کے جواب میں میں نے کہا کہ:۔

"اصولا" تنہا اور خود بخود کوئی چیز ترکیب نہیں پا سکتی جب تک اس کے ساتھ کوئی دوسری چیز نہ مل جائے۔ اب اگر وہ دوسری چیز ہم مادہ فرض کر لیں تو ایک تیسرے محرک کی ضرورت ہو گی اور محرک یقیناً" ایک ایسی چیز ہو گی جو عقل بھی رکھتی ہو گی اور علم بھی چنانچہ اب بقول آپ کے مادہ میں سرے سے عقل موجود ہی نہیں

جبکہ ترکیب عقل کی متقاضی ہے تو فرمائیے کہ مادے نے ترکیب کیسے پائی"۔

مطلب یہ کہ ان باتوں سے قارئین کو معلوم ہوا ہو گا کہ وہ عقل جس کو خود اپنی ہستی کا بھی علم نہیں وہ حق تعالٰی کی ہستی پر بحث کرنے کا کیا حق رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقل کی بے عقلی ہو گی۔ وجہ یہ ہے کہ عقل اس حد تک مفید ہو سکتی ہے جہاں تک وہ درست کام کر سکتی ہے۔ اس لئے کہ عقل کی طاقت اور ادراک حواس خمسہ (دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور مس کرنے) پر منحصر ہے یعنی اگر یہ حواس نہ ہوں تو عقل ناقص ہو گی جبکہ یہ حواس بزعم خود ناقص اور حادث ہیں اور ان میں حق تعالٰی کی پہچان کی قوت ہی موجود نہیں چہ جائے کہ اس کا ادراک کرے۔ (اور یہ ہے حالت ظاہری عقل کی) مگر اس کے علاوہ ایک قدسی عقل دوسری بھی ہے جو بالکل ایک جدا چیز ہے اور اس کے مددگار حواس خمسہ باطنی بھی ہیں یعنی:

(۱) حس مشترک (۲) خیال (۳) حافظہ (۴) ارادہ (۵) واہمہ

یہ حواس باطنی حواس ظاہری سے بھی مدد حاصل کرتی ہیں۔ اگر چہ بغیر ان کے بھی کام کر سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر نیند کی حالت کو لے لیجیے اور یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ کبھی کبھی ایک آدمی ایک ایسا خواب دیکھ لیتا ہے جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو جاتا ہے۔ یا اگر غلط بھی ثابت ہو مگر اس کا جو نقشہ اس کے سامنے ہوتا ہے اسے حواس باطنی کے ذریعے سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ حواس خمسہ ظاہری نیند (خواب) کی حالت میں بالکل معطل ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس حقیقت کے رو سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حواس خمسہ باطنی حواس خمسہ ظاہری کے بغیر بھی اپنا کام کر سکتی ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ مادی عقل کا ادراک اس قدر ناقص ہے کہ ابھی تک اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ خود کیا چیز ہے۔ لہٰذا حق تعالٰی، معجزات اور کرامات کے بارے میں اسی ظاہری ناقص عقل کے دلائل اور خیالات پر غور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ اس

ضمن میں شارع علیہ السلام (فداہ امی وابی) کی بات اور حکم کو بغیر کسی دلیل کے تسلیم کر لینا چاہیے۔ اگر حق تعالیٰ وقفے وقفے سے ہادی و نبی نہ بھیجتے تو یہ دنیا ہر وقت نئی نئی تباہیوں سے دو چار ہوتی۔ اس لئے کہ ہر شخص اپنی عقل کے کہنے پر چلتا اور (جبکہ یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ) عقل ناقص ہے اس کی مثال یہ ہے جیسے آج کل یورپ کے عوام اور عمومی مسلمانوں یا ہندوؤں وغیرہ نے اپنے اپنے مذاہب کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اپنی اندھی عقلوں کو "رہنما" بنا لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دنیا ہر روز تباہی کے نزدیک تر ہوتی جا رہی ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ اس دنیا کی ساری مخلوق تباہ ہو جائے اور اس تباہی کی اصل وجہ حق تعالیٰ کی ذات واجب سے انکار ہے۔ (اس لئے) کہ اگر انسان خدا سے ڈرتا ہو اور خشیت الٰہی کے ساتھ اسی انسان کو یہ فکر بھی دامنگیر ہو کہ مالک حقیقی کل مجھ سے میرے اعمال کی باز پرس کرے گا (اور برے اعمال کا انجام برا ہو گا) تو اس بے پناہ سرکشی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ مگر آج کل لامذہبیت اور نیچریت زوروں پر ہے۔ سزا و جزا یا خوف خدا لوگوں کے دلوں سے اٹھ گئے ہیں۔ متاسفانہ انسانوں سے خود یہی نام نہاد انسان' حیوانوں کا سلوک کرتے ہیں۔ عام لوگوں کا خیال یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں خوراک یعنی کھانے پینے اور جماع کے لئے پیدا ہوا ہے (۱)

....

(۱) در اصل یہ رجحان یورپ کے اٹھارویں صدی کے فلاسفروں کی تعلیمات کا نتیجہ ہے اس ضمن میں ڈارون' سگمنڈ فرائیڈ' اور مارکس وغیرہ کے خیالات و آراء دیکھی جا سکتی ہیں میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ صرف اس قدر کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ان فلاسفہ نے انسان اور حیوان کو ایک ہی چیز ثابت کیا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ جبلتیں انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہیں۔ یعنی کھانا پینا غصہ اور شہوت وغیرہ میں سب برابر ہیں لہٰذا سوچا جا سکتا ہے (طاہر چشتی)

اور جب مرجائے تو جانوروں کی طرح اس کا سارا معاملہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے مال و سر کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ (حکومتوں کی سطح پر) ایک طاقت ور بادشاہ دوسرے کمزور بادشاہ کے عوام اور ملک کو لوٹ رہا ہے۔ مثال کے طور اٹلی نے حبش کو تاخت و تاراج کیا اور بہانہ یہ بنایا کہ ہم نے ایسا حبش کو تہذیب و تمدن سکھانے کے لئے کیا ہے اور یہ نہیں دیکھتے نہ یہ سوچنے کی زحمت گوارہ کرتے ہیں کہ کیا خود اٹلی کا یہ فعل وحشی آدم خوروں اور چارپایوں سے بدتر نہیں۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ خود اٹلی شائستگی، تہذیب اور انصاف کا محتاج ہے (۱)اب اگر کوئی دلیل عقلی طلب نہ کرے یعنی معجزہ اور کرامت کے ضمن میں شارع علیہ السلام کے قول کے بغیر کوئی اور دلیل طلب نہ کرے اور اس کا ہر قول بغیر دلیل کے مان لے تو (آفتاب آمد دلیل آفتاب)(ان جملوں کا ترجمہ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق کیا ہے اگر غلطی ہوئی ہو تو وہ میری ہو گی اور میں معافی کا خواستگار ہوں طاہر چشتی)

یعنی آنحضرت ﷺ کی رسالت ان کے ہر حکم کی دلیل تسلیم کرلے تو یہی دین و دنیا کی سعادت ہے۔ اور لا حجتہ فی الاسلام حدیث بھی ہے۔ (میرا خیال ہے کہ یہاں بابا کا مطلب جبرو اکراہ سے ہے کیونکہ قرآن شریف میں حکم خداندی ہے کہ لا اکراہ فی الدین دین میں کوئی جبر نہیں طاہر چشتی)۔

---

(۱) ظاہر ہے کہ آج کل نہ صرف اٹلی بلکہ سارے براعظم یورپ اور امریکہ نے میکاؤلی کے فلسفے کو اپنا دین و مذہب بنا لیا ہے اور میکاؤلی کے فلسفہ میں حق و انصاف یا انسانیت کا نام تک نہیں بلکہ حکومتی پرزوں کو جھوٹ، مکر، فریب اور تشدد کی تعلیم دی گئی ہے جس پر یورپ و امریکہ عمل پیرا ہے ہندوؤں کا چانکیہ اس سے بھی گیا گذرا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ سارے عیسائی اور ہندو برے ہیں ان میں اچھے لوگ بھی ہیں مگر حکومتی پرزے ایسے ہیں جن سے خدا کی پناہ! والسلام (طاہر چشتی)

شطحیات اولیاء

شطحیات اولیاء جن کو ہفوات مشائخ بھی کہا جاتا ہے بالکل حق ہیں۔ یہ وہ کلام ہے جو حالت سکر، محبت، محویت، یا عشق کے دوران اولیاء اللہ رحمہم اللہ کی زبانوں سے نکل جاتا ہے۔ ایسے کلام کے الفاظ کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں جن کے ظاہری معنے شریعت کے خلاف دکھائی دیتے ہیں لہٰذا ظاہری علماء ان کی مخالفت پر اتر آتے ہیں بلکہ بعض تو دور تک چلے جاتے ہیں اور اولیاء اللہ پر فسق اور کفر کے فتوے لگا دیتے ہیں۔ حالانکہ علماء کے لئے لازمی تھا کہ شریعت کے مطابق ایسی باتوں کی تاویل کرتے اگر تاویل ممکن ہی نہ ہوتی تو سکوت اختیار فرماتے۔ کیونکہ ان کو یہ حق حاصل نہیں کہ طریقت و حقیقت کے معاملات میں مداخلت کریں۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ اولیاء اللہ انتہائی پرہیز گار، متقی اور نیک ہوتے ہیں۔ امام شعرانی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب طبقات الکبریٰ میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"جو شخص طریقت کا علم نہ رکھتا ہو اور جب کبھی وہ کسی فقیر سے ایسی باتیں سن لے کہ توبے کی حقیقت یہ ہے کہ توبہ سے بھی توبہ نکالے تو ایسا بے علم آدمی ضرور یہ کہے گا کہ یہ غلط ہے اس لئے کہ توبے سے توبہ کرنے کا مطلب تو گناہ پر اصرار کرنے کے مترادف ہے لیکن جب فقیر اپنی اصطلاح میں اس کے معنے بیان کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرا مطلب یہ ہے کہ جب تک اپنے نفس کو پاک و صاف نہ مان لیا جائے اور خدا کی رحمت کے علاوہ توبے پر اعتبار ہی نہ کرے۔ یعنی مطلب یہ ہرگز نہیں کہ گناہ پر اصرار کیا جائے۔ تو سننے والا ضرور کہے گا کہ بڑے مزے کی بات کی۔ حالانکہ قبل

ں یہ بات اسے بری لگی تھی"

امام شعرانی رحمتہ اللہ علیہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:

"حضرت عبد اللہ قریشیؒ سے اس کے احباب نے دریافت کیا کہ علم حقائق کی کوئی کیفیت بیان فرمائیے۔ تو آپؒ نے پوچھا کہ اسی وقت حاضرین کی تعداد کتنی ہے۔ تو عرض کیا گیا کہ اس وقت یہاں چھ سو آدمی حاضر ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ ان میں سے ایک سو آدمیوں کو منتخب کرکے پھر انہی میں سے بیس افراد کو منتخب کیا جائے۔ بعد ازاں ان بیس افراد میں سے صرف چار افراد کو منتخب کیا جائے۔ چنانچہ ان کے کہنے کے مطابق عمل کیا گیا تو معلوم ہوا کہ محض یہی چار صاحبان معرفت تھے اور کشف بھی ان کو حاصل تھا۔ (ان چار افراد سے مخاطب ہو کر) حضرت عبد اللہ قریشیؒ نے فرمایا کہ اگر اب میں تمہارے سامنے علم حقائق کے بارے میں زبان کھولوں تو سب سے پہلے تم مجھ پر کفر کا فتویٰ صادر کردو گے"۔

غور فرمائیے کہ ان اولیاء اللہ میں ایسی عظیم ہستیاں بھی گذری ہیں کہ وقت کے صاحبان کشف و معرفت بھی ان کی باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ رہے ہمارے دور کے علمائے ظاہر جنہوں نے صرف دو چار "کتابیں" پڑھی ہوتی ہیں تو یہ بیچارے ایسی باتوں کو کہاں سمجھیں گے۔ چنانچہ حکم خداوندی ظن المومنین خیرا کے بموجب مسلمانوں پر نیک گمان کرنا چاہیے اور اگر اس قسم کی باتیں سن لیں تو ان کی تاویل کریں جو شریعت کے مطابق ہو۔ اس لئے کہ طریقت کا علم انہیں حاصل نہیں ہوتا۔

امام شعرانی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:-

"بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کو سات بار ملک بدر کیا گیا اور ہر بار جب وہ بسطام تشریف لاتے تو ایسے نادر علوم کی باتیں کرتے کہ عوام تو رہے ایک طرف علماء بھی ان کے سمجھنے سے معذور ہوتے تھے۔ یہ باتیں اکثر انبیاء اور اولیاء کے مقامات کے بارے میں ہوتی تھیں۔ حسین بن عیسیٰ جو بسطام میں امام اور ظاہری علوم کے مدرس تھے' حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کی مخالفت پر اتر آیا اس نے بایزید رحمتہ اللہ علیہ کو وطن سے نکال دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ ان کو ملک بدر کیا گیا اور جب تک حسین بن عیسیٰ زندہ رہا لوگوں نے بایزید رحمتہ اللہ علیہ کو وطن نہیں آنے دیا"۔

امام شعرانی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:۔

اسی طرح حضرت ابوسعید خراز رحمتہ اللہ علیہ پر تہمت لگا دی اور کفر کا فتویٰ صادر کیا اور اس کا سبب ابوسعید رحمتہ اللہ علیہ کی ایک کتاب میں چند باتیں تھیں جن میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ "اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ تم کہاں سے آئے ہو اور کہاں جاؤ گے تو میرا جواب حق تعالیٰ کے بغیر اور کچھ نہ ہو گا"۔

آگے فرماتے ہیں کہ:۔

"حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا اور ان کی بلند پایہ کتاب احیائے العلوم کو نذر آتش کیا گیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی ایسی مدد فرمائی کہ ان کی وہی کتاب سونے کے پانی سے لکھی گئی۔ حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کے مخالفین میں قاضی عیاض بہت مشہور تھا۔ امام صاحب نے اس کو بد دعا

دی اور وہ اسی روز مرگیا"

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:۔

"شیخ عبد الحق بن سبعین رحمتہ اللہ علیہ کو لوگ برا بھلا کہتے تھے ان کو بھی لوگوں نے ملک مغرب سے اس طور پر نکالا کہ اس سے قبل مصر میں ڈھنڈورے پٹوائے کہ اگر وہ مصر آئے تو مصری ان سے احتراز کریں۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ انا ھو و ھو انا یعنی میں وہ ہوں اور وہ میں"۔

اب ہم اپنے قارئین کی خدمت میں اختصار کے ساتھ چند شطحیات پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس کی ابتداء حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے ہیں و باللہ التوفیق

شطح۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "خلق اللہ آدم علٰی صورتہ" یعنی حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صورت پر بنایا ہے۔ فرماتے ہیں "انا احمد بلا میم" یعنی احد! فرماتے ہیں "لوولیتم بحبل لھبطہ علٰی اللہ" یعنی اگر تم ایک رسی باندھ کر اوپر سے نیچے گذار لو تو وہ اللہ میں گرے گی۔ مطلب یہ کہ ہر جگہ وجود باری ہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اذا احب اللہ عبد الم یضرہ ذنب جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو گناہ اس بندے کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے کہ اس کا فعل۔ خدا کا فعل ہوتا ہے۔ اور فرماتے ہیں فلا تسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر یعنی زمانے کو گالی مت دو (برا نہ کہو) کیونکہ زمانہ خدا ہے اور فرماتے ہیں لا تسبو الریح فانہ من نفس الرحمٰن یعنی ہوا کو برا مت کہو کیونکہ یہ دم الٰہی (سانس) ہے۔

شطح۔ حضرت امیر المومنین کرم اللہ وجہہ۔

فرماتے ہیں "سبحان من اطاعه العاصی بعصیانه سبحان م ذکره الناس بنیانه" پاک ہے وہ ذات کہ گنہگار نے گناہ کر کے بھی اس فرمانبرداری کی اور پاک ہے وہ ذات کہ غافل نے غفلت کے باوجود اسے یاد رکھا۔ علا ازیں اسد اللہ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے فرمایا " وہ (اللہ) ہر چیز کے ساتھ ہے نہ اس طور پر کہ وہ ہر چیز کے ساتھ ہے نہ اس سے جدا ہے اور یا اس چیز کے غیر ہے یعنی سب کچھ وہ بذات خود ہے اور (مابقایا سب نیست ہے (۱) اور شاہ ولایت علیہ السلام (علیؓ) کا فرمان ہے کہ "انا مقیم القیامه" میں قیامت کا قائم کرنے والا ہوں۔ اور فرماتے ہیں انا باعث من فی القبور" میں ان لوگوں کو زندہ کرنے والا ہوں جو قبروں میں ہیں اور انا حیی الذی لا یموت میں وہ زندہ ہوں جو کبھی نہیں مرتا۔

حضرت سعد رحمتہ اللہ علیہ نے یہ اقوال قراردت (۲) کی تاویل میں پیش کی ہیں۔ مثلاً" قرآن شریف میں جب قاری اس ایت شریف کی تلاوت کرتا ہے "انا اللہ لاالہ الا انا" یعنی میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی اور معبود نہیں" یا جب کوئی یہ حدیث شریف پڑھتا ہے " من شهدنی بالواحدانیه ولک بالرسالته دخل الجنته علی ماکان العمل" "جس نے میری وحدانیت اور تیری رسالت کی گواہی دی۔ وہ جنت میں داخل ہو گا اس نے جیسا بھی عمل کیا ہو"۔

---

(۱) اس شطح کا ترجمہ یہی ہو سکتا تھا۔ پشتو الفاظ یہ ہیں: مغ د هر ځیز سره دے نه داسے چه مغ د هر ځیز سره دے او د مغ نه غیر دے یعنې پخپله دے اور باقی نیست دی" اگر میں نے ترجمہ میں غلطی کی ہو تو براہ کرم قارئین درستی فرمالیں۔ مترجم) (۲) اصل کتاب میں یہی "قرارت" لکھا گیا ہے یعنی میں نے بھی یہی لفظ لکھ دیا ہے۔ غالباً" یہ لفظ "قرات" ہے۔ (مترجم)

ظاہر ہے کہ یہ حدیث قدسی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ کو مخاطب فرمایا ہے اور اس کی تاویل اس طرح پر بھی درست ہے جس طور پر حق تعالیٰ جل مجدہ نے سورہ فاتحہ لوگوں کی زبانوں پر جاری فرمایا ہے۔ اسی طرح خداوند کریم کے مخلص اور نیک بندوں کی زبانی اللہ تعالیٰ کی باتیں کرنا جائز ہیں۔ ایک اور حدیث قدسی میں ہے۔ "بی ینطق" یعنی "میری زبان پر بات کرتے ہیں" اور حضرت علی اسد اللہ الغالب علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "ھذا قرآن الصامۃ وانا قرآن الناطق یعنی یہ خاموش قرآن ہے اور میں ناطق قرآن ہوں (بولنے والا) یہ باتیں حضرت مولانا عبد العزیز نے بھی تحفہ اثنائے عشریہ میں تحریر کی ہیں۔

شطح:۔ امام زین العابدین بن حسین علیہما السلام فرماتے ہیں۔

کہ میں اپنے علم کے خلاصے کو چھپاتا ہوں تاکہ جاہل لوگ ان سچی باتوں سے جل نہ جائیں جو میں بیان کرتا ہوں۔ وہ خواص کا علم ہے اور اگر اس علم کو میں ظاہر کروں تو لوگ مجھے بت پرست کہنا شروع کر دیں گے اور مسلمان میرا خون حلال سمجھ لیں گے۔ (مجھے قتل کریں گے) بلکہ اگر برائی اور برا سلوک مجھ سے کریں گے تو اس کو ثواب جانیں گے۔ اور یہ خاص علم میرے دادا علی علیہ السلام سے مخصوص ہے اور انہوں نے امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم توحید الٰہی کا خلاصہ ہے اس لئے کہ شریعت و طریقت کے علم کے اظہار کی وجہ سے کسی کا خون جائیز نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری بات یہ کہ "لوگ مجھے بت پرست کہیں گے" اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ حق میرے اندرون میں ہے تو بت کی عبادت اسی کو کہتے ہیں۔

شطح:۔ امام جعفر صادق علیہ السلام:۔

فرماتے ہیں کہ جب میں ایک ایت کی تلاوت کرتا ہوں تو یہ اس وقت تک

جاری رکھتا ہوں جب تک کہ اسے اس کے قائل سے نہ سن لوں۔ (یعنی اللہ سے) مطلب یہ ہے جب حضور حاصل ہو جاتا ہے تو قرآن مجھے اپنا کلام دکھائی دیتا ہے (یہاں پر ذرا غور کرنا چاہیے کہ ایت مبارک حضرت امام علیہ السلام خود اپنی زبان سے تلاوت فرماتے اور عجب یہ کہ اللہ کا کلام اپنا کلام محسوس فرماتے یعنی ان کی آواز میں خود حق کلام فرماتے ہیں (فسبحان اللہ العظیم)

شطح :۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ۔

فرماتے ہیں مارایت شیئا" الا ورایت اللّٰہ قبلہ میں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی جس سے قبل اللہ کو نہ دیکھا ہو۔

اور جس وقت حضور اقدس ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خرید فرمایا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خدمت نبوی ﷺ میں عرض کیا کہ مجھے بھی اس بیع (خریداری) میں شریک فرمالیں تو حضرت بلالؓ نے فرمایا کہ :۔

"رسول اللہ ﷺ لا شریک ہیں"

فی الحقیقت حضرت بلالؓ کی یہ شطح بہت ہی بلند و ارفع ہے اور ہر شخص اس کو نہیں سمجھ سکتا۔

شطح :۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔

فرماتے ہیں کہ مارایت شیئا" الا و رایت اللّٰہ معہ" میں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی جس کے ساتھ (معا") میں نے اللہ کو نہ دیکھا ہو۔ حضرت عمرؓ کا فرمان ہے کہ قرآن مجید میں کہیں بھی نہ دشمنوں کا ذکر ہے اور نہ انہیں خطاب کیا گیا ہے۔ جہاں کافروں کو کافر فرمایا گیا ہے ان سے مراد کافران حقیقی ہیں" یعنی عارفین الٰہی۔ اور دشمن سے مراد موہوم ہستیاں ہیں اور ان لوگوں کو اہل ظاہر کافر سمجھتے ہیں۔

شطح :۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ۔ فرمایا ہے کہ مارایت شیئا" الا و

رایت اللہ بعدہ میں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی جس کے بعد اللہ کو نہ دیکھا ہو۔

ہر آنکس راکہ وحدت در وجود ست نخستیں نظر بر نور وجود ست

شطح :۔ اویس قرنی رضی اللہ عنہ ۔

فرماتے ہیں جس وقت عبودیت ختم ہو گئی تو وہ عیش اللہ کا عیش ہے۔ یعنی الوہیت پیدا ہو جاتی ہے اور بندے (عبدہ) کا فعل حق کا فعل ہو جاتا ہے (میرے خیال میں عبد اور عبدہ میں فرق کرنا ضروری ہے اس فرق کو حضرت علامہ اقبال نے یہ کہہ کر نہایت خوبصورتی سے ظاہر کیا ہے عبد دیگر عبدہ ہر چیزے دگر (مترجم)

شطح :۔ حضرت سیدنا ابراہیم ادھم قدس سرہ فرماتے ہیں اگر میں ایک ساعت کے لئے اپنے دل پر قابو پالوں تو وہ گھڑی میرے لئے روم کی سلطنت حاصل کرنے سے بہتر ہو گی۔ اور اگر میری فرحت و خوشحالی اور جوش کا علم بادشاہوں کو ہو جائے تو تلواریں نکال کر میرے پیچھے لگ جائیں گے۔

شطح :۔ شیخ کبیر حضرت فضیل ابن عیاض قدس سرہ کا فرمان ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ بیمار ہو جاؤں تاکہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے سے رہ جاؤں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دائمی نماز میں ہوتے ہیں۔ اس کا ظاہری نماز سے کیا کام۔ (مگر یاد رہے کہ حضرت شیخ کبیر رحمتہ اللہ علیہ نے نماز ترک نہ فرمائی تھی صرف یہ چاہتے کہ جماعت سے کسی طرح رہ جاؤں۔ اس کے کئی معنے ہو سکتے ہیں مثلاً" امام عارف الہٰی نہ ہو یا اسی طرح مشہور ہے کہ حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کو ایک امام الصلوۃ نے کہا کہ بایزید رحمتہ اللہ علیہ نہ تو محنت مزدوری کرتے ہو اور نہ کچھ اور مگر حیرت ہے کہ کھاتے کہاں سے ہو۔ تو حضرت بایزید نے جواب دیا کہ تمہاری بات کا جواب تو بعد میں دوں گا پہلے میں وہ نماز قضا کے طور پر ادا کر لوں جو میں نے تمہاری اقتدا میں پڑھی ہے کیونکہ جو (امام۔ شخص) روزی دینے والے کو نہیں جانتا اس کے پیچھے نماز پڑھنا روا نہیں علیٰ

ھذا القیاس کئی وجوہات ہو سکتی ہیں مترجم)

حضرت شیخ کبیر فیضل ابن عیاض قدس سرہ فرماتے ہیں کہ عرش و کرسی لوح وقلم، جبرائیل و مکائیل، اسرافیل و عزرائیل، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام اور محمد ﷺ میں ہوں (۱) یعنی جو کوئی مقام کلیت میں داخل ہو جائے تو عین کل اور کل کی ذات ہو جاتا ہے۔

شطح:۔ حضرت شیخ معروف کرخی اسد اللہ قدس سرہ

فرماتے ہیں لیس فے الوجود احد الا اللہ ۔ نہیں کوئی موجود ۔ مگر اللہ!

شطح:۔ حضرت طاؤس العلماء۔ (یعنی حضرت جنید بغدادی)

فرماتے ہیں کہ جب تک ایک ہزا صدیقین تمہیں زندیق نہ کہیں تب تک صدیقیت کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور خود میرا اپنا حال بھی یہی تھا۔ یعنی جس وقت توحید الٰہی مجھ پر ظاہر ہو گئی تو سب لوگ میرے مخالف ہو گئے یہاں تک کہ میرے پیرو مرشد بھی۔

شطح۔ حضرت ابو یزید بسطامی قدس سرہ العزیز۔

فرماتے ہیں کہ سبحانی ما اعظم شانی" یعنی پاک ہوں کتنی بڑی

---

(۱) بہت عرصہ ہوا حضرت شہزادہ دار شکوہ قدس سرہ کی ایک کتاب حسنات العارفین (شطحیات داراشکوہ) میری نظر سے گذری تھی اس میں ایک صاحب محمد شریف رحمتہ اللہ علیہ کا یہ شعران کی شطح کے ذیل میں لکھا گیا تھا۔

قبل از ہزار سال محمد ﷺ رسول بود

بعد از ہزار سال محمد شریف شد

مترجم طاہر چشتی

ہے شان میری۔ اور حضرت بایزید کے سامنے کسی نے یہ آیت پڑھی :۔ ان بطش ربک لشدید تو فرمایا کہ "میری گرفت اس سے سخت ہے" یعنی اس کی دوستی اور محبت نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے ۔ محکم و مظبوط !! اور جب یہودیوں کی قبرستان پر آئے تو فرمایا کہ ۔ "حقدار ہیں" اور جب مسلمانوں کی قبرستان پر آئے تو فرمایا کہ "معذور ہیں"۔

حضرت ابویزید بسطامی قدس سرہ العزیز نے جب موذن سے "اللہ اکبر" سنا تو فرمایا کہ الوہیت میں میں بڑا ہوں اور فرمایا کہ میرا علم ۔ محمد ﷺ کے علم سے بلند ہے۔ ایک بار حضرت احمد حرب قدس سرہ نے حضرت بایزید کی خدمت میں ایک جائے نماز بھیج دی۔ تو آپ نے فرمایا کہ "سارے انبیاء و اولیاء اور مخلوقات الٰہی کی عبادت کا تکیہ میں نے سر کے نیچے رکھا ہے اور (اس) جائے نماز کی ضرورت محسوس نہیں کرتا"۔

شطح:۔ اور میرے **مرشد پاک** نے اپنے لئے ۔ **بے نوا** نام پسند فرما لیا ہے۔ اور یہ شطح بہت بلند ہے اس لئے کہ بے نوا کے معنے بے کس کے ہیں یا اس کے لئے ایسا کوئی نہ ہو جس کو آواز دے اور اس سے مدد طلب کرے۔ مطلب یہ کہ جو کوئی حق تعالٰی کی محبت میں محو ہو جائے تو اس کی اپنی ہستی گم ہو جاتی ہے اور کچھ نہیں رہتا۔ البتہ حق کی ذات باقی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک قطرہ دریا میں مل جاتا ہے تو پھر اسے قطرہ نہیں کہا جاتا۔ چنانچہ جب یہ موہوم ہستی گم ہو جاتی ہے اور ذات کے ساتھ یک ذات ہو جاتی ہے تو پھر وہ کس سے مدد طلب کرے گا۔ کس کو آواز دے گا۔ اس لئے کہ اس مقام پر بے نوا اور بانوا ایک ہو جاتے ہیں۔

ایسے اقوال دیگر اولیاء کے بھی موجود ہیں مگر جس قول کی تاویل ہو سکتی ہو تو پھر کسی ولی اللہ کو برا بھلا کہنا انتہائی گستاخی اور بے ادبی ہے اور اولیاء کی بے ادبی۔ حق

تعالیٰ کی بے ادبی ہے۔ حدیث قدسی میں ہے کہ :۔من عادیٰ بی ولیا فقد اذنتہ بالحرب یعنی جو کوئی میرے کسی ولی سے دشمنی کرتا ہے میری طرف سے اس کے خلاف اعلان جنگ ہے (مراد یہ کہ) جو کوئی ایسی باتوں کو نہیں سمجھتا وہ سکوت اختیار کرے۔ اور جو لوگ ایسی باتوں کو سمجھتے ہیں یا جن کو اولیاء کا توسل حاصل ہوتا ہے۔ تو ایسے لوگ ایسی باتوں پر یقین کرتے ہیں۔ اور جن کے قلوب ایسی واردات سے خالی ہوں یا محض سننے سنانے کی حد تک ایسی باتیں کرتے ہوں۔ ان کی کوئی اصل نہیں ہوتی (کیونکہ دراصل) اس حالت کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے لوہے کو انتہائی گرم کیا جائے یہاں تک کہ وہ بھی آگ کی خاصیت اختیار کر لے پھر وہ بھی آگ ہی کا حکم رکھتا ہے اور اگر کوئی اسے چھولے تو آگ کی طرح جلانے کا کام کرے گا۔ یہی مثال اولیاء اللہ کی بھی ہے یہ قدسی لوگ جب حق تعالیٰ کی محبت میں مست و سرشار ہو جاتے ہیں تو اس کی ذات میں محو ہو جاتے ہیں اور پھر اپنی موہوم ہستی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ جیسے حضرت خواجہ خواجگان' غریب النواز معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ "جب میں تیرا ذکر کرتا ہوں تو تیرے ساتھ ہوتا ہوں"۔ مراد یہ کہ ایسے اوقات میں اولیاء اللہ جس طرف دیکھتے ہیں حق تعالیٰ کو دیکھتے ہیں جیسے کہا گیا ہے ما رایت شیئا" فی الارض ولا فے السماء الا ورایت اللہ فیہ" چنانچہ ایسی حالت میں ان سے ایسی باتیں ظاہر ہو جایا کرتی ہیں۔

مرزا غلام احمد (قادیانی) کے بھی کچھ اقوال ہیں مثلاً" انت بمنزلہ ولدی یا ابنی" یا یہ کہ منم محمد و احمد کہ مجتبٰے باشد یا ان کا یہ قول کہ " میں نے دیکھا کہ میں خدا ہوں اور پھر میں نے اس جہاں کو پیدا کیا وغیرہ۔ لاہوری مرزائی ان باتوں کو شطحیات میں شمار کرتے ہیں اس لئے کہ یہ لوگ مرزا صاحب کو نبی تسلیم نہیں کرتے بلکہ مجدد تسلیم کرتے ہیں جبکہ قادیانی مرزائی اس کی نبوت کے

قائل ہیں مگر اس کی الہیت کے دعویٰ کی وہ بھی تاویل کرتے ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ مرزا صاحب پر بھی دیگر اولیاء کی طرح ایسی حالت واقع ہوئی تھی یا نہیں۔ جس نے اس کو ایسے کلام پر مجبور کیا۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ سکر اور عشق کی انتہائی حالت میں اولیاء اللہ رحمہم اللہ سے ایسی باتیں ظاہر ہو جایا کرتی ہیں۔ البتہ جب وہ حالت گذر جاتی ہے۔ تو پھر ایک ولی اللہ ایسی کوئی بات زبان پر نہیں لاتا یعنی نہ یہ کہتا ہے کہ "میں حق ہوں" یا "میں محمد ﷺ" ہوں۔ دراصل اولیاء اللہ ہر وقت اور ہر حالت میں ذکر الٰہی کا اہتمام کرتے ہیں اور ریاضت و مجاہدہ کے دوران ایسا واقعہ رونما ہو جاتا ہے۔

حق تعالیٰ عزاسمہ کا ارشاد ہے:۔

الذین یذکرون اللہ قیاما و قعودا و علیٰ جنوبھم و یتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ماخلقت ھذا باطلا سبحنک فقنا عذاب النار آل عمران ایت نمبر ۱۹۱

ان ہوشمندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار، یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے پس اے رب، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے"۔

اس ایت میں ذکر اور فکر دونوں کا تذکرہ ہے۔ اسی ذکر و فکر کے ساتھ جب عنایت الٰہی شامل ہو جاتی ہے تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اذا تم الفقر فھواللہ یعنی جب فقر تمام ہو جاتی ہے تو وہ اللہ ہے یعنی اللہ کے بغیر اس کی نظر میں اور کچھ بھی نہیں رہتا۔ اور کامل فقیر بھی وہی ہوتا ہے جس میں یہ صفت پیدا ہو۔ اور اگر اس میں اس صفت کی کمی ہو تو اس کے کمال میں نقص ہوتا ہے۔ اور خدا کے فضل سے اگر

اس کے ساتھ ہی عالم، حافظ یا حاجی بھی ہو تو یہ نور علیٰ ہوتا ہے۔ ایسا آدمی اگر سو رہا ہو تو بہتر اور اگر جاگ رہا ہو تو بھی بہتر ہوتا ہے۔ اور اگر اس میں یہ وصف نہ ہو تو چاہے عالم ہو، حافظ ہو یا حاجی ہو تو کیا ہوا۔ مراد یہ کہ اگر ایسا شخص کتنا بھی عابد و زاہد ہو، فقرا کا لباس بھی پہن رکھا۔ ٹونا گنڈا بھی کرتا ہو یا فقیروں کی چند باتیں یاد کرکے لوگوں کو دھوکہ دیتا ہو لوگوں کو مرید کرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں بے کار ہیں کیونکہ فقر کے راستہ میں صدق و صفا لازمی و ضروری ہیں اور اپنی ہستی جو ایک موہوم خواب کی طرح ہے اس کو درمیان سے نکال دینا چاہیے۔

تو مباش اصلا" کمال این ست و بس
تو در وگم شو وصال این ست و بس
تو درو گم شو حلولی ایں بود
آنچہ آں نبود فضولی این بود

حضرت مخدوم شاہ مینا قدس سرہ کا ارشاد بھی اسی حقیقت پر گواہی دیتا ہے ان کی ایک رباعی ہے

مارا نہ مرید ورد خواں باید
نے عالم و حافظ قرآں باید
آتش زدہ بخانماں باید
برخاستہ از دو جہاں باید

ایسے لوگوں میں جو بے تعلق ہوں۔ تو ان کی آزادی اور بے پروائی ظاہر ہوتی ہے اور جو صاحب تعلق ہوں تو دوسرے لوگوں کے ساتھ اوامر و نواھی کے مطابق معاملہ کرتے ہیں۔ مگر نام و نمود اور شہرت کے طالب نہیں ہوتے نیز کسی کے ساتھ برا سلوک روا نہیں رکھتے کسی کی غیبت نہیں کرتے اور نہ کسی پر اعتراض کرتے ہیں یہاں

ہیں کہ کافروں کو بھی تخصیص کے ساتھ برا بھلا نہیں کہتے جب تک کہ اسکا حکم نہ ملے۔ یہ صاحبان تعلق ہر قوم کے ساتھ اخلاق کے دائرے میں ملتے ہیں۔ یہ انتہائی متواضع اور نیک ہوتے ہیں۔ سب کی دلجوئی کرتے ہیں ہر شخص کی پردہ پوشی کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں اور کسی فرد سے بھی کسی دوسرے شخص کا حال احوال معلوم نہیں کرتے۔ کسی سے بھی کوئی سختی نہیں کرتے۔ اگر چہ یہ سب باتیں کرامات ہی کے زمرے میں آتی ہیں تاہم ہر انسان میں یہ خصوصیات نہیں ہوتی ہیں نہ یہ ممکن ہے۔ پھر بھی ان صاحبان تعلق سے کبھی کبھی کرامات کا ظہور بھی ہوتا رہتا ہے اور ایسا قدسی فرد جس زمانے میں ہو خدا کا دوست ہوتا ہے ایسے قدسی فرد کو نہ خرقہ کی ضرورت ہوتی ہے نہ تاج کی اور میرے **مرشد پاک** (قدس سرہ) بعینہٖ اسی طرح ہیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

من انداز قدت رامی شناسم

خلاصہ کلام یہ کہ ایسے افراد ذمائم سے پاک ہوتے ہیں اور جو کوئی بھی ان کے ساتھ انکی مجلس میں بیٹھ جاتا ہے تو اپنے خیالات بھول جاتا ہے اور اللہ کی یاد میں محو ہو جاتا ہے۔ (ایسے لوگوں کو پہچاننے کے لئے یہی کسوٹی ہے کہ شریک محفل اپنے دل کی جاسوسی کرے اور ذرا سوچ کہ ایسے کسی بزرگ کی محفل میں اس کے نفسانی خیالات کہاں تھے۔ اور کیا وہ اس دوران میں اللہ تعالیٰ کی یاد میں محو نہ تھا۔ مطلب یہ کہ اہل اللہ کا معیار یہی ہوتا ہے زیادہ تولنے، جانچنے اور پرکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ طاہر چشتی)

حضرت مخدوم سعد رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حدیث نبوی ﷺ میں وارد ہے کہ ایسا فرد اگر غنی بھی ہو تو ایسی غنا اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ بلکہ یہ اس

کے کمال میں شامل ہوتی ہے۔ مثلاً" حضرت عثمان اور حضرت عبد الرحمان بن عوف رضی اللہ عنہم اور اس امت کے بہت سے اولیاء جیسے حضرت ابوسعید المبارک جو حضرت غوث پاک قدس سرہ کے مرشد تھے۔ بلکہ خود حضرت غوث پاک رحمتہ اللہ علیہ، حضرت عبید اللہ اللہ احرار رحمتہ اللہ علیہ (جو حضرت جامی رحمتہ اللہ علیہ کے مرشد تھے) حضرت محبوب الٰہی سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء قدس اسرارھم کثیر الفتوحات بزرگ تھے مگر ان کے پاس اتنی دولت جمع نہ ہو سکی کہ زکوۃ ان پر فرض ہوتا۔ کیونکہ ایک طرف سے مال آتا تو دوسری طرف یہ خرچ کر دیتے۔ کبھی ان بزرگوں کو دولت سے محبت نہیں رہی۔ البتہ بہت سے اولیاء ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کا گھریا ڈیرہ نان شبینہ سے محروم ہوتا ہے۔ صرف یہ نہیں بلکہ کبھی کبھی صاحبان فتوحات اولیاء بھی بھوکے پیاسے ہوتے ہیں اور یہ خدا کی حکمت ہے کہ وہ اپنے اولیاء کو عوام الناس کے فائدے کے لئے فتوحات عطا فرماتا ہے۔ ورنہ فقر میں دنیا اور مال و دولت کا کیا کام۔ حضور اقدس ﷺ کے بارے میں تحریر ہے کہ " نمے ماند شب درخانہ آنحضرت ﷺ نہ درہمے ونہ دینارے" یعنی حضور اقدس ﷺ کے خانہ مبارک میں کسی درہم یا دینار نے رات نہیں گذاری (یعنی ادھر سے مال آیا۔ اور ادھر آپ ﷺ نے ہاتھوں ہاتھ تقسیم فرما دیا) اکثر اصحاب رسول ﷺ کی روش یہی تھی۔ (دراصل) حضور اقدس ﷺ نے فقر اور تنگدستی کو پسند فرما لیا تھا۔ حضور انور ﷺ اور آپ کے اہل بیت علیہم السلام نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا نہ ہی کبھی بہترین یا قیمتی لباس پہنا تھا۔ بلکہ گلیم سیادت تو ساری دنیا میں مشہور ہے

وشد امن سغب احشا وطوی

تحت الحجارۃ کشحا مسترف الادم

(بھوک کی وجہ سے اپنی انتڑیوں کو باندھ لیتے تھے اور پیٹ کے نرم و نازک چمڑے پر

پتھر باندھ لیتے تھے)

وراوته الجبال الشم من ذهب

عن نفسه فاراها اينما شمم

(اور ان کے پاک نفس کے لئے سونے کے پہاڑ آگئے اور انہیں دکھائے گئے کہ یہ کیسے ہیں۔)

واكدت زهده فيها ضرورته

ان الضرورته لاتعد وعلى العصم

یہی وجہ ہے کہ امت کے اولیاء فقیر ہوتے ہیں دراصل انہوں نے فقر قبول کیا ہوتا ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہ جو اولیاء کے سردار ہیں تو انہوں نے بھی فقر کی حالت قبول فرمائی تھی۔ حضرت غوث پاک قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ "فقیر شاکر بهه از غنی شاکر"۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "سب سے پہلے میں جنت میں جاؤں گا اور فقرائے مومنین میرے ہمراہ ہوں گے"۔

متاسفانہ بعض لوگ صرف فتوحات کے لئے نام نہاد فقر اختیار کر لیتے ہیں اور ایسے اوراد و وظائف و قصائد پڑھتے ہیں جو فتوحات حاصل کرنے کے لئے کار آمد ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو تو خدا خاص اپنے فضل سے اولیاء کے گروہ میں شامل کر لیتا ہے۔ اللہ ایسے لوگوں کی فتوحات کی نیت کو بدل دیتا ہے اور پھر اللہ ہی کے لئے ریاضت اختیار کر لیتے ہیں۔ البتہ بعض کو فتوحات تو عطا کئے جاتے ہیں مگر آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایسے لوگ اللہ کا کلام دنیاوی امور کے لئے استعمال میں لاتے ہیں اور ایسے لوگوں کو "عامل" کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے دل بہت سخت ہوتے ہیں۔ ان کی صحبت مضر ہوتی ہے اور ان کی فتوحات حرام ہوتی ہیں۔

اس لئے کہ جو کلام نفسانی خواہشات یا جاہ و منصب کے لئے استعمال کیا جائے تو اگر چہ وہ خدا ہی کا کلام کیوں نہ ہو تو اس کا اثر سفلی ہوتا ہے۔ وہ اس کو جادو منتر کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی نشانی یہ ہے کہ (بظاہر) انہوں نے دنیا کو ترک کیا ہوتا ہے ایک کونے میں بیٹھے ہوتے ہیں اور اپنی شہرت اور ناموری کے لئے چند مرید پال رکھے ہوتے ہیں بغیر اجازت ان سے کوئی بھی نہیں مل سکتا اور یہ لوگ کوئی دوسرا کام نہیں کرتے۔ یہ ایسا بھی کرتے ہیں کہ فتوحات سے کام لے کر ایک نام نہاد قسم کا لنگر بھی جاری کر دیتے ہیں اور آہستہ آہستہ لوگوں کو مرید بناتے رہتے ہیں۔ چونکہ ایسے لوگوں کے اخلاق بازاری ہوتے ہیں اس لئے جو کوئی بھی ان کا مرید ہو جاتا ہے اس کے اخلاق بھی ایسے ہی ہو جاتے ہیں اور اسی طرح کتوں کی طرح اس دنیا سے گذر جاتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں میں ذرہ برابر بھی ہدایت کا مادہ نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ اپنے بغیر باقی سب کو کافر اور رواجی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے سارے مسلمانوں کو بچائے اور مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ اس کے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کریں بقول حافظ شیراز رحمتہ اللہ علیہ۔

غلام ہمت آں رند عافیت سوزم
که در گدا صفتی کیمیا گری داند

میرے **مرشد پاک** قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ "آج کل اور اس زمانہ میں اکثر لوگ عملیات کا کاروبار کرتے ہیں" یہ انتہائی بری بات ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے مرشد پاک قدس سرہ عاملوں کے سخت ترین مخالف ہیں اور ان کے وظیرہ کو برا سمجھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

فصل نمبر ۷

سماع

حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے بنی نوع بشر کو پانچ عدد حواس ظاہری سے نوازا ہے اور اسی طرح پانچ عدد حواس باطنی بھی عطا فرمائے ہیں۔ ظاہری حواس میں سے ایک دیکھنے کی حس ہے۔ آنکھیں خدا نے اس لئے دی ہیں کہ ان کے ذریعے خدا کی مخلوقات کو دیکھا جا سکے اور دیکھنے کے بعد خدا کی صفات پر غور و خوض کرے اور اپنے خالق کو پہچان لے۔ اس کے علاوہ آنکھوں سے ان چیزوں کو دیکھے جو از روئے شریعت و طریقت جائز ہوں۔ ایسی چیزوں کو بھی دیکھے جو روح کو بھی تقویت دے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ناک اس لئے دی ہے کہ خوشبو اور بدبو میں فرق کر سکے۔ زبان کو خدا نے یہ طاقت دی ہے کہ ہر چیز کا مزہ (ذائقہ) معلوم کر سکتی ہے اور کانوں میں سننے کی طاقت رکھ دی ہے اور باقی تمام جسم میں مس کرنے کی قوت رکھی ہے۔ صانع حقیقی نے یہ حواس ہر انسان کو دیئے ہیں اور ان پانچ حواس سے ہر قسم کا جائز کام لینا ہر انسان کا جائز حق ہے اور ان سے کام نہ لینا کفران نعمت ہے۔ اس لئے ان حواس کے پیدا کرنے اور انسان کو عطا فرمانے سے حق تعالیٰ کی یہی منشا ہے کہ بنی نوع بشر ان سے کام لے۔ اور اگر ان حواس میں سے کوئی ایک دیدہ دانستہ معطل کیا جائے یا کماحقہ اس سے کام نہ لیا جائے تو یہ کفران نعمت ہو گی۔ چنانچہ فطری قانون کے رو سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ کانوں کے ذریعے ہر جائز اور مفید آواز یا میٹھی آواز سن لینی چاہیے۔ انسان کے دل میں ایک ایسا خفیہ راز موجود ہے جیسے پتھر اور لوہے میں آگ موجود ہوتی ہے۔ اس

لئے کہ جب ایک خاص طور پر لوہا پتھر سے رگڑ دیا جاتا ہے تو اس رگڑنے سے آگ پیدا ہو جاتی ہے اور پھر وہ اپنے آس پاس اثر دکھا دیتی ہے۔ یہی مثال خوش نوائی کی بھی ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعے دل کا گوھر حرکت میں آجاتا ہے اور اکثر تفاسیر قرآنی میں لکھا گیا ہے کہ جنت میں دیدار الٰہی کے بعد بڑی نعمت خوش اوازی ہو گی۔ اور حجتہ الاسلام امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مشہور عالم کتاب کیمیائے سعادت میں لکھا ہے کہ "پھر اس سے ایک ایسی چیز ظاہر ہو جاتی ہے جو انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اسی انسان کی عالم علوی (عالم ارواح) سے ایک خاص مناسبت ہے۔ اور عالم علوی بحیثیت کلی عالم حسن و جمال ہے اور حسن و جمال کا دوسرا نام تناسب ہے۔ یہی تناسب ہی عالم حسن و جمال کا میوہ ہے۔ اسی عالم کے ساتھ خوش آوازی اور تناسب ایک مشابہت رکھتی ہے اور اسی وجہ سے دل میں آگاہی پیدا کرتی ہے اور ممکن ہے کہ بعض آدمی اس کو پہچان لیں۔ یہ شوق اور آگاہی سادہ دلوں میں پیدا ہوتی ہے اور عشق و شوق کی طرف لے جاتی ہے۔ جو اس کے لئے خالی ہوتی ہے اس لئے کہ اگر خالی نہ ہو اور اس میں لگی ہو جس میں مشغول ہو (۱) تو اس میں ایک ایسی حرکت پیدا ہو جاتی ہے جس طرح دھونکنی (بنئے) کی وجہ سے آگ میں پیدا ہوتی ہے اور اسی کے طفیل آگ تیز ہو جایا کرتی ہے اور جس دل میں خدا کی محبت کی آگ موجود ہو ان کے لئے سماع از حد ضروری ہوتی ہے اس کے برعکس اگر کسی

---

(۱) یہاں پر میں نے خالصتاً" لفظی ترجمہ کیا ہے اور یہ میری مجبوری تھی تاہم یہ ساری بات قلب یعنی دل کے بارے میں ہو رہی ہے۔ مراد دل کی آگاہی اور شوق ہے جو خوش نوائی سے محظوظ ہو کر عالم تناسب عشق یا حسن کا جلوہ محسوس کرتا ہے اور ایسے دلوں کے لئے سماع بے حد ضروری ہے جن میں حق تعالٰی کی محبت کی گرمی موجود ہو۔ (طاہر چشتی)

دل میں فضولیات اور حرام کاریوں کی محبت ہو تو ایسے "دل والوں" کے لئے سماع نہ صرف حرام بلکہ زہر قاتل ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سماع ہر حال میں اثر کرتی ہے (تاہم) جن لوگوں کے دلوں میں حق تعالیٰ اور اس کے پیارے نبی ﷺ کی محبت کا جذبہ موجزن ہو تو سماع اس میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ الغرض سماع ایک ایسی چیز ہے جو روح کو متاثر کرتی ہے بلکہ روح کی غذا ہے" اور یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بنی آدم کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے "بھانسری" کی آواز کو منتخب فرمایا ہے۔ جو دوبارہ زندہ ہو کر میدان حشر میں جمع ہوں گے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ونفخ فی الصور فاذا ھم من الاجداث الی ربھم ینسلون یعنی جب صور (بھانسری) پھونک دی جائے گی تو سب لوگ اللہ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روح خوش آوازی سے محظوظ ہو کر ایک فرحت محسوس کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ حکیم مطلق ہے تو اس نے میدان حشر میں جمع کرانے کے لئے بھانسری کی آواز کو پسند فرمایا ہے اور سماع کے جواز کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی اور ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر چہ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے۔ کوئی تو اسے حرام کہتا ہے اور کوئی حلال۔ تو ان میں سے جنھوں نے سماع کو حرام کہا ہے وہ اہل ظاہر ہیں۔ انہیں یہ چیز حاصل ہی نہیں۔ ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ کی محبت انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے وہ (اہل ظاہر) کہتے ہیں کہ اصولی طور پر انسان اپنی جنس سے محبت کرتا ہے اور جو چیز اس کی جنس سے نہ ہو تو ایسی چیز سے محبت نہیں ہو سکتی چنانچہ اہل ظاہر کے نزدیک انسان اپنے ہم جنسوں (مخلوقات) کے بغیر کسی اور (اللہ تعالیٰ) سے محبت نہیں کر سکتا اور اگر خالق کی عشق کا نقشہ تیار کر لے تو خیال اور تشبیہ کی وجہ سے وہ باطل ہے اسی لئے یہ لوگ کہتے ہیں کہ سماع یا تو ایک کھیل ہے اور یا مخلوق سے محبت ہے اور یہ سب دین میں حرام ہیں مگر جب ان (اہل ظاہر) سے پوچھا جاتا ہے کہ "بندہ خدا! حق تعالیٰ کی محبت تو واجب ہے اور اس کا تمہارے

پاس کیا جواب ہے"۔ تو فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہی اس سے محبت کرنا ہے" حضرت امام غزالی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ "ان لوگوں کی یہ بات بے حد بری ہے۔ ہم کتاب محبت کے رکن منجیات میں یہ ثابت کر دیں گے مگر یہاں پر صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ سماع کا حکم دل سے لینا چاہیے اس لئے کہ سماع وہ چیز پیدا نہیں کرتی جو دل میں موجود نہ ہو بلکہ جو چیز دل میں ہوتی ہے اس کو ترقی دیتی ہے (اضافہ کرتی ہے) اب یہاں پر غور کرنا چاہیے کہ اگر کسی کے دل میں ایسی چیز ہو جو شرع شریف میں محبوب ہو اور اس چیز (جذبہ) کو ترقی دینا مقصود ہو تاکہ وہ (جذبہ) مزید بڑھ جائے اور یہی چیز (جذبہ) سماع سے قوت حاصل کرتی ہو تو اس لحاظ سے یہ (سماع) ثواب کا کام ہے۔ اور بالفرض کسی کے دل میں باطل چیزیں ہوں جو شرع شریف میں حرام ہیں تو ایسے لوگوں کے لئے سماع بری چیز ہے۔ (علاوہ ازیں) جن لوگوں کے دلوں میں نہ اچھائی ہو نہ برائی تو اس کی سماع "طبع" کے حکم سے ہو گی اور کھیل کے قسم کی ہو گی جس سے لذت حاصل کرتا ہو اور یہ اس کے لئے مباح ہے۔ لہٰذا سماع کی تین قسمیں ہیں۔ مباح، حرام اور مستحب"۔

یہ تو حضرت امام غزالی قدس سرہ کا قول تھا۔ اب میں علمائے ظاہر کا وہ قول زیر بحث لانا چاہتا ہوں جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے محبت کرنا ناممکن ہے اور اس کی فرمانبرداری کو محبت کا نام دیتے ہیں۔ نیز کہتے ہیں کہ حادث و قدیم کی محبت قطعی غیر ممکن ہے۔ تو اس ضمن میں میں کہتا ہوں کہ ظاہری شریعت کے رو سے حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب (عقیدہ) سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھنا جائز ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حق تعالیٰ تو قدیم ہے اور نیز ہر قسم کے جسم اور صورت سے مبرا ہے اور جو تصور یا خیال ہم اس کے بارے میں قائم کریں گے۔ وہ باطل ہوں گے (اس لئے) کہ وہ ذات وھم و گمان سے بہت دور ہے۔ اور خواب دیکھنے کا یہ قاعدہ ہے کہ جو کوئی خواب دیکھتا ہے تو کچھ نہ کچھ نقشہ خواب دیکھنے والے

کے دماغ کو منتقل ہو جایا کرتا ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ کوئی نہ کوئی نقشہ نہ دیکھے تو کچھ اس کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ اس نے خواب میں کیا دیکھا تھا۔ البتہ بعض خواب ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جاگنے پر ان کو ان کا دیکھنے والا بھول جاتا ہے کہ اس نے اصلاً" کیا دیکھا تھا۔ مگر اسی خواب کا مطلب اسے یاد ہوتا ہے۔ خدا کا دیکھنا بھی انہی معنوں میں ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات یکسر ناممکن ہے کہ آدمی کی روح کو ایک نقشہ منقل نہ ہو اور خود بخود وہ چیز یاد آجائے۔ جن لوگوں کو اپنے خواب یاد ہوتے ہیں تو یہ یاداشت اس امر کی متقاضی ہے کہ اس خواب کا پورا پورا نقش اس کی روح کے آئینہ پر ثبت ہو گیا تھا۔ میں روح کا نام اس لئے لیتا ہوں کہ دماغ کا اکثر دارو مدار ظاہری حواس خمسہ پر ہوتا ہے جبکہ حواس خمسہ ظاہری نیند (خواب) کی حالت میں معطل ہوتے ہیں۔ البتہ روح کی جانب سے وہ نقش دماغ کو منتقل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جاگنے پر دیکھاہوا خواب اس طرح یاد رہتا ہے۔ لیکن اگر روح کسی دوسری طرف لگی ہوئی ہو اور کسی اور خیال میں مصروف ہو تو وہ نقش منتقل ہونے سے رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض خواب دیکھنے والے کو یاد نہیں رہتے۔ مدعا یہ کہ ہر خواب کا ایک نہ ایک نقشہ ضرور ہوتا ہے۔ تو وہ علمائے ظاہر جو خدا کی محبت کو ناممکن بتاتے ہیں۔ ہمیں یہ بتا دیں کہ حق تعالیٰ تو شکل صورت سے پاک ہے اور جو کوئی اس کو خواب میں دیکھتا ہے تو یہ کیا دیکھتا ہے۔ اگر علمائے ظاہر اس کا جواب یہ دیں کہ اللہ قادر ہے بغیر نقش اور صورت کے بھی خواب میں دیکھا جا سکتا ہے تو ہم اسے تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ عرض بھی کریں گے کہ:۔

"حق تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے کہ حادث (مخلوق) میں اپنی محبت پیدا کرے"

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خواب میں اپنا بے کیف وجود انسان کے شیشہ میں ظاہر کر سکتا ہے اسی ضمن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایک گڈریا کا قصہ بہت مشہور ہے جو اللہ تعالیٰ کا عاشق تھا اور انتہائی سادگی سے حق تعالیٰ کو خوش کرنے کے

لئے بھانسری بجاتا تھا۔ تاہم میرے **مرشد پاک** قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت بھی ایک بے کیف چیز ہے چنانچہ اگر کسی کو حاصل بھی ہو جائے تو اس کی کیفیت (مادی) نہیں بیان کر سکتا۔

کانرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

دوسری بات خدا کا دیدار ہے۔ جس کے متعلق اہل ظاہر کہتے ہیں کہ وہ جنت میں ہو گی۔ مگر دیدار کے لئے تو جسم و صورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مراد یہ کہ جو چیز جسم و صورت نہ رکھتی ہو تو کسی قانون سے بھی اس کے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال یہاں پر محض یہ ہے کہ کیا یہی حادث انسان جنت میں۔ "قدیم" بن جائے گا۔ آخر یہ انسان اللہ کا دیدار کس قانون کے تحت کرے گا۔ یا کیا یہ انسان (حادث) جنت میں حق تعالیٰ کے وجود کا ایک حصہ ہو گا۔ (نعوذ باللہ) ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی امر بھی ممکن نہیں۔ تو پھر وہی سوال کہ دیدار کس نوعیت کا ہو گا۔ ہاں! یہاں پر دوبارہ وہی بات دہرائی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے جسے ہم بھی مانتے ہیں۔ بلکہ ہم تو یہ بھی کہتے ہیں کہ

من کان فی ھذہٖ اعمیٰ فھو فی الاخرۃ اعمیٰ

"جو اس دنیا میں اللہ کے دیدار سے محروم ہو گا وہ آخرت میں بھی محروم ہو گا"

اب غور فرمائیے کہ "دیدار" سے حاصل کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص جانتا ہے کہ انسان اگر اللہ کے دیدار کا طالب ہے تو اس کی اصل وجہ "محبت" ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر "محبت" نہ ہو تو "دیدار" کی کیا ضرورت یا آرزو پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہمارا ایمان ہے کہ خدا کی محبت انسان کے دل میں موجود ہے اور یہ درحقیقت وہی بار امانت ہے جو حضرت انسان کے علاوہ کوئی بھی اسے اٹھانے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔

خیر تو بحث سماع کی ہو رہی تھی۔ اور اس میں قسم اول مباح ہے جو دفع الوقتی یا کھیل کے طور پر سنی جاتی ہو۔ جیسے حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "عید کی دن

مسجد نبوی ﷺ میں چند حبشی کھیل کھود رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ "تماشہ دیکھنا چاہتی ہو"۔ میں نے عرض کیا "ہاں! اے حضور ﷺ! تو حضور اقدس ﷺ دروازہ میں کھڑے ہو گئے اور ہاتھ کھول دیئے۔ میں نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر سر رکھ دیا اور کھڑی ہو گئی۔ اور کافی دیر تک تماشہ دیکھتی رہی۔ (اسی اثناء میں) حضور اقدس ﷺ نے کئی بار پوچھا کہ بس۔ مگر میں عرض کرتی کہ ابھی نہیں"۔ یہ حدیث مبارک صحیح ہے اور اسے حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے کیمیائے سعادت میں نقل کی ہے اور اسی حدیث مبارک کے رو سے پانچ عدد اجازت نامے عطا ہوئے ہیں۔ پہلی اجازت یہ کہ کھیل اور مختلف تماشے کبھی کبھی دیکھنا حرام نہیں اور حبشیوں کی اس محفل میں تو رقص و سرود بھی شامل تھے۔ دوسری اجازت یہ کہ رقص و سرود کی یہ محفل حبشیوں نے مسجد میں برپا کی تھی۔

تیسری یہ کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو اجازت مرحمت فرما دی۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ دونکم یا نبی ارفدة یعنی کھیلو............" اور یہ حکم ہے اور اگر یہ چیز حرام ہوتی تو آپ ﷺ اس کا حکم کیوں دیتے۔

چوتھی اجازت یہ کے حضور اقدس ﷺ نے اس معاملے میں بزعم خود پہل کی اور حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اگر دیکھنا چاہتی ہو تو دیکھ سکتی ہو۔ اگر آپ خود نہ دیکھتے اور ام المومنینؓ کو منع نہ فرماتے تو لوگ کہتے کہ ام المومنین کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ ناراض کرنا بدخوئی ہے۔

پانچویں اجازت یہ کہ حضور اقدس ﷺ خود بھی کھڑے تھے اگر چہ نظارہ بازی یا کھیل کھود کو دیکھنا آپ ﷺ کے فرائیض میں شامل نہ تھا۔

سماع کی دوسری قسم وہ ہے کہ اگر کسی کے دل میں ایک بری صفت ہو یا اس

کے دل میں کسی غیر عورت یا لڑکے کی محبت ہو اور اسکے سامنے سماع کی جائے تاکہ اس کی لذت میں اضافہ ہو۔ یا اس کی غیر حاضری میں اس کی یاد میں سماع سنے تاکہ اس کا شوق زیادہ ہو اور ایسی غزل سنے جس میں معشوق کے خال و خط و غیرہ کی تعریف ہوئی ہو اور اس سے مراد وہ شخص وہی غیر محرم عورت یا لڑکا لے لے تو یہ سماع حرام ہے۔ اس لئے کہ............ آگ کی طرح اگر ایک حرام صفت کسی کے دل میں پیدا ہوئی ہو تو اسے بجھالینا واجب ہے۔ لیکن سماع ایسی چیز ہے کہ جو کچھ دل کے اندر ہوتا ہے اس میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ چنانچہ ایسی سماع سے یقیناً" ایک حرام خواہش میں اضافہ ہوتا ہو گا۔ للذا ایسی سماع سے اپنے آپ کو بچا لینا چاہیے کیونکہ یہ سماع **حرام** ہے ...... لیکن اگر سماع کے دوران زلف' خال و خط کو اپنی منکوحہ بیوی کی زلفوں یا خال و خط سے تشبیہ دے تو یہ مباح ہے۔

سماع کی تیسری قسم وہ ہے جسے مستحب کہا جاتا ہے یعنی اگر دل میں ایک ایسی پاک صفت ہو جو ثواب کی باعث ہو تو ایسی صفت کو مزید ترقی دینا مستحب اور باعث ثواب ہے اور یہ مستحب سماع بھی چار اقسام پر مشتمل ہے۔

اس کی پہلی قسم یہ ہے کہ حاجی صاحبان حج مبارک کے لئے جا رہے ہوں اور وہ انفرادی یا اجتماعی طور پر خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ کی صفت میں مدح سرا ہوں تاکہ ان کے ذوق سفر میں مزید اضافہ ہو۔ یا غازیان اسلام شوق شہادت کو ترقی دینے کے لئے نغمہ سرا ہوں تاکہ ان کے دل بھی مضبوط ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے عام طور پر عرب رجز پڑھنے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ یہ دلوں اور ارادہ کو مضبوط رکھنے کے لئے ہوا کرتا تھا (للذا اس قسم کی سماع مستحب ہو گی)

سماع کی دوسری مستحب قسم وہ ہے کہ سرود و سماع کی ایک ایسی محفل منعقد کی جائے جو دلوں کو نرم کر دے' سننے والے کو رونا آئے اس کا دل غم سے لبریز ہو جائے اور اس گریہ و غم کا مطلب یہ ہو کہ افسوس معرفت الٰہی حاصل کرنے کے لئے میں

نے کچھ بھی نہ کیا' نیز یہ کہ میں انتہائی گنہگار ہوں' نکیرو منکر کے سوال و جواب کے وقت میرا کیا حشر ہو گا۔ اور خصوصاً" جانکنی کے وقت میری کیا حالت ہو گی۔ وغیرہ اسی طرح خوش آوازی کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام رویا کرتے اور ایسا روتے کہ جنازے ان کے آگے سے نکل جاتے تھے اور ان کو خبر نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ یہ سماع بھی موجب ثواب ہے۔

مستحب سماع کی تیسری قسم یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی مباح کام پر خوش ہوا ہو یا اس سے خوش ہوتا ہو تو اس کو مزید خوشگوار بنانے کے لئے جائز ہے۔ مثلاً" شادی' ولیمہ' عقیقہ' تولد فرزند' ختنہ یا سفر سے بخیریت واپسی کے بعد۔ جیسے حضور اقدس ﷺ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچے تو اہالیان مدینہ ثنیات الوداع" تک استقبال کے لئے آئے تھے بچیاں خوشی سے دف بجا بجا کر یہ بیت گا رہی تھی۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا مادع للہ داع

(ثنیات الوداع سے ہم پر چودھویں کا چاند طلوع ہوا ہے جب تک دعا مانگنے والے خدا سے دعا مانگیں ہم پر خدا کا شکر بجالانا واجب ہے

سبحان اللہ) اسی طرح عید کے روز بھی جائز ہے جب دو دوست ملے ہوں در ضیافت کا موقعہ ہو تو ایسے موقعہ پر بھی جائز ہے۔

مستحب سماع کی چوتھی قسم یہ ہے کہ حق سبحانہ و تعالیٰ اور حضور محمد ﷺ کی محبت میں منعقد کی جائے اور فی الحقیقت اصل سماع یہی ہے۔

☆☆☆☆☆

حرمت سماع کے بارے میں علمائے ظاہر کا استدلال اور اس کا جواب

علمائے امت کا سماع کے بارے میں اختلاف ہے چنانچہ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی شرح مشکوۃ شریف میں لکھتے ہیں کہ بعض علما کہتے ہیں کہ سماع بالکل حرام ہے اور بعض کا ارشاد ہے کہ بالکل حلال ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ساری بات نیت پر منحصر ہے یعنی اگر یہ سماع خاص طور پر اللہ تعالیٰ کے لئے ہو تو حلال ہے اور اگر کسی حرام کام کے لئے ہو تو حرام ہے۔ سماع اور مزامیر کی حرمت کے بارے میں بعض احادیث بھی مروی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض علمائے ظاہر انہی احادیث کو سند کے طور پر پیش کرتے ہیں ...... لیکن (دوسری طرف) سماع اور مزامیر کی حلت کے بارے میں بھی کثرت سے مروی ہیں (مگر صورت حال یہ ہے) کہ حرمت کے بارے میں جو احادیث مروی ہیں۔ وہ یا تو "ضعیف" یا "موضوع" اور شرائط کے ساتھ مقید ہیں (۱)۔ اب جہاں تک حرمت کی احادیث کا تعلق ہے تو وہ سب مکی ہیں اور حلت کی احادیث مجموعی طور پر مدنی ہیں (حقیقت یہ ہے کہ) مکہ میں آنحضرت ﷺ کا لوگوں کو سماع سے منع کرنا ایک ضروری امر تھا کیونکہ وہاں کفار مکہ ایسی سماع کا اہتمام کرتے جس میں بتوں کی تعریفیں بیان ہوتیں اور اس کے ساتھ شراب بھی پیتے۔ (لہذا)

---

(۱) "ضعیف" اور "موضوعی" یا "وضعی" ان احادیث کو کہا جاتا ہے جن کے راویوں میں کوئی کسر ہو۔ وہ ضعیف حدیث کہلاتی ہے اور اگر کسی نے اپنی طرف سے گڑھی ہو تو وہ موضوعی اور یا وضعی حدیث کہلاتی ہے (طاہر چشتی)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ یہ فعل حرام ہے اور بے شک آج تک ایسی سماع حرام قطعی ہے بلکہ کفر ہے اور چونکہ بعض علمائے ظاہر صوفیائے کرام سے بغض اور کینہ رکھتے ہیں اور صوفیاء کی عزت' شرافت اور لیاقت ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے اس لئے وہ انہی منسوخ اور موضوع احادیث کو حرمت سماع کے سلسلے میں پیش کرتے ہیں مثلاً" علمائے ظاہر کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ:۔

قد کثر فی ھذا الزمان وجد بسماع الغناء بالمزامیر و اہل الوجد یقولون حق حق لاشک ان مطلق الغناء فعل حرام مخصوصا" الغناء الذی بالزامیر فانہ حرام قطعی یکفر جاھدہ و مستحلہ فاذا ذکراسم من اسماء اللہ تعالیٰ عزوجل فی ھذہ الموضع ینبغی ان یحصل بہ الکفر کا الذکر فی الحاوی۔ الحدیث القدسی ما محصلہ ان ذکراسم من اسماء اللہ تعالیٰ عند ضرب المزامیر کفر"۔

یعنی اس زمانے میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو سماع اور مزامیر (آلات سماع) پر وجد کرتے ہیں او رحق حق کے نعرے بلند کرتے ہیں (حالانکہ) اس میں کوئی شک نہیں کہ سرود مطلقاً" حرام ہے خصوصا" وہ سماع جو مزامیر کے ساتھ ہو وہ تو حرام قطعی ہے اور جو کوئی اس سے انکار کرتا ہے یا جو کوئی سماع و مزامیر کو حلال سمجھتا ہے وہ کافر ہے (یعنی) جس وقت حق تعالیٰ کا نام ایسے موقعوں پر لیا جائے تو ایسے مواقع پر اس کے ساتھ کفرواجب ہو جاتا ہے اس لئے کہ مزامیر کے ساتھ خدا کا نام لینا کفر ہے"۔

اس ضمن میں قرآن حکیم کی یہ ایت شریف بھی پیش کی جاتی ہے:

و من الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل بہ عن سبیل اللہ بغیر علم و یتخذھا ھزوا اولئک

لھم عذاب مھین سورہ لقمان ایت نمبر۶

اور بعض لوگ ایسے ہیں جو فضول باتوں کا خریدار بنتے ہیں تاکہ ناسمجھ اور بے علم لوگوں کو اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں اور اس کی ہنسی اڑائیں ایسے لوگوں کے لئے ذلت کا عذاب (مقرر) ہے (۱)

....

(۱) اس ایت مبارک کے بارے چند حقائق کا بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے سراج منیر میں کلبیؒ اور مقاتلؒ کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ نضر بن حارث کلدہ قرشی عراق کی راجدھانی حیرہ سے کچھ عجمی داستانیں قصے خرید کر مکہ میں لاتا اور قریش کو جمع کر کے سناتا اور یہ کہتا کہ محمد (ﷺ) تم کو عاد و ثمود کی پارینہ داستانیں سناتے ہیں اور میں رستم و اسفند یار کے قصے۔ اس واقعہ کے سلسلے میں آیت (مذکور) کا نزول ہوا اس روایت سے معلوم ہوا کہ "لھوالحدیث" سے مراد بیہودہ، فضول اور جھوٹے قصے ہیں لیکن بعض روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ نضر بن حارث کچھ ناچنے والی باندیوں کا ناچ کراتا اور رقص و سرود کی محفلیں منعقد کرتا تاکہ لوگ قرآن شریف کی طرف مائل نہ ہوں .... تفسیر مدارک میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ "لھوالحدیث" گانا ہے۔ (حضرت خواجہ) حسن بصریؒ بھی اسی کے قائل تھے کہ "لھوالحدیث" سے گانا مراد ہے۔ خطیب نے (سراج منیر میں) خواجہ حسن بصری کا قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یشتری کے معنی اس جگہ خریدنا نہیں بلکہ قرآن کو چھوڑ کر گانے بجانے کے سامان اور آلات کو بجائے قرآن کے اختیار کرنا مراد ہے (تفصیل کے لئے لغات القرآن جلد پنجم مولفہ مولانا سید عبد الدائم الجلالی صفحہ ۵۰ ـ ۲۴۹ ملاحظہ فرمائیں۔

ایت ایت مبارک کے بارے میں مندرجہ بالا حوالہ جات (بقیہ اگلے صفحے پر)

(علاوہ ازیں علمائے ظاہر حدیث امامہؓ کا بھی حوالہ دیتے ہیں) اور کہتے ہیں کہ حدیث امامہؓ سے بھی سماع کا ناجائز ہونا ثابت ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:۔

مارفع صوتہ بغناء الابعث اللہ شیطانین علٰی منکبیہ یضربان باعقابھا علٰی صدرہ حتی یمسک (رواہ ابن ابی الدنیا فی ذم الملاہی و الکبیر)

یعنی ابی امامہؓ سے روایت ہے کہ جو کوئی سرود کے ساتھ اپنی آواز بلند کرے تو خدا اس کی طرف دو عدد شیطان بھیج دیتا ہے جو اس کی پیٹھ اور گردن کو تپ تپاتے (ہاتھ مارتے) ہیں وغیرہ۔

شیخ ابراھیم عراقی جنہوں نے احادیث کا تخریج کیا ہے تو انہوں نے مندرجہ بالا حدیث کو ضعیف بلکہ اضعف کہا ہے اور جہاں تک متذکرہ بالا ایت شریف و من الناس من یشتری کا تعلق ہے تو اس بارے میں اگر متعدد تفاسیر کا مطالعہ کیا جائے تو دیگر مفسرین نے اس ایت کے یہ معنے نہیں کئے ہیں بلکہ انہوں نے اس کی اصل شان نزول بیان فرمائی ہے اور وہ یہ ہے کہ "نضر بن حارث یہودی لوگوں کو کہتا کہ تم

جامع و مانع ہیں ظاہر ہے نضر بن حارث عجمی قصے کہانیوں کے علاوہ دوشیزاؤں کے ناچ گانے کی محفلیں منعقد کراتا تاکہ مکہ کے عوام (قریش) قرآن عظیم الشان کی ایتوں کو سماعت کرنے سے باز رہیں۔ چنانچہ حق تعالٰی اور حضور اقدس ﷺ نے ایسی محفلوں اور امور کو حرام قرار دیا ہے ظاہر ہے کہ خدا اور رسول خدا ﷺ ایسی محفلوں کی اجازت کیونکر دیتے جن میں بے ہودہ قصے اور دوشیزاؤں کے ناچ گانے کا اس لئے اہتمام کیا گیا ہو کہ (خدانخواستہ) لوگ قرآن شریف کے سننے سے باز رہیں فی الحقیقت ایسی سماع قطعی حرام بلکہ کفر ہے (طاہر چشتی)

محمد (ﷺ) کے پاس کس لئے جاتے ہو۔ کیونکہ وہ تو تمہیں پرانے قصے بیان کرتا ہے میرے پاس آؤ کہ میں تمہیں رستم و اسفند یار کے قصے بیان کروں"۔ چنانچہ اس حوالے سے لوگوں کو حضور اقدس ﷺ کے پاس جانے سے روکتا تھا (حوالے کے لئے تفسیر یسیر وغیرہ مطالعہ فرمائیں) لہٰذا اب قارئین غور فرمائیں کہ ایت مذکور سے سماع و مزامیر کی حرمت کیسے ثابت ہو سکتی ہے۔ (خصوصاً اس سماع کے بارے میں جو صوفیاء کی محفلوں میں ہوتی ہے) اس لئے کہ یہ ایت مبارک تو نضر بن حارث یہودی کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ البتہ ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی محفل سماع میں ایسے ابیات و اشعار کہے جائیں جن کی وجہ سے لوگ خدا اور رسول ﷺ کے راستے سے ہٹ کر گمراہ ہوتے ہوں تو جیسے ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ بخدا ایسی سماع نہ صرف حرام بلکہ کفر ہے۔ علمائے ظاہری حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث بھی پیش کرتے ہیں۔

ان اللہ عزوجل حرم القلب و بیعھا و عنھا و تعلمھا (رواہ الطبرانی۔ وفی الاوسط) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ خدا نے مطربہ عورت کو بیچنا یا اس کو اپنے پاس رکھنا اور اسے تعلیم دینا حرام قرار دیا ہے مگر اس حدیث کے بارے میں بیہقی رحمتہ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث "محفوظ" نہیں ہے یعنی صحیح نہیں۔

مخالفین سماع ایک حدیث یہ بھی پیش کرتے ہیں۔

عن ابی مالکؓ الاشعری قال قال رسول اللہ ﷺ لیکونن منی امتی اقوام یستحلون الخمر و الحریر والمعارف۔

یعنی ابی مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے بعض اقوام شراب کو حلال کریں گے۔ اور ریشم اور معارف یعنی سرود وغیرہ

کو بھی حلال کریں گے مگر امام بخاری کے نزدیک یہ حدیث تعلیق کی صورت رکھتی ہے
اسی وجہ سے امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اس حدیث کو "ضعیف" کہا ہے اور یہ
حدیث۔ حدیث امامہؓ سے متعلق ہے۔

اسی طرح حضرت ابو داؤد رحمتہ اللہ علیہ اور اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ نے یہ
حدیث بھی نقل کی ہے:۔

ان اللہ عز وجل امرنی ان امحو المزامیر والکبارات
یعنی بربط و المعارف۔ (اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں مزامیر و کبارات اور
معارف یعنی آلات سرود کا خاتمہ کر دوں۔

اسی طرح قیس بن عبادہؓ کی حدیث بھی پیش کی جاتی ہے جو یہ ہے:۔
ان اللہ حرم علی الخمر والکوکبہ والقیان یعنی ابوداؤد نے قیس
بن عبادہؓ سے روایت کی ہے کہ حضور اقدس کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر خمر
اور کوبہ یعنی کھیل اور مطربہ عورتوں کو حرام فرما دیا ہے۔ یہ حدیث بھی امامہؓ کی
حدیث کے حوالے سے بیان ہوئی ہے اور حدیث امامہؓ میں ہے فاسحلا لھم
الخمور و ضربھم الدفوف یعنی عذاب ہے ان لوگوں کے لئے جو شراب حلال
سمجھتے ہیں اور دفوں کو بجاتے ہیں۔ مگر حضرت عبدالرحیم عراقی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے
ہیں کہ یہ تمام احادیث ضعیف ہیں۔ ابو شیخ من حدیث مکحول
مرسلا لاستماع الی الملاھی معصیتہ اور ابوداؤد اور ابن عمرؓ روایت
کرتے ہیں کہ جب ابن عمرؓ نے مزامیر کے سرود کو سنا تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس دیں۔
اور اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ مگر اس کے بعد یہ بھی کہا ہے کہ یہ حدیث
موضوع ہے اور اس سے انکار بھی کیا ہے۔ ایک اور حدیث یہ بھی بیان کی جاتی ہے
ھو اعلم باطل بثلثتہ بقلمہ بفرسہ و تادیبہ بفرسہ وملاعبتہ مع

نسائه رواه اصحاب السنن الاربع عن عقبته بن عامر یعنی اصحاب سنن اربعہ نے عقبہ بن عامرؓ سے روایت کی ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ مذاق اڑانا اور کھیلنا مسلمانوں کے لئے باطل یعنی حرام ہیں مگر تین چیزیں یعنی علم اور گھوڑے کو سدھارنا اور گھوڑے اور اپنی بیوی کے ساتھ کھیلنا۔

و عن جابرؓ قال قال رسول اللہ ﷺ الغناء ینبت النفاق فی القلب کما ینبت الماء الزرع۔ رواہ البیقی فی شعب الایمان بیہقی۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے۔ کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ سرود دل میں نفاق پیدا کرتا ہے۔

(مختصر یہ کہ) ان احادیث کا لب لباب یہ ہے جن کو بعض علماء سماع اور مزامیر کی حرمت کے سلسلے میں بہ شدت تمام پیش کرتے ہیں مگر فی الحقیقت ان احادیث میں اکثر ضعیف ہیں اور بکثرت مقید (مثلاً) وہ حدیث جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں خمرو معارف کو محو کرنے پر مامور ہوا ہوں (تو یہ مقید ہیں اور) مطلب یہ ہے کہ ان مزامیر کو محو کیا جائے جن کے ساتھ شراب پینے کا استعمال ہوتا ہو۔ دیگر احادیث میں لھو اور ملاہی کا بیان ہے جس کا مطلب کھیل ہے مگر (یہ بھی ہے) کہ جو کھیل حرام نہیں ان کو دیکھنا جائز ہے (قارئین غور فرمائیں)

سماع و مزامیر کا جواز۔

اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر ان احادیث نبوی ﷺ کو بھی بیان کیا جائے جو سماع و مزامیر کی حلت اور جواز کے بارے میں وارد ہوئی ہیں چنانچہ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

قالت دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عندی جاریتان تغنان بغنا بعاثد۔ الحدیث فی الصحیحین و

فی روایته ان ابابکر دخل علیها و عندها جارتیان تدفغان و تغینان والنبی صلی اللہ علیہ وسلم مغش ثبوبه متهمز هما ابابکر۔ کشف البنی ﷺ من وجهه و قال دعهما ابابکر فانها ایام عید رواہ مسلم)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرے ہاں رسول اللہ ﷺ داخل ہوئے اس وقت میرے یہاں دو لڑکیاں سرود بجا رہی تھیں اور اس کے ساتھ بعاث کے ابیات گا رہی تھیں۔ (بعاث بنی اوس اور بنو خزرج کے جنگی اور رجزی اشعار تھے جو جہالت کے وقت سے رائج تھے۔ یہی لوگ ایمان لانے کے بعد انصارؓ کہلائے) صحیحین میں بس اسی قدر ہے مگر صحیح مسلم میں اس روایت کا ذکر اس اضافے کے ساتھ ہوا ہے کہ:۔

حضرت ابوبکرؓ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں داخل ہوئے اس وقت دو لڑکیاں دف بجا رہی تھیں اور سرود میں مشغول تھیں۔ اسی وقت حضور اقدس ﷺ (پاس ہی) روئے مبارک پر کپڑا ڈال کر استراحت فرما رہے تھے حضرت ابوبکرؓ نے لڑکیوں کو ٹھوکا تو حضور اقدس ﷺ نے روئے انور سے کپڑا ہٹا کر فرمایا کہ چھوڑیے ابوبکرؓ یہ عید کا موقعہ ہے"۔

اور سبیل الرشاد میں لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو قبیلہ بنی نجار میں اترے جبکہ اسی دوران بنی نجار کی بچیاں سرود بجا کر یہ اشعار گا رہی تھیں۔

نحن جوار من بنی النجار وحبذا محمد من جار

یعنی اے قوم! (بنی نجار) تم کتنے خوش نصیب ہو کہ محمد ﷺ تمہارا مہمان۔ ہمسایہ ہے (اور الحمد اللہ) ہم اسی قوم بنی نجار (ہی) کی لڑکیاں ہیں اور بیہقی نے دلائل النبوت میں ذکر کیا ہے کہ جس وقت حضور اقدس ﷺ غزوہ تبوک

سے واپس تشریف لا رہے تھے تو صحابیاتؓ دفوف بجا بجا کر یہ اشعار گا رہی تھیں او راس حدیث کو حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا ما دع اللہ داع

(اب ایک حدیث مبارک یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ مزید تسلی ہو)

عن محمد بن حاطب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصل مابین الحلال و الحرام الدف والصوت فی النکاح

"یعنی نکاح کے دوران دف کے بجانے (سازو آواز) میں حلال و حرام کے درمیان فرق کیجیے" اس حدیث مبارک کو ترمذی اور ابن ماجہ نے ذکر کیا ہے اور مشکوۃ شریف میں بھی مکمل صحت کے ساتھ نقل کی گئی ہے امام ترمذی نے بھی تصریح کی ہے کہ یہ حدیث "حسن" (صحیح) ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:۔

قالت قال رسول اللہ ﷺ اعلنوا النکاح و اجعلوافی المساجد و اضربوا علیہا الدف یعنی فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ نکاح کا اعلان (ضرور) کیا کرو اور یہ اعلان مسجد میں دف بجا کر کیا کرو" اس کا مطلب یہ ہے کہ دف بجانا اور اشعار کہنا مسجد میں بھی جائز ہے۔ ترمذی کے نزدیک یہ حدیث "غریب" ہے اسی طرح حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:۔ قالت جاء رسول ﷺ فدخل ...... مجلس علی فراشی فجعلت جویرات یضربن بدفو فھن و ...... من قتل من ابائھن...... یوم بدر و قالت

....

یہاں پر الفاظ کی صحت پر مجھے شبہ ہے چنانچہ یہ جگہ خالی چھوڑ دی مترجم

احداهن و فینا نبی یعلم ما فی غد فقال رسول اللہ ﷺ ھذا و قولی بالذی کنت تقولین یعنی ربیع بنت معوذ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک رات آپ ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے (اس وقت) میرا نکاح ہو گیا تھا۔ او رمیری رخصتی ہو رہی تھی۔ میرے فرش پر تشریف رکھی اور اس وقت لڑکیاں دفیں بجا بجا کر شہدائے بدر (رضی اللہ عنہم) کے مرثیے گا رہی تھیں جن کے باپ غزوہ بدر میں شہید ہوئے تھے۔ اسی اثناء میں ایک لڑکی نے یہ مصرعہ کہا کہ ہم میں ایک ایسا نبی بھی ہے جو کل کی باتیں جانتا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ نہ کہو وہ کہو جو تم پہلے کہہ رہی تھیں (یعنی شہدائے بدر کا مرثیہ) اس حدیث مبارک سے ثابت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے عورتوں کی زبانی دف کے ساتھ مرثیہ سماعت فرمایا ہے۔ جبکہ دف بھی مزمار (آلہ موسیقی) ہے یہ حدیث مبارک مشکوۃ شریف کے باب النکاح میں بھی موجود ہے۔ وعن عائشۃؓ

قالت زفت امراۃ الی رجل من انصار فقال

رسول اللہ ﷺ اما کان معکم ھو فان الانصار یحبھم رواہ بخاری "یعنی صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت ایک انصاری مردؓ کو بیاہی گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تمہارے پاس لہو یعنی مزامیر یا دف نہیں ہے۔ (کہ اسے بجاؤ)۔ اس لئے کہ انصارؓ تو اسے (سرود) کو پسند کرتے ہیں"۔ ایک اور حدیث مبارک میں ہے:۔ و فی الصحیح ابن حبان قالت عائشہ الاتغنین فان ھذا الحی من الانصار یحبونھم الغنا و عن ابن عباس............ (۱)

---

(۱) یہ لفظ سمجھ میں نہ آیا (مترجم)

رواہ ابن ماجہ یعنی ابن حبانؒ کی صحیح میں ہے کہ فرمایا حضرت عائشہؓ نے کہ میرے پاس ایک لڑکی آئی اور میں نے ایک انصاری سے اس کا نکاح کر دیا پس حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے عائشہ تم سرود کا اہتمام نہیں کرتیں کیونکہ انصارؓ تو اسے (سرود) کو بہت پسند کرتے ہیں اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابن ماجہ نے بھی ذکر کیا ہے۔

اسی طرح حضرت عامر بن سعد رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ "میں ایک رات کسی گاؤں میں داخل ہو گیا اس وقت ایک نکاح کی تقریب میں حضرت ابن کعبؓ اور حضرت ابی مسعودؓ بھی شامل تھے جبکہ لڑکیاں گا بجا رہی تھی چنانچہ میں نے ان دونوں اصحابؓ رسول ﷺ سے کہا کہ اے غازیان بدر! یہ تم کیا کر رہے ہو۔ (کہ گانا بجانا سن رہے ہو۔) تو انہوں نے جواب دیا کہ تم بھی اگر اس کو سننا چاہتے ہو تو بیٹھ جاؤ اور سنو ورنہ تمہیں چلے جانے کی اجازت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا ہے کہ یہ کام نکاح میں مباح ہے"۔ اس حدیث شریف کو نسائی نے نقل کیا ہے۔ البتہ مشکوۃ شریف میں اس اضافے کے ساتھ نقل کی گئی ہے کہ ان دونوں اصحابؓ رسول ﷺ (جو لڑکیوں سے غزل اور دف کا بجانا سن رہے تھے) کے ہمراہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ راستے پر جا رہے تھے کہ مزامیر کی آواز سنی تو دریافت کیا کہ یہ کیا ہے۔ کہا گیا کہ یہ ختنے کی خوشی میں ہو رہا ہے تو خاموش رہے اور منع نہیں کیا۔

مندرجہ بالا تمام احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عید، نکاح، شادی اور جہاد میں دف بجانے اور مجلس و سرود کو مباح فرمایا ہے۔ قطع نظر ان احادیث کے جو سماع کی حرمت میں وارد ہوئی ہیں تو بالفرض اگر ان کو ہم صحیح بھی مان

پس تو جو احادیث ہم نے سماع کی حلت میں نقل کی ہیں اور کچھ اور بھی نقل کریں گے۔ تو بالیقین ان کو بھی صحیح تسلیم کریں گے۔ کیونکہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ یہ ساری احادیث موضوعی ہوں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس بات کا کیا علاج ہو گا۔ کہ ایک چیز کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو قسم کے احکام صادر فرمائے ہوں۔ جیسے امام طحاوی رحمتہ اللہ علیہ نے پانی کی طہارت کے بارے میں متضاد احادیث نقل کی ہیں اور انہوں نے کئی احادیث سے یہ ثابت کیا ہے.............. مثلاً" جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیر بضاعہ پر وضو فرما رہے تھے تو اصحاب رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کنویں میں لوگ مردار چیزیں اور حیض کے کپڑے پھینکتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پانی کو کوئی چیز گندہ نہیں کر سکتی۔ اس قسم کی کئی احادیث انہوں (طحاوی) نے نقل کی ہیں اور پھر ان کے برعکس ایسی احادیث بھی نقل کی ہیں۔ مثلاً" جب پانی میں کوئی گندی چیز گر جائے تو پانی ناپاک ہو جاتا ہے جیسے چوہایا مرغا وغیرہ۔ آخر میں یہ فتویٰ دیا ہے کہ پانی ناپاک ہو گا اور اس وقت تک ناپاک ہو گا جب تک اسے صاف نہ کیا جائے۔ ان اصولوں کے پیش نظر دیکھنا چاہیے کہ ان احادیث کی ضد پیش کرنے کا بھی کوئی انتظام ہو گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل میں تطبیق کیسے پیدا کی جائے گی۔ اس لئے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سماع و مزامیر کی مخالفت فرمائی ہوتی تو دوسری طرف سماعت بھی فرمایا ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ایک چیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمائی ہو اور خود ہی ایسا کرتے بھی ہوں۔ تو اس صورت کے لئے اور کوئی راستہ نہیں (کہ ہم اس امر کو تسلیم کریں) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن مزامیر اور سماع کو منع فرمایا ہے وہ سماع یا تو مکے کے کفار کا تھا جس کے ساتھ بتوں کی تعریفیں ہوتیں یا جو فواحش کی طرف مقترن ہو یا جس کے ساتھ شراب نوشی کی جاتی ہو (بصورت دیگر) جو سماع مباح و

مستحب ہے وہ خود سماعت فرمایا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی سننے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔ ممانعت کی احادیث میں اکثر احادیث مکی زندگی اور اسلام کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ جو کفار کے سرود کے سلسلے میں ارشاد فرمائی گئی ہیں اس لئے کہ کفار سرود کے ساتھ شراب نوشی کرتے اور بتوں کی تعریفیں کرتے۔ چنانچہ ان دنوں جو لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے کفار ان کو بھی ورغلانے کی کوشش کرتے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کو منع فرمایا۔ مدینے کی بھی اگر ایسی کوئی حدیث موجود ہو تو وہ مشروط اور مقید ہے۔ گویا اپنے موقع اور محل پر سماع کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ یعنی اگر وہ خاص موقع ہو تو جائز ہے ورنہ ناجائز ہے۔ خصوصاً" حضور اقدس ﷺ کا بچیوں اور عورتوں سے دف سماعت فرمانا تو صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ سماع کی تین قسمیں بھی ثابت ہیں اور حرمت کی احادیث کے بارے میں حضرت امام غزالی قدس سرہ نے اپنی مشہور عالم کتاب احیاء العلوم میں تحریر فرمایا ہے کہ اس سے مراد شیطانی جذبہ ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی شیطانی جذبے کی خاطر یا دوسرے الفاظ میں خواہش نفس کی خاطر سماع سنے تو اس کے ضمن میں احادیث نبوی ﷺ میں "لھو" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور علماء بھی سماع کو "ملاھی" کہتے ہیں مگر اس سے مراد ناجائز سماع ہے۔ جو مستی اور حرام کاری کے لئے سنا جاتا ہے اور جو ایسے سماع کو سنے وہ "لاھی" ہوتا ہے .... مگر حضور اقدس ﷺ نے (بہت نہ سہی) تھوڑے بہت سماع کو سنا ہے اور اس کی اجازت بھی مرحمت فرمائی ہے لہٰذا اگر اب بھی "ہر قسم" کے سماع کو "لھو" کہا جاتا ہو تو ایسے لوگوں کے لئے مناسب ہے کہ توبہ نکالیں ورنہ وہ سب (خدانخواستہ) حضور اقدس ﷺ کی ھتک کے مرتکب ہو جائیں گے۔

فنعوذ باللہ منہا

اسی طرح جو لوگ اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور اپنے مرشد کی محبت میں

سماع سنتے ہوں تو ظاہر ہے ان کی نیت پہلے ہی سے طاعت سے متعلق ہوتی ہے بخدا "لہو" سے ان کا کوئی علاقہ نہیں ہوتا ایسے سماع کو برا سمجھنا یا ان کی برائی کرنا بذات خود بری بات ہے. اور ایسے سماع کو کیسے "لہو" میں شمار کیا جا سکتا ہے ذرا غور فرمائیے جب قوال یہ الفاظ کہے۔

دریں دلے کہ جمال محمد ﷺ عربی ست
فدائے خویش نہ گشتم کمال بے ادبی ست

اور یا یہ شعر کہے۔

الصبح بدا من طلقه   والليل دجى من وفرته

او رپھر صاحبان دل ایسا کلام سنیں تو بے ہوش نہ ہوں گے۔ اور اگر مکمل صاحب حال نہ بھی ہو تو بھی اس کو "لہو" میں شامل نہیں کیا جا سکتا (کیونکہ) اگر ایسے کلام سے محبت اور محبت بھی حضور نبی کریم ﷺ سے ہو اور اس محبت میں ایسے کلام سے کوئی بے حال ہوتا ہو اور یہ لہو ہو تو میری دعا ہے کہ

خداوند کریم ہمارا خاتمہ اس قسم کے لہو پر کرے۔

آمین یا رب العالمین ۔

ابن ماجہ نے ایک حدیث نقل کی ہے و عن عباس انكحت عائشه ذات قرابته لها من الانصار فجاء الرسول ﷺ احديتم الغنا قالوا نعم قال ارسلتم معها من تغنى قالت لا فقال رسول الله ﷺ ان الانصار قوم فيهم غزل فلو بعثتم معها من يقول

آتيناكم آتيناكم   فحيانا و حياكم

یعنی حضرت عباسؓ سے روایت ہے کہ "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ایک رشتہ دار لڑکی جو انصار سے تعلق رکھتی تھی، بیاہ دی۔ آنحضرت ﷺ

تشریف لائے تو فرمایا کہ کیا تم نے لڑکی کو رخصت کر دیا۔ تو عرض کیا گیا کہ ہاں! تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ گانے والوں کو بھی بھیجا ہے۔ جو گانے گائے۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ نہیں یا رسول اللہ ﷺ۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ انصار ایسی قوم ہے جو غزلیں گاتے ہیں اور اگر تم دلہن کے ساتھ کسی ایسے گانے والے کو بھیجتے جو یہ غزل گاتے کہ ہم تمہاری طرف آگئے ہم تمہاری طرف آگئے پس خدا ہم کو اور تم کو زندہ رکھے" بعض راویوں کے نزدیک اس غزل (نظم) کا دوسرا مصرعے (شعر) یوں ہے

ولولا حنتطه الحمراء۔ لم تسمن غداكم

اور اسکا مطلب یہ ہے کہ "اگر سرخ گندم نہ ہوتا تو تمہاری کنواریاں اس قدر مضبوط نہ ہوتیں" بعض کے نزدیک اس کا دوسرا مصرعہ (شعر) اس طرح ہے۔

ولولا عجوة السوداء ماكنا بواوكم

یعنی اگر سیاہ کھجور نہ ہوتے تو ہم فاقہ کش تمہارے گھروں میں نہیں بلکہ کہیں اور ہوتے۔

ایک اور حدیث مبارک ملاحظہ فرمائیے:۔

و عن عمر بن شعیب عن ابیه عن جده ان امراه قالت انی نذرت ان اضرب علی راسک بالدف قال اوفي بنذرک رواه ابی داؤد "یعنی عمر بن شعیبؓ نے اپنے باپ او راپنے جد (دادا) سے روایت کی ہے (یعنی عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم) کہ ایک عورت نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نے نذر مانی ہے کہ اگر آپ ﷺ جہاد سے صحیح سلامت واپس تشریف لے آئے تو میں آپ کی خدمت میں دف بجاؤں گی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اپنی نذر پوری کردو" یہ حدیث مبارک صحیح بخاری میں ان الفاظ کے اضافے کے ساتھ نقل

کی گئی ہے فقال علیہ السلام ان کنت نذرت فاضربی فضربت بین یدیہ و غنت شعر

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع　　وجب الشکر علینا ما دع اللہ داع

یعنی حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم نے نذر مانی ہو تو وہ پوری کر دو (آنحضرت ﷺ کے حضور میں) تو دف بجا کر اس نے شعر کہا کہ ثنیات الوداع کی جانب سے ہم پر چاند نے طلوع کیا ہے ہم پر شکر بجا لانا واجب ہے (نذر پوری کرنا بھی ضروری ہے) بہر حال اس حدیث سے تو صاف ظاہر ہے کہ دف بجانا اور اس کے ساتھ کچھ گانا (کہنا) بالکل مباح ہے۔ دوسری بات یہ کہ گناہ کے سلسلے میں نذر ماننا درست نہیں۔ اس ضمن میں ہم نذر ہی کی ایک اور حدیث مبارک پیش کرنا چاہتے ہیں

نذر کی حدیث

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

عن عائشہ ان الرسول ﷺ قال من نذر یطیع اللہ فلیطیعہ و من نذر ان یعصیہ فلا یعصیہ رواہ البخاری

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جس کسی نے نذر مانی کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو مناسب ہے کہ اطاعت کرے اور جس نے گناہ کی نذر مانی تو مناسب ہے کہ گناہ نہ کرے یعنی نذر پوری نہ کرے اور یہ حدیث بخاری شریف میں ہے۔ گناہ کی نذر اور اس کے کفارے کے لئے بھی حدیث شریف موجود ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے قالت قال رسول اللہ ﷺ لا نذر فی المعصیتہ فکفارتہ کفارۃ الیمین رواہ ابوداؤد و ترمذی و نسائی یعنی فرمایا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ گناہ کی نذر ماننا درست نہیں اور اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا ہے۔ یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے نقل فرمائی ہے۔ و فی مسند احمد ان الحبشته کانوا یدفنون بین یدی الرسول ﷺ و یرقصون یقولون محمد عبد الصالح فقال ما یقولون قال محمد عبد الصالح "یعنی امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں روایت کی ہے کہ حبشی آنحضرت ﷺ کے سامنے ناچ رہے تھے اور دف بجا رہے تھے اور کہتے تھے کہ محمد ﷺ نیک بندہ ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تو عرض کیا گیا کہ ہم کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) نیک بندہ ہے"۔

واخرج نسائی فی السنته باسناد صحیح و الطبرانی فی الکبیرات امراۃ جاء ت الی النبی ﷺ فقال العائشہ۔ اتعریفین ھذہ فقالت لا یا نبی اللہ ﷺ فقال ھذہ فینته بنی فلان یحبیں ان نغنیک قالت نعم فغنت یعنی نسائی نے اپنی کتاب السنته میں صحیح اسناد کے ساتھ روایت کی ہے اور طبرانی نے اپنی معجم الکبیرات میں بھی یہی روایت کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے پاس ایک عورت آگئی آپ ﷺ نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ اے عائشہ تم اس عورت کو جانتی ہو۔ تو اس نے جواب دیا کہ نہیں یا رسول اللہ (ﷺ) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ فلاں قوم کی ایک باندی ہے اور کیا تم اس سے کچھ غزل (گانا) سننا چاہتی ہو۔ تو عائشہ نے عرض کیا کہ ہاں! یا رسول اللہ ﷺ چاہتی ہوں۔ تو پھر اس عورت نے گانے گائے۔

گذشتہ اوراق میں ہم بنی نجار کی لڑکیوں کی ایک حدیث پاک نقل کر چکے ہیں

جس کے سلسلے میں ابن ماجہ نے یہ الفاظ بھی تحریر کئے ہیں فقال النبی ﷺ یعلم انی لاحبکن یعنی حضور اقدس نے فرمایا کہ اللہ کو علم ہے کہ تم (بچیاں) مجھے بہت پیاری ہو۔

ان احادیث کی تاویل ہے

جس حدیث مبارک میں حضرت ابوبکرؓ نے بچیوں کو دف بجانے سے منع کیا تھا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیش نظر بھی وہی مکہ کی حالت تھی یعنی ان کا یہ خیال تھا کہ چونکہ مکہ معظمہ میں حضور اقدس ﷺ نے اس کام کی ممانعت فرمائی تھی تو وہ کام یہاں (مدینہ منورہ) میں بھی منع ہو گا۔ مگر حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "ابوبکرؓ چھوڑو یہ عید کے دن ہیں" مطلب یہ کہ اگر یہ کام حرام ہوتا تو آنحضرت ﷺ کیونکر اجازت مرحمت فرماتے۔ اس امر کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ ﷺ نے حرام کام کی اجازت دی ہو (نعوذ باللہ) اور اس سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وقت گذارنے اور دل کو خوش کرنے کے لئے سماع جائز ہے اسی طرح حدیث مبارک کے ایک لفظ "تضربان" کا مطلب بعض علماء کودنا یا اچھلنا بھی لیتے ہیں اور اس سے "رقص" کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے مولوی قطب الدین خان نے اس حدیث مبارک کے کئی فوائد بیان کئے ہیں۔

ربیع بنت معوذ کی حدیث میں حضور انور ﷺ نے جس عورت کو منع فرمایا تھا وفینا نبی یعلم ما فی غد کے ضمن میں بھی حضور اقدس ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے کے بغیر علم غیب کا عقیدہ آپ ﷺ سے منسوب ہو۔ اس منع فرمانے کا یہ مطلب نہ تھا کہ اس کو سماع سے منع فرمایا بلکہ اس قول سے کہ ہمارے نبی ﷺ کو (بغیر واسطہ الٰہی کے) علم غیب حاصل ہے غور فرمائیے اس وقت حضور اقدس ﷺ کا ارشاد تھا

قولی بالذی کنت تقولین

اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ "علم غیب" والی بات چھوڑ کر وہ بات کرو جو تم پہلے کر رہی تھی یعنی سماع کے ساتھ شہدائے بدر رضی اللہ عنھم کا مرثیہ کہو۔

جہاں تک انصار رضی اللہ عنہم کی احادیث کا تعلق ہے تو ان سے صاف صاف ظاہر ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے بزعم خویش اپنی رضا و رغبت سے حضرت عائشہ کو تماشہ یا سماع دیکھنے اور سننے کے لئے آمادہ فرمایا اور یہ خیال نہ فرمایا کہ دوسری عورتیں سنیں گی تو اپنی ناقص عقل کی وجہ سے کیا کیا بنا دیں گی۔ تاہم انصار رضی اللہ عنہم کی دلجوئی کو مقدم جانا۔ یہاں پر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر سماع جائز نہ ہوتا تو آپ ﷺ انصارؓ کی دلجوئی ہرگز نہ فرماتے۔ مزید براں جس حدیث مبارک میں "غزل" کالفظ آیا ہے تو اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ خود حضور اقدس ﷺ اس بات پر راضی تھے کہ کسی کو سرود و سماع کے ساتھ بھیجا جائے اور حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد "لو بعثتم" یعنی کاش تم نے کسی کو بھیجا ہوتا اور وہ مصرعہ جس سے تشویق و دعا کا اظہار معلوم ہوتا ہے اس سے بھی اباحت ثابت ہے۔ اور نذر کی حدیث مبارک کے سلسلے میں مولوی قطب الدین خان فرماتے ہیں کہ "نذر طاعت کے لئے مانی جائے جیسا کہ حدیث کے مفہوم سے بھی ظاہر ہے تو غزل گانا اور دف بجانا اگر چہ مباح تھا مگر طاعت نہ تھی مگر حضور اقدس ﷺ کا جہاد سے صحیح و سلامت واپس آنے پر خوشی کے اظہار میں طاعت بھی ہو گئی۔ تو جب سماع سے خاص کر اطاعت ھی مراد ہو تو ظاہر ہے کہ وہ تو لامحالہ مباح ہو گا۔

بنی نجار کی لڑکیوں کے دف بجانے اور غزل گانے اور ان سے یہ ارشاد فرمانے کہ:

"بخدا تم (بچیاں) مجھے بہت پیاری اور عزیز ہو"

سے بحیثیت مجموعی "عام" اباحت ثابت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نہ جہاد کا موقعہ تھا، نہ شادی ہو رہی تھی اور نہ ہی عید کا موقعہ تھا۔ وغیرہ

اب اس حدیث مبارک کو لے لیجیے جس میں نکاح کے وقت دف بجانے کا ذکر ہے تو اسی حدیث مبارک کی بنیاد پر حضرت امام مالک رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ "نکاح کی شرط ہے" اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بھی اپنے رسالے میں نقل کی ہے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں۔

"مزامیر را حرام قطعی گفتن چہ معنی دارد۔ دلیل قطعی نیست مگر آیتہ محکم یا حدیث متواتر یا اجماع امت۔ اگر بالفرض حرام باشد حرمت اں از احادیث احادست و احادیث احاد دلیل ظنی

ست۔ از انکار ما یشتباہ کفر لازم نمے آید۔ حرمت سماع از احادیث
ثابت ست و مالک قائل حرمت آں نیست۔ مکروہ میگوید و شافعی
آنرا حلال میگوید و تاویل می کند"

"اگر ایت محکم یا حدیث متواتر یا اجماع امت (کا قول) موجود نہ تو مزامیر کیونکر اور کیسے حرام ہو سکتے ہیں۔ (یعنی حرام نہیں) اور بالفرض اگر حرام بھی ہو تو یہ حرمت احادیث احاد کی وجہ سے ہو گی (مراد یہ کہ اس ضمن میں کوئی متواتر حدیث موجود نہیں ہے) اور احادیث احاد صرف ظنی دلیل پر مبنی ہیں اور ان میں سے جو ثابت ہوتا ہے اس سے انکار کرنا کفر نہیں۔ اس لئے کہ سماع کی حرمت احادیث (صحیح) سے ثابت ہے۔ تاہم امام مالک رحمتہ اللہ علیہ اسے حرام نہیں کہتے بلکہ "مکروہ" کہتے ہیں جبکہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ اس کو حلال کہتے ہیں اور تاویل کرتے ہیں"

ان احادیث کی صحت اور صحابہؓ اور تابعین کا سماع سننا۔

متذکرہ بالا جو احادیث ہم نے نقل کی ہیں سب کی سب اتنی مستند اور صحیح ہیں کہ کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی کچھ کہے تو ظاہر ہے کہ یہ اس کی سینہ زوری یا جہالت ہو گی اس لئے کہ سماع و نغمہ اتنی پاکیزہ اشیاء ہیں کہ انسان تو انسان حیوان بھی اسے سن کر مست ہو جاتا ہے اور اس سے لطف حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی کم سن بچے کے سامنے بھی کوئی آلہ سماعت بجایا جائے تو وہ معصوم بھی خوشی سے ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے اور لطف و مزہ محسوس کرتا ہے۔ جو لوگ سماع کو برا کہتے ہیں ان کی ارواح کالی سیاہ ہیں اور حیوانات سے بھی بدتر ہیں ایسے لوگ حق اور تحقیق کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں رکھتے (جبکہ) انہی احادیث کو سند مان کر اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ نے عیدوں، شادیوں اور علاوہ ازیں دیگر مواقع پر پورے شوق سے غزلیں اور دف بجانا باقاعدہ سماعت فرمایا ہے۔ لہٰذا یہ بات کیسے ممکن ہے کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم "لھو" کو اختیار کریں۔ اور نعوذ باللہ "لاھی" کے زمرے میں آجائیں۔ (استغفراللہ) اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ـــ اصحابؓ تو "لاھی" ہوں اور ان کے مابعد "تابعین" متقی ہوں جبکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

خیر القرون قرنی ثم یلون ثم یلون

اس حدیث مبارک کو ہم پہلے بھی نقل کر چکے ہیں یہاں پر چند دیگر مستند احادیث اور حوالہ جات پیش کی جاتی ہیں مثال کے طور پر حضرت جابر بن سعدؓ کی حدیث درج ذیل کی جاتی ہے:۔

و عن جابربن سعد رضی اللہ عنہ قال دخلت علی قرظہ بن کعبؓ و ابی مسعود الانصاریؓ فی عروس و از جوار تغینن فقلت ای صاحبی رسول اللہ ﷺ و اھل بدر یفعل ھذا عندکم۔ فقالا اجلس ان شئت فاسمع معنا و ان شئت فاذھب قد رخص لنا فی اللھو عند العروس

عامر رضی اللہ عنہ (جابرؓ) سے روایت ہے کہ میں ایک شادی کے سلسلے میں گیا تو وہاں قرظہ بن کعبؓ اور ابی مسعود انصاریؓ بھی تھے جہاں باندیاں گا بجا رہی تھیں تو میں نے (ان دونوں سے) پوچھا کہ آپ دونوں اصحاب رسول ﷺ اور بدر کے غازی ہیں یہ تم کیا کرتے ہو اور ہمارے سامنے یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ (یعنی عورتوں سے غزلیں سن رہے ہو)۔ تو انہوں نے فرمایا کہ اگر تم بھی سننا چاہتے ہو تو بیٹھ جاؤ اور سنو۔ اور اگر تمہارا دل نہ چاہتا ہو تو تم جا سکتے ہو کیونکہ ہم کو شادی اور خوشی کے مواقع پر اس کی اجازت دی گئی ہے" (یہ حدیث نسائی میں درج ہے"

حضرت شیخ عبد الحق محدث نے مدراج میں لکھا ہے:۔

گفتہ اند قائلان بہ اباحت کہ روایت کردہ شدہ ست غنا و سماع آں جماعۃ کثیر از اکابر صحابہؓ کہ در ایشاں چندے از عشرہ مبشرہؓ اند۔ و جم عفیر از تابعین و تبع تابعین و اتباع تبع و دیگر علمائے محدثین و علمائے دین کہ از ارباب زہد و تقویٰ و عبادت بودہ اند۔ و نقل کردہ شدہ است دریں باب از ایشاں روایات و حکایات کہ کفایت است در آں بے شک۔

یعنی اس کے قائلین اس کی اباحت کی بات کرتے ہیں اور اس کی روایت اکابرین صحابہؓ کے ایک گروہ (جس میں اصحاب عشرہ مبشرہؓ بھی شامل ہیں) سے کرتے ہیں جن میں تابعین و تبع تابعین اور تابع تبع تابعین، علمائے محدثین، علمائے دین اور ارباب

زہد و تقویٰ و عبادت کی ایک کثیر تعداد شامل ہے اور اس ضمن میں اتنی روایات و حکایات نقل ہوئی ہیں کہ سماع کی اباحت کے لئے کافی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں"۔

حضرت شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ آگے تحریر کرتے ہیں۔

"و معلوم گردد کہ ائمہ دین و اکابر اہل یقین مختلف بودہ اند در آں اما عبد اللہ بن جعفرؓ سماع غنا از وے مستفیض و مشہورست۔ و نقل کردہ است آنرا ہر کہ امعان کردہ است دریں مسئلہ از فقہا و حفاظ و ارباب تواریخ و ابن عبد اللہ در استیعاب گفتہ نمی دید وے بہ غنا باسے و بود امیر المومنین در آں زمان عم وے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ وے میرفت وےؓ درخانہ جمیلہ از مغنیات بود و سوگند خوردہ بود۔ کہ تغنی نہ کند برائے ہیچ کسے مگر درخانہ خود۔ پس تغنی کرد برائے وے۔ خواست کہ بیاید درخانہ وے و بشنواند اورا و کفارات دہد از یمین خود پس منع کرد وےؓ او را از آں و گفتہ اند کہ بودند مر عبد اللہ بن جعفرؓ را جوارے کہ تغنی میکردند و عودے زد برائے وے۔ و آوردہ اند کہ سعید بن المسیبؒ کہ افضل تابعین است وردہ مے شد بوے مثل در ورع مے شنید غنا را و مستلذمے شد بغنائے آں و ہم چنیں سالم بن عبد اللہ بن عمرؓ و قاضی شریح مے شنید غنا از کنیزکان با جلالت قدر اکبر سن وے۔ و سعید بن جبیرؒ کہ از اعاظم تابعین است شنیدہ از جاریہ کہ تغنی میکرد و دف میزد و ہم چنیں عبد الملک بن جریح کہ از علمائے و حفاظ و فقہا و عباد اجماع است بہ عدالت و جلالت وے مے شنید غنا را وے وانست الحان را۔ و ابراہیم بن سعد مردے بود امام عصر خود درفقہ و روایت نمے شنوانند ایشاں را غنا و فتویٰ داد در مجلس رسید بہ تحلیل غنا"۔

حضرت شیخ محدث رحمتہ اللہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اصحابؓ رسول ﷺ تابعین، تبع تابعین، علماء، زھاد اور اتقیاء نے سماع، غنا اور سرود کو سنا ہے۔

اور ان میں وہ اصحاب کبار رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں جن کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ حضرت شیخ کی مذکورہ بالا عبارت میں حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کا واقعہ بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک گانے والی عورت نے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنے گھر سے باہر ہرگز گانا نہیں سنائے گی۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی اس کے گھر آگیا تو گانا سنائے گی ورنہ نہیں۔ اسی عورت کو جناب امیر المومنین علی علیہ السلام نے کہلا بھیجا کہ آکر سرود کی محفل سجائے۔ چنانچہ اسی عورت نے عرض داشت پیش کی کہ "امیر المومنین علیہ السلام میں نے اپنے گھر سے باہر گانے اور سرود وغیرہ سنانے سے قسم کھائی ہے البتہ اگر امیر المومنین علیہ السلام مجھے خواہ مخواہ بلانا چاہتے ہوں تو حاضر ہو کر قسم کا کفارہ ادا کروں گی" لہٰذا امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا کہ "قسم توڑنے کی کوئی ضرورت نہیں اسے مت توڑو" چنانچہ خود اس کے گھر تشریف لے گئے اور اس کے سرود کو سماعت فرمایا (فسبحان الله العظیم) شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ نے ان تمام بزرگوں کے اسمائے گرامی کے ساتھ ان کی صفات بھی تحریر فرمائی ہیں لہٰذا سب کے ناموں کو دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں یا وہ جن کے اسمائے گرامی دوسری معتبر کتابوں میں مذکوہ ہیں جنہوں نے سماع کو سنا ہے بلکہ حضرت ابراہیم بن سعد رحمتہ اللہ علیہ تو اپنے وقت کے امام تھے اور انہوں نے سماع کے جواز کا باقاعدہ فتویٰ جاری کیا تھا اور یہ بات حضرت شیخ محدث کے مذکورہ بالا بیان سے بھی ثابت ہے۔

اسی طرح حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما نے تو ساز و آواز سماعت فرمانے کے لئے باقاعدہ ایک باندی رکھ لی تھی۔ اور ان کے علاوہ چند دیگر اعاظم دین اور انتہائی قابل احترام اصحابؓ رسول ﷺ کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ بن عفان، عبد الرحمان بن عوفؓ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ اور پانچوں عشرہ مبشرہ میں شامل تھے۔ ان کے بعد تابعین ہیں اور تابعین وہ بزرگ ہستیاں ہیں جنہیں صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھنے کا شرف حاصل تھا اور انہی سے علم حدیث حاصل کیا تھا۔ انہوں نے احادیث کو جمع اور نشر کیا تھا اور جن کو علم حدیث میں سند کا درجہ حاصل تھا۔

امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا سماع سننا اور احناف میں اس کا جواز

اس ضمن میں سب سے پہلے صاحب حدایہ کی عبارت پیش کی جاتی ہے لکھتے ہیں:

قال فی الهدایته فی الکراهته من دعٰی الی ولیمته اوطعام فوجد لهوا" اوغناء" فلا باس ان یقعد ویاکل قال ابوحنیفه ابتلیت بهذا مرة فصبرت۔ قال صاحب الهدایته دلت المسئلته علی ان الملاهی کلها حرام حتی الغناء یضرب قصب و بهذا قال ابوحنیفه ابتلیت لان الابتلاء بالمُحَرم۔

یعنی حدایہ میں ہے کہ اگر کہیں دعوت ہوئی ہو، ولیمہ یا کوئی دوسری ضیافت ہو اور اس کے ساتھ سماع و سرود بھی ہو تو اس کے سننے میں کوئی حرج نہیں اور یا روٹی بھی کھائی جائے۔

امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اسی طرح کی ایک محفل میں، میں مبتلا ہو گیا تھا لیکن میں نے صبر اختیار کیا اس پر حدایہ کا قول ہے کہ حضرت امام حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول سے ظاہر ہے کہ ملاھی بحیثیت کلی حرام ہے چنانچہ اسی لئے حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں "مبتلا" ہو گیا۔ کیونکہ ابتلا حرام کی وجہ سے

رسالہ مولد میں بھی یہی معنے کئے ہیں اور یہی معنے مندرجہ بالا حدیث کے مطابق ہیں اور جس طرح یداللہ فوق ایدیھم سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ کا ہاتھ حق تعالیٰ کا دست مبارک ہے بعینہٖ آپ ﷺ کا دیکھنا بھی حق تعالیٰ ہی کو دیکھنا ہے (اسی طرح) قرآن کریم کی تلاوت باصرہ عبادت' علماء و صلحاء کے چہروں کو دیکھنا اور بزرگوں کی زیارت ان سب سے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے اور یہ بات مشہور ہے (چنانچہ) مولانا عبد العزیز رحمتہ اللہ نے اپنی تفسیر عزیزی میں لکھا ہے :۔

و آنکہ تعلق بہ چشم دارد۔ دیدن مشاہدہ خیر مثل کعبہ شریف و قرآن مجید' و دیدن بزرگان مثل انبیاء علیہم السلام و اولیاء و زیارت قبور شہدا و صالحین کہ جان خود رادر راہ خدا باختہ اندو۔ اوقات عزیز خود را دریاد او گزرا نیندہ

وہ (عبادات) جو آنکھوں سے تعلق رکھتی ہے مشاہد خیر کو دیکھنا ہے۔ مثلاً خانہ کعبہ کو دیکھنا اور قرآن مجید کو دیکھنا (تلاوت بھی) نیر بزرگوں مثلاً" انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رحمتہ اللہ علیہم' شہدا اور صلحا کی قبروں کی زیارت کرنا جنھوں نے اپنی جانوں کی قربانی دی ہوتی ہے اور اپنے عزیز وقتوں کو حق تعالیٰ کی یاد میں گذارا ہوتا ہے۔

اور حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ المومن مراۃ المؤمن" مومن (دوسرے) مومن کا آئینہ ہے اور اس حدیث کے معنے جو ہمارے بزرگوں نے لکھے ہیں وہ یہ ہیں کہ مومن کے ایک معنے "صاحب ایمان" کے ہیں۔ دوسرے معنے ظاہر ہے

---

(۱) غالباً" یہ اشارہ سورہ اعراف کی اس ایت کی طرف ہے و تراھم ینظرون الیک وھم لا یبصرون اور ان کو آپ دیکھتے ہیں کہ گویا وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے (سورہ اعراف یات نمبر ۱۹۸) (مترجم)

الاموال والانفس والثمرات .... البقرہ ایت ۱۵۵

اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کرکے تمہاری آزمائش کریں گے (۱) اس ایت مبارک میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "میں تمہیں ضرور مبتلا کروں گا، خوف و فاقہ اور نقصان مال سے (۲) آزمائش کے لئے" اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

البلاء لاالانبیاء ثم لاالاولیاء ثم لاالمومنین۔

یعنی بلا یا ابتلاء انبیاء کے لئے ہے ان کے بعد اولیاء کے لئے اور ان کے بعد مومنین کے لئے ہے (اب غور کرنا چاہیے) کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے

---

(۱) اگر کوئی یہ کہ دے کہ اس کے معنے یہ ہونے چاہیے کہ میں تمہیں نقص مال اور خوف و خطر سے آزماؤں گا وغیرہ تو یہ معنے وہاں درست ہوں گے۔ کہ خطاب مومنوں سے ہے جبکہ ہمارے بیاں سے بھی ثابت ہے کہ اسی ایت میں لفظ ابتلاء سے مراد آزمائش ہی ہے مگر یہی لفظ ابتلا جہاں کہیں بھی کفار کے بارے میں آیا ہے تو اس کا مقصد و مفہوم عذاب الہیٰ ہے ترجمہ کرتے وقت ہم مجاز ہیں کہ ہر ایت کے سب سے پہلے لفظی معنے بیان کریں اور اس کے بعد دوسرے معنوں کو لیں۔ اگر چہ وہ لغوی ہوں یا اصطلاحی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس ایت شریف کے لفظی معنے بیان کئے ہیں (مولف)

(۲) اس سے قبل مترجم نے مولانا مودودی مرحوم کا ترجمہ پیش کیاہے میرے خیال میں مولانا کا ترجمہ بھی بابا کے مقصد کو پورا کرتا ہے تاہم تسلسل کے پیش نظر یہاں پر بابا کے پشتو الفاظ کو بھی اردو میں منتقل کر دیا ہے تاکہ حضرت بابا کا اصل مطلب فوت نہ ہو (مترجم)

یہ فرمایا کہ "میں مبتلا ہو گیا" تو عین ممکن ہے کہ اس وقت امام صاحب کسی ایسے خیال میں ہوں جو سرود سے بہت ہی اعلیٰ و ارفع ہو اور ہو سکتا ہے سرود سے اس میں نقصان آتا ہو۔ چنانچہ اسی لئے حضرت امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے "ابتلاء" کا لفظ استعمال کیا ہو۔ جس کا مفہوم یہاں بھی آزمائش ہی ہے۔ یا ایسا سمجھ لینا چاہیے کہ اس وقت امام صاحب جس حالت میں تھے اس کے مقابلے میں سماع کی محفل میں بیٹھنا ان کے نزدیک گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے

سیئات الابرار حسنات المومنین

نیک لوگوں کے گناہ عام مومنوں کی نیکیاں ہیں

(یاداشت:یہ بات ہم نے ایسی سنی ہے کہ حسنات الابرار سیات المقربین۔ یعنی نیکوں کی اچھائیاں مقربین الٰہی کے نزدیک گناہوں میں شامل ہیں۔ بہرحال مطلب ایک ہی ہے مترجم)

یہ امام صاحب کے لئے آزمائش یا امتحان کا وقت تھا۔ مگر چونکہ سماع ان کے نزدیک حلال تھا اس لئے صبر سے کام لیا۔ اور بالفرض اگر وہ اس کو حرام سمجھتے اور اس کے باوجود بیٹھے ہوتے تو یہ ان کے تقویٰ اور ورع کے خلاف ہوتا۔ کیونکہ جو شخص علم و دانش کے باوجود کسی حرام کام پر اصرار کرے تو ہمارے خیال میں ایسا شخص امام تو کیا مسلمان بھی نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا صاحب حدایہ کا مذکورہ بالا قول نہ صرف مردود بلکہ حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ پر ایک طعن کے برابر ہے جبکہ انہیں صاحب حدایہ نے "باب الغزا" میں تحریر کیا ہے:۔

طلبل الغزا والدف الذی یباح ضربه فی العروس یضمن باتلافه من غیر خلاف

یعنی جہاد و نکاح (شادی) کے موقعوں پر نقارہ اور دف بجانا مباح ہے۔ اب جبکہ

یہ چیزیں مباح ہیں اور خصوصی طور شادی بیاہ کے موقعوں پر جائز ہیں تو امام صاحب نے بھی تو شادی ہی کے موقع پر سنی تھی۔ صاحب ھدایہ نے بھی اس کو ولیمہ میں حلال تسلیم کیا ہے تو پھر امام صاحب پر اعتراض کے کیا معنے۔ یہاں پر اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ تم نے (مولف نے) تو یہ کہا ہے کہ سیات الابرار حسنات المومنین۔ تو جب امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ اسی ضیافتہ میں ایسے "حال" میں تھے جس کے مقابلے میں سرود اگر مباح بھی ہو مگر پھر بھی گناہ کے زمرے میں آتا تھا۔ اس کے باوجود یہ بھی کہتے ہو کہ اگر امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ اس امر کو حرام سمجھتے تو محفل میں نہ بیٹھتے تو اس کا تمہارے پاس (مولف کے پاس) کیا جواب ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے زمانے کے مقتدا تھے اور اگرچہ اس وقت سرود ان کے لئے مفید نہ تھا مگر عوام کے لئے تو مباح تھا جبکہ امام صاحب نے خود بھی اپنی کتابوں میں ایسے موقعوں پر مباح کہا ہے تو اگر وہ نہ بیٹھتے یعنی شریک محفل نہ ہوتے تو لامحالہ ان کے قول و فعل میں تضاد واقع ہوتا اور لوگ بھی ان کے بارے میں شک کرتے مگر چونکہ عندالشرح یہ کام حرام نہیں تھا اس لئے انہوں نے صبر سے کام لیا اور ان کی باطنی حالت جو کچھ اور جیسی بھی تھی اس کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں کہ وہ حالت بدل گئی تھی یا بحال رہی۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اپنے رسالہ "مسئلہ سماع و وحدۃ الوجود" میں تحریر کیا ہے:۔

> حجتہ الاسلام امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ در احیاء العلوم گفتہ کہ احادیث حرمت غنا کہ وارد اند محمول اند برآں کہ مراد شیطانی ازول برآرد۔ نہ محبت خدائے آرد۔ آں فعل بذاتہ مباح است۔ چنانچہ روز عید و وقت نکاح و قدوم غائب' طعام ولیمہ و ولادت

مولود و در عقیقہ و ختنہ و روز حفظ تمام القرآن و مانند آں۔ و ایں قول را اکثر علمائے حنیفہ اختیار کردہ اند۔

حجتہ الاسلام امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ حرمت غنا کی احادیث اس غنا کی حرمت پر محمول ہیں جو دل میں خدا کی محبت کو زیادہ نہ کرے اور شیطانی مراد کو مزید ابھارے کیونکہ جو غنا خدا کی محبت میں اضافہ کرتی ہے وہ مباح ہے جیسے عید کے دن' نکاح کے وقت' غائب کی واپس رسیدگی پر' ولیمہ کی تقریب میں' بچے کی پیدائش پر' عقیقہ و ختنہ' حفظ و ختم القرآن یا اسی طرح کے دوسرے مواقع پر سننا جائز ہے اور اسی قول کو علمائے حنفیہ نے اختیار کیا ہے"

اسی طرح خزانہ و کافی میں بھی تحریر ہے۔

وفی الخزانته والکافی حرمت الغناء و غیرھا مقید باللھو فمایکون لغیر اللھو بغرض الدین کما فی العرس والولیمته و اسعد اذا ا الغزاۃ والقافله والحصول رقته قلوب عباداللہ المرضیه عند اللہ لاتکون حراما علی مذھب حنفیه"

"خزانہ و کافی میں تحریر ہے کہ غنا یا سرود کی حرمت لھو یعنی حرامکاری کی خواہشات کے ساتھ مقید ہے اور وہ امور جو لھو (حرامکاری کی خواہشات) میں شمار نہیں ہوتے مثلاً" عرس' شادی ولیمہ' جہاد کے لئے غازیوں کی تیاری کے وقت' قافلہ کی روانگی یا آمد کے وقت' دل میں رقت (نرمی) پیدا کرنے کے لئے اور اللہ تعالٰی کے ان

بندوں کے لئے جن سے خدا راضی ہو (یعنی صوفیہ کرام) ان سب کے لئے سرود کا سننا مذہب امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے رو سے حرام نہیں ہے"

علاوہ ازیں امتاع میں لکھا ہے کہ:۔

وفی الامتاع ان السماع یحصل به رقه القلب والخشوع و آثارة الشوق لقاء الله والخوف من سخطه و عذابه وما یفضی الی ذالک قربه واذا کان السماع هکذا فکیف یکون فیه شائبته اللهو والهواء۔

او رامتاع میں لکھا ہے کہ جس سرود و سماع کے ساتھ دل میں نرمی و خوف پیدا ہوتے ہوں اور حق تعالیٰ کی قربت میں اضافہ ہوتا ہو اور غضب و عذاب الٰہی سے ڈرنے کا خوف پیدا ہو تو اس قسم کا سرود عبادت ہے تو جس وقت اس قسم کا سرود سنا جا رہا ہو تو ایسے شخص پر لھو اور حرام کی خواہش کا احتمال کیسے ہو سکتا ہے۔

یاد رہے کہ میں یہ مستند اقوال حنفی مذہب کی معتبر کتابوں سے پیش کر رہا ہوں۔ کیونکہ ہمارے اکثر پختون ملا صاحبان کہتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب میں سماع و سرود کی اباحت ثابت نہیں ہے۔ اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ اگر یہ ملا صاحبان تعصب کو درمیان سے ہٹا دیں اور مندرجہ بالا حوالہ جات کو غور سے ملاحظہ فرمالیں تو انشاء اللہ ان کی تسلی کے لئے یہ کافی ہوں گے۔

حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی قدس اللہ سرہ العزیز جو اکابرین علماء اور روسائے اولیاء میں سے ہیں اپنی عظیم القدر تصنیف "عوارف المعارف" میں لکھتے ہیں کہ السماع یستجلب الرحمته من الله الکریم یعنی سماع (سرود) کے سننے سے خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے اور حضرت شیخ کا یہ قول تواتر کی ایک شان

رکھتا ہے چنانچہ جناب زبدۃ العارفین حضرت حلیم گل بابا رحمتہ اللہ علیہ ابن حضرت شیخ رحمکار المعروف کاکا صاحب رحمتہ اللہ علیہم نے اپنی کتاب "مقامات و مقالات قدریہ" میں لکھا ہے کہ جس وقت مرشد کامل بیٹھا ہو اور اس کی موجودگی میں سماع ہوتی ہو تو اس مجلس پر فرشتے اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل کرتے ہیں۔ اور جتنی دیر تک سماع کی یہ محفل جاری رہتی ہے رحمت الٰہی کی بارش بھی جاری ہوتی ہے حضرت حلیم گل بابا رحمتہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

> نقل است از فوائد الفواد کہ فردائے قیامت یکے را فرمان شود کہ در دنیا سماع شنیدی۔ گوید الٰہی شنیدم! فرمان آید کہ بیتے کہ مے شنیدی براوصاف ماتحمیل کردی؟گوید آری! فرمان آید کہ آن تحمیل کردن تو حادث و اوصاف ما قدیم۔ تحمیل حادث برقدیم چگونہ رواباشد۔ آں بندہ گوید الٰہی ازغایت محبت تحمیل کردم فرمان شود کہ چوں بما تحمیل کردی بر تو رحمت کردیم"

"فوائد الفواد سے نقل کیا جا رہا ہے کہ کل قیامت کے روز ایک شخص سے پوچھا جائے گا کہ تم نے دنیا میں سماع سنی تھی وہ بندہ خدا عرض کرے گا کہ ہاں سنی تھی پھر خدا کا فرمان ہو گا کہ جو شعر تم سنا کرتے تھے تو وہ میرے اوصاف پر تحمیل کیا کرتے تھے۔ وہ بندہ عرض کرے گا کہ ہاں تحمیل کیا کرتا تھا اس کے بعد فرمان الٰہی ہو گا کہ تمہاری تحمیل تو حادث تھی اور میرے اوصاف قدیم چنانچہ حادث کی تحمیل قدیم پر کسی طرح جائز ہو سکتی ہے۔ تو وہ بندہ عرض کرے گا کہ الٰہی تیرے ساتھ انتہائی محبت رکھنے کی وجہ سے ایسا کیا تھا تو حق تعالیٰ کا فرمان ہو گا کہ چونکہ یہ تحمیل تم نے میرے ساتھ محبت کی وجہ سے کی تھی تو جاہم نے تم پر رحمت نازل

فرمادی۔

حضرت حلیم گل بابا آگے فرماتے ہیں :۔

"ابو طالب مکی رحمتہ اللہ علیہ فرمودہ است از عبد اللہ بن جعفرؓ و معاویہ و دیگر اصحاب شنیدہ ام۔ کہ کسے سرود را انکار کرد ہفتاد صدیقان را انکار کرد"

یعنی حضرت ابوطالب مکی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ و معاویہ اور دیگر اصحاب رسول ﷺ سے سنا ہے کہ جس نے سرود (سماع) سے انکار کیا اس نے ستر صدیقوں سے انکار کر دیا۔

مزید برآں حضرت پیران پیر دستگیرؒ نے سرالاسرار میں یہ حدیث شریف نقل کی ہے:۔

من لا وجد لہ لا دین لہ

"جو صاحب وجد نہ ہو گا اس کا کوئی دین نہ ہو گا"۔

یعنی جو کوئی صاحب وجد و سماع نہ ہو گا اس کا کوئی دین نہ ہو گا یہاں پر میں نے لفظ "سماع" بھی وجد کے ساتھ اس لئے تحریر کیا ہے کہ انہوں نے یہ حدیث پاک سماع ہی کے سلسلے میں نقل کی ہے اور حضرت خواجہ خواجگان عالیشان خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ سماع کے حق میں فرماتے ہیں۔

"نہ انکار کنم و نہ ایں کار کنم" یعنی نہ تو سماع کا انکار کرتا ہوں اور نہ ہی یہ کام کرتا ہوں" چونکہ ان کا طریقہ بدرجہ کمال سنت پر تھا اور اُن کو یقین تھا کہ آنحضرت اور صحابہ کرامؓ کا سماع سننا معمولات میں شامل نہ تھا یعنی ہر وقت نہیں سنا کرتے تھے اس لئے فرمایا کہ یہ کام نہیں کرتا تاہم سماع کی حرمت ان کے نزدیک بھی صحیح نہ تھی یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے یہ فرمایا کہ سماع سے انکار نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ اگر

آپ سماع کو حرام سمجھتے تو یقیناً" صاف انکار کرتے اور اسی طرح ایک برے اور حرام فعل سے لوگوں کو بھی منع کرنے کی تلقین فرماتے۔

قارئین کرام غور فرمائیں کہ مندرجہ بالا روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سماع تین اقسام یعنی مستحب، مباح اور حرام پر مشتمل ہے۔۔ قطع نظر اس کے اگر اب بھی بعض لوگ اس بات پر اصرار کرتے ہوں کہ سماع حرام قطعی ہے تو ایسے حضرات کے لئے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے رو سے ایک ایسی روشن دلیل پیش کرنا چاہتا ہوں جو ایسے لوگوں کی تسلی و تشفی کے لئے یقیناً" کافی ہو گی اور اگر اس کے بعد بھی یہ لوگ اپنے انکار پر مصر ہوں تو ان کی مرضی اور اس کا کوئی علاج نہ ہو گا۔

غور فرمایئے شراب از روئے نص قطعی طور پر مطلق حرام ہے اور حضور انور ﷺ نے فرمایا کہ وما اسکر کثیرة فقلیلة حرام ترجمہ: نشہ آور شے خواہ کم ہو یا زیادہ حرام ہے اور شراب کی صدہا قسمیں ہیں (بخدا یہ حدیث مبارک تمباکو پر محمول نہ کریں کیونکہ یہ محض شراب کے بارے میں ہے) بہر حال قرآن و سنت کے رو سے شراب بالاتفاق حرام ہے۔ اب امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب کے رو سے اس کی تفصیل" ملاحظہ فرمایئے فقہ حنفی کی مشہور کتاب ھدایہ کے باب "کتاب الاشربہ" میں لکھا ہے کہ

النبیذ العسل والتین والشعیر
حلال عند ابی حنیفتہ واذ کان
من غیر لھو و طرب۔

یعنی" وہ شراب جو شہد، انجیروں اور جو (شعیر) سے کشید کی گئی ہو امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزد حلال ہے۔ اس حال میں کہ ان کے ساتھ حرام کے کھیل تماشے شامل نہ ہوں" مراد یہ کہ اگر طاقت لانے یا دواء کے طور پر استعمال ہوں تو یہ سب

جائز ہیں اور صاحب در مختار کا قول ہے کہ صاحب ھدایہ نے کہا ہے کہ اگر کوئی نکسیر پھوٹنے کے مرض میں مبتلا ہو اور خون یا بول (پیشاب) سے ایسے مریض کی پیشانی پر فاتحہ شریف لکھ دی جائے تو علاج و صحت کے خاطر یہ جائز ہے چنانچہ اس مقام پر قابل غور بات یہ ہے کہ بول و براز اور خون تو قرآن کے حکم سے ناپاک ہیں مگر ایسی واضح پلید اشیاء پر بھی صحت و علاج کی خاطر فاتحہ کا لکھنا جائز سمجھا اور مانا گیا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ چنانچہ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بخدا اگر صوفیہ حضرات بھی دل کی بیماری کے علاج اور اپنی روح کی تقویت کے لئے سماع و سرود سماعت فرماتے ہوں تو کوئی شک نہیں کہ ان کا ایسا کرنا بدرجہ اولیٰ جائز و حلال ہو گا۔ البتہ مطلق سماع تو نص کے روسے بھی حرام ہے۔ اسی طرح شراب و پیشاب اور خون بھی مطلق حرام و پلید ہیں (مگر علاج و صحت کے لئے جائز ہیں) اب اگر دوائی اور علاج کے لئے کوئی سماع و سرود بھی سنے تو کیونکر اور کیسے حرام کہلائے جائیں۔ تعجب یہ ہے کہ جب اس قسم کے معترضین کے اعتراض کا وفعیہ کیا جاتا ہے (اور ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہتا) تو کہہ دیتے ہیں کہ "ارے صاحب! ایسے لوگ اب اس دنیا میں کہاں ہیں جو سماع کے لائق ہوں"۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ بقول ان کے یہ دنیا اہل حق اولیاء سے یکسر خالی ہے۔ چنانچہ جب ان کو کسی ولی اللہ کی نشاندہی کی جاتی ہے تو اس پر نکتہ چینیوں اور اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔ اور فی الحقیقت ایسا اس لئے ہے جیسا کہ ہم نے تصوف کے بیان میں صراحت کی ہے کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت سے بے بہرہ اور محروم ہوتے ہیں۔ اس لئے اولیاء کے فیض سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اس زمانے میں تو کیا قرون اولیٰ میں بھی کسی کو ولی اللہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے یہ مگر حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

لا یزال من امتی امتہ قائمتہ بامر اللہ لا یضرھم

من خذلهم ولا من خالفهم۔

یعنی میری امت میں ہمیشہ کے لئے ایک گروہ ایسا ہو گا جو خدا کے حکم سے قائم ہو گا ان کو کسی کی مخالفت یا موافقت سے کوئی نقصان نہ ہو گا (نہ پروا)۔

اور فرمان نبوی ﷺ ہے کہ:۔

مثل امتی کمثل المطر لایدری اولها خیرا و آخرھا"۔

یعنی میری امت کی مثال بارش کی طرح ہے جس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی شروع (ابتداء) اچھی تھی کہ آخر (انتہا) اچھی تھی"۔

جہاں تک اہل وجد کا تعلق ہے تو ان کے بھی تین اقسام ہیں پہلی قسم کو اہل کمال کہا جاتا ہے ان کے قلوب میں حق تعالیٰ اپنے بے کیف وجود کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ یہ لوگ بے اختیار ہوتے ہیں اور یہی لوگ حزب اللہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سے انکار دین میں خرابی کا باعث ہوتا ہے (کیونکہ) حدیث قدسی میں وارد ہے کہ:۔

من عادی ولیا فقد اذنته بالحرب (متفق علیہ)

"یعنی جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی روا رکھی اس نے (گویا) میرے ساتھ جنگ کا اعلان کر دیا"۔

یہ متفق علیہ حدیث قدسی صحیحین میں موجود ہے۔ بہر حال ان کی دوسری قسم وہ حضرات ہیں جو استدعائے حال کے لئے سماع کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کی چاہت یہ ہوتی ہے کہ مجاہدہ اور کوشش سے ان پر "حال" وارد ہو۔ یہ پیارے اور اچھے لوگ ہوتے ہیں اور ان کی ایک تیسری قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے جو مرائی ہوتے ہیں یہ ریاکاری اور تکلف کے ساتھ ... کرتے ہیں۔ یہ فاسق لوگ ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ریا اور تکلف کا وجد دو اقسام پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ ایسے شخص کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنی بزرگی اور حال ظاہر کر دے اگر چہ

حقیقت میں نہ وہ بزرگ ہوتا ہے اور نہ صاحب حال! لہٰذا یہ وجد قابل مذمت ہے۔
اس کی دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو کسب کے طور پر کوشش کرتے ہیں کہ یہ حالت اس پر وارد ہو۔ کیونکہ اس معاملے میں کسب کو بھی دخل حاصل ہے۔ اسی لئے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تلاوت کلام پاک کے وقت رونا نہ آتا ہو تو کم از کم رونے والے کی صورت اختیار کر۔ چنانچہ اگر کسی طور پر ابتداء میں یہ حال تکلفاً بھی وارد ہو مگر آخر میں اصلی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور مناسب یہ ہے کہ ایسے افعال سے انکار نہ کیا جائے اور ہر مسلمان کے بارے میں نیک خیال رکھنا چاہیے

فرمان خداوندی ہے:۔

لولا اذ سمعتموہ ظن المومنون بانفسہم خیرا.......

سورہ نور ایت ۱۲

جب تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے اپنے آپس والوں کے ساتھ نیک گمان کیوں نہ کیا.........۔

اور نیز فرمان الٰہی ہے کہ ان بعض الظن اثم...... الحجرات ایت ۱۲ (یعنی بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں) مراد یہ کہ جب تک صحیح بات نہ سنی ہو تو مسلمان مرد و عورت کے متعلق نیک گمان رکھنا چاہیے۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ کسی دوسرے پر بدگمانی آدمی کو فاسق بنا دیتی ہے۔ اگر چہ وہ دوسرا فاسق نہ بھی ہو۔

یہاں یہ بات انتہائی اہم ہے کہ حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ نے خود بھی سماع کو سنا ہے اور اس کا ثبوت ہم شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب مدارج سے پیش کرتے ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ کا سماع سننا۔

حضرت شیخ محدث مدارج میں لکھتے ہیں:۔

نقل کردہ اند کہ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ راہمسایہ بود کہ برشب میخواست و تغنی میکرد و امام گوش میداشت بہ تغنی او۔ نہ شنید شے اواز او را۔ پس پرسید از اہل وے چہ شد کہ شنیدہ نہ شود آواز وے۔ گفتند بیروں آمدہ بود وے امشب۔ پس گرفتند و درزندان کردہ اند۔ پس پوشیدہ امام عمامہ۔ خود را و برفت نزد امیرو شفاعت کرد۔ و او را خلاص گردانید۔ پرسید امیر کہ نام اوچیست۔ گفتند کہ عمر۔ پس برآور داز زندان ہر کرا عمرنام بو و گفت امام بہ آں مرد کہ بازگر آنچہ میکر دی ہر شب چوں گوش داشت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بہ غنائے او و نہی نہ کرد او را۔ دلالت بہرا باحت تغنی نزد وے و استماع وے ہر شب بہ آں ورع و تقویٰ کہ وے داشت حمل نمے تواں کرد مگر بہ اباحت۔ پس آنچہ وارد شدہ ازوے برخلاف آں حمل کردہ شود برغنائے مقترن بہ فحش از برائے جمع میان قول و فعل و حال آنکہ گرفتہ نہ شدہ ست تحریم از مقتضائے فعل وے مگر نص قول وے چنانکہ رفت در ولیمہ کہ در وے غنا بود و مانند آں۔

"یعنی حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا ایک ہمسایہ تھا جو ہر رات کو سرود بجایا کرتا تھا ایک رات اس کے گانے بجانے کی آواز نہیں سنی گئی۔ کیونکہ حضرت حضرت امام ہر شب باقاعدہ سنا کرتے تھے چنانچہ اس کے گھر والوں سے پوچھا کہ اس کی اواز کیوں نہیں سنی گئی۔ گھر والوں نے کہا کہ وہ باہر گیا تھا اور رات کو پکڑا گیا ہے۔ اور جیل خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ لہٰذا امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا عمامہ سر پر رکھا اور اسے رہا کرانے کے لئے امیر کے پاس تشریف لے گئے۔ امیر نے پوچھا کہ اس کا کیا نام ہے۔ فرمایا کہ عمر! پس امیر نے ہر اس آدمی کو رہا کیا جس کا نام عمر تھا۔ جب مغنی عمر رہا ہو گیا تو امام رحمتہ اللہ علیہ نے اس سے کہا کہ جا اور وہی کر جو تم کیا کرتے تھے

(کیونکہ امام ہر رات کان لگا کر سنا کرتے تھے) اور اسے منع نہ کیا۔ یہ امام رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اباحت کی دلیل ہے۔ جبکہ وہ اپنے انتہائی تقویٰ اور ورع کے ساتھ ہر شب کو یہی سرود سماعت فرمایا کرتے تھے اور اس کو سماع و سرود کی اباحت پر محمول کرنا چاہیے اور جو کچھ ان سے سماع کے برخلاف وارد ہوا ہے وہ فحش اور حرام سماع پر محمول ہے۔ کیونکہ حرمت تو نص کے مطابق لی گئی ہے اور بعدہ فعل سے تو امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا یہ فعل ظاہر ہے اور حرمت کے بارے میں نص نہیں۔ جبکہ امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا فعل ایک ولیمہ میں بھی ظاہر ہوا تھا جس میں سماع کا اہتمام تھا"۔

یہ ولیمہ کی وہ دعوت تھی جس کا ذکر ہم نے گزشتہ اوراق میں بھی کیا ہے اور ہدایہ کے ملا صاحب کی رائے کی تردید بھی شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول سے ہو گئی اور اب یہ بات صاف طور پر سامنے آگئی کہ حنفی مذہب میں سماع بالکل جائز ہے۔

امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کا سرود سننا۔

امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگردوں میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ آپ مجتہد فی المذہب تھے۔ مدارج کے حوالے سے امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کا سرود سننا بھی ثابت ہے۔ حضرت شیخ محدث تحریر فرماتے ہیں۔

"حکایت کردہ است ابن قتیبہ کہ ذکر کردہ شدہ نزد ابی یوسف رحمتہ اللہ علیہ مسئلہ غنا۔ پس ذکر کرد قصہ جابرؓ و ابوحنیفہؒ و حکایت کردہ شد است از امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ بسا کہ حاضر شد مجلس ہارون رشید راوے مے بود روئے غنا پس مے شنید و میگریست"۔

یعنی ابن قتیبہ سے روایت ہے کہ امام ابویوسف سے غنا کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے حضرت جابرؓ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کا حوالہ دیا اور امام ابویوسف رحمتہ

اللہ علیہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ عموماً" ہارون رشید کی مجلس میں حاضر ہوتے رہتے تھے اور سرورد سنا کرتے تھے اور سنتے وقت رویا کرتے تھے"۔

حضرت امام ابویوسف کا سرود سنتے وقت رونا ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنے دل کو نرم کرنے کے لئے سرود سماعت فرمایا کرتے تھے اور یہی ہمارا مطلب ہے کہ ایسی غنا عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔

حضرت امام داؤد طائی کا سماع سننا۔

حضرت امام داؤد طائی کے متعلق مدارج میں تحریر ہے:۔و حکایت کردہ انداز داؤد طائی کہ وے حاضر شد سماع را۔ و راست مے شد پشت او در سماع بعد ازاں کہ منحنی شدہ بوداز کبر سن۔ و بود وے رحمتہ اللہ علیہ عالم فقیہہ حنفی تلمیذ امام اعظم کوفی رحمتہ اللہ علیہ" یعنی حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے کہ وہ سماع کی محفل میں شامل ہوا کرتے تھے۔ دوران سماع ان کی جھکی ہوئی کمر سیدھی ہو جاتی تھی جو بڑھاپے کی وجہ سے جھلک گئی تھی۔ حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ فقہ حنفی کے بہت بڑے عالم تھے اور حضرت امام اعظم کوفی رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد تھے"۔

حضرت شیخ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق صرف اسی قدر تحریر کیا ہے جبکہ دیگر کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ انہوں نے کچھ علم امام یوسف رحمتہ اللہ علیہ سے بھی حاصل کیا تھا ہارون الرشید نے ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ کا وسیلہ اختیار کیا تھا (۱) ایک بار امام ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ

---

(۱) غالباً" یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ حضرت ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کے استاد حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ نے ہارون الرشید کی طرف سے چیف جسٹس شپ کا عہدہ قبول نہیں کیا تھا مگر ابو یوسف رحمتہ اللہ نے قبول کیا۔ (مترجم)

حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں تشریف لے گئے اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ
حضرت داؤد طائی کی طرف بڑھایا مگر انہوں نے ہاتھ نہ ملایا اور فرمایا کہ انہی ہاتھوں سے
تم ہارون الرشید کے دستر خوان پر روٹی کھاتے ہو۔ امام ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ نے یہ
سنا تو خوب روئے اور فرمایا کہ جو علم تم نے مجھ سے سیکھا ہے اس کی حرمت سے میری
یہ بات منظور کر لو اور ہارون الرشید سے ملاقات کرنے پر راضی ہو جاؤ۔ حضرت داؤد
نے یہ شرط رکھ دی کہ یہ ملاقات رات کے وقت اندھیرے میں ہو۔ چنانچہ ابویوسفؒ
ہارون الرشید کو لے کر حضرت کے گھر چلے گئے ہارون نے حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ
علیہ کی خدمت میں ایک ہزار دینار پیش کئے اور کہا کہ یہ بالکل حلال ہیں۔ مگر انہوں
نے فرمایا کہ "مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں"۔ ہارون نے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا
کہ میرے بعد میرے سلسلے کے لوگ سند کے طور پر اس واقعہ کو بیان کریں گے کہ
داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ نے "بادشاہ" کی نذر قبول کی تھی۔ اس لئے میں اس رقم کو ہر
گز قبول نہیں کروں گا۔ ابی یوسف رحمتہ اللہ علیہ نے پوچھا کہ تمہاری معاش کیا ہے۔
تو انہوں نے فرمایا کہ اپنے والد کا کچھ مال ورثے میں ملا ہے اس کو میں نے ایک بنیا
(آدمی) کے پاس رکھا ہے اور بقدر حاجت ہر روز اسی مال سے خرچ کرتا ہوں اور اس
کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ اے میرے خدا! جب یہ مال خرچ ہو جائے تو میری عمر بھی
اس کے ساتھ ختم کر دے۔ حضرت ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ نے ان کے خرچے اور
رقم کا اندازہ کیا اور روز و شب کا حساب لگاتے رہے جب ان کے خیال میں مال کا
آخری سکہ بھی ختم ہو گیا۔ تو اعلان کر دیا کہ حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ وفات پا
گئے۔ چنانچہ جب کسی شخص کو ان کی طرف بھیجا گیا کہ حقیقت حال معلوم کرے تو
واقعتاً" معلوم ہوا کہ حضرت وفات پا چکے تھے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون
مقصد صرف یہی ہے کہ حضرت داؤد طائی جیسے پرہیز گار، عالم باعمل اور ولی اللہ

بھی سماع و سرود کو جائز اور حلال سمجھتے تھے اور خود بھی سماعت فرمایا کرتے تھے۔

سبحان اللہ۔

حضرت امام مالکؒ کا سننا۔
غزل گانا اور دف بجانا۔

حضرت امام مالکؒ اپنے مذہب کے عالیشان امام ہیں آپؒ کے متعلق مدارج میں تحریر ہے:۔

پرسیدہ شد امام مالکؒ از سماع۔ پس گفت. دریافتم اہل علم را در بلاد خود کہ منکر نیستند آنرا۔ وے شنید ازاں ۔ و گفت منکر شود آں را مگر عامی یا جاہل یا عراقی غلیظ الطبع۔ وہم چنیں نقل کردہ است از وے عدالے و حکایت کردہ است اباحت را از وے امام قشیری و استاد ابومنصور و قفال وغیر ایشاں و آنچہ نقل کردہ شدہ است ازمالکؒ کہ گفت نمے شنوند آنرا مگر فاسقاں محمول نست برغنائے کہ مقتران است بوےے منکر جمعا بین القول والفعل۔

یعنی امام مالکؒ سے سماع کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے شہروں میں بہت سے اہل علم کو دیکھا جو سماع سے انکار نہیں کرتے بلکہ خود سنتے ہیں۔ امام صاحب نے مزید فرمایا کہ سماع سے انکار کرنے والا یا تو بے علم ہو گا' یا جاہل ہو گا یا غلیظ فطرت رکھنے والا کوئی عراقی ہو گا۔ اور نقل کیا گیا ہے کہ آپ امام قشیری اور استاد ابومنصور اور قفال سے سماع کی اباحت کی نقل فرمایا کرتے تھے۔ جہاں تک حضرت امام مالک کے اس قول کا تعلق ہے کہ سماع بغیر فاسقوں کے اور کوئی نہیں سنتا تو ظاہر ہے اس کا مطلب وہ غنا ہے جو فحش او رمنکرات کے ساتھ وابستہ ہو''

(ایسے سماع کو تو جاہل سے جاہل آدمی بھی جائز نہیں کہہ سکتا)

اور حضرت شیخ محدث رحؒ نے حضرت ابراہیم بن سعد رحؒ کے بارے میں لکھا ہے۔

"و پرسید از وے احوال مالک رحمتہ اللہ علیہ۔ پس گفت خبردارند مرا کہ دعوتے بود درنبی یربوع (۱) و باقوم دفوف بود و عودہا کہ غنی میکروند و لعب مے نمودند۔ بامالک رحمتہ اللہ علیہ دف مربع کہ میزد آنرا و تغنی میکرد"

یعنی ابراہیم بن سعد رحمتہ اللہ علیہ سے امام مالک رحمتہ اللہ علیہ اور سماع کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں ایک دعوت میں شامل تھا اور وہ دعوت بنی یربوع میں تھی۔ وہاں پر لوگوں کے پاس دفوف (دف کی جمع) اور ستار تھے جن کو وہ لوگ بجا بجا کر گا رہے تھے اور کھیل رہے تھے۔ اس وقت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے پاس ایک چوکور (مربع) دف تھا جس کو آپ بجا رہے تھے اور ساتھ ساتھ غزل بھی گا رہے تھے"

امام شافعی کا سماع سننا

مدارج میں لکھا ہے

"و امام مالک و شافعی گفتہ است غزالی کہ تحریم غنا مذہب او نیست و تبیع کردم چندیں از مصنفات وے را ندیدم او را بتحریم وے۔ و استاد ابومنصور بغدادی گفتہ کہ مذہب وے اباحت سماعت است بہ قول و الحان چوں بشنود مرد از مرد یا از جاریہ خود یا خانہ بعضے اصدقائے خود ونشنود آنرا درمیان راہ مقترن نہ گردد و سماع بہ چیزے از منکرات و ضائع نہ کند بہ سبب آں اوقات نماز را و روایت کردہ است از ابومنصور بغدادی از یونس بن عبد الاعلی کہ شافعی استجاب کرد مرا بسوئے مجلسے کہ در وے قینہ بود کہ تغنی میکرد چوں فارغ شد قینہ شافعی گفت آیا خوش کردی تو این را گفتم نہ گفت اگر راست مے گوئی نیست ترا حس۔

---

(۱) مدارج النبوت جلد1 ترجمہ اردو از مولانا عبد المصطفیٰ محمد اشرف 730،۳۰۷ پر یہ نام بنی یربوع لکھا گیا ہے جبکہ تجلیات میں بنی یربوع ہے

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب سماع کی اباحت ہے۔ استاد ابو منصور بغدادی نے بھی کہا ہے کہ ان دونوں حضرت کا مذہب اباحت سماع ہے بشرطیکہ وہ سماع مقترن اور فحش نہ ہو اور سرراہے بھی نہ کی جاتی ہو' نماز کے وقت بھی نہ کی جاتی ہو۔ ابو منصور بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے یونس بن عبد الاعلیٰ سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ میں امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ ایک ایسی محفل میں گیا جہاں ایک آدمی گا رہے تھا۔ جب وہ گانا ختم ہوا تو امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم اس سماع و سرود سے محفوظ ہوئے۔ تو میں کہا کہ "نہیں" تو امام رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر تم سچ کہتے ہو کہ اس سماع و سرود سے تم نے کوئی لطف نہیں اٹھایا تو تم میں کوئی حس نہیں۔ اس کے بعد شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا قول تحریر فرمایا ہے:

کہ خوش داشتن سماع و غناء و طبع سلامت و حس است و ناخوش داشتن آں اعوجاج طبیعت و نقصان حس۔ و ازیں جا معلوم مے شود کہ دلیلے شرعی بر حرمت و کراہت آں نیست۔ اگر آں بودے خوش داشتن طبع آں راچہ فائدہ کردے۔ در تاثیر نغمہ در طبائع' ہیچ کس راسخن نیست کہ در حیوانات موجود (۱) است چہ جائیکہ آدمیان۔

---

(۱) ان لوگوں کو شرم آنا چاہیے جو سماع کو حرام کہتے ہیں جب کہ یہی سماع و سرود حیوانات کو بھی متاثر کرتے ہیں اور انسان تو اشرف المخلوقات ہے کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ بنی آدم حیوانات سے بھی گئے گذرے ہیں (کہ سماع سے لطف اندوز نہ ہوں۔) حقیقت یہ ہے کہ جنت میں دیدار الٰہی کے بعد دوسری بڑی نعمت سماع ہو گی جس کو بعض لوگ حرام قطعی سمجھتے ہیں (مولف)

یعنی سماع و سرود سے لطف اندوز ہونا طبیعت کی سلامتی اور اسی طرح حس کی سلامتی سے تعلق رکھتا ہے اور اس سے محظوظ نہ ہونا طبیعت و حس کی علالت اور کجی کی دلیل ہے۔ چنانچہ اس سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ سماع کی حرمت اور کراہت کے بارے میں کوئی صحیح اور شرعی دلیل موجود نہیں اگر ایسا ہوتا تو سماع سے طبیعت کا لطف اٹھانے کا کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ مراد یہ کہ نغمہ میں جو تاثیر ہوتی ہے اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ حیوانات بھی اس کی تاثیر سے متاثر ہوتے ہیں پھر بنی آدم کیوں متاثر نہ ہوں۔

اس کے بعد شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا ایک قول نقل کیا ہے "و بالجملہ و تحقیق صحیح شدہ است از قول و فعل شافعی رحمتہ اللہ علیہ چیزے کہ صریح است در اباحت۔ و نیست نص در تحریم"۔

یعنی مجموعی طور پر حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے قول و فعل سے یہ بات صحیح طور پر ثابت ہے کہ سماع ایک مباح چیز ہے اور اس کی حرمت کے بارے میں کسی قسم کی کوئی نص موجود نہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کا رقص کرنا اور سرود سننا۔

مدارج میں تحریر ہے:۔ "و امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ صحیح شدہ است کہ وے شنیدہ است غنا را نزد پسر خودش کہ نام وے صالح است۔ روایت است از ابوا لعباس فرغانی کہ مے گفت۔ شنیدم صالح بن حنبل رحمتہ رحمتہ اللہ را کہ مے گفت بودم من کہ دوست میداشتم سماع را۔ و بود پدر من کہ ناخوش میداشت آنرا۔ پس وعدہ کردم ابن حنادا را (۱) کہ باشد نزد من شبے۔ پس باشد نزد من تا دانستم

---

(۱) ترجمہ مدارج جلد اول صفحہ ۱۳۷ پر ابن حنادہ لکھا ہے

کہ خواب کرد پدر من پس شروع کرد ابن جنادہ در تغنی پس شنیدم آواز پائے برابر بام پس بر آمدم بالائے بام و دیدم پدر خود را بالائے بام کہ مے شنود غنارا و دامن در زیر بغل اوست و وے خرامد بالائے بام گویا کہ رقص مے کند۔ و مثل ایں قصہ از عبد اللہ بن احمد بن حنبل نیز منقول است و این دلالت دارد بر اباحت سماع نزد وے۔ و آنچہ منقول است از وے مخالف ایں محمول است بر غنائے مزموم و مقترن کہ فحش و منگر روایت کردہ شدہ است از احمد رحمتہ اللہ علیہ کہ وے شنید قوالے را نزد پسرش صالح و انکار نہ کرد۔ پس گفت پسروے۔ اے پدر! آیا نبو دی تو کہ انکار می کردی۔ و مکروہ می داشتے تو آنرا۔

گفت بہ من چناں رسانیدہ اند کہ استعمال می کنند باوے منگررا"

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت امام احمد حنبل رحمتہ اللہ علیہ کے ایک فرزند تھے جن کا نام صالح تھا چنانچہ ابوالعباس روایت کرتے ہیں کہ صالح کہا کرتے تھے کہ سماع مجھے پسند تھی جبکہ میرے والد (امام احمد جنبل) اسے ناپسند کرتے تھے۔ لہذا ایک گانے والے ابن جنادہ جو میرے دوست تھے کو میں نے ایک رات بلایا۔ جب مجھے یقین آگیا کہ اب میرے والد محترم سو چکے ہوں گے تو ابن جنادہ نے سماع و سرود شروع کیا۔ اسی اثناء میں میں نے بالائے چت آہٹ سنی اس لئے میں اوپر والی چت پر گیا چنانچہ میں نے دیکھا کہ میرے والد نے اپنا دامن بغل میں دبایا ہے اور جھوم جھوم کر (گویا ناچ کر) سرود و سماع سن رہے ہیں ایسی روایت عبد اللہ بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے اور یہ حضرت امام کے نزد اباحت سماع پر دلالت کرتی ہے اور حضرت امام حنبل رحمتہ اللہ علیہ کا جو قول حرمت سماع کے بارے میں منقول ہے وہ اس سماع کے بارے میں ہے جو مقترن اور حرام و فحش ہو۔ (مگر یہاں قول و فعل میں تطابق دستیاب نہیں اس لئے کہ عبارت بالکل صاف ہے کہ:۔

کہ "می شنود غنارا" یعنی سماع فرمایا کرتے تھے")۔ اور اپنے فرزند نے بھی ان سے کہا کہ اے پدر بزرگوار! آپ تو مجھے بھی اس کام سے منع فرماتے تھے اور اسے مکروہ سمجھتے تھے تو حضرت امام نے فرمایا کہ مجھے ایسی روایت موصول ہوئی ہے کہ یہ مباح ہے حرام نہیں یعنی جس سے منع فرمایا کرتے تھے وہ حرام ہے۔

یوسف بن یعقوب کے گھر میں معرفی کا بجانا:

مداراج میں لکھا ہے:

وہمچنیں صاحب امتاع در آلات و مزامیر سخن کردہ۔ گفتہ کہ معروف در ائمہ اربعہ مزامیر است۔ باوجود آں از بعضے علمائے مذہب شافعی و اصحاب ظواہر و غزالی و امثال وے خلافہا نقل کردہ۔ و انواع آلات و مزامیر ذکر کردہ اماوف مختلف فیہ است۔ بعضے مطلق حرام دانستہ۔ بعض فرق کردہ در جلاجل وارد غیر آں و صواب اباحت اوست درنکاح و بعضے اعلان آں ہدف مستحب دانستہ و در شبابہ کہ بمعنے نے است نیز اختلافہا ذکر کردہ دیگر از مزامیر عود است کہ آنرا بربط نیز گویند و تارہا دارد کہ آنھارا زیر و بم گویند و در وے نیز اختلافہا ذکر کردہ و گفتہ کہ معروف در مذہب ائیمہ اربعہ آنست کہ زدن آں و شنیدن آں حرام است و رفتہ اند علماء بجواز آں و حکایت کردہ اند سماع آنرا از عبد اللہ بن عمر و حکایت کردہ شدہ است کہ در آمد عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بر عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پس یافت نزد وے جاریہ کہ میزد عود۔ پس گفت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مر عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ را آیامی بنی دریں باسی گفت "لا باس بھذا" و نقل کردہ اند سماع آنرا از عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و معاویہ بن ابی سفیان و عمر بن العاص و حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ و از غیر صحابہ عبد الرحمان بن حسان و خارجہ بن زید کہ از فقہائے مدینہ است و نقل کردہ است استاد ابو منصور بغدادی از زہری و

سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ و عطا بن ابی رباح و شعبے عبد اللہ بن ابی عتیق رحمتہ اللہ علیہ و اکثر فقہائے مدینہ مطہرہ و حکایت کردہ است از ابراہیم بن سعد رحمتہ اللہ علیہ کہ در آمد بر رشید و گفت "اریدالعود" (یعنی میں عود ستار چاہتا ہوں) پس گفت رشید المجرام عود المزمار قال لا بل عود المزمار (یعنی انگیٹھی میں جلانے کی خوشبودار عود (لکڑی) یا مزمار کی عود (یعنی ستار) تو اس نے کہا کہ نہیں مزمار والی عود (یعنی ستار) پس طلبید رشید عود را و بنواخت آنرا۔ ابراہیم بن سعد فتویٰ داد بر اباحت غنا و عود و نقل کردہ است فاکہی در تواریخ مکہ معظمہ بہ سند کہ دارد موسیٰ بن المغیرا العجمی کہ خواند وے عطا بن ابی رباح راپس در آمدو بودند در آنجا قومے کہ میزدند عود را تغنی میکر دند چوں دید ند عطا را کہ در آمد بازماندند ازاں پس گفت نمے نشینم تا عود نہ کنید بہ آنچہ میکر دید۔ پس بنشست و تغذی کرد صاحب امتاع ہمیں عود را اصل ساختہ و مزامیر دیگر را بہ آں قیاس کردہ و بالجملہ وے دریں باب از وسعت و خلاعت خالی نیست"۔

یعنی اسی طرح صاحب امتاع نے آلات و مزامیر کے متعلق گفتگو کی ہے انہوں نے کہا ہے کہ مذاہب ائمہ اربعہ کے نزدیک مزامیر معروف ہیں اگر چہ شافعی مذہب کے بعض علماء، علمائے ظاہر اور اسی طرح غزالی نے اختلاف بھی کیا ہے اور آلات و مزامیر کے کئی قسموں کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن دف مختلف فیہ ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو مطلق حرام کیا ہے اور بعض نے مطلق طور پر مباح کیا ہے اور بعض گھنگرو اور بغیر گھنگرو کی تفریق رکھتے ہیں اور درست یہ ہے کہ نکاح میں مباح ہے اور بعض کے نزدیک اعلان نکاح کے وقت دف بجانا مستحب ہے اور شبابہ یعنی بانسری کے متعلق اختلاف ہے دوسرے مزامیر میں عود ہے جس کو بربط بھی کہتے ہیں اس میں کئی تار ہوتے ہیں اور ان کو زیرو بم کہا جاتا ہے اور ان کے بارے میں اختلاف ہے اور کہا گیا

ہے کہ چاروں مذاہب میں اس کا بجانا اور سننا حرام ہے علماء کا ایک طبقہ اسکو جائز سمجھتا ہے اور اس کے جواز میں عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سماعت بیان کرتے ہیں انہوں نے روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تشریف لے گئے اس وقت ان کے سامنے ان کی باندی بربط بجانے میں مصروف تھی۔ حضرت عبد اللہ بن جعفر نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے پوچھا کہ آیا تم اس میں کسی قسم کی قباحت محسوس کرتے ہو۔ تو انہوں نے فرمایا کہ قطعاً" نہیں اور علما نے صحابہ میں سے عبد اللہ بن زبیر امیر معاویہ بن ابو سفیان' عمرو بن العاص' حسان بن ثابت اور غیر صحابہ میں سے عبد الرحمان بن حسان اور خارجہ بن زید جو فقہائے مدینہ میں سے ہیں ان سب کا بربط سننا نقل کیا ہے استاد ابو المنصور نے زہری سے اور سعید بن المسیب نے ابن ابی رباع شعبی اور عبد اللہ بن ابی العتیق وغیرہ مدینہ کے فقہا سے نقل کیا ہے (۱) اور لفظ خلاعت کے معنے ہیں پریشان ہونا یا بے سرو سامان ہونا۔ یعنی بات کو طول دینا کہ ایسی بات کی جائے جن سے فقہا کی اجتہاد باطل ہو جاتی ہو اور یہ بات بے سروسامانی اور پریشانی کا سبب ہے اور تیسرے معنے فسق و فجور کا مرتکب ہونا ہیں جو یہاں پر نہیں لئے جا سکتے اس لئے شیخ چند باتوں کے بعد تفسیق و تشنیع سے منع کرتے ہیں اور جب وہ ایسا کرتے ہیں تو خود کیونکر ایسا کر سکتے ہیں۔
چنانچہ ایسا سمجھنا صحیح نہ ہو گا تاہم اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

....

(۱) حضرت محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی عبارت کا ترجمہ بابا نے نہیں دیا تھا میں نے اس کا ترجمہ شروع کیا تھا مگر جلد ہی محسوس کیا کہ آگے جا کر انہوں نے ترجمہ اور مطلب بیان کیا ہے لہٰذا یہاں تک آکر باقی ترجمہ نہ کیا بہر حال جو کچھ ہوا ہے بہتری اسی میں ہو گی (مترجم)

و اجتماع آلات مزامیر نیز نقل کردہ و گفتہ اختلاف است ازبیان، قائلین بہ تحریم آں کبیرہ است یا صغیرہ و متاخرین از شافیہ بر آنند کہ صغیرہ است ایں چند حکمات از کتاب مذکور نقل کردہ شد و العھدۃ علیہ و غرض از نقل جز آں نیست کہ اگر احیاناً ازیں طائفہ چیزے ازاں نقل کردہ شود مبالغہ در تشدید و تحصیل و تشنیع و تفسیق و تضلیل نہ نمایند و سترعیوب و زلالت قوم شعاری خودسازند۔ و اما عامہ رانہ گزارند و تقلید ایشاں کنند فالحق ان یتبع واللہ اعلم(یعنی حق بات یہ ہے کہ حق کی تابعداری کی جائے اور ہر چیز کا علم اللہ تعالٰی ہی کو ہے) و ایں ضعیف درایں مسئلہ در مواضع متعددہ ذکر کردہ است و درہمہ تفصیل و تردید و توسط نگاہ داشتہ بہ ادنے میلے بجانب حرمت یاکراہت و درایں کتاب نقل اقاویل جانب اباحت غالب افتاد۔ زیراکہ آں جانب دیگر مشہور و مقرر شدہ است در ازہاں حاجت بہ نقل نہ دارد و نیت ہماں است کہ گفتہ شد

عیب مے چوں ہمہ گفتی ہسنرش نیز بگوئے
نفی حکمت مکن از بہردل عامے چند

شیخ قدس سرہ نے پہلے سماع کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے۔

و مقصود کاتب الحراف از نقل اقاویل اباحت آنست کہ تا معلوم شود کہ مسئلہ مختلف فیہ است جزم کردن بہ یک جانب و ترجیح آں و تعصب نمودن در آں مناحب طریق اختلاف نیست۔ اگر یکے را اصلاح وقت درآں نماید کہ توقف کند و ملاحظہ و احتیاط نماید و در ورطہ خلاف و نزاع نیفتدو سلامت حال خود در آں بند احتیاط و تقوٰی در آں اندیشد۔ مبارک باد اما باید کہ زبان قال حال از فسق و تشنیع (۱)

---

(۱) واقعی جو نادان سماع کو کلی طور پر حرام سمجھتے ہیں وہ انتہائی عظیم القدر بزرگوں کے بارے میں بھی برے اور ناموزوں الفاظ استعمال کرتے ہیں جیسے حضرت پیران پیر قدس سرہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ آپ نے حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہ کے لئے محفل منعقد کی تھی۔ ایسے بزرگوں کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے

تضلیل و تقبیح بزرگان و افتادن در ایشاں باوجود تعارض دو لہ و جانبِ طریق و وجود علماء فقہا و عرفا در آں جانت دیگر قطع نظر از راجح و مرجوح نگاہ دارد و سررشتہ انصاف رہا نہ کند

صحت و عافیت گرچہ خوش افتاد اے دل
جانب عشق عزیز ست فرو مگذارش"

اس طویل عبارت کا مختصر ترجمہ یہ ہے کہ شیخ محدث عبد الحق دہلوی قدس سرہ نے مدارج میں تحریر فرمایا ہے کہ صاحب امتاع آلات سماع و مزامیر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ چاروں مذاہب کے ائمہ کے مابین مزامیر معروف ہیں تاہم بعض شافعی علماء بعض علمائے ظاہر، غزالی اور اسی قبیل کے دیگر حضرات نے اس کے خلاف نقل کی ہے اور آلات و مزامیر کے کئی اقسام بیان کئے ہیں لیکن دف کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ اسے مطلق مباح اور بعض لوگ مطلق حرام سمجھتے ہیں بعض دیگر گھونگرو والے دف وغیرہ میں فرق کرتے ہیں جو اسے نکاح کے اعلان کے لئے مستحب سمجھتے ہیں بھانسری بجانے میں بھی بڑا اختلاف ہے بہرحال مزامیر میں عود یا ستار یا بربط اور اس کی تاریں ہیں جن کو زیر و بم کہتے ہیں ان میں بھی اختلاف ہے کہتے ہیں کہ مذاہب اربعہ میں حرام ہیں مگر علماء کی ایک جماعت نے اس کے جواز پر بھی فتویٰ دیا اور سماع کی حکایت کرتے ہیں۔ عبد اللہ بن جعفرؓ اور عبد اللہ بن عمرؓ کے متعلق کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت عبد اللہ بن عمرؓ حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ کے ہاں تشریف لے گئے اس وقت حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ کی ایک باندی یہی چیزیں بجا رہی تھی۔

حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا کہ کیا ان کی کوئی ممانعت ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں اسی طرح عود کو عبد اللہ بن زبیرؓ، معاویہ بن ابوسفیان، عمرو بن العاص، حسان بن ثابتؓ اور عبد الرحمان بن حسانؓ اور خارجہ بن زیدؓ جسے فقہائے مدینہ نے بھی سنا ہے استاد ابو منصور بغدادی نے زہری، سعید بن المسیبؒ عطاء بن ابی رباح، شعبی، عبد اللہ بن عتیق اور اکثر فقہائے مدینہ سے حکایت کی ہے یعنی ان حضرات نے مزامیر کی سماع کو سنا ہے عبد العزیز ماجشون کا ایک دوست کہتا ہے کہ وہ (عبد اللہ بن ماجشون) دف بجانے کو جائز سمجھتے ہیں ابن سمعان کی حکایت ہے وہ طاؤس سے اور طاؤس ابراہیم بن سعد سے روایت کرتے ہیں کہ ابراہیم بن سعد رشید (۱) کے ہاں تشریف لے آئے اور کہا کہ میں عود چاہتا ہوں، تو رشید نے پوچھا کہ کونسی عود۔ انگیٹھی میں جلانے کی خوشبودار لکڑی یا مزمار والی عود (سیتار) تو اس نے کہا کہ مزمار والی عود۔ چنانچہ رشید نے بجانے والی عود منگوائی اور بجا کر سنائی ابراہیم بن سعد نے عود بجانے کی اباحت کا فتویٰ دے دیا۔ اور فاکہی مکہ معظمہ کی تاریخ میں باقاعدہ سند سے حکایت کرتے ہیں۔ کہ موسیٰ بن المغیرہ الجمی نے عطا بن رباح کو بلایا تو وہ آگیا مگر وہاں پر کچھ لوگ ایسے تھے جو عود بجا رہے تھے اور اس کے ساتھ غزلیں گا رہے تھے جب ان لوگوں نے عطا کو دیکھا تو چپ ہو گئے تو عطاء نے کہا کہ اگر تم عود نہیں بجاؤ گے تو میں نہیں بیٹھوں گا۔ چنانچہ انہوں نے عود بجانا شروع کیا اور عطاء بیٹھ گئے اور اس کو سننا شروع کیا صاحب امتاع نے اسی عود کو اصل سمجھا ہے اور دیگر مزامیر کو اسی پر قیاس کیا ہے اور یہ بات درست بھی ہے۔ اس لئے کہ مزامیر سے مطلب ایک ہی حاصل ہوتا ہے۔ چاہے وہ باجہ ہو، رباب طبلہ یا ستار ہو۔ جب ایک

....

(۱) یعنی ہارون الرشید عباسی خلیفہ

چیز کی اباحت ثابت ہو گئی تو سب جائیز سمجھے جائیں گے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی قدس سرہ لکھتے ہیں کہ اس مسئلہ کے بارے میں میں نے کافی غور و خوض کیا ہے اور اوسط نظر سے یہ فیصلہ کیا کہ اس کی حرمت کے بارے میں بھی دلائل موجود ہیں اور اباحت کے بارے میں بھی۔ تاہم اباحت کا پہلو غالب ہے اس کے بعد حضرت شیخ نے حافظ شیراز کا یہ شعر لکھا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ:

"تم نے شراب کی جملہ برائیوں کو یاد کیا اب ذرا اس کی اچھائیوں کا بھی ذکر کرلو۔ چند ایک دلوں کو خوش کرنے کے لئے کسی شے کی حکمت کی نفی نہ کر۔"

حضرت شیخ محدث لکھتے ہیں کہ "سماع کی اباحت کے بارے میں جو اقوال میں نے نقل کئے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور اسے یکطرفہ جاننا یا یک طرفہ حصر کرنا (گھیرنا) مناسب نہیں ہے۔ یعنی صرف یہ کہنا کہ یہ فعل حرام ہے یا یہ کہ یہ فعل حلال ہے جائز نہیں۔ مراد یہ کہ یقین کی بات ہے یعنی جس کو یقین ہو کہ یہ فعل جائز ہے وہ اس کو جائز مانے۔ اور اگر کوئی صاحب زہد و تقویٰ کی طرف حد سے زیادہ مائل ہو اور اسے اپنے حال اور خیال کے مطابق اچھا نہ سمجھتا ہو تو وہ نہ سنے۔ مطلب یہ کہ ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کی کوئی ضرورت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اصحاب رسول ﷺ تابعین رضی اللہ عنہ اور تبع تابعین اعاظم اولیاء، علماء اور فقہا کی سماعت ثابت ہے اس سلسلے میں راجح و مرجوح کو بھی نہ دیکھے۔ اور انصاف کو ہاتھ سے نا جانے دے۔"[۱۹]

اب اگر تھوڑا سا غور کیا جائے اور تحقیق و انصاف کی نظر سے معاملے کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی

رحمتہ اللہ علیہ کا متذکرہ بیان اور حافظ شیراز کا شعر پیش کرنا ان کے مذاق پر پوری روشنی ڈالتا ہے چاہے وہ خود سماع نہ سنتے ہوں تو نہ سہی مگر ان کا قلب سماع کے ذوق اور شوق سے لبریز تھا۔ اور سماع کے قائل تھے۔ انہوں نے مزامیر کے سلسلے میں صاحب امتاع کا قول نقل فرمایا ہے اور وہاں پر "خلاعت" کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی شرح ہم نے کی ہے اور بعد ازاں انہوں نے "والعهدة عليه" کا جملہ تحریر فرمایا ہے یعنی اس بیان کا ذمہ دار صاحب امتاع ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صاحب امتاع نے جو کچھ لکھا ہے ان کے خیال میں درست نہیں بلکہ بزعم خود ہی انہوں نے عبد اللہ بن جعفرؓ اور ان کے عود سننے کا ذکر کیا ہے اور معاً دیگر اصحاب ﷺ کا حال بھی بیان کیا ہے اور یہ حضرت شیخ نے صاحب امتاع سے نقل نہیں کیا ہے (بلکہ یہ ان کی اپنی ذاتی تحقیق اور معلومات ہیں) میرا مطلب یہ ہے کہ اگر حضرت شیخ محدث سماع کو جائز نہ سمجھتے تو یہ حوالے نہ دیتے بلکہ صاف طور پر لکھ دیتے کہ یہ اصحاب رسول ﷺ پر تہمت اور بہتان تراشی ہے۔

بہر نوع حضرت شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ کی تحقیق سے ہمارا یہ نظریہ صحیح اور درست معلوم ہوتا ہے جیسا کہ حضرت شیخ لکھتے ہیں:

"وایں جا نقل آقاویل اباحت غالب افتاد"

یعنی یہاں اباحت کے اقوال کا پلہ بھاری ہو گیا ہے اور جب یہ بات ثابت ہو گئی۔ تو "والعهدة" کا مطلب یہ ہے کہ فقہا سارے کے سارے مزامیر کو حرام سمجھتے ہیں مگر صاحب امتاع اس کے برعکس تمام مزامیر کو جائز و حلال سمجھتے ہیں چنانچہ حضرت شیخ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے آپ کو اس جھگڑے سے یوں چھڑایا ہے اور فرمایا ہے کہ:

"یہ صرف میری رائے نہیں کہ مزامیر مباح ہیں بلکہ صاحب امتاع کی بھی یہی رائے ہے"

اور اگر حضرت شیخ محدث اس رائے سے متفق نہ ہوتے تو جناب حافظ شیراز رحمتہ اللہ علیہ کا شعر کیوں نقل فرماتے۔

سماع و مزامیر کے بارے میں شیخ محدث کی خصوصی تحریر۔

حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ محض لفظ سماع کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

و بالجملہ دریں جاسہ طریقہ است۔ یکے مذہب فقہا است و ایشاں انکار میکنند۔ اشد انکار۔! و سلوک میکنند مسلک تعصب و عناد و الحاق میکنند فعل آنرا بہ ذنوب و کبائر و اعتقاد آنرا بکفرو زندقہ و الحاد! واین افراط است و خروج است از طریقہ اعتدال و انصاف و نمی باید بر آں جرات کرد۔ خصوصاً" در موضع خلاف نقل کردہ شدہ است از علمائے مذہب آنچہ دلالت بر حرمت و کراہت۔

دوم طریقہ محدثین است و ایشاں میگویند کہ ثابت نشلہ است در تحریم حدیث صحیح و نص صریح بلکہ ہرچہ وارد شدہ است دراں باب از احادیث۔ یا موضوع است یا مطون ایں چنیں آیات قرآنی اگر چہ تفسیر کردہ اند آں را بعضے مفسرین بہ چیزے کہ دلالت میکند بر حرمت غنا۔ اما آنرا تاویلات و محامل دیگر ہم است کہ ذکر کردہ اند غیر ایشاں از علماء چوں ثابت نہ گردد حرمت' ثابت شد اباحت بہ دلالت قوی وے سبحانہ' واحل لکم الطیبات و بعضے گویند ثابت نشلہ است نہ بر حرمت نہ بر اباحت آں دلیل قطعی شرعی پس مسئلہ مبنی گردد بر اصل در اشیاء کہ خطرست بہ اباحت۔

و سوم طریقہ سادہ صوفیہ و مذہب ایشاں دریں باب مختلف و افعال مجتنب آمدہ و بعضے اجتناب کردہ و بعضے معاشرت نمودہ و باشد کہ انکار ایشاں اشد باشد در اجتناب و تشدید قوی باشد۔ زیراکہ مذہب ایشاں اخذبہ عزیمت و احتیاط در فعل و اقوال است درجمیع اقوال و احوال و لیکن بر بعضے از ایشان غالب آمدہ .... و شوق و سکر و محبت و .... حال و وجد و ہیجان و حکم ایشاں حکم والہ و سکران ست۔ و شک نیست در تاثیر نغمات در نفوس و نطریب قلوب و اثارث کو امن بواطن و این معلوم است . بمشاہدہ و عیاں حتے درحیوانات و بلہ صبیان پس متمکنات ایشاں ثابت اند بربساط حکم و ادب بارسوخ قدم و متلونان از اہل شوق و مقشعر بہ غلبہ وجد و عزائم۔

حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ کا مطلب صاف ہے آپ کی رائے میں سماع کے سلسلے میں تین گروہ ہیں ان میں سے پہلا گروہ فقہا کا ہے یہ گروہ سماع سے انکار کرتا ہے بلکہ اس فعل کو گناہ کبیرہ میں شمار کرتے ہیں اور ان کے نزدیک سماع کے معتقدین کو کفرو زندقہ سے تعبیر کرتے ہیں اس ضمن میں حضرت شیخ محدث کا ارشاد ہے کہ ایسا کہنا اور سمجھنا فقہا کی زیادتی اور افراط ہے چونکہ یہ گروہ محدثین کی طرح مسائل کے استنباط کے فن سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے اس لئے وہ ظاہر کو فوقیت دیتے ہیں۔ چنانچہ شیخ محدث کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک فقہا کا قول نہ صرف کمزور ہے بلکہ ماننے کے قابل ہی نہیں ہے اور یہاں تک کہ اگر فقہااس کے مخالف بھی ہوں تو ان کے مخالفت کی پروانہ نہ کرنی چاہیے کیونکہ وہ اس معاملے سے واقف ہی نہیں۔

دوسرا گروہ محدثین کا ہے ان کی رائے میں حرمت سماع کے بارے میں کوئی صریح آیت یا کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔ اور سماع کی حرمت کے سلسلے میں جو

احادیث پیش کی جاتی ہیں تو ایسی تمام احادیث یا تو موضوعی ہیں یا مطعون ہیں یعنی ان کے راوی کمزور اور بے اعتبار ہیں (اور موضوع حدیث اس حدیث کو کہتے ہیں جو کسی نے اپنی طرف سے گڑھی ہوئی ہو یعنی حضور اقدس ﷺ کا ارشاد نہ ہو اور اسے "حدیث" کہا جاتا ہو۔ ایسی حدیث کو موضع، وضع کردہ یا موضوعی حدیث کہتے ہیں ویسے علم حدیث ایک مکمل اور مدلل علم ہے خوش قسمتی سے حضرت شیخ محدث ایک بہت بڑے نامی گرامی محدثین کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ خود بھی محدث تھے اور وہ اس معاملے میں اصل و نقل کے فرق کو اچھی طرح جانتے تھے۔ چنانچہ جب وہ ایسی احادیث کو موضوعی فرماتے ہیں تو ایسا کہنے کا ان کو پورہ پورہ حق حاصل ہے کیونکہ وہ اس علم کے ایک بے بدل عالم ہیں اور ان کا ارشاد سند کا درجہ رکھتا ہے۔ مترجم)

اسی طرح بعض مفسرین نے بعض آیتوں کے دوسرے معنے بیان کئے ہیں جو حرمت غنا پر دلالت، کرتے ہیں لیکن ایسی ایتوں کے دوسرے محامل اور تاویلات بھی موجود ہیں (جن سے سماع کی اباحت ثابت ہوتی ہے) لہٰذا ایسے حالات میں حرمت ثابت نہیں ہوتی اور جب حرمت ثابت نہیں ہوتی تو اباحت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے اور محدثین کی دلیل اس ضمن میں قوی ہوتی ہے۔

تیسرا طبقہ صوفیہ کا ہے ان میں بھی ایک گروہ سماع کا منکر اور دوسرا اس کا بلا تکلف قائل ہے اور ان دونوں گروہوں کا اپنے اپنے مقام میں مستقل ہونا بھی حضرت شیخ محدث کی تحریر سے ثابت ہے مراد یہ کہ حضرت شیخ محدث نے لکھا ہے کہ حضرات صوفیہ ایسے لوگ ہیں جو بے حد احتیاط سے کام لیتے ہیں اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ صوفیاء کا انکار اور اقرار دونوں انتہائی شدید اور سخت ہوتے ہیں تو صوفیہ کرام میں بھی بعض تو سماع کا اقرار کرتے ہیں اور بعض اس کا انکار کرتے ہیں علاوہ ازیں

بعض مفسرین قرآن کا بعض آیتوں سے حرمت سماع ثابت کرنا اور جمہور مفسرین کا انہی ایتوں کے دوسرے معنے بیان کرنا اور ان سے سماع کی حلت ثابت کرنا بھی معلوم ہے لہٰذا اس کے بعد حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے سماع و مزامیر کی بحث کو یکجا کر کے مجموعی طور پر نتیجہ نکالا ہے اور تحریر فرمایا ہے:۔

و حقیقت حال و منشا اختلاف آں مے نماید کہ سرود شنیدن و مزامیر زدن در زمان قدیم کاروبار بے قیداں و لاہیاں و فاسقان و شراب خوران بود۔ و لہٰذا درحدیث صحیح آمدہ کہ آنحضرت ﷺ فرمودہ فرستادہ شدہ ام من کہ محو کنم معارف را کہ نام آلات و مزامیر است و نہی کنم از شراب خمر و زنا و در اصل نام غنا لہو است و ذکر وے در باب ملاہی مے کند۔ و بعد از محو و محق آثار ایں امور و رفع و ازالہ منکرات چوں آں رسم و عادت نماندہ' مسلمانان و صالحان' و پارسایان نیز در آں افتادن و ازاں محفوظ گشتند بے ملابست بہ فسق و منکرات و مخالطت بہ اہل فسق و فجور۔

یہاں پر حضرت شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ کی تحریر سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ حدیث مبارک میں یہ ارشاد کہ فرمایا حضور ﷺ نے کہ "میں معارف کو ختم (محو) کرتا ہوں" اس کا ترجمہ لکھا ہے۔ دوسری چیز اس بات اور امر کی صحت کہ مسلمانوں' پارساؤں اور صالحین کا آلات و مزار میں مبتلا ہونا اور اس سے ان کی اصلاح کا ہونا۔ انہی الات و مزامیر سے لطف اندوز ہونا یہاں تک کہ بڑی شان والی عظیم القدر ہستیاں بھی اس میں مبتلا ہو گئیں۔ تیسری بات یہ کہ اس امر کا ثابت ہونا کہ یہ لوگ سماع و مزامیر کو فسق و منکرات کے لئے استعمال میں نہیں لاتے بلکہ وہ فسق و فجور سے بہت دور ہوتے تھے۔ چنانچہ انہی دلائل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک آلات و مزامیر فسق کے زمرے میں نہیں

آتے۔ چاہے کچھ علماء اس کو فسق ہی میں شمار کرتے ہوں۔ (یعنی حضرت شیخ کی رائے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور ایسے علماء کا انکار ان کی بلا وجہ زیادتی ہے) چنانچہ حضرت شیخ محدث آگے فرماتے ہیں :۔

و جماعۂ دیگر چوں دیدند کہ ایں عادت فاسقان و نشان بے قیدی ہست و مشابہتے بحال ایشاں دارد و بخوف آں مبادا اثرے بجانب کشد اجتناب کردند و تحذیر نمودند و از شارع علیہ السلام نیز اگر بہ ایں ملاحظہ تحذیرے و معنے و عیدے صادر شدہ باشد دور نباشد۔

حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ کی اس تحریر سے بھی وہی بات ثابت ہوتی ہے کہ فاسقین سے مراد وہی قدیم فاسق ہیں اور سرود اور مزامیر کو ان کے حال سے مشابہ کیا گیا ہے "اور اثرے بجانب کشد" کا جملہ تحریر فرمایا ہے اور اس فقرہ کا اشارہ شراب نوشی اور بدکاری کی طرف ہے (جو کفار کا شیوہ تھا) بہر حال سرود و مزامیر فی نفسہ دونوں فسق میں شمار نہیں کئے جا سکتے اور نہ یہ فسق ہے اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

و آں کہ محدثان گویند کہ نفی از شارع علیہ السلام بہ ثبوت نہ پیوستہ وہیچ حدیثے دریں باب بہ صحت نہ رسیدہ بعد از تقریر آنکہ دائرہ صحت باصطلاح ایں طائفہ تنگ است مراد آں خواہد بود کہ نہی آں علی الاطلاق و تحریم آں لذاتہ نشدہ چنانکہ از خمر و زنا و امثال انہا۔

یعنی جب محدثین یہ کہتے ہیں کہ سرود و مزامیر کے حرمت کے بارے میں کوئی حدیث بھی صحت کا درجہ نہیں رکھتی (صحیح نہیں ہے) تو ان کا یہ کہنا "نظر" کے ساتھ ہے اور ان کے اس بیان کی صحت کا دائرہ بہت تنگ ہے (کیونکہ) وہ قیود جو احادیث کی صحت کے بارے میں مقرر کی گئی ہیں بہت سخت ہیں۔

لہٰذا احادیث تو اس ضمن میں آئی ہیں جیسا کہ خود شیخ محدث نے بھی ایک حدیث کا ذکر کیا ہے مگر محدثین کے انکار کا مطلب یہ ہو گا کہ ایک حدیث مبارک میں خصوصی طور پر سرود و مزامیر کی حرمت کا ذکر آیا ہو گا جیسے زنا اور شراب کے بارے میں صریحاً موجود ہیں تاہم سرود و مزامیر کی حرمت کے بارے میں ذکر شدہ کوئی حدیث صحت کے درجے تک نہیں پہنچتی (نہ ہے) چنانچہ یہ دونوں چیزیں یعنی سماع و مزامیر بذاتہ حرام نہیں ہیں نہ مطلق حرام ہیں لیکن اگر ان کے ساتھ شراب نوشی اور بدکاری کا ارتکاب ہو رہا ہو تو پھر حرام ہوں گی۔

شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ آگے لکھتے ہیں۔

و آنکہ بعضے از اہل ظواہر گفتہ اند کہ ہیچ حدیثے وارد نہ شدہ ایں سخن خالی از مکابرہ نیست۔

یعنی بعض اہل ظاہر کہتے ہیں کہ سماع وغیرہ کے جواز کے بارے میں کوئی حدیث وارد نہیں ہے مگر ایسا کہنا ان کی زور آوری ہے۔

شیخ محدث کے اس فقرے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ سماع کے جواز کے سلسلے میں بعض احادیث موجود ہیں۔ آگے تحریر فرماتے ہیں۔

و مثال ایں حال قصہ ظروف و اوانی است کہ انہارا ختم و نرفت و نقیر و بام نام است کہ در وقت اباحت خمر استعمال آں میگروند و شراب در آں مے خورند چوں شراب حرام شد استعمال ایں ہم اوانی و خوردن مشروبات دیگر در آں چند گاہ حرام ساختند از برائے محو ردقیع آثار آں وچوں حرمت خمر ثابت و مقرر شدہ و احتیاج بہ قمع و قلع

آثار و علامت آں نماند منع و نہی ازاں اوانی نیز نماند۔ و باوجود آں علماء و آئمہ دیں دو فرقہ شدند جمعے بمنع رفتنداز استعمال آں اوانی و قومے بہ تجویز کمافی موضعہ و در مانحن فیہ (یعنی مزامیر جن کا ذکر ہو رہا ہے) نیز مانند ایں دو فرقہ آمدند۔ قومے بہ نظر مادت شریف قدیم کہ ایں صورت نشان اہل فسق است منع و رسم احتیاط را گرفتہ ایاوند و جمعے نظر بر معنے و حقیقت حال اندا ختند کہ اگر بلاست فسق و مسکرات است حرام و اگر نہ چنیں است مباح واللہ اعلم و علمہ احکم۔

حضرت شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ کی اس تحریر سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے کہ کہ علماء و محدثین کی ایک بڑی جمعیت کی رائے ہے کہ اگر سرود و مزامیر کے ساتھ زنا کاری اور بدکاری نہ ہوتی ہو تو مباح ہے مثلاً" شراب کے برتن کی اباحت کی طرح جبکہ دوسرے گروہ کی رائے میں شراب کے برتن اور مزامیر دونوں منع ہیں۔

سماع و مزامیر سے اختلاف۔

سماع و مزامیر کے متعلق اختلاف کا مسئلہ اصحابؓ و تابعین کے وقت سے چلا آرہا ہے ایک گروہ سماع و مزامیر کو لہویات میں شمار کرتا ہے اور انہیں حرام سمجھتا ہے چنانچہ قرآن عظیم الشان میں جہاں کہیں بھی "لہو" کا لفظ آیا ہے اس کو سماع و مزامیر پر منطبق کرتا ہے مگر دوسرا گروہ جواب دیتا ہے کہ قرآن عظیم الشان میں ارشاد خداوندی ہے:

وما ھذہ الحیوۃ الدنیا الا لھو و لعب۔ عنکبوت ایت ۶۴

بہ تحقیق دنیا کی زندگی ______________

لہو لعب کے علاوہ کچھ بھی نہیں (۱) تو جب ہر چیز لہو و لعب میں شامل ہو گئی تو گویا اس طرح ہمارا کھانا پینا بھی اسی دنیائی زندگی میں شامل ہے اور وہ بھی حرام ہو گئے (مگر چونکہ ایسا ممکن نہیں) اس لئے وہ قرآن مجید سے دلائل پیش کرتے ہیں مثال کے طور پر قرآن مجید میں حق سبحانہ و تعالیٰ کا فرمان ہے:۔

الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ

جو لوگ اقوال سنتے ہیں اور پیروی کرتے ہیں اچھے قول کی۔ (سورہ الزمر آیت نمبر۱۸)

یہ ایت صاف طور پر سماع کے بارے میں ہے اور اس سے ثابت ہے کہ اچھے کلام (شعر و غزل) کو سننا مباح بلکہ مستحب ہے اگر یہ حضرات لفظ "قول" سے قرآن مجید لیتے ہیں جیسا کہ واقعتاً" ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معنے موقعہ کے مطابق نہیں اس لئے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ فیتبعون احسنہ (پیروی کرتے ہیں اچھی باتوں کی) تو اس سے نعوذ باللہ ثابت ہوتا ہے کہ خدانخواستہ قرآن میں بری باتیں بھی ہیں اس لئے خدا فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو "اقوال" سنتے ہیں اور ان میں سے اس قول کی پیروی کرتے ہیں جو احسن ہے۔ ظاہر ہے کہ "اچھے" کی ضد "بد" ہے تو گویا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عظیم الشان ایسے لفظوں کا مجموعہ ہے جس میں اچھے

---

(۱) سورہ الحدید میں ایک ایت ایسی ہے اعلموا انما الحیوۃ الدنیا لعب و لھو ایت ۲۰۔ ترجمہ۔ تم جان لو کہ حیات دنیوی محض لہو لعب ہے۔

اور برے ہر دو قسم کے اقوال موجود ہیں۔

جبکہ ایسا سمجھنا غلط ہی نہیں کفر ہے۔ کیونکہ قرآن عظیم الشان کا ہر ہر حرف حسنہ ہے ہر ایک لفظ پر ایمان لانا ضروری ہے یعنی قرآن عظیم الشان کے کسی ایک لفظ سے بھی کوئی بدبخت انکار کر لے تو وہ کافر ہو گا پس یہ آیت اشارت کے ساتھ نہیں بلکہ صراحت کے ساتھ سماع کے حق میں ہے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی یہی ایت شریف سماع کی فصل کے ابتدا میں تحریر کی ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی جو علمائے متاخرین میں سے مستند اور جید عالم ہیں وہ بھی مالا بد میں لکھتے ہیں :۔

"سرود حرام است آنکہ باز دارندہ از ذکر الٰہی و مہیج شہوت است"

یعنی سرود وہ حرام ہے جو ذکر الٰہی سے باز رکھنے والا ہو اور شہوت کو بر انگیختہ کرتا ہو

مزید برآں دف بجانا اعلان نکاح کے لئے اور طبل بجانا غازیوں کے لئے مباح کیا گیا ہے قاضی صاحب نے اسی سماع کو درویش کے نفس کو مطمئن کرنے کے لئے تجویز کیا ہے۔ اور ایک گروہ نے خوشی کے دیگر اوقات میں مباح سمجھا ہے ایک گروہ نے تخصیص کے ساتھ اس دف کو حرام کہا ہے جس میں گھونگرو لگے ہوں مگر بعض دوسرے حضرات نے اس کو بھی مباح کہا ہے جبکہ بعض علماء و مشائخ نے کوئی تفصیل دیئے بغیر سماع کو مطلق حلال کہا ہے۔ مدارج میں تحریر ہے۔

و طائفہ بہ اباحت رفتہ و اطلاق کردہ قول را در آں و تفصیل نکردہ میان نساء و رجال و مردان و تسویہ کردہ میان آں و لیکن بشرط امن از فتنہ و قوع در آں و بعضے

فرق کردہ اند میان قلیل و کثیرو رجال و نساء۔

یعنی بعض حضرات اس تفصیل ہی میں نہیں گئے ہیں کہ سماع عورتوں سے سنی جائے یا مردوں سے یا خوبصورت لڑکوں سے مگر شرط یہ ہے کہ کسی فتنے کا خوف نہ ہو۔ البتہ بعض حضرات نے تفصیل دی ہے۔

اس ضمن میں جہاں تک محدثین رحمہم اللہ کا تعلق ہے تو انہوں نے ان احادیث کو متفقہ طور پر موضوعی کہا ہے جو سماع کی حرمت کے بارے میں وارد ہیں۔ (اور جو اکثر علماء ایسی ضعیف و موضوع احادیث کو سند کے طور پر پیش کرتے ہیں) ایسی تمام احادیث ضعیف ہیں یا موضوعی ہیں اور صاحب امتاع نے ایسی تمام احادیث کے بارے میں کہا ہے کہ "جماعت ظاہری اور مالکیہ' شافعیہ اور حنابلہ نے ایسی حدیثوں کو ضعیف کہا ہے اور ائمہ اربعہ کے اماموں ' سفیان ثوری' اور داؤد طائی ایسی احادیث کو حجت تسلیم نہیں کرتے اور یہ سب انتہائی اونچے درجے کے مجتہدین ہیں۔ اور انہی کے مذاہب کی تقلید کی جاتی ہے۔ اسی طرح ابوبکر بن عربی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب احکام الاحادیث میں اس قسم کی احادیث کو ضعیف کہا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ غنا کی حرمت کے بارے میں ہر ایک حدیث صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح صاحب قاموس علامہ مجدالدین فیروز ابادی نے بھی سفر السعادۃ کے خاتمہ میں لکھا ہے:

"درباب زم سماع حدیث صحیح وارد نہ شدہ"

یعنی سماع کی حرمت کے بارے میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔

تحریم آلات لہویہ کی احادیث کے بارے میں ابوبکر رحمتہ اللہ علیہ اور ابن طاہر

رحمتہ اللہ علیہ نے بھی صاف طور پر لکھا ہے کہ ایسی احادیث میں کوئی صحیح نہیں ہے۔
علاؤالدین قونوی نے شرح تعرّف میں محمد بن حزم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حرمت سماع کے بارے میں کوئی ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے اور اگر صحیح ہوتی تو ہم اسے ضرور مان لیتے مگر ایسی تمام احادیث موضوعی ہیں حضرت قونوی رحمتہ اللہ علیہ نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ ایسی تمام احادیث جھوٹی اور موضوع ہیں اور شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب میں سرود و سماع اور آلات سرود کے بارے میں تحریم کی احادیث موضوعی سے محدثین کے انکار کا ذکر موجود ہے جس کا ذکر ہم نے گذشتہ اوراق میں کیا ہے اور یہاں پر بھی دہراتے ہیں کہ غنا اور آلات سماع کی حرمت کے بارے میں کوئی صحیح حدیث پاک موجود نہیں اور ایسی تمام احادیث کو اگر دیکھا جائے تو علت سے خالی نہیں ہیں اور اس بات کو حضرت شیخ محدث نے بھی تسلیم کیا ہے اور اسے شراب کے ظروف کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

جن لوگوں کی رائے میں مزامیر حرام ہیں تو وہ تمام مزامیر کو فسق و منکرات میں داخل سمجھتے ہیں۔ مگر جن لوگوں کی رائے میں مباح ہیں وہ مزامیر کو نہیں شراب و بدکاری کو فسق و منکرات میں شامل سمجھتے ہیں رہی وہ غنا جس کے بارے میں وارد ہے کہ:

"الغنا ینبت النفاق فی القلب کما ینبت الماء البقل"

یعنی غنا دل میں نفاق پیدا کرتی ہے بالکل اس طرح جیسے سبزی میں پانی سرایت کرتا ہے۔
مگر یہ غنا۔ وہ غنا ہے جو فحش امور کے ساتھ سنی جاتی ہو اور اس کے سننے والے

کو خدا یا خدا کے ذکر سے کوئی واسطہ یا رابطہ نہ ہو۔ یا ایسی کنیزیں خریدنا جن سے غنا سیکھی جائے۔ تو ایسی غنا کی نہی میں احادیث وارد ہیں اور وہ سب حق ہیں اور صاف بات یہ ہے کہ مشائخ و اولیاء رحمہم اللہ کا ایسی سماع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اولیاء تو انتہائی پاکیزہ اور برگزیدہ لوگ ہوتے ہیں ایسی غنا تو ایک عام دنیا دار شخص بھی پسند نہیں کرتا۔

مختصر یہ کہ سماع و مزامیر کے سلسلے میں مذاہب اربعہ کے امام اور علماء اپنے اپنے طور پر اختلاف رکھتے ہیں اسی طرح مشائخ چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور قادریہ میں بھی اختلاف موجود ہے مگر ان سے کبیر الشان مشائخ نے سماع کو سنا ہے مثلاً" حضرت ابوسعید ابوالخیر قدس سرہ نے بھی سنی ہے .... مولوی قطب الدین خان صاحب نے مشکوۃ شریف کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ سلسلہ چشتیہ میں حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء اور حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی قدس اسرارہم نے سنی ہے اور انہی کے سلسلہ میں شمائل الاتقیاء کے جامع مولانا رکن الدین ابوالفتح قدس سرہ بھی ہیں حضرت مخدوم سید جہانگیر قدس سرہ نے لطائف اشرفی میں لکھا ہے کہ " و در مجلس خواجہ بہاء الدین نقشبند شاہین و رباب و نے ونائے حاضر میگر دند" یعنی حضرت بہاء الدین نقشبند قدس سرہ کی مجلس میں بانسری اور رباب وغیرہ حاضر ہوتے تھے۔ اور حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ نے اپنی مشہور عالم کتاب "عوارف المعارف" میں تحریر فرمایا ہے آپ نے اپنے فرزند کو نصیحت فرمائی ہے کہ:۔

"یا بنی لا تنکر السماع فانہ لہ ارباب"

"اے میرے فرزند سماع سے انکار نہ کر کیونکہ یہ انتہائی بزرگ لوگوں نے سنی ہے"[۱]

حضرت جنید بغدادی قدس سرہ جن کو سید الطائفہ کا اعزاز حاصل ہے فرماتے ہیں کہ جس دم فقراء سماع سنتے ہیں تو اس وقت رحمت باری نازل ہوتی ہے۔ شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ نے صاحب استماع کا یہ قول نقل کیا ہے اور سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ وہ عظیم ہستی ہے جن کے بارے میں حضرت علامہ جلال الدین سیوطی (مفسر قرآن و محدث) نے تحریر فرمایا ہے کہ:۔

و نحن نقعد ان طرق الجنید و صحبه طریق اقوم"

"یعنی ہمارا عقیدہ ہے کہ جنید اور اس کے احباب کا طریقہ ہی صحیح ہے"

اور امام غزالی قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ "جو کوئی دف کے ہمراہ غزل سننا حرام سمجھتے ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے انکار کرتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کا منکر کافر ہے" .... اب فقہا کا سماع سننے والوں کو کافر کہنے سے فرق معلوم ہوتا ہے یہ باتیں حضرت شیخ محدث کی تحریروں میں بھی موجود ہیں۔

غرضیکہ اس بارے میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں سب سے انکار و اقرار دونوں ثابت ہیں یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ محدث نے آخر میں تحریر فرمایا ہے کہ امریست مختلف فیہ و در امر مختلف فیہ عیب یکدیگر نہ باید کرد و ہر یکے را بحال باید گذاشت۔ فربکم اعلم بمن هو اهلٰی سبیلا" یعنی یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے اور ایسے مختلف فیہ مسئلہ میں ایک دوسرے کو برا نہ کہنا چاہیے بلکہ بہتر یہی ہے کہ ہر ایک کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اب جو بے علم لوگ یا ضدی حضرات کو

اس اختلاف اور اس کی نوعیت کا علم نہیں۔ وہ یہی خیال کریں گے کہ خدانخواستہ صوفیاء شریعت کے خلاف کام کرتے ہیں یعنی سماع و مزامیر مطلق حرام ہیں۔ مگر یہ لوگ اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ اگر سماع و مزامیر حرام ہوں تو ان کا فاعل فاسق ٹھہرتا ہے اور فاسق کا ولی اللہ ہونا دشوار تو کیا قطعی ناممکن ہے چنانچہ سوچنے کی بات ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اولیاء اللہ اس پر کاربند ہیں سماع کی محفلیں منعقد کرتے ہیں اور سماع سنتے ہیں۔ مگر پھر بھی خدا کے ولی ہیں۔ یہی بات ایسے ضدی لوگوں کے لئے سوچنے کی ہے کہ جب ایک چیز شریعت کے خلاف ہو تو اس کو روا جاننے والا شخص کس طرح ولایت کے درجے پر فائز ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جو شخص شریعت کے خلاف ہوتا ہے وہ تو مسلمان بھی نہیں ہوتا چہ جائیکہ ولی اللہ کے درجے پر فائز ہو۔

اب غور فرمایئے کے حضرت ابوسعید ابوالخیر' حضرت خواجہ خواجگان معین الدین چشتی غریب النواز' خواجہ قطب الاقطاب بختیار کاکی' بابا فریدالدین شکر گنج' حضرت علاؤالدین صابر کلیری' سلطان المشائخ محبوب الہی حضرت نظام الدین اولیاء ' خواجہ راجہ نصیرالدین چراغ دہلوی' سید الطائفہ طاؤس العلماء حضرت جنید بغدادی' حضرت سمنون محب'حضرت ذوالنون مصری' حضرت ابوبکر شبلی قدس اسرارھم وغیرہ انتہائی نامور اولیائے امت ہیں اور حضرت پیران پیر دستگیر عبد القادر جیلانی قدس سرہ جنہوں نے سرالاسرار اور غنیۃ الطالبین میں سماع کے باقاعدہ آداب تحریر فرمائے ہیں اور متاخرین اولیاء کرام میں سے حضرت سید علی ترمذی یعنی حضرت پیر بابا صاحب اور حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب اور آپ کے فرزند ارجمند حضرت حلیم گل بابا صاحب قدس سرھم سب جلیل

القدر اور عظیم القدر اولیاء تھے۔ تو غور فرمانے کا مقام ہے کہ کیا یہ سب ایک حرام فعل کے مرتکب تھے۔ کیونکہ یہ سب سماع سماعت فرمایا کرتے تھے تو سوال یہی ہے کہ یہ سب کیونکر خداوند کریم کے اولیاء میں شمار ہونے لگے۔ (مراد یہ کہ سماع کو حرام کہنے والے احتیاط سے کام لیں مترجم)

اسی طرح حضرت شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ نے بھی تحریر فرمایا ہے۔

"بہ تحقیق بودند در صوفیہ جماعہ از اہل فقہ و حدیث و بہ انواع علوم شرعیہ مثل استاد ابوالقاسم قشیری۔ شیخ ابوطالب مکی و شیخ شہاب الدین سہروردی و ذکر کردہ اند ایشاں در رسائل و تصانیف از آنچہ دلالت میکند بر اباحت سماع قولاً و فعلاً"۔

یعنی تحقیق کے ساتھ صوفیائے کرام میں اہل فقہ' حدیث' علم معرفت اور دیگر قسم کے علوم شرعیہ کی ایک بڑی جماعت شامل ہے مثلاً" استاد ابوالقاسم قشیری رحمتہ اللہ علیہ شیخ ابو طالب مکی' شیخ شہاب الدین سہروردی وغیرہم۔ جنہوں نے اپنی تصانیف و رسائل میں سماع کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے ان سے قولاً" اور فعلاً" سماع کی اباحت ثابت ہے (یعنی سماع جائز و حلال ہے)

مزامیر کی اباحت۔

مزامیر کے بارے میں یہ بات صاف طور پر ثابت ہے کہ کہ روز عید' شادی کے موقع پر یا خوشی کے دوسرے مواقع پر دف بجانا اور غنا جائز ہے بلکہ جس وقت کسی کا جی چاہے حلال ہے جیسے کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے اور ہم نے گذشتہ اوراق میں پیش کردی ہیں مگر خیال رہے کہ یہ احادیث پاک قولی بھی ہیں اور فعلی بھی وہ اس طرح

کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو غنا کے لئے ایک لڑکی بھیجنے کا اشارہ فرمایا تھا۔ اور ایک موقعہ پر لڑکیوں کو ارشاد فرمایا تھا۔

وقولی بالذی کنت تقولین

اور یہاں تک کہ آپ ﷺ نے خود بھی سنا تھا۔ اب سوچنے کا مقام ہے کہ نص کے مقابلے میں کسی دوسرے کا قول یا اجتہاد یا تاویل کیسے درست ہو سکتے ہیں۔ حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اگر میرا کوئی قول قرآن و حدیث کے خلاف ہو تو اسے قبول نہ کیا جائے۔ اب جبکہ خود بھی انہوں نے مزامیر کو سنا ہے جس کا تذکرہ گذشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے۔ اور علاوہ ازیں حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا سننا بھی ثابت ہے تو اس کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں رہتا۔ مطلب یہ کہ اگر یہ حرام ہوتا تو اس کے ساتھ فسق لازم آتا اور اصحاب رضی اللہ عنہ و تابعین رضی اللہ عنہ کو کون فاسق کہہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مزامیر مباح ہیں۔ ان بزرگوں کے گھروں میں معرفے کے بجانے پر تو شیخین گواہ ہیں اور یہ حضرت شیخ عبد الحق محدث کے بیان سے بھی ثابت ہے اس کی مثال بھی ہو بہ ہو عود کی طرح ہے اور اگر ایسا نہ سمجھ لیا جائے تو فسق لازم آئے گا اور شیخین کا مخرج بھی باطل ثابت ہوتا ہے اور جدید طور پر جو مزامیر آج کل مستعمل ہیں چاہے ان کی ساخت اور بناوٹ کیسی بھی ہو سب کے سب مزامیر کے زمرے میں شامل ہیں اور مزامیر ہی کا کام دیتے ہیں اور سورہ یاسین میں نئی نئی سواریوں کا ذکر موجود ہے اور یہ کہ تمہارے لئے نئی نئی سواریاں

ائیں گی جن کا تمہیں علم نہیں۔ مراد یہ کہ نئے مزامیر کچھ جدا چیزیں نہیں ہیں جو حرام قرار دیئے جائیں کیونکہ یہ انہی پرانے مزامیر ہی کی طرح ہیں اور انہی کی طرح مزامیر ہی کا کام دیتے ہیں تو جب قدیم حرام نہیں جدید بھی حرام نہیں ہو سکتے۔ دوسری جانب محدثین کی رائے میں بھی مزامیر کی حرمت کے بارے میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے اور اگر ہو تو وہ شراب اور زنا وغیرہ کے ساتھ مقید ہو گی۔ حضرت شیخ محدث کے بیان سے یہی ثابت ہے کہ علماء اور امامان دین اس سلسلے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں ایک گروہ کے نزدیک مزامیر شراب کے برتنوں کے استعمال کرنے کی طرح مباح ہیں اور دوسرے گروہ کے نزدیک شراب کے برتن اور اور سماع و مزامیر دونوں ناجائز اور حرام ہیں اس سلسلے میں جہاں تک اجتہاد کا تعلق ہے تو دونوں گروہ ثواب میں برابر کے شریک ہیں اور اگر ان میں سے کوئی گروہ بر سر خطا بھی ہو تو ثواب اسے بھی ملے گا چنانچہ ہر دو گروہ کے متبعین کے لئے لازم ہے کہ ایک دوسرے کو مطعون نہ کریں۔

یہی مثال شبانہ یعنی "نے" کی ہے اور وہ خصوصی طور پر ان میں شامل ہے شیخ محدث نے لکھا ہے کہ "نے" بھی بعض کے نزدیک مباح ہے اور ہمارا مذہب بھی اسی گروہ کے ساتھ وابستہ ہے جو اس کو مباح سمجھتا ہے۔

عہد ما بالب شیرین دہناں بست خدا ما ہمہ بندہ و این قوم خداوند اند

میرے **مرشد پاک** (قدس سرہ) بہت زیادہ سماع سنتے ہیں۔ خاکسار (مولف)

نے ایک بار ان کی خدمت مبارک میں عرض کیا تھا کہ :۔

"حضور! آپ کا اس قدر زیادہ سماع سننے کا مطلب کیا ہے"۔

تو فرمایا کہ:۔

"بہت زیادہ سننے کی وجہ سے میرے سماع کا شوق بھی کم ہو گیا ہے لیکن صورت حال یہ ہے کہ جہاں بہت سے لوگ بیٹھے ہوں اور اگر ایسی محفل میں غناد و سماع کا اہتمام نہ ہو تو وہ لوگ بے فائدہ بات چیت یا ایک دوسرے کی غیبت کریں گے اور میں غیبت کے مقابلے میں سماع کو ہزار مرتبہ بہتر سمجھتا ہوں"۔

سماع کے متعلق اکثر علماء نے اس کو سننے کے لئے مسجد کو منتخب کیا ہے اور یہ اس لئے جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ سماع عبادت میں شامل ہے تو مسجد ہی عبادت کے لئے ایک منتخب مقام ہے چنانچہ بہتر ہو گا کہ سماع مسجد میں ہو۔ حضرت مخدوم سید جہانگیر نے بھی سماع کے لئے مسجد ہی کو پسند کیا ہے (ملاحظہ ہو لطائف اشرفی)۔

حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی یہی فرمایا ہے (حضرت امام بچپن ہی سے حصول علم و معرفت کے لئے اپنے گھر سے نکلے تھے) اور میرے **مرشد پاک** (قدس سرہ) کا ارشاد ہے کہ "اس زمانہ میں مسجد میں سماع سننا مناسب نہیں اس لئے کہ پرانے وقتوں کے لوگ نیک گمان رکھا کرتے تھے بدنیتی اور بدگمانی سے کام نہ لیتے تھے۔ چنانچہ مخالفت بھی نہ کرتے تھے مگر اس زمانے میں تو لوگ بلاوجہ مخالفت کرتے ہیں اور ان کی مخالفت خدا کے لئے نہیں ہوتی بلکہ اپنے نفسوں کے لئے ہوتی ہے ورنہ بصورت دیگر مسجد میں سماع کا سننا ثواب سے خالی نہیں"۔

آخری فیصلہ اور چند سوالات۔

اس کے بعد ہم سماع کے آثار' اشعار کی اقسام اور وہ اشعار جن کو حضور اقدس ﷺ نے پسند فرمایا تھا اور نیز شرائط سماع اور آداب سماع کے متعلق کچھ حقائق بیان کریں گے مگر یہاں پر سب سے پہلے آخری فیصلے کے طور پر علماء حضرت سے چند سوالات کریں گے اور وہ یہ کہ:

پہلی بات یہ کہ سماع و مزامیر کے بارے میں جو حقائق ہم نے ثبوت کے طور پر بیان کئے ہیں تو ان سب کو بغور ملاحظہ فرمائیں اور مکمل انصاف سے فیصلہ کریں کہ ہر قسم کا سماع حرام نہیں نہ ہی ہر قسم کی غنا منع ہے چنانچہ عوام کے سامنے جو احکام ان علماء حضرات نے پھیلا رکھے ہیں ان کو واپس لے لیں اور صرف یہی نہیں بلکہ آئندہ کے لئے بھی ایسے احکام جاری نہیں کریں گے اور اگر علماءحضرات ایسا نہ کریں گے تو اعاظم اور مستند اولیاء رحمتہ اللہ علیہم کے بارے میں عوام کے دلوں میں کدورت پیدا ہو جائے گی اور وہ ان عظیم ترین اولیاء کو گنہگار ہی سمجھیں گے اور اس کی زد آنحضرت ﷺ تک پہنچ جائے گی اور عوام کے اس گناہ کے ذمہ دار علماء ہوں گے ہو سکتا ہے کہ علماء حضرات یہ کہہ دیں کہ اس زمانے میں اس قسم کے اہل لوگ موجود نہیں تو ہم اس کے جواب میں یہ عرض کریں گے کہ چاہے ایسے لوگ نہ بھی ہوں تو ہم ان کی پیروی سے کیوں باز آئیں۔ (تاہم سچی بات یہ ہے کہ) کوئی زمانہ بھی اولیاء اللہ سے خالی

نہیں ہوتا اس لئے علماء حضرات کا یہ کہنا صریحاً" غلط ہے کہ اس زمانے میں اگلے زمانے کی طرح راسخ العقیدہ لوگ نہیں ہیں اس لئے جیسے ہم نے عرض کیا ہے کہ ہر دور اور ہر زمانہ میں اولیاء اللہ موجود ہوتے ہیں اور یہ بات احادیث نبوی ﷺ سے بھی ثابت ہے۔

لہٰذا اگر ان معقول اور مدلل دلائل کے بعد بھی یہ لوگ ہر قسم کے سماع و مزامیر کو حرام کہتے ہوں تو اس صورت میں مناسب یہ ہو گا کہ:۔

"ایسے علماء حضرات میرے اس رسالے کا جواب لکھ دیں اور وہ جواب چاہے اردو، پشتو یا عربی اور فارسی ہی میں کیوں نہ ہو البتہ ان کی بحث کا مدار محدثین حضرات کے اصول پر ہو"۔

اور یہ اس لئے کہ اسلامی مسائل کا استنباط و اخراج محدثین حضرات نے سرانجام دیا ہے اور فقہا کلیتاً" محدثین ہی کے محتاج ہیں اور اگر یہی محدثین حضرات نہ ہوتے تو دین کے مسائل کا اخراج کہاں سے ہوتا۔ اس پر بھی فقہا حضرات گنہگار نہیں ہیں بشرطیکہ ان کی نیت دین کی خدمت کرنا ہو۔ مراد یہ کہ علماء حضرات کے لئے لازم ہے کہ وہ سب سے پہلے قرآنی آیتوں سے پوری صراحت کے ساتھ سماع و مزامیر کی حرمت ثابت کر دیں صراحت سے اس لئے کہ تاویل کے ساتھ جو چیز ثابت ہوا کرتی ہے اس کو اصولی عقیدہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر آیت:۔

و من الناس من یشتری لھوا الحدیث لیضل
عن سبیل اللہ بغیر علم و یتخذھا ھزوا"

"اور بعض آدمی ایسا بھی ہے جو ان باتوں کو خرید تا ہے جو اللہ سے غافل کرنے والی ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے بے علم لوگوں کو گمراہ کر دے اور اس کی ہنسی اڑا دے"۔ (سورہ لقمان ایت ٦)

اس ایت کریمہ کی شان نزول کے بارے میں تفسیر یسیر وغیرہ میں لکھا ہے کہ یہ ایت نضر بن حارث یہودی کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ وہ لوگوں کو حضور ﷺ کی مجلس سے منع کیا کرتا تھا۔ اور لوگوں کو رستم و اسفندیار کے فضول قصے بیان کیا کرتا تھا (اسی ایت کے سلسلے میں حاشیہ صفحہ ۳۰۳-۳۰۴ تا ۳۰۳-۳۰۴ مطالعہ فرمائیں۔ مترجم) اگر یہ ایت شریف مطلق طور پر سماع و مزامیر کی حرمت کے بارے میں نازل ہوئی ہوتی تو دوسرے مفسرین حضرات بھی ان کی حرمت بیان فرماتے مگر دوسرے مفسرین اس کے وہ معنے کرتے ہیں جو حق ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی آیتیں حرمت سماع کے بارے میں پیش کرنا سینہ زوری کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اب نماز، روزہ، زکوۃ اور حج وغیرہ کے بنیادی مسائل کو لے لیں جو اصل ہیں تو وہ قرآن مجید کی آیتوں سے صراحت کے ساتھ ثابت ہیں تو ہمیں کوئی بتا دے کہ کسی مفسر یا محدث نے ان مسائل کے کچھ اور معنے دیئے ہوں۔ یا انہوں نے یہ کہا ہو کہ صلوۃ سے مراد محض دعا ہے اور رکوع، قیام و سجود ضروری نہیں بلکہ اٹھتے بیٹھتے ہوئے خدا کو یاد کرنا ہی نماز ہے (ظاہر ہے ایسا کسی نے بھی نہیں کہا ہے) اسی طرح زکوۃ کو لے لیجیے (زکوۃ کے متعلق بھی کسی نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کی ہے) مطلب یہ کہ جو مسئلہ اصولی نہ ہو تو اس میں اختلاف ہوتا ہے اور مختلف فیہ مسئلہ میں فریق

ثانی پر تکفیر و تفسیق کے فتوے لگانا محض سینہ زوری' مکابرہ اور عذاب الٰہی کا باعث ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں نے تو اصولوں میں بھی مخالفت کی ہے مگر اپنی مخالفت کو انہوں نے تکفیر و تفسیق پر محمول نہیں کیا ہے بلکہ اسے "اجتہادی غلطی" پر محمول کیا ہے مثال کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب کا یہ اصول ہے کہ جو کوئی سفر پر روانہ ہو اور مدت قصر کی ہو تو وہ نماز قصر ادا کرے گا مگر چونکہ نماز قصر ایک نعمت ہے اور نعمت فاسق کو نہیں مل سکتی تو اگر کوئی فسق و فجور کی نیت سے یعنی ڈاکہ ڈالنے کے دوران یا زنا کاری کی نیت سے سفر اختیار کرے تو نماز قصر ادا نہیں کرے گا لیکن حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر چور چوری کے لئے سفر اختیار کرے تو نماز قصر ادا کرے۔ غور فرمایئے اس اصولی اختلاف میں ایک دوسرے پر تکفیر کو کس صاحب نے جائز مانا ہے۔ اور تو اور حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے اپنے شاگردوں نے بھی ان سے اصولوں ہی میں اختلاف کیا ہے کہ جو کوئی باوضو ہو اور اس کے بدن کے کسی عضو سے خون نکل جائے تو اس شخص کا وضو ٹوٹ جائے گا مگر انہی کے شاگرد عزیز حضرت امام محمد رحمتہ اللہ علیہ کے بدن سے ایک روز وضو کے بعد خون نکل گیا تو لوگوں نے دوبارہ وضو کرنے کا مشورہ دیا مگر حضرت امام محمد رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "میں اہل مدینہ یعنی حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب پر عمل کرتا ہوں" چنانچہ انہوں (امام محمد) نے "اصل" ہی میں اپنے استاد سے اختلاف کیا لہٰذا ہمارے علماء حضرات کو غور و فکر سے کام لینا چاہیے کہ وہ اختلاف جو تفسیق و تکفیر کا باعث ہو سکتا ہے وہی اختلاف نص صحیح میں ہو

سکتا ہے صرف ظن اور تاویل کے رو سے ایک بڑی جمعیت پر تکفیر کے فتوے صادر کرنا محض غلو اور افراط بھی ہے اور خداوند کریم کی ناراضگی کا موجب بھی۔

سماع موسیقی ہے یا غیر موسیقی۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ سماع کی کوئی بھی قسم موسیقی کے قواعد و ضوابط سے جدا نہیں ہے اس لئے جن چیزوں پر غنا کا لفظ صادق آتا ہو چاہے وہ غزل ہو' قصیدہ ہو' رباعی ہو یا ٹپہ ٹھمری اور دادرہ ہو یہ سب چیزیں آواز کے اٹھانے اور کم کرنے سے باہر نہیں ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے شعر کی کوئی قسم بھی عروض و قواعد کے بغیر نہیں ہوتی۔ یا کلام کی کوئی بھی قسم صرف و نحو کے قواعد سے باہر تصور نہیں کی جا سکتی۔ (ہاں! یہ حقیقت ہے کہ) صرف و نحو' عروض اور قواعد موسیقی بعد (آخر) میں بنے ہیں اور شعرو کلام اس دنیا میں پہلے سے موجود تھے اور جو کلام یا اشعار ان قواعد و ضوابط سے قبل وجود میں آئے تھے۔ آج بھی موجود ہیں مگر وہ بھی انہی قواعد کے تحت آتے ہیں چنانچہ غنا بھی موسیقی کے قواعد کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی شعر عروض کے بغیر نہیں کہا جا سکتا اور کوئی کلام صرف و نحو کے بغیر ناممکن ہے۔

رہی بات ان علوم کے سیکھنے کی تو ظاہر ہے کہ کوئی علم بھی مشق و ریاض کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح غنا بھی بہ کمال و تمام مشق و ریاض سے سیکھی جاتی

ہے مراد یہ کہ ہر غزل گانے والا مطرب یا گویا نہیں کہلایا جا سکتا یعنی جس طرح ہر شاعر عروضی نہیں ہوتا اور ہر متکلم صرفی یا نحوی نہیں ہوتا اسی طرح غنا کے کمال کا غنا کی اصل سے کوئی تعلق نہیں اور قرآن عظیم الشان کی تلاوت یا قرات بھی جس لہجہ یا طرز میں کی جاتی ہے اگر چہ راگنی کی صورت اس میں بھی پائی جاتی ہے مگر اس میں آواز کی ایسی کمی بیشی (غنا کی طرح) نہیں ہوتی اس لئے قرآن مجید کی قرات کو غنا نہیں کہا جا سکتا البتہ مجازاً" جیسے ایک حدیث شریف میں ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

لیس منا من لم یتغنی بالقرآن

جو کوئی قرآن حکیم کو غنا کے ساتھ نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں ہے

یہاں غنا سے مراد خوش الحانی اور خوش آوازی ہے اور اسی مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے خیال میں "ایک بہت بڑے اعتراض" کا جواب دیا جائے جن کا کہنا ہے کہ

"صوفیہ مزامیر کے ذریعے خدا سے اپنی محبت میں اضافہ کرتے ہیں یا اشعار سے یعنی اگر بات ایسی ہو تو مناسب یہی ہے کہ قرآن مجید کے سننے سے اپنے شوق الٰہی اور محبت الٰہی میں اضافہ کریں کیونکہ قرآن مجید کا سننا ہر چیز سے برتر ہے"۔

اس اعتراض کا جواب حضرت امام غزالی قدس سرہ کے الفاظ میں سماعت فرمایئے حضرت امام غزالی قدس سرہ اپنی بلند پایہ تصنیف "کیمیائے سعادت" میں فرماتے ہیں:۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں کی سماع بھی ممکن ہے اور اس سے

بھی وجد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے چنانچہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو قرآن حکیم کی سماع کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے ہیں اور ان میں سے ایسے لوگوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جو قرآن حکیم کی سماع کے دوران وفات پا چکے ہیں ایسے لوگوں کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جا سکتی۔ البتہ ہم نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں ان کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے تاہم صوفیائے کرام جو قاریوں کی جگہ قوالوں کو بٹھاتے ہیں اور قرآن مجید کی بجائے سماع و غنا کا اہتمام کرتے ہیں تو اس کے پانچ اسباب ہیں اول یہ کہ قرآن مجید کی ساری آیتیں بحیثیت مجموعی عاشقین کے حال کے مطابق نہیں۔ اس لئے کہ ان میں کافروں کے قصے' معاملات کے احکام اور دیگر امور بھی شامل ہیں اس لئے کہ قرآن مجید ہر قسم کے لوگوں کے لئے رہنمائی اور اصلاح کا کام دیتا ہے مثلاً" جب قاری میراث کی آیتوں کی تلاوت کرے کہ ماں کے لئے چھٹا اور بہن کے لئے آدھا حصہ مقرر ہے یا یہ کہ جب کسی عورت کا خاوند مر جائے اسے چار مہینے اور دس دن عدت کی مدت گزارنی ہو گی علی ھذاالقیاس تو ایسی آیتیں ہر عاشق کی عشق میں اضافہ نہیں کرتیں الا اس عاشق کے جو سرتاپا عشق الٰہی میں غرق ہو اور ایسی ہر چیز پر وجد میں آتا ہو اگرچہ وہ چیز مقصود سے دور ہی کیوں نہ ہو مگر تاہم
ایسے عاشق نایاب ہیں (۱)

....

(۱) جیسے گلستان میں حضرت شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا (بہ آواز دولاب مستی کنند تو ایسے لوگوں کے لئے قرآن مجید کی سماع جائز ہے (مولف)

دوسرا سبب یہ کہ اکثر لوگوں کو قرآن مجید یاد ہوتا ہے وہ کثرت سے تلاوت کرتے ہیں اور کثرت سے اسے سنتے ہیں اور جو چیز بہت زیادہ سنی جاتی ہو وہ بسا اوقات دل کو آگاہی نہیں دیتی۔ کیونکہ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب وہ پہلی بار اسے سنتا ہے تو اس پر حال طاری ہو جاتا ہے مگر بار دیگر سننے سے حال طاری نہیں ہوتا اور غزل تو نئی سے نئی ہوتی ہے جبکہ قرآن مجید تو وہی ہے جو تھا۔ تم نہیں دیکھتے جب عرب حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور تازہ تازہ قرآن مجید کی آیتوں کو سنتے تو ان پر عجیب حالت طاری ہوتی اور باقاعدہ روتے رہتے حضرت ابوبکرؓ کا کہنا ہے کہ کنا کما کنتم ثم قست قلوبنا" یعنی ہم بھی (کسی وقت) تمہاری طرح تھے مگر اب ہمارے دل سخت ہو گئے ہیں۔

مراد یہ کہ قرآن مجید سے قرار پا چکے ہیں اور اس کے سننے کے عادی ہو گئے ہیں غرضیکہ جو چیز تازہ ہو اس کا اثر بھی زیادہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاجیوں کو حکم دیتے کہ اپنے اپنے شہروں کو بعجلت روانہ ہونا کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں کعبہ سے اتنے مانوس ہو جاؤ کہ خدانخواستہ اس کی بڑھائی (رعب) تمہارے دلوں سے نکل جائے تیسرا سبب یہ کہ بہت سے دل ایسے ہیں جب تک ان کو خوش آوازی اور لحن داؤدی کے ذریعے حرکت نہ دی جائے وہ متحرک نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ عام گفتگو یا باتوں سے کسی پر وجد کی کیفیت طاری نہیں ہوتی لیکن اگر کلام موزون خوش الحانی سے ادا ہو تو وجد طاری ہو جاتا ہے کیونکہ اسکا اثر کچھ اور ہوتا ہے اور یہ

قرآن مجید کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا کہ گویا وہ بھی غزلوں یا گانوں کی صورت میں
کسی (تلاوت کی) جائے اور اس پر تالی بجائی جائے یا اس میں تصرف کی جائے اور جب
وہ بے الحان ہو تو مجرد رہ جائے گا اور اگر عشق کی آگ اسی طرح گرم ہو تو اس سے
اور تیز ہو جائے گی چوتھی سبب یہ کہ الحان کو دوسری چیزوں کی طرح آوازوں کی مدد کی
بھی ضرورت ہوتی ہے جیسے نے' دف' طبل اور شاہین وغیرہ اور چونکہ یہ چیزیں ہزل کی
صورت رکھتی ہیں اور قرآن مجید عین جد ہے لہٰذا اس کو ایسی چیزوں سے بچانا چاہیے جو
عوام کی نظر میں کم مایہ ہوں جیسے جب حضور اکرم ﷺ ربیع بنت معوذؓ کے گھر
تشریف لے گئے تو اس کی باندیاں دف بجا رہی تھیں اور ساتھ گا بھی رہی تھیں۔ جب
انہوں نے حضور اکرم ﷺ کو دیکھا تو آپ ﷺ کی تعریف میں اشعار کہنا
شروع کئے اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایسا مت کہو البتہ جو کچھ پہلے کہہ رہی
تھیں وہی کہو۔ وجہ یہ کہ حضور ﷺ کی ثنا عین جد ہے اور دف کے ساتھ
مناسب نہیں ہے" (یہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کی اپنی اشتہاد ہے مصنف) اصل بات
یہ ہے کہ باندیاں کہہ رہی تھیں وفینا نبی یعلم ما فی غد
ہم میں وہ نبی ﷺ ہے جن کو آنے والے کل واقع ہونے والے حال کا علم ہے
تو اس سے حضور ﷺ نے منع فرمایا۔ مطلب یہ کہ حضور اقدس
ﷺ یہ پسند نہ فرماتے تھے کہ آپ ﷺ کو علم غیب کی نسبت ہو اور
امام غزالی نے بھی فرمایا ہے کہ دف کے ساتھ مناسب نہ تھا یعنی علم غیب کی اس قسم
نسبت ماس کا ثبوت کیمیائے سعادت کی فصل سماع میں صفحہ ۳۷۴ پر موجود ہے اس

قسم کے اشعار سے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ ان لوگوں (صوفیاء) کا ہر لفظ سے اپنے حال کے مواتق معنے اخذ کرنا ممکن ہے یہ لوگ زلف سے کفر کا اندھیرا' چہرے سے نور ایمان یا شائد زلف سے سلسلہ اشکال حضرت الہیت بھی مراد لیتے ہیں جیسے کوئی کہتا ہے

گفتم بشمارم سریک حلقہ زلفش
تابود کہ بہ تفصیل سر جملہ بر آرم
خندید بہ من برسر زلفین کہ مشکیں
یک پیچ بہ پیچد و غلط کرد شمارم

اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ خدائے پاک کی مدح و صفت بھی سماع میں داخل ہے اور دف کے ساتھ جائز و حلال ہے تو پھر آنحضرت کی نعت یا صفت بیان کرنا بھی دف وغیرہ کے ساتھ بدرجہ اولیٰ حلال و مستحب اور عبادت کے مترادف ہے البتہ یہ تعریف ایسی نہ ہو جو شریعت کے خلاف ہو۔ اس لئے کہ دف ہزل کی صورت رکھتا ہے پانچویں یہ کہ ہر کسی کی ایک خاص حالت ہوتی ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے حال کے مطابق شعر سنے مگر جو شعر اس کے حال کے مطابق نہیں ہوتا اس سے کراہت پیدا ہوتی ہے اور شائد وہ یہ کہہ دے کہ ایسا مت کہو بلکہ یوں کہو۔ اور یہ بات قرآن مجید کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی کہ وہ اپنے اندیشوں کو اپنے خیال کے ساتھ مطابق کر سکے اور قرآن کے معنے برعکس کر دیئے جائیں مشائخ نے جو قوال مقرر فرمائے ہیں اس کی وجہ یہی ہے جو بیان کر دی گئی تو اب دو وجوہات ہیں ایک سننے والے کی ضعف اور

"سرے قرآن مجید کی عظمت اس لئے کہ تصرف (۱) میں گرفتار نہ ہو جائے"

رہا یہ اعتراض کہ سماع صرف قرآن مجید ہی کا ہونا چاہیے مناسب نہیں ہم نے قرآن کو غنائیت سے پڑھنے کے متعلق ایک حدیث شریف پیش کی ہے ایک اور حدیث مبارک یہ ہے:۔

لکل شیئی حلیته و حلیته القرآن حسن الصوت

ہر ایک چیز کا ایک زیور ہوتا ہے قرآن مجید کا زیور خوش آوازی ہے۔

اور ایک تیسری حدیث مبارک میں ہے:۔

و عطیت مزمار من آل داؤد۔

یعنی آل داؤد سے ایک مزمار مجھے عطا ہوا ہے:۔

یعنی "نے" اور نے کی خوش آوازی اور ایک چوتھی حدیث میں ہے

ما اذن اللہ بشئی ما اذن البنی یتغنی بالقرآن

یعنی اللہ تعالیٰ نہیں سماعت فرماتا کوئی اور شے الا نبی ﷺ کی خوش آوازی سے قرآن مجید کی قرات اور انہی وجوہات کی بنا پر حضرت شیخ محدث نے لکھا ہے:۔

و در معنے غنا ہمہ یکیست و راجع بصوت احسن است نعم در قرات قرآن

....

(۱) اصل کتاب میں یہی "تصرف" ہی لکھا گیا ہے اگر چہ میرے خیال میں یہاں کچھ اور ہونا چاہیے۔ تنزل ...... یا اسی طرح کا کوئی دوسرا لفظ۔ (مترجم)

تفاوتے مے کند کہ در غنائے موسیقی تمطیط و تغیر بسیار است"۔اور مجد الدین فیروز آبادی نے سفر السعادت" کے آخر میں لکھا ہے:۔ درباب قرآت بالحان و تغنی چیزے ثابت نہ شدہ بلکہ خلاف آں در صحیح وارد است و ھو ان النبی دخل مکۃ یوم الفتح و ھو یقرا سورۃ الفتح و یرجعونھا قال الراوی والرجع آآآ۔یعنی حضور اکرم ﷺ فتح مکہ کے روز مکہ تشریف لائے آپ ﷺ سورہ فتح کی تلاوت فرما رہے تھے اور ترجیع بھی فرما رہے تھے راوی کہتا ہے کہ ترجیع آآآ کو کہتے ہیں

ظاہر ہے کہ جب یہ تینوں الف ممدودہ ہوں تو اس سے مراد آواز کو کم یا زیادہ کرنا ہوتا ہے اور اس کے بغیر لہجہ ممکن نہیں ہے اور موسیقی کی اصطلاح میں اس کو سر کہتے ہیں۔

حضور اقدس ﷺ کے پسندیدہ اشعار۔

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد گرامی ہے الشعر کلام حسن و قبیحہ قبیح یعنی شعر ایک کلام ہے اس میں جو اچھا ہے وہ اچھا ہے اور جو برا ہے وہ برا۔ اور قرآن شریف میں یہ آیت مبارک والشعراء یتبعھم الغاون (اشعراء ایت نمبر ۲۲۴) یعنی شاعروں کی راہ (پر) تو بے راہ لوگ ہی چلا کرتے ہیں تو یہ ایت مبارک شعرائے کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس کے بعد الا الذین آمنو و عملوا الصلحت (یعنی مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے) کا ذکر بھی اس کے فورا" بعد آتا ہے (یہ ذکر سورہ شعراء کی آخری آیت میں موجود ہے اس عنوان سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کو خود قرآن شریف میں ملاحظہ فرمالیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن شریف نے ہر نیک و بد کام کے درمیان ایک لکیر کھینچ دی ہے اور اسی طرح کفار اور مومنین کے اعمال کا فرق بھی واضح کیا ہے۔

قرآن شریف اللہ تعالیٰ کا برحق کلام ہے اور اس میں کوئی بات اندھا دھند نہیں فرمائی گئی ہے نہ اس کا امکان ہے اور اس میں کفار کے بارے میں ارشاد ہے وانھم یقولون مالا یفعلون یعنی یہ لوگ زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں جبکہ مومن کی شان اس سے جدا ہے۔ طاہر چشتی)

اور خلیل احمد عروضی کی ایک روایت شمائل الاتقیاء میں موجود ہے کہتے ہیں:۔

وکان الشعراء احب الی رسول اللہ ﷺ من کلام الکثیر

یعنی حضور اقدس ﷺ کو دوسرے کلام یا عام باتوں سے اشعار پسند تھے۔

جہاں تک غزل میں معشوق کے اعضا کی تعریف' انکار یا اقبال کا تعلق ہے یا معشوق کی اداؤں' ناز نخروں اور عادتوں کے بیان یا اس کے ہجر و وصال کی بات ہو تو ازروئے شرع شریف یہ منع نہیں ہے اس کا ثبوت قصیدہ بانت سعاد میں ہمیں ملتا ہے۔ یہ قصیدہ حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اقدس ﷺ کی شان میں لکھا تھا۔ اس کے شروع میں حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معشوق کی صفت کی ہے یہ قصیدہ مبارک بانت سعاد حضور اقدس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود سماعت فرمایا ہے اور اسے پسند بھی فرمایا ہے ایک مقام پر حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تھا۔

'والعفو عند کرم الناس مامول

حضور اقدس ﷺ نے اس کی اصلاح کی اور فرمایا۔

العفو عند رسول اللہ مامول۔

(سبحان اللہ)

مزید براں حضرت علی علیہ السلام' حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عائشہ ؓ نے بھی اشعار کہے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا۔

این موسیٰ این عیسیٰ این یحییٰ این نوح
انت یاِ صدیق عاص تب الی المولیٰ الجلیل

موسیٰ علیہ السلام کہاں ہیں، عیسیٰ علیہ السلام کہاں ہیں، یحییٰ علیہ السلام کہاں ہیں اور نوح علیہ السلام کہاں ہیں۔ اے صدیق عاصی (گنہگار) خدا سے توبہ کر۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

ومن طلب الدعاء بغیر زهد کمافی اللیل یرمی بالذباب

جو شخص پرہیز گاری کے بغیر خدا سے دعا مانگتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص گھپ اندھیرے میں مکھی پر تیر چلا رہا ہو۔

یہ مندرجہ ذیل اشعار بھی امیر المومنین علی علیہ السلام کے ہیں۔

بقدر الکدتنقسم المعالی
و من طلب العلی سهر اللیالی
تروم العزثم تنام لیلا
یغوص البحر من طلب الا لی

یعنی مراتب کوشش کے اندازے سے تقسیم ہوتے ہیں اور جو کوئی اعلیٰ مرتبے کا طالب ہو تو ایسے لوگ راتوں کو جاگتے ہیں ایک تم ہو کہ قدر و منزلت بھی مانگتے ہو اور رات کو نیند کے مزے بھی لیتے ہو۔ مگر یاد رکھو۔ جو لوگ لعل و جواہر کے متلاشی ہوتے ہیں وہ سمندر میں غوطے لگاتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ازواج مطہرات کے بارے میں فرماتی ہیں۔

کبد الحسود تقطعی قدیات من اهوی معی
یا لیل طل یا نوم ذل یا شمس قف لا تطلعی

یعنی حاسدوں کے کلیجے زخمی ہو گئے اور میرے پاس وہ شخص ٹھہر گیا جسے میں دل

سے چاہتی ہوں سوائے رات طویل ہو جا' اے نیند ذلیل' (ختم) ہو جا اور اے سورج تو بھی ٹھہر جا اور طلوع نہ ہو۔

خاتون جنت حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے حضور اقدس ﷺ کا مرثیہ کہا تھا اور بہت مشہور ہے اسی مرثیے کا ایک شعر ہے۔

صبت علی مصائب لوانها

صبت علی الایام صریان لیالیا

یعنی مجھ پر ایسی مصائب نازل کی گئیں اگر وہ دنوں پر گرائی جاتیں تو وہ راتوں میں بدل جاتیں۔

حضرت عمر بن شرید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز میں آنحضرت ﷺ کی ردیف میں سوار تھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تمہیں امیہ بن صلت کے اشعار میں سے کچھ یاد ہیں"۔ میں نے عرض کیا کہ "ہاں! حضور! یاد ہیں" تو ارشاد ہوا کہ "کہو" تو میں نے ایک شعر کہہ دیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا "آگے (اور) کہو" تو میں نے ایک شعر اور کہہ دیا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اور کہو" یہاں تک کہ میں نے سو اشعار کہہ دیئے۔ (یہ حدیث شریف صحیح مسلم اور مشکوۃ شریف میں موجود ہے)

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

اللہ یودد حسانا" بروح القدس

اللہ تعالیٰ روح القدس کے ذریعے حسان کی مدد کرتا ہے۔

اور جہاں تک امیہ بن صلت کا تعلق ہے تو وہ ایک کافر شاعر تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اچھے اشعار سننا سنت ہے اور ان کی طرف رغبت بھی سنت ہے چاہے وہ اشعار کسی کافر شاعر کے کیوں نہ ہوں اور فقیہ ابو اللیث کی دبسان سے شمائل

الاتقیاء میں نقل کی گئی ہے:۔

کان اصحاب البنی نیا شدون الشعر و النبی جالس بینهم

یعنی اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اشعار میں (گیت) گا رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان تشریف فرما تھے۔ (سماعت فرما رہے تھے)

اور جنگ خندق کے موقع پر تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا ایک تاریخی حقیقت ہے۔

انا النبی لاکذب

انا ابن عبد المطلب

علاوہ ازیں "مضمرات" میں تحریر ہے کہ: شهادة الشاعر اذالم یقذف فی شعره مقبولة لان الشعر لیس یفسق۔

شاعر کی شہادت (گواہی) قبول ہے اگر وہ اپنے اشعار میں گندی بات یا گالیاں نہ دیتا ہو کیونکہ شعر کہنا فسق نہیں ہے۔

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نظم اور نثر دونوں کلام کے اقسام ہیں اور دونوں ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح غزل اور ٹپہ بھی کلام ہی کی قسمیں ہیں اور اگر (خدانخواستہ) ان میں گالیاں دی گئی ہوں یا کفر و شرک کی باتیں کی گئی ہوں یا دوسری خلاف شرع باتیں کی گئی ہوں یا ہجو اور دیگر قسم کے مبالغات ہوں۔ یا ایسی جھوٹی اور دروغ باتیں ہوں جن کی تحمیل سچائی یا سچی باتوں پر نہ ہوتی ہو تو اس صورت میں نظم و نثر دونوں برابر ہیں۔ یعنی صرف نظم ہی نہیں اگر نثر میں بھی خلاف شرع باتیں کی گئی ہوں تو وہ منع ہوں گی۔ مراد یہ کہ گیت گانا (سندرے) فی نفسہ حرام نہیں اور اس میں کافر و مسلمان کی تخصیص بھی نہیں جس کا کلام اچھا اور بے ضرر ہو گا بہتر ہو گا اور جس کا کلام برا ہو گا تو ظاہر ہے کہ وہ حرام ہو گا۔ اصل بات یہ ہے کہ ارباب

قال کی اصطلاحات جدا ہیں اور ارباب حال کی الگ۔

ہر یکے را اصطلاحے دادہ ام

قطع نظر اس کے ایک حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں یہ اشعار سنائے جا رہے تھے۔

حیتہ الھولٰی کبدی فلا طبیب ولا راقی

الا الحبیب الذی شغفت بہ قلبی فعندہ رقیتی و تریاقی

بہ تحقیق میرے دل کو محبت کی اژدھانے کاٹا ہے جس کے علاج کے لئے کوئی طبیب نہیں کیونکہ میرا طبیب صرف وہی ہے جو مجھ سے میرا دل لے گیا ہے"

یہ اشعار سماعت فرماکر حضور اقدس ﷺ نے وجد فرمایا اصحاب رسول ﷺ نے بھی آپ ﷺ کی موافقت کی۔ وجد فرماتے وقت ردائے مبارک (چادر) حضور اقدس ﷺ کے دوش مبارک سے گر گئی۔ چنانچہ اسی چادر اقدس کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے چار سو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور آپس میں بانٹ دیئے۔ معاویہ نے پوچھا کہ آپ ﷺ نے یہ کیا کیا۔ تو حضور اقدس ﷺ نے جواب دیا

یا معاویہ لیس بکریم من لم یھتز عند سماع ذکر الحبیب

اے معاویہ! جو کوئی محبوب کا ذکر سنے اور خوش نہ ہو تو وہ کریم نہ ہو گا۔

یہ حدیث مبارک صحیحین میں موجود ہے۔ اور یہ وہ وقت تھا۔ کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے تھے۔ اور حضور اقدس ﷺ کو یہ نوید سنائی تھی کہ "یا رسول اللہ ﷺ! آپ کی امت کے درویش لوگ آپ کی امت کے اغنیاء کے مقابلے میں پانچ سو برس قبل جنت میں جائیں گے" یہ سن کر حضور اقدس ﷺ بے حد خوش ہوئے اور استفسار فرمایا کہ "تم میں سے کوئی ایسا ہے جو اشعار

کہے"۔ چنانچہ ایک شخص نے مندرجہ بالا اشعار کہے اور یہ روایت تفسیر احمدی میں موجود ہے بہرحال اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خوشی کے موقعہ پر سماع جائز ہے۔

یہاں پر ایک اور بات بھی ہے حضرت جامی قدس سرہ کا ایک شعر ہے فرماتے ہیں۔

روحی فداک اے صنم الطحی لقب

آشوب ترک شور عجم فتنۂ عرب

اب اگر کوئی ایسے کلام پر اعتراض کرتا ہو۔ تو سمجھ لیجیے۔ کہ ایسے "حضرت" کو انس و محبت کا مقام حاصل نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:۔

ان من اشد امتی لی حبانا من یکون بعدی یود احدھم لو رائی باھلہ و مالہ

مجھ سے بے حد محبت وہ لوگ (بھی) کرتے ہوں گے جو میرے بعد ہوں گے ان کی حالت یہ ہوگی کہ اگر مجھے دیکھیں تو مال و اولاد سب کچھ مجھ پر قربان کریں گے۔

فی الحقیقت یہ صفت اور خصوصیت ہر کسی کو عنایت نہیں کی گئی ہے ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء ایسے لوگوں کے دلوں میں محبت کا نشہ بھرپور ہوتا ہے اور بے اختیاری کی حالت میں ایسی باتیں کرتے ہیں اور جو لوگ ایسے حضرات سے محبت رکھتے ہیں یا ان کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے ہیں وہ بھی انہی کی طرح ہو جاتے ہیں۔

حرام اور حلال سماع۔

گذشتہ بحث سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو گئی ہے کہ سماع کے دو اقسام ہیں۔ ایک حلال اور دوسری حرام۔ اور اس کے ثبوت میں ہم حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رضی اللہ عنہ کا ایک حوالہ بھی پیش کرنا پسند کریں گے فرماتے ہیں۔

سماع علی الاطلاق حرام نیست۔ وعلی الاطلاق حلال نہ۔ بر عوام حرام است کہ بہ لہو و لغو شنوند و برزہاد مباح است و براہل تصوف مستحب است و برعشاق حلال۔ وہم خواجہ مے فرماید۔

سماع بر چہار قسم است یکے حلال کہ شنوندہ را تمام میل بجانب حق بود بہ مجاز ہیچ میلے نہ۔ دوم مباح است کہ آنکہ صاحب سماع رامیل بہ سوئے حق بیشتر و جانب مجاز اندکے۔ سوم مکروہ ہست آنکہ میلے بسوئے مجاز بود مجازی کہ ممنوع شرع است اگر یکے میل بحلال کنیزک خود دارد آں مباح باشد ورنہ حرام چہ میل در شرع کند۔ فاما صاحب سماع باید کہ فرق میان حلال و حرام و مکروہ و مباح کردن برآند۔ ھذا سرہ بین السامع والحق۔

یعنی یہ سننے والے اور حق بات کے درمیان ایک راز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سماع فی نفسہ حرام نہیں ہے البتہ بعض وجوہات کی وجہ سے حرام ہو جاتا ہے مثلاً اگر راگ یا شعر میں بے حیائی کا مظاہرہ' بات یا گالی وغیرہ موجود ہو یا ایسے امور جو نفس کی خواہش کے مطابق ہوں۔ یا قوال کوئی خوبصورت لڑکا ہو اور سننے والے کا دل اس کی طرف متوجہ ہوتا ہو یا سننے والے کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہو۔ علی ھذا القیاس۔

سماع کے شرائط۔

اولیائے کرام رضی اللہ عنہم نے سماع کے لئے تین شرائط مقرر فرمائے ہیں یعنی اخوان' مکان اور زمان۔ اخوان سے ان کا مطلب وہ لوگ ہیں جو صاحبان طریقت ہوں جو آپس میں ہمدرد و ہمراز ہوں اور نیز سماع کے وقت غیر لوگ موجود نہ ہوں نہ وہ لوگ موجود ہوں جو سماع کو لھو اور فضول گانا بجانا تصور کرتے ہوں۔ زمان سے مراد وہ

اوقات ہیں جن میں سنن و فرائض نہ آتے ہوں۔ یا کھانے پینے اور نیند کا وقت نہ ہو (مطلب یہ کہ سنن و فرائض کی ادائیگی کا وقت نہ ہو نہ کھانے پینے کا وقت ہو) تاکہ دل اس طرف مائل نہ ہو۔ اور مکان سے مراد ایک ایسی جگہ ہے جو علیحدہ ہو اور اس میں غیر نہ ہو۔

ان میں سے جہاں تک تیسری شرط کا تعلق ہے تو فی زمانہ اس کی پابندی ممکن نہیں رہی ہے میرے **مرشد پاک** (قدس سرہ) کا ارشاد ہے کہ "اس زمانے کے اکثر لوگ شرعی امور اور ان پر عمل کرنے سے بے پرواہی برتتے ہیں۔ فسق و فجور میں بھی روزانہ اضافہ ہو رہا ہے اور اگر لوگوں کو وعظ و نصیحت شروع کی جائے تو لوگ اس کے سننے سے کتراتے ہیں اور بیٹھ کر سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ البتہ سرود ایک ایسی چیز ہے جو ہر آدمی کا دل اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اگر چہ عوام کے قلوب لھو کی طرف مائل ہیں مگر جوں جوں وہ صوفیانہ سماع میں شرکت اختیار کریں گے ایک بار' دوبار اور سہ بار آئیں گے۔ تو آخر کار ان کے دل اس طرف مائل ہو جائیں گے۔ ارشاد خداوندی بھی کچھ اسی طرح ہے:۔

ادع الٰی سبیل ربک بالحکمتہ والموعظتہ الحسنتہ

"یعنی آپ ﷺ اپنے رب کی راہ کی طرف (لوگوں کو) علم و حکمت و نصیحت کے ذریعے بلائیے۔

اور یہ کام بھی حکمت سے تعلق رکھتا ہے اس لئے کہ فی زمانہ وعظ و نصیحت سننے کے لئے کوئی نہیں آتا۔ جبکہ سماع بھی کوئی حرام فعل نہیں"۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ عام لوگ سماع کی محفل میں شریک نہ ہوں۔ تو ایسے لوگوں کا ایک جواب تو وہ ہے جو میں نے اپنے مرشد پاک (قدس سرہ) کی زبانی لکھ دیا ہے اور دوسری بات یہ کہ اس کامؐ کے لئے ہمیں اپنا کوئی خاص (ذاتی) مکان

میسر نہیں ہے ہم محفل سماع دوسروں کے ڈیروں میں منعقد کرتے ہیں۔ چنانچہ تیسری شرط کے فوت ہونے کی صورت میں ہم نے اپنے سلسلے کے مرشدوں کی "سنت" کو ہرگز ترک نہیں کر سکتے۔ اور جس قدر فائدہ سماع میں ہے اتنا نقصان شرط کے توڑنے میں نہیں ہے ایک اور بات یہ بھی ہے کہ پرائے ڈیرے میں ہم کسی کو آنے سے منع بھی نہیں کر سکتے۔ اور جیسا کہ ہم نے اس فصل کے اوراق میں تحریر کیا ہے کہ سماع کے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے چنانچہ بہتر یہی ہو گا کہ سب مسلمانوں پر نازل ہو۔ حضرت حلیم گل بابا رحمتہ اللہ علیہ نے "مقامات قدسیہ" میں لکھا ہے:-

نقل است از رسالہ حجتہ الاسلام امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کہ اگر مریدے عامی در مجلس شیخ باشد او رانیز سماع مباح است کہ بشنود کما قال علیہ الصلوۃ والسلام ھولاء قوم لایشقی بھم جلیسھم۔ ایں قومے است کہ ہر کہ ہمراہ ایشاں نشیند بدبخت نمے ماند۔ یعنی مشائخ برحق قومے اند کہ ہم نشین ایشاں بدبخت نہ شود۔

یعنی حضرت حجتہ الاسلام امام غزالی قدس سرہ اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں کہ اگر کسی شیخ کا کوئی عامی مرید اس کی مجلس میں سماع سنے تو اس عامی مرید کے لئے مباح ہے اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ (صوفیاء) ایک ایسی قوم ہے جن کی مجلس میں بیٹھے والا کوئی شخص بھی بدبخت نہیں ہو سکتا۔ یعنی جو شخص بھی ان کی مجلس میں اٹھتا بیٹھتا ہو وہ بدبخت نہیں ہو سکتا۔

چونکہ اس زمانہ میں تبلیغ کے لئے انتہائی حکمت و تدبیر کی ضرورت ہے اس لئے مکان کی شرط ضروری نہیں اگرچہ اگلے وقتوں کے اولیاء کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو ضروری جانا ہے مگر اس زمانے کے اولیاء اس کی ضرورت کو اہمیت نہیں دیتے۔

آداب سماع۔

مشائخ عظام قدس اسرارھم نے سماع کے لئے بعض آداب مقرر فرمائے ہیں اور ہر سامع کے لئے ضروری ہے کہ ان کا خیال رکھے۔ یہاں پر چند ایک ایسی باتیں میں لکھنا بھی پسند کرتا ہوں جو میرے مرشد پاک (قدس سرہ) میں موجود ہیں پہلی بات یہ کہ حضور باچہ جان (قدس سرہ) باوضو ہو کر سماع سنتے ہیں۔ سماع کی ابتداء اور انتہا میں تلاوت کلام پاک کرتے ہیں اور کلام الہی کی تقدس کے خاطر شیرینی بھی تقسیم فرماتے ہیں۔ سماع کے دوران ہرگز ہرگز کسی دوسرے امر کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اگر کوئی مصنوعی طور بھی پر وجد کرلے تو اس کو منع نہیں فرماتے (غرضیکہ مکمل یکسو ہو کر سماع سنتے ہیں) سماع کے بعد بھی مصنوعی وجد والے کو یہ نہیں فرماتے کہ آئندہ ایسا نہ کرو۔ البتہ عمومی طور پر فرما دیتے ہیں کہ مصنوعی وجد و حال کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مزید برآں جب تک محفل سماع جاری ہو اور جب تک مکمل طور پر ختم نہ ہو حضور (قدس سرہ) محفل سے باہر نہیں نکلتے۔

اب شمائل الاتقیاء کی چند باتیں تحریر کی جاتی ہیں جو اس کے مصنف نے رسالہ قشیری رحمتہ اللہ علیہ سے نقل کی ہیں لکھتے ہیں۔

چنانچہ در سماع طہارت ظاہر واجب است۔ طہارت باطن نیز می باید و آں ازالہ خطرہ غیرست۔

یعنی سماع میں ظاہری طہارت (وضو) ضروری ہے باطنی طہارت بھی لازمی ہے کیونکہ اس سے غیراللہ کے خطرہ کا ازالہ ہوتا ہے۔

خواجہ حافظ شراز رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

طہارت ارنہ بخون جگر کند عاشق

بقول مفتی عشقش درست نیست نماز

رسالہ بوراق میں تحریر ہے:۔

"اگر چہ صاحب سماع را واردے روئے دہد۔ و در خاطر ایثاری برقوال و اقران بگزرد و درحال بے توقف و تاخیر و بے تامل و تانے بعمل مقرون کند تا موجب حرمان و مستوجب حرمان نہ گردد"۔

ترجمہ رسالہ قشیری میں لکھا ہے:۔

"اگر کسے را واردے روئے داد و ذوق باقی باشد اگر اصحاب مجلس بنشینند اوہم موافقت کند تا ملامت بہ کسے نہ رسد و اگر نشستہ حرکتے میکند روا باشد"

"یعنی اگر کسی پر "حال" طاری ہو جائے۔ اور اس کا شوق ابھی باقی ہو اور اسی دوران حاضرین مجلس بیٹھ جائیں تو مناسب یہی ہے کہ وہ بھی بیٹھ جائے تاکہ کوئی ملامت (خفہ) نہ ہو۔اور اگر بیٹھے بیٹھے وجد کرے تو جائز ہے۔

آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

"آداب دیگر:۔ اگر درویشے از سروجد برخاست اصحاب باید کہ موافقت کنند وہمہ بخیزند کہ ایں عادت محمودہ است و سنت حسنہ مخالفت آں ترک حرمت باشد"

"یعنی جو درویش دوران وجد اٹھ جائے اور کھڑے ہو کر وجد کرے تو حاضرین کے لئے بھی مناسب ہے کہ کھڑے ہو جائیں۔ یہ بڑی اچھی عادت ہے اور سنت حسنہ ہے اور اس سے درگذر کرنا یا چھوڑنا ترک حرمت ہے"۔

"آداب دیگر، اگر یکے رابیتے و صوتے ذوقے داد وبکررمے کنانند۔ روا باشد۔ اگر بہ وجود طلب تسلیم شودو مکرر نہ کنانند حق تعالیٰ در دل گوئندہ الہام کند تا اوبے تقاضائے آنکس تکرار کند"۔

"یعنی اگر کسی کو کوئی شعر یا آواز پسند آجائے اور وہ اسے باردگر سننا چاہتا ہو تو یہ جائز ہے اور اگر برداشت کرلے اور مکرر کہنے کے لئے نہ کہے تو حق تعالیٰ قوال کے دل کو الہامی طور پر باخبر کردیتا ہے اور وہ اسے مکرر کہہ دیتا ہے"۔

اگے تحریر فرماتے ہیں۔

" اگر شیخے یا صاحب کشف بر حالت یکے واقف باشد کہ وجد و حال بحق نیست و حرکات با ادب نمے کند۔ بظاہر خاموش باشد و بہ باطن مدد نماید۔ تا او ازاں حال و بے ادبی باز آید"۔

یعنی "اگر شیخ طریقت یا کسی دوسرے صاحب کشف شخص کو معلوم ہو جائے کہ مجلس میں کسی شخص کا وجد و حال مصنوعی ہے تو مناسب یہی ہے کہ بہ ظاہر قطعاً" خاموش رہے البتہ باطنی طور پر اسے ایسی توجہ کرے کہ وہ اپنی حرکت اور بے ادبی سے باز آجائے"۔

آداب دیگر:۔ در ابتدا و انتہا سماع قرآن خوانند۔ تابہ برکت آں قائل و سامع مغفور گردد"۔

آداب دیگر یہ کہ سماع کی ابتدا اور خاتمہ پر قرآن شریف کی تلاوت کی جائے تاکہ حق تعالیٰ قوال اور سامعین کو بخش دے"۔

حضرت علی ھجویری عرف داتا گنج بخش قدس سرہ العزیز اپنی مقبول عالم کتاب کشف المحجوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

" سامع در خاستن تکلف نہ کند یعنی بے وارد نہ خیزد۔ وبہ جہت خاستن از کسے حشم نہ دارد۔ و اگر مساعدت کند منع ہم نہ کند۔ و در ابیات امتحان نہ کند کہ چہ شنیدی۔ وچہ تحمیل کردی۔ کہ در آں پراگندگی ہا باشد و برکتے در جمع نماند۔ حضرت شیخ ما فرمودہ کہ از کسے تحمیل پرسیدہ خود بگوید"

یعنی سامع (سننے والا) اٹھ کر کھڑے ہونے میں تکلف سے کام نہ لے مراد یہ ہے کہ صحیح حال اور وجد کے بغیر نہ اٹھے اور اگر کوئی اٹھ کھڑا ہو تو اس پر غصہ بھی نہ ہو اور اگر اس کی مساعدت کی جائے تو کسی کو ایسا کرنے سے بھی منع نہ کرے۔ اور اشعار کے متعلق کسی کا امتحان بھی نہ لے کہ تم نے کیا سنا اور کیسے تحمیل کیا۔ کیونکہ اس سے انتشار پیدا ہوتا ہے اور جمعیت (مجلس) میں برکت نہیں رہتی۔ میرے شیخ (قدس سرہ العزیز) کا ارشاد ہے کہ کسی سے اشعار کا مطلب پوچھنے سے یہ بات بدرجہا بہتر ہے کہ اپنے مطلب (تحمیل) کی طرف توجہ دے"۔

آداب دیگر:۔ اگر قوالے سماع ناخوش میکند۔ عیب نہ گیرد ونہ گوید کہ صوت دیگر بگوو او را درمیانہ نہ بیند و حوالہ بحق کند۔ و اگر یکے راسماع در گرفت و ترا وقت نیست۔ تنگ باید آمد۔ نیاز مندی کن۔ تاترا وقت پیدا شود"۔

(یعنی "اگر قوال کی سماع تمہارے دل کو خوش نہ کرتی ہو تو اس کی برائی نہیں کرنی چاہیے اور نیز قوال کو نہ کہا جائے کہ کچھ اور کہو۔ (اس حال میں) قوال کو درمیان میں نہ دیکھا جائے بلکہ معاملہ حق تعالیٰ کے سپرد کرے اور اگر کسی پر وجد طاری ہو اور تم پر طاری نہ ہو تو تم کو دل تنگ نہ ہونا چاہیے (صبر کرنا چاہیے) تم نیازمندی سے کام لوتا کہ تم پر بھی حال طاری ہو"۔

آداب دیگر:۔ "در سماع بہ تکیہ نہ نشیند و آسیب بہ یارے نہ رساند"۔

"یعنی سماع کے دوران تکیہ لگا کر نہیں بیٹھنا چاہیے اور نہ کسی شریک محفل دوست کو تکلیف پہنچانی چاہیے"۔

شیخ زین الدین قدس سرہ العزیز نے فرمایا ہے کہ:۔

"اگر صوفی در سماع باشد چناں رود کہ دامن او بہ دامن دیگرے نہ رسد۔ و حالت دروغ نیارد و برائے نمودن کسے رقص نہ کند و حالت نیارد"۔

"یعنی اگر سماع کے دوران کوئی صوفی چلے پھرے تو مناسب یہی ہے کہ اس کا دامن بھی کسی سے مس نہ ہو (احتیاط کرے) اور اپنے اوپر مصنوعی حال طاری نہ کرے اور نہ ہی کسی کو دکھانے کی خاطر رقص کرے یا مصنوعی حال طاری کرے"۔

مزید برآں ترجمہ رسالہ قشیری میں تحریر ہے

"اگر وجد و حال و حرکات او بہ ہوائے نفس باشد۔ بعد سماع او را بخلوت تنبیہہ کند اگر قبول نہ کند و اعراض نماید زود باشد کہ در جمیع نصیحت شود و بطلان حالت ہائے او ظاہر گردد۔ ہر کہ مردود اہل اولیاء و اہل معنے بود مردود باشد"۔

یعنی اگر کوئی اپنے نفس کی خاطر وجد کرے تو مناسب ہے کہ (شیخ) سماع کے بعد تنہائی میں اس کو سمجھائے کہ ایسا کرنے سے باز رہے اگر ایسا شخص شیخ کی نصیحت کو قبول نہ کرے تو دیکھا جائے گا کہ بہت جلدی یہ شخص لوگوں کے سامنے (خود بخود) شرمندہ ہو جائے گا اور ایسے شخص کی باطلانہ حالت از خود لوگوں پر ظاہر ہو جائے گی (یاد رکھو) جو کوئی اولیاء اور اہل باطن کی طرف سے مردود گردانا جائے وہ مردود ہی ہوتا ہے"۔

آثار سماع۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ غنا (یعنی خوش آوازی جس سے مراد راگ یا راگنی ہوتی ہے) میں کسی کو بے ہوش کرنے کی تاثیر ہوتی ہے اس بارے میں انسان تو انسان حیوانات بھی صوت و غنا سے مست ہوتے ہیں ۔ سانپ بین کی آواز سے اور اونٹ حدی سن کر مست ہو جاتے ہیں۔ (یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ) بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ سماع کے دوران ایک بے علم آدمی کیوں اور کیسے وجد میں آجاتا ہے۔ حالانکہ اس کو کچھ بھی علم نہیں ہوتا کہ قوال کیا کہتا ہے۔ تو اس اعتراض کا جواب حضرت امام غزالی قدس سرہ یوں دیتے ہیں کہ "پھر تو یہ اونٹ سے پوچھا جائے

کہ نہ جانتے اور نہ سمجھتے ہوئے حدی سن کر کیوں مست ہو جاتا ہے"۔ حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی فرماتے ہیں۔

اشتر عرب در حالت مست و طرب　　تو خود چہ آدمی از عشق بے خبری

غنا کی تاثیر عمومی ہے اور تاثیر غنا کے سلسلے میں انسان و حیوان میں کوئی فرق نہیں اور جب سماع اچھے انداز اور اچھی شان سے شروع ہو جاتی ہے تو ایسے وقت میں اس سے درویش اور غیر درویش ہر دو یکساں متاثر ہوتے ہیں اس کی دوسری تاثیر یہ ہے کہ جس وقت نغمات کے اشعار میں ایسی باتوں کا ذکر ہو جو کسی کے حال یا واردات کے مطابق ہو اور غنا بھی اس کے ساتھ شامل ہو جائے تو یہ مطابقت کبھی کبھی تو بالکل صاف اور واضح ہوتی ہے اور کبھی کبھی تحمیل کے ذریعے ہوتی ہے۔ اور تحمیل کے معنے یہ ہیں کہ ایک چیز کسی پر اٹھائی جائے اور اس کے مرادی معنے یہ ہیں کہ ایک شعر کے معنے اپنی حالت پر منبطق کرنا یا اپنے خیال اور عقیدے کے مطابق گردانا۔ مثلاً" قوال کہدے۔

مدام مست میدارد نسیم جعد گیسویت
خرابم میکند ہردم فریب چشم جادویت

اب اگر سامع یا سالک کا محبوب صاحب گیسو ہو تو تحمیل کی ضرورت ہی نہیں رہتی جیسے ہمارے حضور اقدس ﷺ کی مثال لے لیجیے۔ اور اگر محبوب مرشد ہو اور صاحب گیسو نہ ہوں تو تحمیل کر سکتا ہے۔ کہ وہ سلسلہ جس نے میرے دل کو تم سے باندھ رکھا ہے تو اسی تعلق کی بنا پر تیری (محبت) کی خوشبو میرے دماغ میں جاگزین ہے اور اسی سبب سے مستی محسوس کرتا ہوں ۔ یہ بات کبھی کبھی تو ابتداء ہی سے دل میں ہوتی ہے اور کبھی دوران سماع خود ہی آدمی اس کو سمجھ لیتا ہے۔ اس کا تعلق انسان کے ساتھ ہے اور حیوانات اس میں شامل نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں

سالک کا قلبی تعلق اللہ تعالیٰ، رسول اکرم ﷺ یا اپنے مرشد سے وابستہ ہونا ضروری ہے۔ (یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ) جو لوگ صاحبان منزل اور صاحبان سماع یا صاحبان مقام ہیں تو ایسے حضرات پر دوران سماع انوار الٰہی کا نزول ہوتا ہے اور اسی دوران ان پر مخفی اور پوشیدہ رازوں کا انکشاف ہوتا ہے۔

اس مقام پر چند باتیں "شمائل الاتقیاء" سے بھی نقل کی جاتی ہیں۔

"قول نظام الحق والدین قدس سرہ۔ سماع بردو نوع است۔ ہاجم کہ بمجرد سماع بیت و حسن صوت سامع را در جنبش آرد۔ و دوم غیر ہاجم کہ چوں سماع بشنود در تحمیل افتد۔ وایں تحمیل بر شیخ۔ برحق وغیر آں باشد"۔

"یعنی سماع کی دو قسمیں ہیں ایک ہاجم اور یہ اس سماع کو کہتے ہیں کہ شعر اور اچھی آواز کے سنتے ہی سننے والے کو مست کر دیتا ہے دوسری سماع غیر ہاجم ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایسی سماع سنی جائے تو سننے والے کو تحمیل کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور یہ تحمیل حق تعالیٰ، رسول اکرم ﷺ یا اپنے شیخ سے متعلق ہوتی ہے"۔

رسالہ "غریب" میں لکھا ہے۔

"چوں در سماع از فہم و تحمیل فارغ شوند حال روئے نماید۔ وایں حضور باشد و فہم و تحمیل غیبت بود"۔

"یعنی سالک جب سماع کے دوران فہم و تحمیل سے فارغ ہو جاتا ہے (یعنی مکمل طور پر سمجھنے اور سمجھ کر تحمیل کے مرحلہ سے گذر جاتا ہے) تو "حال" (وجد) ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کو حضور کہتے ہیں اور فہم وتحمیل کے مرحلہ کو غیبت کہتے ہیں (حضور کے آسان معنے یہاں پر "حاضر" ہونے کے ہیں اور غیبت کے

یعنے غائب یا غیر حاضر ہیں مراد یہ کہ سوچنے اور تحمیل کے مرحلہ میں سالک غائب یا غیر حاضر ہوتا ہے مگر جب نکتہ پا لیتا ہے تو حاضر ہو جاتا ہے اور "حال" ظاہر ہو جاتا ہے۔ سید طاہر چشتی مترجم)

اسی طرح رسالہ خواجہ ذوالنون مصری (قدس سرہ) میں تحریر ہے:۔

"حق تعالٰی خوش الحان و صوت حسن را در دلہائے مصفا و جانہائے مزکی و دیعت نہادہ است تابواسطہ آں آلائش بشریت و کدورت انسانیت از بواطن ایشان مضحل گردد"

"حق تعالٰی نے خوش الحانی اور خوش آوازی (کی تاثیر) قدسی روحوں اور پاک دلوں کو وودیعت کی ہے تاکہ اس کے طفیل بشریت کی آلائش اور انسانی کدورت کو سالک کے باطن سے چلتا کرے"۔

رسالہ "سر اللہ" میں لکھا ہے کہ:۔

"تلذز احوال در سماع مختلف فیہ است۔ برونق مقام روح قدسی لذت تواند یافت و این حاصل نہ شود مگر اہل معرفت را کہ جمیع حیوانات .سماع مائل اند زیرا کہ ہر یک را براندازہ خود روحیست کہ بداں روح زندہ است و آنرا صدہا لذت است"۔

"یعنی احوال کی لذت سماع کے دوران مختلف ہوتی ہے رونق مقام روح قدسی میں لذت لی جا سکتی ہے اور یہ اہل معرفت کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں ہوتی (ویسے" تمام حیوانات سماع سے رغبت رکھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اندازے سے ایک روح رکھتے ہیں جس کے طفیل وہ زندہ ہوتے ہیں اور اس کے لئے سینکڑوں لذتیں ہیں (یعنی روح قدسی کے لئے)۔

مزید برآں رسالہ شمسیہ میں ہے:۔

"بعضے را در سماع حال غالب مے آید۔ چنانچہ تمیز نے ماند۔ و بعضے را بہ آنکہ حال روئے داد مغلوب نمے شود۔ ایں کمال ست"۔

یعنی بعض لوگوں پر سماع کے دوران "حال" غالب آجاتا ہے چنانچہ ان کا تمیز اٹھ جاتا ہے (بے ہوش ہو جاتے ہیں) مگر بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ "حال" کی کیفیت تو ان پر طاری ہوتی ہے مگر وہ اسی حال سے مغلوب ہو کر تمیز (ہوش) نہیں کھوتے اور یہ کمال ہے"۔

آگے لکھتے ہیں:۔

(۱) "در حال سماع و تلاوت سہ قسم سعادت نزول مے یا بداز فیض بر عالم جبروت آں و اثر میکند آنرا احوال گویند و آں میان ملک و ملکوت است ازاں بکائے و حرکتے ظاہر میشود آنرا آثار گویند از ملک بہ جوارح میرسد"۔

"سماع اور تلاوت کے دوران تین قسم کی برکتیں نازل ہوتی ہیں پہلی سعادت یابرکت عالم جبروت سے اور وہ دل پر اثر کرتی ہے اور اسے احوال کہتے ہیں اور یہ ملک و ملکوت کے درمیان ہوتی ہے جس کی وجہ سے گریہ (رونا) اور اعضاء کی حرکت ظاہر ہوتی ہے اور اس کو آثار کہا جاتا ہے جو ملک سے جوارح تک پہنچتی ہے" اور رسالہ ذوالنون مصری قدس سرہ میں تحریر ہے:۔

السماع وارد الحق یزعج القلوب الیٰ حق"

"یعنی سماع وارد حق ہے جو قلوب کو حق کی طرف لے جاتی ہے"۔

رسالہ لوائح میں ہے:۔

"وارد ضعیف در اضطراب اندازد۔ وارد قوی در درد اندازد"۔

....

(۱) یہاں پر اصل کتاب میں صفحہ ۲۹۸ صرف "و" لکھا ہے اگرچہ رسالہ شمیہ میرے پاس نہیں تاہم میرے خیال میں یہ لفظ "در" ہے چنانچہ میں نے "در حال سماع ......" لکھا ہے خدا کرے یہ صحیح ہو۔ مترجم

"یعنی کمزور حال سالک کو مضطرب (بے قرار) کر دیتا ہے اور قوی حال درد پیدا کرتا ہے۔

فوائد الفود میں ہے:۔

"در سماع سعادتے کہ حاصل مے شود بر سہ قسم است۔ انوار و احوال و آثار۔ انوار بر ارواح، احوال بر قلوب و آثار بر جوارح نازل مے شود۔ و گریہ و جنبش ظاہر از آثار است"۔

"یعنی سماع کے دوران جو سعادت حاصل ہوتی ہے اس کے تین اقسام ہیں (۱) انوار (۲) احوال اور (۳) آثار

ان میں سے انوار روح پر، احوال دلوں پر اور آثار اعضائے بدن پر نازل ہوتے ہیں۔ رونا اور جنبش اعضاء آثار سے تعلق رکھتے ہیں"۔

رسالہ جنید قدس سرہ میں لکھا ہے:۔

"حق تعالیٰ ذریات بنی آدم را در روز میثاق خطاب **الست بربکم** کرد۔ ہمہ ارواح در لذت سماع مستغرق شدند۔ چوں دریں عالم آمدند ہر گاہ کہ صوت حسن شنوند ارواح ایشاں بیاد آں کلام در اضطراب آیند۔ زیرا چہ در حسن صوت نیز تاثیر آں کلام است"۔

"یعنی حق تعالیٰ نے بروز میثاق ارواح بنی آدم سے **الست بربکم** کا خطاب فرمایا اور تمام ارواح نے اس سے انتہائی لذت حاصل کی اور سب کے سب اس کے سننے سے مست و مستغرق ہو گئیں۔ پھر جب اس دنیا میں آئیں تو جب بھی اور جہاں بھی میٹھی اور اچھی آواز کو سنتے ہیں تو سب بنی آدم کی ارواح کو وہی خطاب یاد آجاتا ہے اور بے قرار ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ ہر خوبصورت آواز میں تاثیر اسی خطاب کی وجہ سے ہے"۔

قول محقق ہے کہ:۔

"حسن صوت بدل چیزے در نیارد فاما آنچہ در دل است بجنباند و بہ تحریک آرد۔ درختانے کہ در بہشت اند از ہر یکے صوتے و لحنے خوش مختلف بروں مے آید"۔

"یعنی اچھی آواز دل میں کوئی اضافی چیز پیدا نہیں کرتی بلکہ جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے اسی (جذبے) کو متحرک کرتی ہے جو درخت جنت میں ہیں ان میں سے ہر ایک سے مختلف قسم کے ساز و آواز نکلتے ہیں"۔

آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہر عضوے را از سماع حظے و نصیبے است نصیب چشم گریستن و نصیب زبان خروشیدن و نصیب دست خرق جامہ و نصیب پائے رقص کردن است"۔

"سماع کے دوران جسم انسانی کے ہر اندام کا اپنا اپنا حصہ (کردار) ہے۔ مثلاً آنکھوں کا حصہ رونا ہے' زبان کا حصہ خروش کرنا' (یعنی شور کرنا) ہاتھ کا حصہ کپڑے پھاڑنا اور پاؤں کا حصہ رقص کرنا ہے"۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ

وَ

بِحَمْدِہٖ

حضرت شیخ کبیر ابن عطاء قدس سرہ کا قول ہے:۔

الحرکتہ فی السماع علٰی ثلثتہ معاد' طرب ورجاء و الخوف در طرب رقص و دست بردست زدن از فرحت است و در رجا عبث د اضطراب و فریاد' و در خوف گریہ و طمانچہ بر روئے زدن و جستن"۔

"یعنی سماع میں حرکت تین قسم کی ہے یعنی خوشی کی' امید کی اور خوف کی۔

خوشی کی حالت میں ایک ہاتھ سے دوسرے کو مارا جاتا ہے۔ امید کی صورت میں بے قراری اور فریاد کی جاتی ہے اور خوف کی حالت میں رونا اور منہ پر طمانچہ مارا جاتا ہے اور اچھلا کودا جاتا ہے"۔

حضرت شیخ عبد الحق محدث نے مدراج میں حضرت شیخ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول لکھا ہے

"شیخ ابن عربی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) گفتہ است کہ تاثیر نغمہ بالذات بر روح حیوانی است کہ حرکت و اضطراب کار اوست۔ و روح انسانی منزہ است ازاں کہ کل درد و معانی است وسکون و اضمحلال و توانی صفت اوست"۔

"یعنی شیخ اکبر محی الدین ابن العربی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نغمہ کی تاثیر محض روح حیوانی پر مرتب ہوتی ہے جس کا کام ہی حرکت اور بے قراری ہے جبکہ روح انسانی اس سے پاک و مبرا ہے اس لئے کہ وہ واردات معانی اور درد کا مقام ہے اور سکون و اضمحلال اس کی صفات ہیں"۔

اس کے بعد شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"اما ایں جا کس راے رسد کہ بگویم نعم تاثیر نغمہ بالذات بر روح حیوانی باشد۔ اما اگر بواسطہ جوری و اتصالے کہ میان روح حیوانی و روح انسانی است حال ایں سرایت بہ آں کند چہ مانع است"۔

"حضرت شیخ محدث نے بڑی عالمانہ اور عاقلانہ بات کی ہے اور منصفانہ بھی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ جب جسمانی امراض کی وجہ سے روح حیوانی ضعیف ہو جاتی ہے تو روح انسانی پر بھی ان کا اثر پڑتا ہے ایسا شخص بہت کم بولتا ہے اور دوسروں کی باتوں کو بھی اچھی طرح نہیں سمجھ پاتا اور یہ تو مشہور بات ہے کہ "رائی العلیل علیل" "یعنی" بیمار شخص کی رائے بھی بیمار ہوتی ہے" جبکہ امراض میں قوت مدرکہ اور بعض

میں قوت ناطقہ اور بعض امراض میں یہ دونوں قوتیں باقی نہیں رہتیں البتہ بعض امراض میں یہ دونوں باقی ہوتی ہیں مگر ان میں کچھ نہ کچھ فتور ضرور ہوتا ہے چنانچہ اب ان دونوں قوتوں کی تطبیق اور تشریح اس طرح کی جائے گی کہ پہلے اس امر کو ذہن نشین کر لیا جائے کہ حرکت کرنا یعنی اٹھنا بیٹھنا یا اچھل کود یا چلنا پھرنا واقعتاً" روح حیوانی کا وظیفہ ہے اور یہ تمام کے تمام حیوانات میں مشترک ہے (یعنی سبھی حرکت کرتے ہیں) مگر روح انسانی جس کو نفس ناطقہ بھی کہتے ہیں یقیناً" درد اور معانی کا محل ہے یعنی عقل و ادراک اور باتیں کرنا اسی روح انسانی یا نفس ناطقہ کی شان ہے اور عقل و ادراک کے لئے سکون ضروری ہوتا ہے اور اگر کوئی چیز اس کو متاثر کرے مثلاً" خوشی یا غم کو لے لیجیے تو جب کوئی چیز اس پر اثر انداز ہو جائے اس وقت وہ اسی اثر کے علاوہ کوئی دوسرا خیال نہیں لا سکتی نہ ایسا کرتی ہے اور جس وقت یہ سکون کو بالکل چھوڑ دیتی ہے اور اپنے مقام سے حرکت نہیں کرتی تو انسان سو جاتا ہے یا بے ہوش ہو جاتا ہے یا جب مرجاتا ہے تو دونوں (حیوانی اور انسانی روحیں) قائم نہیں رہتیں اور یہ سب باتیں ثابت ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ محدث کے قول کا مطلب یہ ہے کہ پورا پورا تغیر جیسا کہ روح حیوانی میں پیدا ہوتا ہے جس کو ہر شخص دیکھتا ہے ویسے روح حیوانی (۱) میں نہیں ہوتا۔ اور شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ کے نزدیک روح حیوانی ایک مرکب (سواری) کی حیثیت رکھتی ہے اور روح انسانی راکب (سوار) کی۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں کہ مرکب حرکت پذیر ہو اور راکب متحرک نہ ہو۔

---

(۱) یہاں پر کتاب "تجلیات محمدیہ" میں صفحہ ۳۰۱ پر یہی روح (حیوانی) لکھا گیا ہے راقم مترجم کے خیال میں یہاں "روح انسانی" ہونا چاہیے ورنہ مفہوم سمجھ میں نہ آئے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مترجم

میرے **مرشد پاک** (قدس سرہ) کا بھی یہی خیال ہے وہ بھی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ سے متفق ہیں۔ حضرت شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ کا خیال بھی درست ہے اور عند التامل حضرت شیخ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول بھی حق ہے کہ راکب کی جنبش ذاتی نور ہے اور مرکب کی جنبش کی وجہ سے اس کی حرکت نور ہی نور ہے۔

یہاں پر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرت شیخ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس بات کی نفی نہیں کی ہے کہ روح انسانی نغمہ کو نہیں سمجھتی یا اس سے لذت حاصل نہیں کرتی بلکہ حضرت شیخ کے قول سے خاص طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ روح انسانی پر معانی اور درد کا ورود ہوتا ہے اور اگر اسے سکون حاصل نہ ہو تو وہ معانی کا کس طرح ادراک کر سکے گی۔ جبکہ یہ امر تو ثابت و ظاہر ہے کہ روح انسانی ہی معانی کا ادراک کرتی ہے اور (کمال یہ کہ) اہتزاز کے باوجود ساکن بھی ہوتی ہے۔ اور تحمیل اسی کو کہتے ہیں اور اس کی لذت اسی کے ساتھ مخصوص ہے اور جس وقت یہ لذت حاصل کرتی ہے اس وقت روح حیوانی ان فیوضات کی طاقت نہیں رکھتی اور سکون میں اس کی اتباع نہیں کرتی جس طرح دیگر موقعوں پر کرتی ہے حضرت شیخ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول عمومی ہے یعنی وہ حالت جو عام طور پر دیکھی یا سمجھی جا سکتی ہے یا بالفرض خیال کیا جائے تو اکثر اولیاء اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین نے عین سماع کے دوران انتقال فرمایا ہے اور ان کی روح حیوانی اور روح انسانی نے ایسی جنبش کی ہے کہ قالب کو چھوڑ دیا ہے مثلاً" حضرت خواجہ عماد رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت معین الدین عرف ننھے میاں اولیاء اور ان کے خلیفہ حضرت محمود الحسن الہ آبادی رحمتہ اللہ علیہ وغیرہ اور بہت سے اولیاء کرام سماع کی حالت میں اپنی جان جان آفرین کے حوالے کر چکے ہیں۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت شیخ عبد الحق محدث اور حضرت خواجہ محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء قدس اسرارھم کے

ارشادات کی تطبیق کے بارے میں تصفیہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک مثال پیش کی جاتی ہے مثلاً" جب پانی سے بھرا ہوا ایک برتن سائے کے قریب رکھا جاتا ہے تو ایسے اوقات میں سورج حرکت میں نظر آتا ہے اس لئے کہ ہوا پانی کو متحرک کرتی ہے اور اس تحریک کی وجہ سے سورج کا عکس پانی میں متحرک نظر آتا ہے بالکل یہی مثال روح انسانی کی ہے اور یہ ایک نور (سورج) ہے جس کا منبع قلب ہے جس کو ہم ظرف (برتن) کہہ سکتے ہیں اور قلب کا نرم ہونا پانی کی طرح اور عشق کی مثال ہوا کی طرح سمجھ لیجیے جبکہ خود عشق کا نام بھی "ہوا" ہی ہے چنانچہ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جب ہوا کی تحریک کی وجہ سے سورج پانی میں متحرک نظر آتا ہے بعینہ اسی طرح عشق کی وجہ سے قلب متحرک ہوتا ہے اور اس کا اثر دیگر اعضاء پر پڑتا ہے اور فی الواقعہ اگر روح انسانی ہو اور وہ متحرک نہ بھی ہو۔ تاہم یہ بات ثابت ہے کہ حرکت کرنا روح انسانی کا کام ہے ۔ ہاتھوں سے چیزوں کو پکڑنا یا تھامنا ٹانگوں کے ذریعے چلنا پھرنا یہ سب روح حیوانی کے کام ہیں جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "میں اپنے بندے کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے دیگر چیزوں کو پکڑتا ہے۔ پاؤں بن جاتا ہوں جن کے ذریعے چلتا پھرتا ہے اور وہ بغیر میرے کسی حال میں تنہا نہیں ہوتا۔ اور جب روح حیوانی یہ قوت حاصل کر لیتی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ چاہے روح حیوانی ہو یا انسانی جب فضل ایزدی ہو جاتا ہے تو ہر دو ارواح کی حالت اور ہو جاتی ہے پھر جب سماع میں کوئی بھی حرکت کر لے تو باعث رحمت خداوندی ہوتی ہے۔

یہاں پر میں (حمزہ بابا) بھی اپنے **مرشد پاک** (قدس سرہ کے فیض و توجہ کی برکت سے عرض کرنا چاہوں گا کہ روح انسانی نے جب ۔"بلیٰ"۔ کا اقرار کیا تھا اس وقت اس کی مثال ایک چھوٹے سے معصوم بچے کی تھی۔ بعد ازاں اس کو معرفت الٰہی کے حصول کے لئے یہ قالب عطا کی گئی۔ چنانچہ یہ حالت اس کی نئی جوانی کہلائی جا سکتی

ہے۔ جب آدمی مرجاتا ہے اور اس کی روح عالم برزخ کو سدھارتی ہے تو یہ حالت اس کی مکمل جوانی کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد جنت کا مقام ہے تو جنت میں روح کی مثال ایک بوڑھے کی ہوتی ہے اور جب وصال الٰہی کا وقت آتا ہے اور یہی روح ذات الٰہی میں محو ہو جاتی ہے تو اس کو اس کی موت سمجھ لینا چاہیے کیوں۔ اس لئے کہ روح کی اپنی کوئی ہستی باقی نہیں رہتی۔

غرضیکہ روح انسانی کی مثال اس عالم ناسوت میں ایک نابلد مسافر کی سی ہے اور یہ طے شدہ امر ہے کہ ایک ملک کی سیر اور معلومات حاصل کرنے کے لئے ایک ایسے رہبر کی ضرورت ہوتی ہے جو اس ملک کی تمام راہوں اور چپے چپے سے واقف ہو اور سیر کنندہ کو دکھا بھی سکتا ہو۔ بالکل اسی طرح روح حیوانی..... روح انسانی کی اسی عالم ناسوت میں ایک رہبر کی حیثیت رکھتی ہے یا یوں سمجھ لینا چاہیے کہ روح حیوانی اسی روح انسانی کے لئے ایک آئینہ کی طرح ہے جو عالم ناسوت کے تمام نقوش روح انسانی کو منتقل کرتی ہے اور روح انسانی ان سے قدسی معانی اخذ کرتی ہے اور یہ اس لئے کہ عالم ناسوت کی تمام موجودات میں بھی معرفت حق کے ابتدائی خزانے موجود ہیں۔ اب غور فرمایئے کہ عالم ناسوت کے اجسام یا موجودات کے نقوش کا ملاحظہ روح حیوانی یقیناً" کرتی ہے اور انہیں محسوس بھی کرتی ہے اس لئے کہ یہ خود بھی اسی عالم ناسوت ہی کا ایک جزو ہے۔ مگر یہ روح حیوانی ان اجسام و موجودات کو اپنی استطاعت کے مطابق محسوس کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ روح (حیوانی) یہ طاقت نہیں رکھتی کہ اپنی محسوسات سے قدسی معانی اخذ کر سکے۔ اس کے برعکس روح انسانی ان سے قدسی معانی اخذ کرتی ہے وجہ یہ ہے کہ روح انسانی کی تسلی اور سکون عالم ناسوت میں نہیں ہو پاتی۔ نہ ہی یہ روح (انسانی) عالم ناسوت میں سے ہے چنانچہ یہ بات ثابت ہے کہ سماع سے روح حیوانی محض لذت ناسوتی اخذ کرتی ہے اور یہی لذت روح انسانی کو قدسی لذت

عطا کرتی ہے یعنی لاہوتی لذت محسوس کرتی ہے۔

وجد و حال اور رقص۔

ارشاد ربانی ہے۔

انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم........ سورہ انفال

ایت نمبر۲

ترجمہ= (ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو ڈر جاتے ہیں)

جان لینا چاہیے کہ سماع میں جو حالت پیدا ہوتی ہے وہ محبت کا ثمرہ ہوتی ہے چاہے وہ محبت کیسی ہو یا بصورت دیگر وہبی ہو یا القاء کا ثمرہ ہو۔ یعنی مرشد کامل جب اپنے کسی مرید یا کسی دوسرے شخص کو توجہ کرے (اور وہ حالت محسوس کرے) یا عوام الناس میں بھی بعض ایسے لوگ ہیں جن کی فطرت میں روحانی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور جب ایسا کوئی شخص فقراء کی محفل میں آتا ہے اور اس پر درویشوں کا عکس پڑ جاتا ہے تو ایسے حالات میں وہ بھی روتا ہے یا ہنستا ہے یا بے قرار ہو جاتا ہے اچھلتا کودتا ہے کبھی کبھی کچھ نہ کچھ زبان سے کہتا رہتا ہے' لوٹ پھوٹ ہو کر رقص کرتا ہے چاہے درویشی سے کوئی واقف ہو یا نہ ہو عام حالات میں بھی جب کوئی شخص ڈول کی آواز یا طبلے کی تھاپ سنتا ہے تو زمین پر پاؤں مار کر ایک قسم کی خوشی و انسباط کا اظہار کرتا ہے مطلب یہ کہ غیر شعوری طور پر غیر منضبط حرکات کا ارتکاب کرتا ہے ان حرکات کی نوعیت کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ اس موقع پر نہ تو پہلے کبھی کی ہوتی ہیں نہ بعد میں۔ مدعا یہ کہ جب تک حق سبحانہ و تعالیٰ' جناب رسالت ماب ﷺ فداہ روحی' اپنے مرشد یا کسی دیگر محبوب و معشوق سے محبت نہ ہو تو کبھی اور کسی طور پر اسی حرکات کا

ارتکاب نہیں ہوتا ہے اور اصطلاح میں ایسی حالت کو وجد یا تواجد کہتے ہیں۔

وجد ایک ایسی حالت ہے جو "تکلفاً" وارد نہیں (۱) ہوتی اور سماع کی سماعت کے دوران خود ہی سننے والے کا دل جس کسی سے وابستہ ہو تو ایسے شخص کو بے قرار کر لیتی ہے اور اس کو وہب کہتے ہیں۔ اسی کو ہاجم بھی کہا جاتا ہے جہاں تک تواجد کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنا قلب حضور اقدس ﷺ یا اپنے مرشد کی طرف متوجہ کر لے اس ارادے کے ساتھ کہ اس کے دل میں ذوق پیدا ہو اور جب قدرے ذوق پیدا ہو جاتا ہے تو اسے مزید بڑھانے کی سعی کرتا ہے اور اس سے لذت حاصل کر لیتا ہے چنانچہ یہی لذت وجد کو جنم دیتی ہے اس کو کسب کہتے ہیں یا غیر ہاجم۔

شمائل الاتقیاء نے رسالہ قشیریہ سے نقل کی ہے لکھتے ہیں:۔

"تواجد طلب کردن وجد است بہ اختیار خود و آں کمال نہ باشد و قوی کہ پیوستہ مرصدیافت وجد باشد۔ در حق ایشاں ایں حدیث است کان لم تبکوا فتباکوا یعنی اگر شمار اگریہ نمے آید خود را بہ گریہ کردن مانند کنند"

"یعنی تواجد کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اختیار سے وجد کی حالت کو طلب کیا جائے مگر یہ کمال نہیں .... ایسی ہی لوگوں کے بارے میں حدیث فرمائی گئی ہے کہ اگر تمہیں رونا نہیں آتا تو رونے کی صورت بنا لو"۔

آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

"وجد از لطائف حق است و تواجد از وظائف بندہ۔ فلما وجود آنست کہ بعد ترقی وجد رووے دہد۔ تواجد بدایت

---

(۱) اصل کتاب (تجلیات محمدیہ) میں اس تمام جملے کا چربہ اڑ گیا ہے چنانچہ سیاق و سباق کو دیکھتے ہوئے یہی ترجمہ موزوں جانا گیا ہے۔ خدا کرے کہ بابا کا مطلب بھی یہی ہو

وجود نہایت۔ و وجد واسطہ میان دو یافت آنگاہ است کہ غائب شوند از یافت خود بہ آنچہ
مے آید بر آدمی از .... او"

"یعنی وجد لطائف حق میں سے ہے اور تواجد بندہ کا فعل ہے البتہ وجود اس کو کہا جاتا ہے کہ ترقی کے بعد ظاہر ہو۔ اسی طرح تواجد بدایت یعنی ابتداء ہے اور وجود انتہا ہے اور وجد ان دونوں کے درمیان ایک واسطہ ہے اور یافت وہ چیز ہے کہ اسی یافت سے بھی غائب ہو (یعنی واجد یا سالک) دوسرے الفاظ میں سالک کو یافت اور واردات کا نہ علم ہو اور نہ خبر کہ یافت کیونکر حاصل ہوئی"۔

حضرت شیخ ابو علی دقاق قدس سرہ کا قول ہے:۔

"تواجد بر مثال آب است و وجد بر مثال غرق شدن و وجود ہلاک شدن است در آب"۔

"یعنی تواجد پانی کی طرح ہے اور وجد پانی میں غرق ہونے کے مصداق ہے اور وجود پانی میں ہلاک ہونے کے مصداق ہے"

اسی طرح رسالہ "سوی اللہ" میں لکھا ہے:۔

""معنی وجد یافتن است یعنی حالتے یافتہ شود کہ پیش ازیں نہ بودہ باشد و وجد کہ بہ تکلف بود نفاق باشد۔ مگر آنکہ بہ تکلف کردن اثرے از وجد پیدا آید و ایں واقع است کہ از تکلف وجد روئے نماید۔ چنانچہ در خبر است کہ خواندن و شنیدن قرآن باید کہ گریہ و زاری کند و اگر گریہ نیابد بہ تکلف گریہ آرند یعنی اسباب حزن بہ تکلف در دل گزرانند۔ و آنرا اثرہا است۔ قال علیہ السلام ابکوا فان لم تبکوا فتباکوا وتواجد ہم بدیں حدیث درست است" یعنی وجد کے معنے پانا (یافتن) ہیں یعنی ایک ایسی حالت کا پانا کہ اس سے قبل نہ وارد ہوئی ہو اور اگر وجد تکلف کے ساتھ ہو تو یہ نفاق ہو گی مگر اس میں وہ وجد شامل نہیں جو تکلف کے ساتھ بھی ہو اور اثر بھی رکھتا

ہو (یعنی اصلی وجد کا) چنانچہ حدیث مبارک میں ہے کہ تلاوت و سماعت قرآن مجید کے وقت رونا چاہیے اگر رونا نہ آتا ہو تو تکلف کے ساتھ لایا جائے اور رونے کے اسباب دل میں پیدا کیے جائیں کیونکہ وہ اثر رکھتے ہیں چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ روو اور اگر رونا نہیں آتا تو رونے والے کی حالت بناکر رولو۔ اس لئے تواجد بھی اس حدیث مبارک کے رو سے درست ہے"۔

اور رسالہ "غریب" میں ہے کہ۔

الوجد اظہار الحال واحوال الباطن۔ مختلفه یکے را فرق، و یکے را امید وصال و یکے راخوف و یکے را رجا و چوں حال بر سر غلبہ کند بروفق حال حرکتے پدید اید۔ تواجد تکلف بود دراتیاں بہ وجد آنچہ در ظاہر پدید آید وجد است۔ و آنچہ درباطن پدید آید حال است چوں حال درست شد وجد برحال دلیل کند وجدے کہ از صحت حال بنود از بت پرستی صعب تر است"۔

یعنی وجد حال کے اظہار کو کہتے ہیں اور احوال باطن کے اظہار کو کہا جاتا ہے اور اس کی مختلف قسمیں ہیں کسی کا فراق کی وجہ سے کسی کا وصال کی امید کی وجہ سے کسی کا خوف کی وجہ سے کسی کو رجا کی وجہ سے ہوتا ہے او رجب حال غالب آجاتا ہے تو اس حالت کے موافق حرکت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ تواجد تکلف سے ہوتا ہے .... ظاہر میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہی وجد ہوتا ہے اور جو باطن میں ظہور کرے وہ حال ہوتا ہے جب حال درست ہوتا ہے تو وجد بھی حال پر دلیل ہوتی ہے جس وجد کا حال درست نہ ہو تو وہ بت پرستی سے زیادہ برا ہوتا ہے۔

عمدۃ الفقہ میں تحریر ہے:۔

"الرقص مباح عند بعض العلماء چوں نزدیک بعض علماء مباح باشد در مذہب امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ پس ہر کہ مطلقاً" حرام گوید صاحب مذہب راتفسیق

نسبت کردہ باشد قال علیہ السلام اختلاف امتی رحمۃ"۔

"یعنی رقص بعض علماء کے نزدیک مباح ہے۔ تو جب بعض علماء اس کو مذہب امام شافعی میں مباح سمجھتے ہیں تو اس کے باوجود جو لوگ اس کو مطلقاً" حرام کہتے ہیں وہ صاحب مذہب کو فسق کی نسبت کرتے ہیں (حالانکہ) نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت کا (ایسے معاملوں میں) اختلاف رحمت ہے"

ایک اور روایت "ذخیرہ فقہ" میں ہے فرماتے ہیں:۔

سماع الغناء والرقص والسماع الدف و ان کان فیہ جلاجل لیس بحرام"

"یعنی دف کے ساتھ راگ سننا (سماع) اور رقص کرنا چاہے دف کے ساتھ گھنگرو بھی لگے ہوں حرام نہیں ہے"۔

اور حضرت امام غزالی قدس سرہ نے کیمیائے سعادت میں لکھا ہے:۔

" حضرت رسالت ماب ﷺ امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ را" فرمود انت منی وانا منک ونیز زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ راگفت انک اخونا و مولانا وجعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ راگفت اشبہت بخلقی و خلقی ہرسہ ازیں شادی حجل کروند معنے حجل رقص است۔ چند بار پائے بر زمین زوند۔ چنانچہ عادت عرب باشد۔ و مہتر داؤد علیہ السلام تابوت سکینہ رقصاں استقبال کرد"۔

"یعنی آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ تم مجھ سے اور میں تجھ سے ہوں۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ تم (ہی) ہمارے بھائی اور دوست ہو اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ تم خلق اور خلق میں میری طرح ہو۔ اس خوش خبری سے تینوں حضرات حجل ہو گئے اور حجل کے معنے رقص کرنا ہے اور یہ جیسے عربوں کی عادت ہے چند بار پاؤں زمین پر مارے اور حضرت داؤد علیہ السلام

نے تابوت سکینہ کا استقبال رقص کے ساتھ کیا تھا"۔

اور حبشیوں کا رقص کرنے اور گانے میں کہ محمد صالح بندہ ہے کہنا اور دف بجانے کے متعلق ہم نے گذشتہ اوراق میں احادیث پیش کی ہیں ۔ رسالہ غوث اعظم قدس سرہ میں تحریر ہے:۔

رایت الارواح کلھا یترقصون فی قوالبھم بعد قولہ الست بربکم الی یوم القیامتہ"

"میں نے تمام روحوں کو اپنے اپنے قالبوں میں الست بربکم کی سماعت پر قیامت تک رقص کرتے ہوئے دیکھا۔

اور حضرت مخدوم سعد رحمتہ اللہ علیہ (فرماتے ہیں) کہ ستر ہزار فرشتے عرش کے سامنے رقص کر رہے تھے۔ اور جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر آگئے تو ان فرشتوں کی جدائی کی وجہ سے دلگیر تھے۔ یہ بھی حضرت مخدوم سعد نے لکھا ہے اور اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ رقص فرشتوں کا کام ہے اور فرشتوں کے فعل سے انکار کرنا اچھی بات نہیں ہے۔

حضرت عبد الوہاب شعرانی قدس سرہ نے طبقات الکبریٰ کے مقدمہ میں لکھا ہے۔ "اب صوفیاء کے وجد و حال کو برا سمجھنا اور ان کے خاص فہم کے علاوہ اور کچھ بھی باقی نہ رہا اور یہ ایسے امور ہیں جن میں سے ایک بھی صریح سنت کے خلاف نہیں ہے اور اس کا تصفیہ بھی آسان ہے (وہ ایسے کہ) جو اصحاب ان چیزوں کو درست سمجھتے ہیں وہ ان کے مذہب کی پیروی ان کے مقلدین کے طور پر کریں اور جن کے خیال میں درست نہ ہوں تو وہ خاموش رہیں اور انکار نہ کریں وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ یعنی اولیاء اللہ رحمہم اللہ مجتہدین طریقت ہیں اور ایک مجتہد کا دوسرے مجتہد سے انکار بے اثر ہوتا ہے

فصل نہم

روح انسانی۔

حق تعالیٰ ... تمام حیوانات کو روح عطا کی ہے مگر جہاں تک روح انسانی کا تعلق ہے تو ابنائے آدم ...، بغیر یہ روح (روح انسانی) کسی اور جاندار کو نہیں دی گئی ہے۔ اس روح کو کبھی تو "نفس" کہا جاتا ہے اور کبھی نفس ناطقہ ۔ تاہم معرفت الٰہی کا محل یہی روح انسانی ہی ہے ارشاد ربانی ہے

سنریھم آیتنا فی الآفاق وفی انفسھم

ہم عنقریب ان کو اپنی قدرت کی نشانیاں ان کے گرد و نواح (آفاق) میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی .... سورت حم سجدہ ایت نمبر ۵۳

نیز ایک اور ارشاد خداوندی ہے۔

وفی انفسکم افلا تبصرون۔

یعنی تمہاری ذاتوں میں ہے تو کیا تم نہیں دیکھتے۔

کبھی اسے (روح کو) قلب بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے لمن کان لہ قلب (اس کے لئے جو قلب رکھتا ہے) اور حضرت امام غزالی قدس سرہ نے کیمیائے سعادت میں اور مولانا عبد العزیز صاحب (محدث) نے فتح العزیز میں بھی ایسا ہی لکھا ہے یعنی روح کو قلب کہا ہے اسی روح کو کبھی کبھی خفی اور اخفی بھی کہا جاتا ہے جیسے شمائل الاتقیاء میں کشف المحجوب کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ اللّٰہ عالم السر والخفیات" یعنی حق تعالیٰ سر اور خفیات دونوں پر عالم ہے ۔ کبھی کبھی اس کو نفس امارہ کہا گیا ہے جیسے قرآن حکیم میں ہے وما ابرئی نفسی ان النفس لامارتہ بالسوء الا ما رحم ربی یعنی میں پاک نہیں کرتا اپنا قلب یا نفس اور یہ بہت بدی کا حکم دیتا ہے لیکن میرا رب رحم کرنے والا ہے۔ کبھی اس کو لوامہ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن شریف میں ہے لا اقسم بالنفس اللوامہ یعنی قسم

کہتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے۔ کبھی اس کو ملہمہ بھی کہا جاتا ہے قرآن عظیم الشان میں ہے ونفس و ماسوھا فالھمھا فجورھا و نقوھا اور قسم ہے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اس کو بنایا اور نیکی اور بدی کا الہام کیا" اسی روح کو نفس مطمئنہ بھی کہا گیا ہے"

یاایتھا النفس المطمئنتہ ارجعی الٰی ربک راضیتہ مرضیتہ
الفجر ایت نمبر ۲۷-۲۸

اے مطمئن نفس تو اپنے پروردگار کے جوار رحمت کی طرف رجوع کر اس طرح کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔

قرآن حکیم کے جملہ مترجمین صاحبان نے نفس کا ترجمہ جان یعنی روح اور براہ راست "نفس" لکھ کر دیا ہے حضرت مخدوم سعد قدس سرہ نے مجمع السلوک میں تحریر فرمایا ہے کہ نفس امارہ، نفس لوامہ، ملہمہ اور مطمئنہ ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں البتہ قرآن حکیم میں اس کو متغائر اوصاف کی وجہ سے جدا جدا ناموں سے موسوم فرمایا گیا ہے۔

میرے **مرشد پاک** (قدس سرہ) بھی یہی فرماتے ہیں کہ "روح یا نفس ایک ہی چیز ہے ان میں فرق محض یہ ہے کہ یہی نفس الگ الگ اور متغائر صفات رکھتا ہے اور مختلف صفات رکھنے کی وجہ سے اسے مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے اور تزکیہ کے بعد یہ اصلی روپ دھار لیتا ہے"

اور کبھی اس کو قلب بھی کہتے ہیں (جیسا کہا گیا ہے) اور اس کی تاویل عرش کے ساتھ کی جاتی ہے قلب المومن عرش اللہ تعالٰی یعنی مومن کا دل عرش الٰہی ہے اور ایک حدیث قدسی میں ارشاد ہوا ہے لا یسعنی لرض ولا سمائی الا قلب المومن یعنی میں نہیں سماتا مگر عبد مومن کے دل میں سماتا ہوں۔ کبھی نفس کو "منفخ" بھی کہتے ہیں۔ کبھی اس کو "سکینہ" کہا گیا ہے فانزل اللہ علیھم السکینتہ اور پھر اللہ تعالٰی نے ان پر سکینہ نازل فرمایا کبھی اسے

"روح قدسی" کہا گیا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے وایدنہ بروح القدس اور ہم نے اس کی مدد (تائید) روح القدس سے فرمائی علامہ داؤد قیصری نے شرح فصوص الحکم کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "نفس" کو "کلمہ" بھی کہا گیا ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ فرمایا گیا ہے او راسے "فواد" بھی کہتے ہیں ارشاد ربی ہے:۔

ماکذب الفواد ما اریٰ نجم ایت نمبر ۱۱

قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں کوئی غلطی نہیں کی

اس کو "صدر" بھی کہا گیا ہے الم نشرح لک صدرک آیا ہم نے تمہارا صدر کشادہ نہیں فرمایا۔ اور کبھی اس کو "روع" بھی فرمایا گیا کیونکہ ایک حدیث مبارک میں ہے ان روح القدس لفستت فی روعی ان نفسنا قوت حتی تستکمل رزقھا۔

"یعنی روح القدس نے میری روح میں ڈال دی ہے کہ کوئی بھی اس وقت تک نہ مرے گا جب تک اس کی روزی پوری نہ ہو" اور روح کے سارے نام اپنی متغائر صفات کی وجہ سے صوفیانہ اصطلاحات میں مروج ہیں۔ مزید براں اس کو "امر ربی" بھی کہا گیا ہے ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا" (سورہ بنی اسرائیل ایت نمبر ۸۵)

اور یہ لوگ (امتحانا) تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں فرما دیجیے کہ روح میرے رب کا امر ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے" اور خدا کا امر کیا ہے تو وہ اس کا ارادہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

انما امرہ اذا اراد شیئا" ان یقول لہ کن فیکون (یاسین ایت نمبر ۸۲

یعنی یہ اس کا کلام یا امر ہے وہ جب کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو فرما دیتا ہے کہ ہو جا۔ تو ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا تھا کہ کفار نے

حضور اقدس ﷺ سے پوچھا تھا کہ روح کیا ہے تو ارشاد ہوا کہ یہ لوگ تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں تو آپ ﷺ فرما دیجیے کہ روح میرے پرودگار کا امر ہے۔ اور اس سے زیادہ شریعت نے اس کا راز نہیں کھولا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر کہ ومہ اس کی حقیقت کو کیسے جان سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ایت قل الروح من امر ربی کے بعد وما اوتیم من العلم الا قلیلا" بھی فرمایا گیا ہے یعنی تم کو بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

ملحوظ خاطر رہے کہ اس سے یہ بات قطعا" ثابت نہیں ہوتی کہ آنحضرت ﷺ کو بھی روح کے بارے میں معلومات حاصل نہ تھیں۔ معاذ اللہ سوچنے کی بات ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے غلاموں کو تو اس کا علم ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خود حضور انور ﷺ کو اس کا علم نہ ہو۔ فے الاصل بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے وما اوتیتم "کی وجہ سے غلطی کی ہے اس لئے کہ اگر اس کے معنے یہ کئے جائیں کہ

"اے نبی ﷺ! روح کے بارے میں ہم نے تم کو تھوڑا سا علم دیا ہے"

تو ظاہر ہے کہ یہ یا ایسا ترجمہ صحت کا کوئی امکان نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ پھر آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی کیا تاویل کی جائے گی جب آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ مجھے "ما کان وما یکون" ۔ کا علم عطا ہوا ہے اصل بات یہ ہے کہ "اوتیتم" کا ضمیر کفار یا دیگر بنی آدم کی طرف راجع ہے اور فرمایا گیا ہے کہ تم کو تھوڑا علم دیا گیا ہے یعنی کفار یا دوسرے بنی آدم روح کی حقیقت و کیفیت کو نہیں جان سکتے۔ اور بالفرض اگر ہم اس کے یہ معنی کر دیں کہ خود رسول اللہ ﷺ کو روح کا پورا پورا علم نہ تھا تو پھر آپ ﷺ کی اس حدیث مبارک کی کیا تاویل کی جائے گی۔

من عرف روحہ فقد عرف ربہ

جس نے اپنی روح کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا

فرمایئے اور سوچئے کہ کیا معلم اول (حق تعالیٰ) کے شاگرد اول کو اپنے نفس یا روح کا علم (۱) نہ ہو گا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر بات ایسی ہوتی تو پھر نعوذ باللہ آپ ﷺ اللہ کو کیسے پہچان سکتے تھے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

چونکہ ارواح کا علم ایک خاص علم ہے اس لئے حق تعالیٰ جل مجدہ نے عوام پر اس کے انکشاف کا علم ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ نقل ہے کہ جس وقت روح کو حکم دیا گیا کہ آدم علیہ السلام کے قالب میں داخل ہو جائے تو جب اس نے قالب آدم علیہ السلام میں تاریک مقام کو دیکھا تو گھبرا گیا۔ پھر بھی حکم ملا کہ ادخلو کارھہ یعنی کراہت کے باوجود داخل ہو جا اور نور محمدی ﷺ حضرت آدم علیہ السلام کے جبین میں رکھ دیا گیا چنانچہ اس نور کی روشنی کی وجہ سے اور اس کی محبت کی وجہ سے قالب میں داخل ہو گئی اور اب یہ حالت ہے کہ اسی قالب سے روح اس قدر مانوس ہو گئی ہے کہ اسے نہیں چھوڑتی۔

بہر حال یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ روح کے بارے میں اولیاء اللہ رحمہم اللہ کے اقوال بھی نقل کیے جائیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ فرماتے ہیں:۔

---

(۱) اسی طرح من عرف نفسه فقد عرف ربه بھی فرمایا گیا ہے یہاں پر غور و فکر کا مقام یہ ہے کہ جن لوگوں کو عرفان نفس ہوا ہو گا تو بلاشبہ انہوں نے اللہ کو بھی پہچانا ہو گا اور حضور اقدس ﷺ ایسے تمام بندگان الہٰی کے سردار ہیں اب غور فرمایئے کہ خود حضور اقدس ﷺ کے علم خداوندی یا روح کے بارے میں علمیت کی کیا اہمیت ہو گی فہم من فہم (مترجم)

''روح کے بارے میں خاموش رہنا چاہیے مگر میں اپنی تاویل و اجتہاد سے کہتا ہوں کہ روح انسانی کا تعلق عالم امر سے ہے جو مساحت و مقدار سے باہر ہے اور روح حیوانی کا تعلق بشری عالم خلق سے ہے جو مساحت و مقدار کے اندر ہے حامل روح علوی ہے اور اس کا محل اس کا مورد ہے۔ یہ جسمانی اور لطیف ہے حس اور حرکت کی قوت رکھتی ہے اور اس کا مقام قلب ہے یعنی قلب سے پیدا ہوتی ہے اور قلب گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو جانب چپ سینے کے اندر ہے اور روح حیوانی اسی قلب کے ذریعے تمام لوگوں کو پہنچتی ہے۔ یہ روح تمام حیوانات میں موجود ہے اور مورد روح علوی ہے اور یہ روح حیوانات کی صفت کے علاوہ انسانی جسم میں الگ صفت حاصل کرتی ہے اور نفس بن جاتا ہے اور نطق والہام کا محل بن جاتا ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

ونفس وما سوها فالهمها فجورها وتقوها سورہ شمس ایت ۷،۸

ترجمہ:۔ اور قسم ہے انسان کی جان کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری دونوں باتوں کا اس کو القا کیا۔

مجمع السلوک میں حضرت شیخ جنید بغدادی قدس سرہ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ ''حق تعالیٰ نے روح کے بارے میں تفصیلاً'' بیان مناسب نہیں سمجھا البتہ اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ایک موجود چیز ہے باقی اس فکر میں نہیں پڑنا چاہیے کہ کیسی ہے اس کا رنگ اور نقشہ کیا ہے''۔

کتاب شمائل الاتقیاء میں رسالہ غریب سے نقل کیا گیا ہے کہ ''روح کی چار خاصیتیں ہیں۔ اول نباتی، دوم حیوانی، سوم نفسانی اور چہارم انسانی'' اور رسالہ عین القضاۃ ہمدانی میں تحریر ہے کہ ارواح چار اقسام پر مشتمل ہیں (۱) نامیہ (۲) متحرکہ (۳) ناطقہ (۴) قدسی۔

نامیہ روح نباتات، حیوانات اور اسی طرح انسان میں بھی موجود ہے۔ پرورش پانا

اسی روح نامیہ کا وظیفہ ہے یہ روح عالم خلق میں ایک مخلوق ہے اس میں طول، عرض اور عمق موجود ہے جہاں تک روح متحرکہ کا تعلق ہے تو وہ حیوانوں اور انسانوں (دونوں میں) موجود ہے یہ بھی مخلوق ہے اور جسم کی حرکت کا تعلق اسی روح کے ساتھ وابستہ ہے۔ ان دونوں (نامیہ، متحرکہ) کا وجود عناصر کی خاصیت سے متعلق ہے اب رہی روح ناطقہ تو یہ صرف اور صرف انسانوں میں ہوتی ہے یہ عالم امر سے ہے یہ روح نباتات اور حیوانات میں نہیں ہوتی اور عناصر سے کوئی علاقہ یا تعلق نہیں رکھتی کیونکہ قل الروح من امر ربی اس کی صفت ہے او جہاں تک روح قدسی کا تعلق ہے تو وہ انبیاء علیہم السلام اور مخصوص اولیائے کرام رحمھم اللہ کے لئے مختص ہے یہی "سکینہ" ہے اور اسی کو ہی سکینہ کہا جاتا ہے یہی "منفخ" ہے اور ونفخت فیہ من روحی کا منشا یہی روح ہے اس کی اہم خصوصیات میں باطنی معانی کو سمجھنا معجزات انبیاء علیہم السلام، کرامات اولیاء رحمھم اللہ، مشاہدات، خرق عادت، مردوں کو زندہ کرنا، زندہ کو مارنا یہ سب امور اسی روح کی خصوصیات ہیں مگر ذہن نشین رہے کہ یہ خواص اس روح کی ذاتی صفات ہرگز نہیں ہیں۔ جیسا کہ آریہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو روح کو حق تعالیٰ کی پیدائش تسلیم نہیں کرتے نیز ان کے عقیدے کے مطابق مادہ یا "پرکرتی" کو بھی اللہ نے پیدا نہیں کیا ہے۔ اور نیچری عقیدہ رکھنے والے ایسی کسی روح کو نہیں مانتے جو مادی جسم کی فوتیدگی (موت) کے بعد بھی زندہ رہے۔ اگر چہ موجودہ دور کے سائینسدانوں کی اکثریت روح کو تسلیم کرنے لگے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ انسانی وجود کے ساتھ ایک ایسی روح بھی موجود ہے جو غیر فانی ہے۔ تاہم نیچری عقیدہ کے لوگ اسی روح کے منکر ہیں البتہ جن لوگوں کو حق تعالیٰ نے عقل سلیم دی ہے وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ نیچری عقیدہ بے حد کمزور اور دلیل سے مبرا ہے اور ایک جاہل سے جاہل شخص بھی نیچری عقیدے کا قائل نہیں ہو

سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان اور حیوان میں ایک ہی قسم کی روح مان لی جائے جس
کو روح حیوانی کہا جاتا ہے (گویا دونوں کی زندگی اسی ایک روح تک محدود ہے اور جب
یہ ان سے نکل جاتی ہے تو دونوں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے ہیں مترجم) تو غور کرنے
کی بات یہ ہے کہ پھر انسان اپنی زندگی اور اپنے اوقات کے لئے ایک مکمل دستور العمل
یا پروگرام بناتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں مراد یہ کہ اپنے اوقات مختلف
اشغال پر تقسیم کر لیتے ہیں اور ہر ایک کام کے لئے ایک خاص وقت مقرر کرتے ہیں مگر
جانوروں میں یہ خاصیت نہیں ہے (چنانچہ معلوم ہوا کہ) یہ کام روح انسانی کا ہے اور
جس سے جانور محروم ہیں۔ اس مدعا کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں مثلاً" پانی سے
لبریز ایک برتن پڑا ہو اور کہیں سے ایک پیاسا جانور آجائے تو آتے ہیں فوراً" اس برتن
میں پانی پینے کے لئے منہ رکھ دے گا۔ مگر جونہی اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ پانی
بہت گرم ہے یعنی ابتداء میں اسے یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ پانی گرم ہے یا ٹھنڈا ہے
مگر جب ابلا ہوا پانی اس کے جبڑوں کو جلا لیتا ہے تو منہ ہٹا لیتا ہے اور ایسا پانی پینے سے
باز رہتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اگر دوسرے روز اسی جانور کو پیاس لگے اور پڑا
ہوا پانی دیکھ لے تو گرم و سرد کی پروا کئے بغیر پھر بھی پینے لگ جاتا ہے جبکہ انسان ایسا
نہیں کرتا نہ ہی اس سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کیونکہ وہ پانی کی دونوں حالتوں کو
معلوم کر سکتا ہے اور یہی کام روح انسانی کا ہے۔

دوسری بات یہ کہ تمام نیچری لوگ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ مسمریزم کا ایک عامل
اپنی توجہ سے کسی دوسرے آدمی کو بے ہوش کر سکتا ہے۔ تو سوال یہی ہے کہ اس
معمولی سے عامل کے پاس کونسی طاقت ہوتی ہے جو اس کے وجود سے باہر باہر بھی تصرت
کر سکتی ہے۔ اس کے جواب میں اگر یہ لوگ یہ کہدیں کہ یہ اس کی قوت ارادی ہوتی
ہے تو یہ میں بھی مانتا ہوں کہ یہ تاثیر قوت ارادی کی ہے مگر سمجھ لینا چاہیے کہ ارادہ

ایک عرض (چیز) ہے اور عرض کسی جسم کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا ارادہ روح کا ہوتا ہے اس لئے کہ مادی دماغ یا روح کو یہ قوت حاصل نہیں کہ جسم سے باہر کسی اور پر اثر کردے۔ بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عامل اپنے معمول کو توجہ سے بے ہوش کرسکتا ہے اور ہم اسے تسلیم بھی کرتے ہیں تو لامحالہ ہم یہ تسلیم کرنے پر بھی مجبور ہوں گے کہ وہ اسے (توجہ کے ذریعے) جان سے بھی مار سکتا ہے اس لئے کہ موت بھی بے ہوشی کی آخری سرحد ہے۔ بعض اہل مذہب کہتے ہیں کہ جان سے مار دینا خدا کا کام ہے اور انسان کو یہ طاقت حاصل نہیں کہ کسی کو موت کا مزہ چکھا دے۔ لیکن جب ایک آدمی کسی شخص کو بندوق کی گولی یا چھرے سے مار کر ختم کرلیتا ہے تو یقیناً" یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدرت حق کی مشیت ہی یہی تھی مگر یہ سارا فعل ایک آدمی کا ہوتا ہے اور اسی آدمی (قاتل) کو اس فعل کا جواب بھی دینا ہو گا چنانچہ اسی طرح روح کی طاقت کو بھی سمجھنا چاہیے اور یہ کام روح انسانی کی بے پناہ قوت کے پیش نظر اتنا بڑا اور دشوار بھی نہیں کیونکہ روح انسانی کو اللہ تعالیٰ نے اتنی قوت عطا فرمائی ہے کہ مادی عقل اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ نہ صرف روح انسانی کی بے پناہ قوت کے بلکہ سرے سے روح انسانی ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ در اصل ایسے لوگ قدسی یا روحانی عقل سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ مادی عقل کے پیمانے سے روحانی اقدار کو ماپتے ہیں جبکہ مادی عقل تو محض مادی اشیاء کی ماہیت کو جان سکتی ہے اور جہاں تک روح کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ وہ مادی چیز نہیں ہے۔

مندرجہ بالا ثبوت اماتت احیاء کے بارے میں پیش کیا گیا (۱)۔ اب احیائے

---

(۱) یہ جملہ اصل کتاب (تجلیات محمدیہ) میں نامکمل لکھا گیا ہے میں نے اندازے سے یہ ترجمہ کیا ہے۔ خدا کرے بابا کا مطلب بھی یہی ہو مترجم

موئی کو بھی اسی اصول کے مطابق دیکھنا چاہیے۔ بہرحال یہ تو سب لوگ مانتے ہیں کہ بعض اشخاص توجہ کے ذریعے بیماروں کو اچھا کرتے ہیں یہاں تک کہ اگر بیمار جانکنی کی حالت تک پہنچ گیا ہو تو وہ بھی محض ایک توجہ کے ذریعے بالکل تندرست ہو جاتا ہے اور میرے **مرشد پاک** کا ایک ایسا کارنامہ بہت مشہور ہے واقعہ یہ تھا کہ مسمی جمعہ خان مزری منڈی (بازار ڈبگری) میں بیمار پڑا تھا۔ اس کی حالت یہ تھی کہ شدت علالت سے اس کے ہاتھ پاؤں سے دم نکل گیا تھا مراد یہ کہ اس کی صحت کی تمام امیدیں ختم ہو گئی تھیں۔ کسی نے جا کر حضور باچہ جان (قدس سرہ) کو حقیقت حال سے آگاہ کیا چنانچہ حضور باچہ جان (قدس سرہ) علیل جمعہ خان کے پاس تشریف لے گئے بس دو چار ہی منٹ بیٹھے ہوں گے کہ جمعہ خان نے آنکھیں کھولیں اور ایک گھنٹہ کے بعد باقاعدہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر چلنے پھرنے لگا اور اس شدید بیماری کے بعد تین چار سال زندہ رہا۔ اس واقعہ کے بے شمار گواہ موجود ہیں اور میں نے بھی اس کا ذکر کسی خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں کیا ہے بلکہ ایسے معاملات کے منکر بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہے اور یہ موضع نڑاں (شریف) مظفر آباد ریاست کشمیر کے حضور خواجہ راجہ محمد عظیم چشتی قدس سرہ سے متعلق ہے۔ برسبیل تذکرہ عرض کروں گا کہ حضور خواجہ راجہ سائیں محمد عظیم چشتی قدس سرہ میرے **مرشد پاک** (قدس سرہ) کے مرشد تھے۔ بہرحال واقعہ یہ تھا کہ گاؤں میں ایک آدمی کا فرزند سخت بیمار تھا۔ یہاں تک کہ جانکنی کی حالت تک پہنچ گیا۔

اور مقامی ملا صاحب نے تلاوت سورہ یاسین شروع کر دی۔ بیمار لڑکے کی دو بہنیں تھیں انہوں نے حضور سائیں صاحب قدس سرہ کو دیکھا بھی تھا۔ کہ ایک گوشہ نشین فقیر ہیں۔ ان لڑکیوں نے اپنے والدین سے کہا کہ ہم اسی گوشہ نشین فقیر سے دعا لینے کے لئے جانا چاہتی ہیں۔ ملا صاحب نے فرمایا کہ کفر کی باتوں سے باز آجاؤ کیونکہ لڑکا نزع کی

حالت میں ہے اور گھڑی دو گھڑی کا مہمان ہے اور تم ہو کہ فقیر کے پاس جانا چاہتی ہو۔ مگر ان لڑکیوں نے ملاصاحب کی بات نہ مانی فوراً" حضور سائیں صاحب قدس سرہ کے ہاں چلی گئیں اور رو رو کر اپنے بھائی کی حالت بیان کی حضور سائیں صاحب نے پہلے تو یہ مشورہ دیا کہ کسی ملا صاحب سے دم کیا جائے کیونکہ میں تو ایک فقیر آدمی ہوں۔ مگر بچیوں نے عرض کہا کہ یا حضرت! مولوی صاحبان سے جو کچھ ہو سکتا تھا انہوں نے کر لیا ہے اب ہم آپ کے پاس حاضر ہوئی ہیں کہ خدائے پاک سے ہمارے بھائی کی صحت کے لئے دعا مانگ لیجیے کیونکہ ہمارا یہی ایک اکلوتا بھائی ہے اور اگر یہ فوت ہو گیا تو ہمارا والد لاوارث ہو جائے گا لہٰذا حضور سائیں صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ اچھا تھوڑی دیر صبر کر لو اور خود مراقبہ میں چلے گئے کچھ دیر کے بعد اپنا سر مبارک اٹھا کر فرمانے لگے کہ "اچھا! اب گھر جاؤ تمہارا بھائی تندرست ہو گیا ہے" اور بفضل خدا یہی لڑکا اس کے بعد بھی سولہ برس تک زندہ رہا (۱)۔ بہر حال جب لڑکیاں اپنے گھر آگئیں تو دیکھا کہ ان کا بھائی تندرست ہو کر چارپائی پر بیٹھا تھا۔ لڑکیوں نے حاضرین اور ملاصاحب کو سارا واقعہ بیان کیا۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس واقعہ کی تاریخ لکھ دی اور اس کے پورے سولہ برس کے بعد وہ لڑکا فوت ہو گیا یہ کوئی ڈھکا چھپا واقعہ نہیں بلکہ نزاں شریف میں اس کے چشم دید گواہ موجود ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر حالت نزع کا بیمار توجہ سے تندرست ہو سکتا ہے تو

---

(۱) **یمحواللہ مایشاء و یثبت وعندہ ام الکتاب** یعنی خدا ہی اپنے حکم سے جو مٹانا چاہے مٹا دیتا ہے اور ام الکتاب اسی کے پاس ہے مطلب یہ کہ ایک کام ہونے والا بھی ہو مگر خدا ایسا نہ چاہتا ہو تو نہیں ہو سکتا اور اولیاء اللہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پاؤں اور زبان وغیرہ کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں (بحکم خداوندی) (مولف)

بالیقین یہ روح کا کام ہے اور اگر روح یہ کمال دکھا سکتی ہو تو ظاہر ہے کہ وہ مکمل مردہ کو بھی زندہ کر سکتی ہو گی حشرات الارض میں بھی ایسی خاصیت (اثر) موجود ہوتی ہے کہ ایک کے وجود سے دوسرے کا وجود جنم لیتا ہے سائینسدان کہتے ہیں کہ اگر ایک پرانی مینڈک مرجائے اور پھر اسے سکھا کر اس کا سفوف بنا دیا جائے اور بعد ازاں اسی سفوف کو گیلی (نمدار) زمین پر چھڑک دیا جائے تو اس سے مینڈک کے چھوٹے چھوٹے بچے پیدا ہو جائیں گے اسی طرح چارپائیوں کی لکڑی کی اندرونی گرمی کی وجہ سے کٹھمل پیدا ہوتے ہیں گائے بھینسوں کے گوبر سے بچھو پیدا ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہر چیز ایک روح رکھتی ہے اور اسی روح میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی عجوبے کا اظہار کر دے۔ اگر چہ یہ طاقت حق تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہے (۱)۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ

---

(۱) اس ضمن میں مناسب معلوم ہوتا کہ لائق احترام ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی خطبات بہاولپور کا ایک ملتا جلتا حوالہ بھی پیش کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں " حال ہی میں پیرس میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جسے ایک یورپین غیر مسلم (غالباً" کیتھولک) ڈاکٹر ژوفرائے (جوفرائے) نے لکھا ہے اس کا عنوان "روزہ" ہے آگے لکھتے ہیں کہ "جہاں تک حیوانوں کا تعلق ہے ان کے متعلق اس نے ذکر کیا ہے کہ ایسے وحشی جانور جو بالکل فطری حالت میں رہتے ہیں جس زمانے میں برف باری ہوتی ہے انہیں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں ملتی اور بعض اوقات اس کا سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہتا ہے جن علاقوں میں برفباری شدید ہوتی ہے وہاں برف کی وجہ سے مہینوں تک زمیں نظر نہیں آتی۔ اس صورت میں ایسے جانور جو اپنی غذا خود حاصل کرتے ہیں انہیں کوئی چیز نہ کھانے کو ملتی ہے نہ پینے کو اس کے باوجود وہ نہیں مرتے۔ (باقی اگلے صفحے پر

جب جمادات و حیوانات ایسے عجوبے دکھا سکتے ہیں تو انسان کی کیا بات ہے جبکہ وہ اشرف المخلوقات ہے وہ کیا کچھ نہ دکھا سکتا ہو گا۔

اس (ڈاکٹر ژوفرائے) نے لکھا ہے کہ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ جانور، پرندے، سانپ، وغیرہ سب پہاڑوں کے غاروں میں چلے جاتے ہیں اور وہیں سو جاتے ہیں اس کو ہائبرنیشن (HIBERNATION) کہتے ہیں یعنی سردی کی نیند۔ اس کا سلسلہ ہفتوں بلکہ مہینوں تک جاری رہتا ہے وہ (ژوفرائے) بیان کرتا ہے کہ یہ نہ کھانے اور نہ پینے کی حالت، یعنی روزے کی باعث ان جانوروں میں نئے سرے سے جوانی آجاتی ہے" محترم ڈاکٹر صاحب نے مزید تحریر کیا ہے کہ بقول ڈاکٹر ژوفرائے "سردیوں خصوصاً برفباری کے زمانہ میں درختوں کے سارے پتے جھڑ جاتے ہیں انہیں کوئی پانی نہیں دیا جاتا ان کی کسی قسم کی آبپاشی نہیں ہوتی گویا وہ روزہ رکھتے ہیں روزے کی مدت ہفتوں اور مہینوں تک چلتی ہے یہ روزہ ختم ہونے پر درختوں کو ایک نئی جوانی حاصل ہوتی ہے" ملاحظہ فرمائیے (خطبات بہاولپور صفحہ نمبر ۲۰۵-۶)

اگر چہ یہ بحث "روزے" سے متعلق ہے مگر جانوروں اور پودوں کی قدرتی طاقتوں کے متعلق بھی نادر معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ان سے بہت کچھ اخذ کیا جا سکتا ہے نیز صوفیا کے "قلت طعام" وغیرہ پر بھی روشنی پڑتی ہے جبکہ ڈاکٹر ژوفرائے اسی ایٹمی دور کے ایک سائینسدان ہیں اور یہ سب ان کی جدید تحقیقات و تحسسات کا نتیجہ ہے اس سے قبل راقم مترجم نے علامہ طنطاوی کی تفسیر قرآن مجید میں بھی اسی قسم کی عجیب و غریب معلومات کا مطالعہ کیا تھا۔ خصوصاً درختوں کے متعلق تو حضرت علامہ نے محیر العقول معلومات پیش کی تھیں۔ اگر کسی کی خواہش ہو تو وہ علامہ طنطاوی کی تفسیر کا مطالعہ ضرور کرے۔ مترجم

مراد یہ کہ "الروح عالم بما کان و بما یکون" اسی روح ہی کی صفت ہے ان الفاظ کے معنے یہ ہیں کہ "جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے روح کو اس کا علم ہے" اور فیض یعنی حق تعالیٰ کی مدد اس کی معاون ہوتی ہے اور یہ روح قالب کے ساتھ متصل ہے نہ منفصل۔ جیسے ذات الٰہی کا تعلق عالم کے ساتھ ہے اور حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہ نے بھی کچھ اسی طرح فرمایا ہے

از جمادی مردم و نامی شدم   و ز نما مردم بحیوانی شدم

مردم از حیوانی و آدم شدم   پس چہ ترسم کے ز مردن کم شدم

جملہ دیگر بمیرم از بشر   پس بر آرم از ملائک سر بدر

از ملک ہم باقدم جستن بہ ہو   **کل شئی ہالک الا وجهه**

پس عدم گردم عدم چوں ارغنون   گویدم   کانا الیہ راجعون

یعنی میں روح نباتی ہوا پھر حیوانی۔ بعد ازاں روح قدسی وجہ اللہ کے آگے معدوم ہوا اور جو کوئی ایسا ہو جائے تو وہی **انا للہ وانا الیہ راجعون** کے معنوں کو سمجھ سکتا ہے۔

مگر بعض آریہ مذہب سے تعلق رکھنے والے ہندو حضرت مولانا روم قدس سرہ کے ان اشعار سے بھی تناسخ (اواگون) ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کوئی تعجب کی بات نہ ہو گی اگر ڈارون کی ذریت بھی حضرات مولانائے روم قدس سرہ کے متذکرہ بالا اشعار سے "ارتقاء" ثابت کرے اور دعویٰ کر دے کہ انسان بندر سے ترقی کر کے انسان بنا ہے یعنی جب اس (بندر) کی دم غائب ہو گئی تو اس "مخلوق" پر انسان کا اطلاق ہو گیا (۱)

---

(۱) ڈارون کے متعلق ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تقریر و تحریر (بقیہ اگلے صفحے پر)

جہاں تک آریہ ہندوؤں کا مولانائے روم قدس سرہ کے اشعار سے تنائج

دلچسپی کا باعث ہو گی۔ ڈاکٹر صاحب نے ''خطاب بہاولپور'' میں تصریح کی ہے کہ: ڈارون کا نظریہ ہمارے ہاں بعض اوقات پیچیدگی پیدا کرتا ہے کہ ہم فرض کرتے ہیں کہ ''ڈارون ایک ملحد تھا' خدا کو نہیں مانتا تھا حالانکہ ڈارون کی سوانح عمری پڑھئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ خدا کا قائل تھا'' آگے فرماتے ہیں کہ ''میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں کیمبرج یونیورسٹی میں عربی نصاب کی جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ان میں یا تو اخوان الصفا کے اقتباسات ہوں گے یا ابن مسکویہ کی ''الفوز الاصغر'' کے انتخابات ان دونوں کتابوں میں ارتقاء کا نظریہ بیان کیا گیا ہے'' ڈاکٹر صاحب نے ابن مسکویہ کے ارتقاء کے نظریہ کو مختصر طور پر لکھا ہے کہ ابن مسکویہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ پہلے مادہ کو پیدا کرتا ہے۔ مادہ ترقی کر کے بخار یا دھوئیں کی صورت اختیار کرتا ہے۔ پھر یہ چیزیں ترقی پاکر پانی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور یہ پانی جمادات سے ترقی پاکر مرجان کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس میں پتھر اور درخت دونوں کی خاصیت ہوتی ہے اور اس کے بعد جمادات ترقی پاکر نباتات کی صورت میں ارتقاء پذیر ہوتے ہیں آخر میں ایک درخت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس میں جانور کی خصوصیت ہوتی ہے یہ کھجور کا درخت ہے کہ اگر اس کا سر کاٹ دیا جائے تو سارا درخت مرجاتا ہے اس کے بعد ادنی ترین انسان پیدا ہوتا ہے وہ ترقی کرتے کرتے کیا بنتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں ''ابن مسکویہ بیان کرتا ہے اور اخوان الصفا میں بھی وہی بیان کیا گیا ہے کہ وہ بندر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ڈارون کا بیان نہیں یہ مسلمان حکماء کا بیان ہے پھر اس کے بعد ترقی کرتا ہے تو ادنی قسم کا انسان بنتا ہے وحشی انسان' وہ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ ترین انسان بنتا ہے یہ بشر ولی اور پیغمبر ہوتا ہے پھر اس سے بھی ترقی کر کے فرشتہ بنتا ہے پھر فرشتوں کے بعد ذات باری تعالیٰ خدا ہی کی ذات ہوتی ہے ہر چیز خدا سے شروع ہو کر خدا ہی کی طرف جاتی ہے **والیہ المرجع والماب** (خطبات بہاولپور مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی صفحہ نمبر ۲۱۶-۲۱۷ مطالعہ فرمایئے) محترم ڈاکٹر صاحب کا حوالہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ حقیر مترجم اس ضمن میں مسئلہ پر مزید روشنی ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ قارئین کرام خود ہی نتیجہ نکال دیں والسلام مترجم

ثابت کرنے کا تعلق ہے تو اس کی مثال چیل کے گھونسلے سے گوشت لانے کے مترادف ہے۔ غور فرمائیے تناسخ کا مطلب یہ ہے کہ روح جسم کو چھوڑنے کے بعد کسی دوسرے جسم میں حلول کر لے جو حسب قاعدہ ماں کی رحم' یا انڈے میں تیار ہوا ہو۔ (جبکہ حضرت مولانا نے جسم و جسمانیت کی بات ہی نہیں کی ہے) حضرت مولانا نے اصل وجود یعنی روح کی بات کی ہے اور فرماتے ہیں کہ اسی روح کی صفات آہستہ آہستہ تبدیل ہو کر قدسی صفت اختیار کر لیتی ہیں اس کا تناسخ سے کوئی تعلق یا کوئی نسبت نہیں ہے دوسری بات یہ ہے کہ اصلا" تناسخ محض ایک فرضی ڈھکوسلہ ہے۔ اور فرض کیجیے ویدک دھرم ایک عالمگیر مذہب کی صورت اختیار کر لے اور فرض کیجیے کہ دنیا کی ساری مخلوق اس پر عمل پیرا ہو جائے تو معلوم ہے اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بالفرض ساری دنیا کے لوگ "نیک" ہو جائیں گے چنانچہ اصول تناسخ کے رو سے یہی نیک لوگ جانوروں (یا دوسرے جسموں) کے قالبوں میں نہیں آئیں گے۔ اور جو مخلوق جانوروں وغیرہ کے قالبوں میں ہوں گے وہ تمام کے تمام مر جائیں گے (ختم ہو جائیں گے) لہٰذا ظاہر ہے کہ واپس انسانی قالب میں نہیں آئیں گے۔ اس لئے کہ آریہ کا اصول یہ ہے کہ روح اپنی گناہوں کی سزا حیوانی قالب کی صورت میں پورا کرتی ہے اور جب وہ حیوان خنزیر' کتا' گدھا اور ٹٹو وغیرہ مر جاتا ہے تو اس کی روح اس انسان کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو پہلی بار اس کی طرف سے کتے یا خنزیر میں حلول کر گئی تھی جس طرح قیدی اپنی قید کا زمانہ قید کاٹنے کے بعد آزاد ہو کر اپنے گھر چلا جاتا ہے تو وہ آدمی جو حیوانات کی جون (قالب) میں گرفتار ہوتا ہے وہ بھی بنی آدم بن جائے گا اور دیگر بنی آدم ویدک دھرم پر قائم رہ کر برے افعال نہ کریں گے۔ چنانچہ اس دنیا کی ساری آبادی تہس نس ہو جائے گی جانوروں بلکہ دوسری ہر چیز کا نام و نشان نہیں رہے

گا کیونکہ ہر طرف آدمی ہی آدمی ہوں گے (دوسری کوئی چیز باقی نہ رہے گی) تو اس صورت حال میں خوراک، دودھ، باربرداری یا زمینداری وغیرہ کے لئے کوئی جانور دستیاب نہ ہو گا جبکہ حق تعالیٰ نے کوئی چیز بے فائدہ پیدا نہیں فرمائی ہے۔ تعجب یہ کہ آریہ بھی اس کو مانتے ہیں کہ کوئی چیز بے فائدہ نہیں ہے اور ہر چیز ایک خاص کام کے لئے پیدا کی گئی ہے تو سوال یہی ہے کہ جانور یا ڈور ڈنگر جن کاموں کے لئے پیدا کئے گئے ہیں چنانچہ وہ تو نہ رہیں گے یہاں تک کہ پرندے بھی نہ رہیں گے کیونکہ سب آدمی ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا تباہ اور ختم ہو جائے گی۔ صرف ختم ہی نہیں دوبارہ کبھی پیدا نہ ہو گی۔ اس لئے کہ ھندو کہتے ہیں کہ جب روح مکتی (نجات) پا لیتی ہے تو پھر کوئی قالب اختیار نہیں کرتی۔ تو جب انسانی روح ایک طویل عرصے تک انسانی وجود میں رہ جاتی ہو اور برے افعال نہ کرتی ہو وہ نجات پا لیتی ہے اور اسے دوسرے قالب میں منتقل ہونے کی ضرورت نہیں رہتی۔ لہٰذا یہ دنیا خالی ہو جائے گی۔ اگر چہ یہ اصول بھی خود آریاؤں کے عقیدے کے خلاف ہے اس لئے کہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا کا یہ سلسلہ بھی "قدیم" ہے اور ہم نے دنیا کی قدامت کے عقیدے کو اپنے گذشتہ کسی حاشیہ میں باطل ثابت کیا ہے۔ اسی طرح عقیدہ تناسخ بھی قطعی طور پر باطل ہے۔ اور حضرت مولانائے روم کے مفید اشعار کا مطلب وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ان کا مطلب روح کی صفات کے مدراج سے ہے اور حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کے رسالے سے منقول ہے کہ جو احکام اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ظاہر ہوتے ہیں، مومن اور کافر دونوں کی ارواح ان کو سمجھتی ہیں یعنی سمجھنے کا مادہ ان میں موجود ہوتا ہے مگر (یہ الگ بات ہے) کہ کفر اور گناہوں کی وجہ سے کافر محجوب ہو جاتے ہیں اور قول محقق سے بھی یہی ثابت ہے کہ روحیں دو ہیں ایک جار (جاری۔)

اور دوسری مقیم۔ جس وقت آدمی سو جاتا ہے روح جار خارج ہو جاتی ہے یہی انسانی روح ہے جو ناطق ہے دوسری روح مقیم ہے جو تادم مرگ نہیں نکلتی یہی حیوانی روح ہے۔ اسی کو متحرک بھی کہتے ہیں (یاد رہے) روح کی کوئی شکل نہیں ہوتی مراد یہ کہ روح مادی شکل نہیں رکھتی۔ البتہ جن نیک بختوں کو خدا نے کشف کے مرتبہ سے نوازا ہے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں پر روح کو ایک تمثیل سے ظاہر فرمایا کرتا ہے۔ روح کے وجود کے سلسلے میں ایک عقلی ثبوت یہ بھی ہے کہ جب ایک آدمی سو جاتا ہے تو اس کے حواس معطل ہو جاتے ہیں کوئی کام نہیں دے سکتے۔ لیکن یہ بات ہمیں مکمل ثبوت کے طور پر معلوم ہوئی ہے کہ بعض مومنین بلکہ عام لوگوں کے اکثر خواب درست ثابت ہوئے ہیں بلکہ یہ تو یورپ کے لوگ بھی مانتے ہیں مثلاً" ایک مس صاحبہ کا کہنا ہے "میری ایک انگشتری کہیں کھو گئی جس میں ایک بیش بہا نگینہ جڑا ہوا تھا۔ مگر تلاش بسیار کے بعد بھی نہ ملی۔ آخر ایک رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ وہی انگشتری ایک سڑک کے کنارے کیچڑ میں پڑی ہے چنانچہ صبح کو میں اس مقام پر گئی اور وہیں کیچڑ میں مجھے میری انگشتری مل گئی" ایسی بہت سے مثالیں اور بھی ہیں۔ مطلب صرف یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کسی نہ کسی حد تک خوابوں کی صحت کا قائل ہے۔ اب جبکہ یہ ثابت ہو گیا کہ اکثر خواب درست ثابت ہوتے ہیں تو اب سوچنا چاہیے کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ بظاہر تو اس کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر چہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ محض اتفاق ہوتا ہے لیکن خیال رہے کہ اہل عقل کے نزدیک اتفاق کی کوئی حیثیت نہیں نہ یہ کوئی چیز ہے۔ ہاں! اگر کوئی یہ کہہ دے کہ جب انسان سو جائے تو دماغ میں کوئی نہ کوئی خیال ضرور آتا ہے۔ تو یقیناً" میں اسے مان لوں گا۔ مگر میں یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہیں کہ دماغ غیب سے آنے والے واقعات کے متعلق بھی سوچ سکتا یا

خیال کر سکتا ہے اور وہ بھی نیند کی حالت میں۔ دماغ کی خاصیت تو یہ ہے کہ ہمیشہ کے لئے اس فکر میں مگن رہتا ہے جو اس کو حواس کے ذریعے ملتا رہتا ہے مگر ظاہر ہے کہ نیند کی حالت میں تو حواس بالکل معطل ہوتے ہیں تو پھر وہ خیالات جو نیند سے بیدار ہونے کے بعد بھی اسے یاد ہوتے ہیں تو کوئی شبہ نہیں رہتا کہ وہ محض روح کے خیالات ہوتے ہیں اور وہ خواب درست ثابت ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خواب درست ثابت ہوتا ہے کیونکہ یہ روح ہی کا علم ہے اور ہم پیچھے لکھ آئے ہیں کہ روح میں گذشتہ اور آئندہ آنے والے امور و واقعات کے علم کا مادہ موجود ہے۔ عقل سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ اسی انسان میں ایسی روح موجود ہے جو اس مادی ڈھانچے کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہتی ہے اور خواب دیکھنا روح کے اثبات کی اچھی مثال ہے اگر چہ روح کی پہچان بھی ہر انسان کو نصیب نہیں ہوتی۔

میرے **مرشد پاک** (قدس سرہ) کا ارشاد ہے کہ روح باقاعدہ ایک نقشہ رکھتی ہے اور وہ نقشہ اسی انسان کی شکل کی طرح ہوتا ہے۔ الا ہو بہ ہو ایسا بھی نہیں ہوتا بلکہ اس ظاہری شکل سے ہزار ہا درجے خوبصورت ہوتا ہے یہ ایک ایسا نقشہ ہوتا ہے کہ آدمی اس پر عاشق ہو جاتا ہے حضرت جبرائیل امیں علیہ السلام بھی کبھی کبھی وحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور تشریف لاتے۔ حضرت مولانائے روم قدس سرہ فرماتے ہیں

صورت از بے صورتی آمد بیرون

بازشد انا الیہ راجعون

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **اول ما خلق اللہ روحی اور اول ما خلق اللہ نوری و خلق الخلق من نوری** یعنی حق تعالیٰ نے سب

سے پہلے میری روح کو پیدا کیا اور اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا کیا اور بعد ازاں میرے نور سے تمام مخلوق کو پیدا کیا۔ لہٰذا جناب رسالت مآب ﷺ کی روح اقدس احدیت ذات کے نور سے ظاہر ہوئی ہے اور مومنین کی ارواح آنحضرت ﷺ کی روح سے ظہور پذیر ہوئی ہیں .... اگر ایک تختہ پر ایک نقش کھینچ لیا جائے اور اس کے اوپر ایک اور بھی کھینچ لیا جائے تو ظاہر ہے کہ پہلا نقش معدوم ہو جائے گا یا بیکار ہو جائے گا مگر روح کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے کیونکہ اگر روح کے تختہ پر ہزار رہا اور کھوکھا نقوش بنا دیے جائیں تو تضاد رکھنے کے باوجود بھی سب موجود ہوں گے۔ مرصاد میں لکھا ہے کہ روح قہر اور لطف کی دونوں صفات رکھتی ہے اس کے لطف سے صفائی اور نور کا اظہار ہوتا ہے اور قہر سے تاریکی اور کدورت پیدا ہوتی ہے۔

اسی کتاب "مرصاد" میں یہ حدیث قدسی بھی تحریر ہے فی الروح خفی وفی الخفی سر و فی السر انا یعنی روح میں خفی اور خفی میں سر اور سر میں۔ میں (حق تعالیٰ) ہوں۔ اور مشائخ عظام رحمہم اللہ کی کتابوں میں یہی حدیث قدسی اس طرح بھی تحریر ہوئی ہے

الا ان فی جسد بنی آدم مضعته وفی المضعته قلب وفی القلب سر وفی السر خفی وفی الخفی اخفٰی وفی الاخفی انا

"یعنی بنی آدم کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے اور اسی لوتھڑے میں دل ہے اور دل میں سر ہے اور سر میں خفی ہے اور خفی میں اخفی ہے اور اخفی میں۔ میں (حق تعالیٰ) ہوں"

رسالہ روح الارواح میں تحریر ہے کہ

"حجاب کا جلانا روح کا کام ہے اور اناالحق (۱) کہنا اس کی گفتار ہے۔ نیز روح بغیر کسی واسطہ کے خدائے پاک کا کلام سنتا ہے اور بغیر حجاب کے اسے دیکھتا ہے نفس کو بغیر دیت کے قتل کرتی ہے۔ اس کو عقل نہیں پہچان سکتی۔ البتہ عرفا اس کو دیکھ سکتے ہیں اور اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ جس نے اسے دیکھا اور پہچان لیا ومن عرف روحه فقد عرف ربه۔ ومن عرف ربه فقد کل لسانه حکم کے معاملے میں حاکم ہے (یعنی روح) اور عبودیت میں منفرد۔ جدائی میں غمگین ہوتی ہے۔ حق اسی کے ساتھ ہے اور یہ حق کے ساتھ ہے۔ تمام عالم سے بڑی ہے ہر جگہ موجود ہے۔ ہر چیز اسی میں ہے۔ اور یہ بھی ہر چیز میں ہے پھر بھی لاپتہ ہے۔ روح کی صورت ایک آئینہ کی طرح ہے اور روح نے قل الروح من امر ربی کا آئینہ اشکال سے جدا کر دیا ہے اور حضرت قطب الدین دمشقی رحمتہ اللہ علیہ نے رسالہ کیہ میں لکھا ہے کہ انسان کی تمام حالتوں کا ذکر قرآن شریف میں مذکور ہے اس کی پہلی حالت یہ ہے ولقد خلقنا الانسان من طین "انسان کو ہم نے مٹی سے پیدا کیا" اور اس کا بدن جسم کثیف ہے اس کی دوسری حالت یہ ہے:۔

یاایتھا النفس المطمئنته ارجعی الٰی
ربک راضیا مرضیته

اور نفس جسم لطیف ہے جیسے بدن کے مختلف اجزاء میں ہوا کی لطافت یا دودھ میں مکھن۔ اور کتب فی قلوبھم الایمان یعنی ہم نے ان کے دلوں میں ایمان نقش کر دیا۔ اور قلب نفس میں داخل ہے مگر نفس سے بدرجہا روشن اور لطیف ہے

---

(۱) یہ لفظ اصل کتاب میں صاف طور پر سمجھ میں نہیں آتا۔ میرے خیال میں یہ "اناالحق" ہی ہے۔ چنانچہ یہی لکھا گیا (مترجم)

تیسری حالت یہ ہے **یعلم السر واخفیٰ** اور سر ایک روحانی نور ہے جو نفس کا آلہ ہے اور نفس کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا اور یہ کسی چیز سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جب تک اس کے ساتھ سر نہ ہو۔ چوتھی حالت یہ ہے **ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی** روح ایک روحانی نور ہے جو نفس کا تیسرا آلہ ہے اور انسان کے بدن میں زندگی میں اس وقت تک ہوتی ہے جب تک روح اسی نفس میں ہوتی ہے (۱) ہے۔ اور حق تعالیٰ کی عادت بھی یوں ہی جاری ہے۔

پانچویں یہ کہ روح خفی کو صوفیاء اخفی کہتے ہیں کہ وہ سر، روح

---

(۱) میں (حمزہ بابا رحمتہ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ جو روح امر ربی ہے وہ نفس کے اندر ہے اور نہ نفس اس کے طفیل زندہ ہے۔ چاہے وہ ہو یا نہ ہو۔ روح حیوانی کی وجہ سے نفس اور جسم زندہ ہوتے ہیں۔ اگر امر ربی اس جسم سے باہر ہو جائے یعنی جب یہ تعلق اس کے ساتھ ہے تو بھی جسم زندہ ہو گا بعض لوگ روح کو "راح" یا "ریح" کی مناسبت سے "ہوا" کی طرح ایک چیز سمجھتے ہیں مگر مجھے ان لوگوں سے اختلاف ہے میرے خیال میں وہ نہ تو کہیں گئی ہے نہ آئی ہے بلکہ وہ جیسے تھی ویسے ہی ہے۔ چونکہ روح جسم نہیں ہے اس لئے اس کے آنے جانے کا کوئی مطلب نہیں نکلتا او رجس وقت جسم مر جاتا ہے تو اس کا مراد یہ نہیں کہ اس سے روح چلی گئی اس لئے جسم مرگیا۔ بات یہ نہیں۔ جسم روحانی کے طفیل زندہ ہے یعنی جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہو کہ روح حیوان قوی اور زندہ رہے تو یہ زندہ ہوتی ہے (روح حیوانی) اور جب اجل آجائے تو مر جاتی ہے چونکہ روح ناسوت کا علم حاصل کرنے کے لئے اس جسم سے متعلق ہے اس لئے جسم کے مرنے کے بعد اس کے ساتھ تعلق قطع کر لیتی ہے اس لئے کہ اس کے لئے (روح کے لئے) جسم ناسوتی میں کوئی غذا باقی نہیں رہتی (مصنف)

اور قلب سے بھی زیادہ مخفی ہے سب کے دلوں اور سب کے قوت سمجھ سے اور وہ
ایک نور ہے جو سر اور روح سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ اور عالم حقیقت کے بہت
قریب ہے جب، کبھی نفس، قلب، عقل، سر اور روح اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتے ہیں
تو روح اخفی ہی انہیں آگاہ کرتی ہے۔ اور واقعتاً" یہ اللہ ہی کی طرف سے آگاہ کرنا
ہوتا ہے جو روح اخفی کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ غفلت عام اولیاء یا مومنین کی
ہوتی ہے اس لئے کہ خاص اور اخص اولیاء غفلت سے مبرا ہوتے ہیں وہ کبھی بھی اعلیٰ
سے اسفل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے یہاں تک کہ حق تعالیٰ بھی ان کے حق میں
ارشاد فرماتا ہے کہ وہ صرف اللہ ہی سے ڈرتے ہیں اور خدا کے علاوہ اور کسی سے
نہیں ڈرتے اور یہ روح اخفی باقی تمام روحوں سے زیادہ لطیف ہے۔ اس کے متعلق
اولیاء اللہ کا ارشاد ہے کہ یہ روح ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے خاص
بندوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ارشاد ہے یلقی الروح من امرہ
علیٰ من یشاء من عبادہ

وہ (اللہ) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنی روح (۱) (وحی۔ حکم۔ فرشتہ) بھیجتا
(اتارتا ہے) اور یہ روح عالم قدرت کی ملازم یا نوکر ہے یعنی ہاتھ کے وسیلے کی طرح
ہے اور عالم حقیقت کی مشاہد ہے۔ یہ کبھی بھی مخلوق کی طرف متوجہ نہیں ہوتی یہ دنیا
کی طرف کوئی التفات نہیں کرتی۔ جہاں تک نفس کا تعلق ہے تو اس کے اطوار اور
صفات بدلتے رہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد کے لئے ان کو الگ الگ پیدا فرما
ہے اور ہر ایک میں ایک فائدہ رکھا ہے اگر محض ایک ہی جان لیں

---

(۱) سورہ المومن کی پندرھویں آیت مبارک ہے اور سورہ المومن پارہ نمبر ۲۴ میں
ہے۔ مترجم

تو ہر ایک میں جو جو فائدہ ہے وہ بیکار ہو جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ روح اور نفس میں یہ فرق ہے کہ روح کی تمام صفات نیک ہیں اور نفس کی سراسر بری ہیں یعنی جس وقت اس پر نفس امارہ کا اطلاق ہوتا ہے اس وقت اس کی صفات بری ہوتی ہیں بلکہ ایسے وقت میں یہ (نفس) خدائی کا دعوے دار ہوتا ہے یعنی جو باتیں خدا نے اپنے لئے مقرر کی ہیں نفس ان کو اپنے لئے مانگ لیتا ہے۔ حال یہ ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ میرے (خدا کے) بندے میری ہی (خدا کی) بندگی کریں۔ مگر دوسری طرف نفس بھی یہی چاہتا ہے کہ لوگ میرے (نفس) کے مطیع رہیں۔**وعلیٰ ھذا القیاس۔**

اور صوفیاء کبھی کبھی قلب کہتے ہیں مگر اس سے مراد نفس ہوتا ہے اور کبھی اس سے روح مراد لیتے ہیں، کبھی عقل کیونکہ اس کا مقام قلب ہے اور اس کو قلب اس لئے کہتے ہیں کہ اگر نفس غالب ہو جائے تو یہ اس کے تابع ہوتی ہے۔اور اگر روح غالب ہو جائے تو اس کے تابع ہوتی ہے مطلب یہ کہ اگر ایک آدمی اس تمام بحث پر غور کرے اور مختلف مضامین کی تطبیق کرلے تو اولیاء اللہ رحمہم اللہ کی بات سمجھ میں آجائے گی جیسا کہ وہ فرماتے ہیں کہ روح نہ تو عرض ہے اور نہ جوہر بلکہ ایک لطیف و بے صورت نور ہے اور اسی روح کی وجہ سے جسم خاکی نامی، متحرک اور مدرک ہے اور مختلف ظہورات کے ساتھ اس قالب میں ظاہر ہوئی ہے کبھی قلب کی صفت سے موصوف اور کبھی صفت خفی کے انوار سے منور ہو کر انوار ملکوت کا ایک لطیفہ ہوتی ہے اور انوار جبروتی کی جامع اور انوار لاہوتی کی مظہر ہوتی ہے جو عالم ناسوت میں غریب و مسافر ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

کن فی الدنیا کانک غریب۔

یعنی دنیا میں مسافر کی طرح رہو۔

اولیاء اللہ پر اس کی کیفیت (روح کی) وھب یا کسب کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے

اور ہر قسم کے کمالات اسی روح کے ساتھ وابستہ ہیں اور کوئی شک نہیں کہ قدم اور حدوث کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق رکھتی ہے۔ قدم کے ساتھ اس کا تعلق کچھ اس قسم کا ہے کہ "اول" ہی خداوند عالم کے علم و ارادہ میں موجود تھی اور ابد میں اس کی ابدیت شریعت سے بھی ثابت ہے کہ ارواح قیامت کبرئ میں فنا نہ ہوں گی۔ اگرچہ اس حقیقت میں عرش۔ لوح و قلم بھی اس کے ساتھ شامل ہیں مگر شرف انسانیت۔ مظہرات اور مقصود پیدائش کی وجہ سے ہر چیز پر فوقیت رکھتی ہے۔ اور حدوث کے ساتھ اس کے "واسطہ" کی حالت یہ ہے کہ اپنے ظہور میں جسم کی محتاج ہے۔ چنانچہ عند التامل اس کا تعلق ہر دو کے ساتھ معلوم ہوتا ہے اگرچہ قدم کے ساتھ اس کا واسطہ غالب ہے۔

فرستادیم آدم را بہ گیتی جمال خویش در صحرا نہادم

عقل انسانی

حق تعالیٰ عز اسمہ نے روح انسانی یا نفس ناطقہ کو ایک ملکوتی جوہر بھی عنایت فرما دیا ہے جسے "عقل" کہتے ہیں اور اسی عقل ہی کے ذریعے انسان ہر چیز کی حقیقت سمجھتا ہے اور یہ اسی نفس ناطقہ ہی کی ایک خاص صفت ہے کہ انسان ہر چیز کے بارے میں "فکر" سے کام لیتا ہے اور معاملے کی اونچ نیچ پر غور کرتا ہے چاہے کوئی معاملہ ظاہر سے تعلق رکھتا ہو یا باطن سے اس کو سمجھنے کی سعی کرتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز کی کیفیت سمجھنا چاہتا ہے۔

دل میں عقل کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آنکھوں میں بینائی ہے۔ اور جان لینا چاہیے کہ حضور اقدس ﷺ کی روح پاک کو عقل اول اور عقل کل کہا جاتا ہے۔ اور یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا لقب بھی ہے چنانچہ یہ عقل جو انسان کو دی گئی ہے بہت بڑی چیز ہے اور جس طرح روح ایک نور ہے بالکل اسی طرح عقل بھی ایک نور ہے اور میرے **مرشد پاک** (قدس سرہ) کا ارشاد گرامی ہے "کہ انسان کی شرافت عقل سے مکمل ہو گئی کیونکہ یہ صرف روح تھی اس وقت اس کی شرافت ادنیٰ حیثیت رکھتی تھی۔ اسی طرح جب روح میں عشق نہ تھی تو بھی اس کی شرافت ادنیٰ حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ ان تینوں (روح، عقل اور عشق) کی برکت سے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہو گیا اگر ان تینوں میں سے کوئی ایک بھی نہ رہے تو اس کی شرافت ادنیٰ ہو گی" یہ آنحضرت ﷺ کی مقدس روح کا ایک پرتو ہے حدیث شریف میں ہے اول ماخلق اللہ العقل فقال لہ اقبل فاقبل ثم قال لہ ادبر فادبر دم ثم قال لہ اقعد فقعد۔ ثم قال لہ انطق فنطق ثم

قال له اصمت فصمت فقال فعزتی وجلالی و عظمتی وکبریائی و سلطانی و جبروتی ما خلقت خلقا احب الی منک ولا اکرم الی منک بک اعرف و بک احمد و بک اطاع وبک اخذ و بک اعطی و ایاک اغاتب و لک الثواب و علیک العقاب وما اکرمتک بشیئی افضل من الصبر یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عقل کو تخلیق فرمایا پھر اس سے فرمایا کہ "آگے آؤ تو وہ آگے آگئی۔ پھر حکم ہوا کہ پیچھے ہٹ جاؤ تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ پھر حکم ہوا کہ بیٹھ جاؤ تو وہ بیٹھ گئی پھر حکم ہوا کہ باتیں کرو تو وہ باتیں کرنے لگی۔ پھر ارشاد ہوا کہ خاموش ہو جا تو وہ خاموش ہو گئی پھر فرمایا کہ میں اپنی عزت، جلال، عظمت کبریائی، سلطانی و جبروت پر قسم کھاتا ہوں کہ تم سے بہتر مخلوق میں نے کوئی اور پیدا نہیں فرمائی اور جو مجھے تم سے زیادہ محبوب ہو۔ کیونکہ تیرے ذریعے ہی میں پہچانا جاؤں گا اور تیرے ہی ذریعے میری تعریف کی جائے گی۔ اور میں تم ہی پر غصہ کروں گا اور تیرے لئے ہی ثواب ہے۔ اور تیرے ہی لئے عذاب ہے اور میں نے تمہیں صبر کے ساتھ بزرگی عطا فرمائی ہے" اور حدیث شریف میں یہ بھی ہے اتقوا فراسته المومن فانه ینظر بنور الله یعنی مومن کی فراست سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے اور جان لینا چاہیے کہ حضرات صوفیا کے نزدیک عقل کی چار قسمیں ہیں۔ شمائل الاتقیاء میں "رسالہ سر اللہ" کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ عقل کی پہلی قسم حقیقی دوسری الہامی تیسری مجازی اور چوتھی غریزی کہلاتی ہے حقیقی عقل وہ ہے جو آدمی کی تخلیق سے اول ہی اول حق تعالیٰ نے ایک نور کی صورت میں ظاہر فرمائی اور اس سے خطاب فرمایا جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث سے ظاہر ہوتا ہے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء میں یہ روح اپنی حقیقت کے ساتھ بعینہ موجود ہوتی ہے اور اس کا مقام روح ہے دوسری الہامی عقل وہ ہے جو عالم

ملکوت سے فیض حاصل کرتی ہے اور اسی فیض کی برکت سے حق تعالیٰ کی نشانیوں پر غور کرتی ہے اور نیز حادث و قدیم میں فرق کرتی ہے۔ مزید برآں خیر و شر میں تمیز کرتی ہے اور آدمی کو اس دنیا سے قطع نظر آخرت کی طرف متوجہ کرتی ہے اور اس عقل کا مقام دل ہے۔ تیسری مجازی عقل وہ ہے جو حق تعالیٰ نے قلب کی سرشت میں رکھ دی ہے اور یہی قلب ارادت الٰہی سے کبھی کبھی منقلب بھی ہوتا ہے یعنی کبھی لطف و کرم اور کبھی قہر و غضب کی طرف مائل ہو جاتا ہے مگر جب یہی قلب "قائم" ہو جاتا ہے تو طاعت میں فتور یا نقصان نہیں آتا اور "قلب سلیم" اسی قلب کو کہا جاتا ہے اور جو قلب متفرق و منتشر ہو کر منہیات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور چوتھی عقل غرزی وہ ادراک ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں پیدا کیا ہوتا ہے اور وہی ادراک ہے جس کے ذریعے ایک آدمی بری اور اچھی چیزوں میں تمیز کرتا ہے اور یہی وہ عقل ہے جس کے طفیل بنی آدم حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اس کا مقام دماغ ہے اور دل اس سے کام لیتا ہے علماء نے عقل کی بجائے علم کو ترجیح دی ہے کیونکہ علم خدائے پاک کی صفت ہے اور اسمائے حسنیٰ میں شامل ہے یعنی حق تعالیٰ کو عالم یا علام بھی کہا جاتا ہے جبکہ "عقل" بنی آدم کی صفت ہے نیز حق تعالیٰ کو عقل کی نسبت نہیں کی جاتی۔ مگر بعض علماء نے مذکورہ بالا حدیث مبارک اور دیگر دلائل کے ذریعے عقل کو ترجیح دی ہے۔ اس تفصیل کے بعد یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ بالعموم تمام بنی آدم کے عقول جن قوتوں سے کام لیتی ہیں تو بحیثیت مجموعی وہ دس قوتیں (یا احساسات) ہیں ان میں سے پانچ کو حواس خمسہ ظاہری اور مابقایا پانچ کو حواس خمسہ باطنی کہا جاتا ہے حواس خمسہ ظاہری یہ ہیں:۔

(۱) باصرہ:۔ یعنی وہ جس کے ذریعے مختلف رنگوں، چیزوں اور شکلوں کو دیکھا جاتا ہے یعنی دیکھنے کی حس اور اس کا مقام آنکھیں ہیں۔

(۲) سامعہ:۔ اس کے ذریعے بنی آدم مختلف آوازوں کو سنتا ہے اور یہ قوت کانوں میں ہوتی۔ یعنی سننے کی حس۔

(۳) شامہ:۔ اس حس یا قوت کے طفیل خوشبو یا بدبو میں تمیز کی جاتی ہے اور یہ قوت ناک کو عطا ہوئی ہے۔

(۴ ذائقہ:۔ اس قوت یا حس کے ذریعے ہر چیز کا ذائقہ معلوم ہوتا ہے اور یہ حس زبان کو دی گئی ہے ۔۔

(۵) لامسہ :۔ اور اس قوت یا حس کے ذریعے چیزوں کی نرمی، سختی، گرم سرد کو معلوم کیا جاتا ہے یہ حس عام طور پر تمام بدن میں موجود ہوتی ہے مگر خصوصیت کے ساتھ انگشت شہادت میں بدرجہ اتم ہوتی ہے۔

جہاں تک حواس خمسہ باطنی کا تعلق ہے تو اس کا مقام کاسئہ دماغ ہے پھر علماء و عقلاء نے دماغ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلی قوت کو حس مشترک کہتے ہیں یہ قوت دماغ کے پہلے حصے میں ہے اس کا کام یہ ہے کہ حواس خمسہ ظاہری جو کچھ مجموعی طور پر محسوس و معلوم کرلے تو وہ سب کچھ ان سے یہی حس مشترک حاصل کرلیتی ہے۔ گویا کہ حواس خمسہ ظاہری اسی حس مشترک (باطنی) کے جاسوس ہیں یعنی وہ جو کوئی خبر پالیتی ہیں **من و عن** حس مشترک کے حوالے کردیتی ہیں۔ دوسری باطنی حس کو قوت خیال کہا جاتا ہے اس کا فرض منصبی یہ ہے کہ جو کچھ حس مشترک سے معلوم کرلے اس کو "محفوظ" کرلیتی ہے اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ فرض کیجیے۔ باصرہ (دیکھنے کی حس) کسی شخص کو دیکھ لے تو اس کا رنگ اور ناک نقشہ معلوم کرلیتی ہے اور یہی معلومات اس سے قوت حس مشترک حاصل کرلیتی ہے۔ اور پھر حس مشترک سے وہی معلومات قوت خیال حاصل کرلیتی ہے اور اس طرح سے محفوظ کرلیتی ہے کہ چاہے وہ آدمی چلا بھی جائے تو اس حس کے اندر اس کی شکل و صورت محفوظ رہ جاتی

ہے اور یہ حس (خیال یا متخیلہ) گویا حس مشترک کا خزانہ ہے۔ تیسری: متصرفہ اور متصرفہ وہ قوت ہے کہ ہر چیز کی صورت اور معنی کو یکجا کر کے اور سوچ سمجھ کر اس کو جان لے۔ صورت سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کو حواس خمسہ ظاہری معلوم کرتی ہے اور اسی وجہ سے اس کو متخیلہ بھی کہتے ہیں اور معنی سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کو حواس خمسہ ظاہری معلوم نہیں کر سکتی ہیں۔ مثلاً" دوست کی دوستی اور دشمن کی دشمنی کو پہنچاننا۔ اور اس صفت کی وجہ سے اس کو متفکرہ بھی کہا جاتا ہے۔ حواس خمسہ باطنی کی چوتھی قوت کو قوت واہمہ کہتے ہیں۔ اس قوت کا کام یہ ہے کہ جو چیزیں حواس خمسہ ظاہری نے معلوم کی ہوں یا معلوم نہ کی ہوں اور ان چیزوں کا وجود ہو یا نہ ہو۔ مگر قوت واہمہ خود ہی اپنی طرف سے اس کا ایک نقشہ بنا لیتی ہے مثلاً" سورج تو ایک ہی ہے اور چاند بھی ایک ہے مگر قوت واہمہ ایسے چار چار پانچ پانچ چاند اور سورج فرض کر سکتی ہے اور یہ قوت حواس کی تابع نہیں ہے۔ مثلاً" رات کے وقت کسی کے گھر میں کسی مرے ہوئے انسان کی لاش پڑی ہو۔ اور باصرہ (دیکھنے کی قوت) دیکھ رہی ہو کہ یہ مردہ ہے اور کوئی حرکت نہیں کر سکتا اور متخیلہ بھی خیال کر لے کہ یہ مردہ لاش بے حس و حرکت ہے اور کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی مگر اس کے باوجود (یعنی باصرہ اور متخیلہ) کے علم کے باوصف واہمہ خوفزدہ ہو گی اور اس پر ایک دہشت طاری ہو گی۔ حواس خمسہ باطنی کی پانچویں قوت کو حافظہ کہا جاتا ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ جو علم و معلومات حواس خمسہ ظاہری اور باطنی نے مل کر حاصل کی ہوتی ہیں ان سب کو اپنے احاطے میں لے کر یاد رکھتی ہے اور کسی ایک کو بھی اپنے احاطے سے نہیں جانے دیتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دماغ کے پہلے حصے میں حس مشترک کا مقام ہے پھر خیال کا اور دماغ کے دوسرے حصے میں پہلے نمبر پر متصرفہ ہے اور اس کے بعد واہمہ ہے اور دماغ کے تیسرے حصے میں پہلے حافظہ کا مقام ہے اس تفصیل کے بعد سمجھ

لینا چاہیے کہ عقل مجازی اور عقل غریزی جو ان قوتوں سے کام لیتی ہیں تو تعلیم کی محتاج ہوتی ہیں کیونکہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ جب تک علم نہ ہو۔ اس کی ایک قوت بھی کسی چیز کی مکمل حقیقت یا اصلیت کو نہیں پہچان سکتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ فرض کیجیے زید اور عمر ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہوں تو دونوں کی قوت باصرہ ایک دوسرے کو دیکھے گی اور ان کی متصرفہ قوت یہ خیال کرے گی کہ ہم دونوں "آدمی" ہیں مگر جب تک ایک دوسرے کو نام لے کر نہ پکاریں ایک دوسرے کی پہچان ممکن نہ ہو گی۔ یہاں پر ملحوظ خاطر رہے کہ علم سے میرا مطلب وہ علم یا علمیت نہیں جو پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے بلکہ اس سے مراد "لغوی معنے" ہیں یعنی پہچان یا دریافت اور اس میں وہ علم بھی شامل ہے (یعنی پڑھنے لکھنے والا علم) فرشتوں کی حالت بھی یہی تھی جب تک ان کو علم نہیں دیا گیا تھا تو کسی چیز کو بھی پہچاننے سے قاصر تھے اور حضرت آدم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے نام سکھائے اور وہی چیزیں فرشتوں کے سامنے دکھائی گئیں اور ان سے دریافت کیا گیا تو فرشتے ان کو پہچاننے سے عاجز آگئے اور ان چیزوں کے نام نہ بتا سکے۔ بعد ازاں جب وہی چیزیں حضرت آدم علیہ السلام کو دکھائی گئیں تو حضرت آدم علیہ السلام نے سب کے نام بتا دیئے چنانچہ فرشتوں نے عرض کیا کہ اے اللہ تیری ذات پاک ہے ہمیں تو بس اتنا ہی علم ہے جو تو نے دیا ہے علاوہ ازیں جہاں عقل کی قوتوں کو علم کی ضرورت ہے وہاں علم کو بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں فارسی کی ایک مثال ہے یک من علم را دہ من عقل باید یعنی ایک من علم کے لئے دس من عقل کی ضرورت ہوتی ہے حضرت مخدوم سعد قدس سرہ نے لکھا ہے کہ جس وقت خدا نے عقل کو پیدا فرمایا تو فرمایا کہ "میں کون ہوں" عقل خاموش رہی (اور کوئی جواب نہ دے پائی) چنانچہ عقل کی آنکھوں میں وحدانیت کا سرمہ ڈالا گیا لہٰذا بول اٹھی کہ انت اللہ لا الٰہ الا انت " یعنی

تو ہی معبود ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عقل جو نور کی حالت میں تھی بغیر تعلیم کے خدا کو نہ پہچانتی تھی تو غور کرنا چاہیے کہ وہ "عاقل" جو محض عقل مجازی اور عقل غریزی سے تعلق رکھتا ہے اور اگر وہ الہامی اور حقیقی عقل سے خالی ہو تو حق تعالیٰ کو کیسے پہچان سکے گا۔ قطع نظر ان حقائق کے اگر چہ عقل کی ساری قوتیں انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہیں اور اس کے وجود میں موجود ہوتی ہیں۔ مگر بچہ جب تک بالغ نہ ہو مکمل نہیں ہوتیں پھر جب تک چالیس برس کا نہیں ہوتا عقل میں اضافہ نہیں ہوتا یعنی چالیس برس کے بعد اس میں اضافہ ہو جاتا ہے اور تجربہ بھی حاصل ہوتا ہے مراد یہ کہ چالیس برس کی عمر میں قابل اعتبار ہو جاتا ہے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ بات عقلاً" و نقلاً" ثابت بھی کر دی جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے بدیہات پر غور کرنا چاہیے کہ بعض لوگوں میں بعض قوتیں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہیں جیسا کہ زرقائے یمامہ کی قوت باصرہ (دیکھنے کی قوت) کا ذکر کتابوں میں موجود ہے کہ وہ تین دنوں کی مسافت کی دوری پر بھی کسی سوار کو دیکھ سکتا تھا۔ خاقانی نے کہا ہے۔

چشم زرقا را کشیدہ کحل غیب

اسی طرح ایک حکیم کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ کئی میلوں کی دوری سے چکی پینے کی آواز سن لیا کرتا تھا۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایسی باتیں شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتی ہیں اسی طرح حکماء اور عقلا کی دماغی قوتیں دیگر لوگوں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہیں مثال کے طور پر گذشتہ یا موجودہ زمانے کے موجدوں اور عام لوگوں کی ذہنی قوتوں میں فرق کو دیکھا جا سکتا ہے اسی طرح بعض لوگوں کی قوت واہمہ اتنی طاقت ور ہوتی ہے کہ وہ حد سے زیادہ ڈرتے رہتے ہیں بعض کی قوت متفکرہ انتہائی طاقت ور ہوتی ہے ایسے لوگ جس مسئلے کے متعلق بھی غور کرتے ہیں تو صحیح طور پر اس کو حل

کر لیتے ہیں وعلیٰ ھذا القیاس۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ اگر یہ قوتیں بعض دوسری چیزوں سے بھی قوت حاصل کرتی ہوں تو معمول سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہیں مثلاً" دور بین کے ذریعے اتنی دور سے چیزیں نظر آتی ہیں کہ عام طور پر نہیں آسکتیں۔ اور جیسے طبیعت کی قوت لامسہ اپنی قوت متفکرہ کی علمی مدد کے ذریعے نبض کی حرکات سے معلومات حاصل کرتی ہے بالکل اسی طرح جو ہنر اور کام جس قوت کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں اور جونہی یہی قوت اس کا مکمل علم حاصل کر لیتی ہے تو وہ اپنی حدود سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

جب یہ بات **بدیہا**" ثابت ہو گئی تو سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی قوت شامہ نے یہ کارنامہ کر دکھایا تھا کہ مصر سے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کی خوشبو محسوس فرمائی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کتنی دور سے آواز سنی تھی۔ یہ سب باتیں حق ہیں۔ اگر سرسید اور اس قماش کے لوگوں نے ان امور کی تاویلیں نہ کی ہوتیں تو مخالفین اسلام پر ہر روز نئے نئے اعتراضات نہ کرتے۔ مطلب یہ کہ یہ تاویلیں سرسید وغیرھم کی طرف سے ان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ اگرچہ آج کل آریہ سماج (ہندو) بھی اپنے ویدوں کے کمزور منتروں کی تاویلیں کرتے ہیں یہاں تک کہ بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی اور مساوات (انسانی) جو کلیتاً اسلامی اصول ہیں کو ویدک دھرم میں داخل کر رہے ہیں بہر حال جب یہ ثابت ہو گیا کہ دور دراز فاصلوں سے بعض عام لوگوں کی حواس خمسہ ظاہری کام کر دکھاتی ہیں تو ایک نبی علیہ السلام کا اپنے شہر کنعان میں مصر سے اس کے بیٹے کی قمیص کی خوشبو محسوس کرنا کیونکر ناممکن ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی قوت سامعہ نے آسمان کا دروازہ کھلنے کی آواز بھی سنی تھی اور متفکرہ قوت امتیاز کے فرائض پوری کر رہی تھی اور فرشتہ سورہ انعام لے کر نازل ہو گیا۔ بالکل اسی طرح آنحضرت

ﷺ نے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف دیکھا اور قبلے کے رخ کو درست فرمایا۔

اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ عقل اور نقل دونوں سے یہ بات ثابت ہے کہ حق تعالیٰ نے ان حواس میں دو قسم کے مادے (خصوصیات) رکھے ہیں ایک وہ جس کو بالفعل کہا جاتا ہے اور دوسرے کو بالقوہ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ہر وقت کام نہیں کر سکتے لیکن ہو سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ذات میں عقل حقیقی اور عقل الہامی کے علاوہ مذکورہ بالا مادے پہلے سے موجود ہوں۔ (اس لئے) انہیں تمام قوتیں انتہائی درجے تک حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح جو مادر زاد ولی ہوتے ہیں ان کو بھی بعض قوتیں کسی قدر تفاوت کے ساتھ حاصل ہوتی ہی۔ البتہ وہ لوگ جو مادر زاد ولی نہ ہوں ان کو پہلے ریاضت کی توفیق دی جاتی ہے اور کسب کے بعد وھب الٰہی ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور ان کا مخفی مادہ اسے ظاہر کر دیتا ہے ان کا سامعہ کچھ اور سنتا ہے (جو عام لوگ نہیں سن سکتے) اور (اسی طرح) ان کی قوت باصرہ بصیرت الٰہی سے مل جاتی ہے (مگر خیال رہے) کہ انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ انتہائی بلند ہوتا ہے اور اولیاء رحمھم اللہ جن مراتب کو حاصل کرتے ہیں ان کے سامنے اس عقلی مکاشفہ کی مثال ہو بہو ایسی ہے جیسے ایک فاضل ترین استاد کے سامنے الف۔ بے کا ایک شاگرد ہوتا ہے وہاں نہ عقل رہتی ہے نہ عاقل۔ نہ ادراک ہوتا ہے اور نہ مدرک ہوتا ہے۔

حضرت شیخ سعد قدس سرہ فرماتے ہیں:۔ "تامرد بہ باطن نہ رسد و کشف امور غیبی نہ بشود دیدہ عقل کشادہ نہ گردد و معانی معقولات روئے نہ نماید و اسرار آفرینش و حکمت وجود ہر چیز نہ داند کمال استدلال دست نہ دہد"

"جب تک (سالک) باطن تک نہ پہنچ جائے اور اس پر امور غیبی منکشف نہ ہوں نیز اس کی عقل کی آنکھیں کھل نہ جائیں، معقولات کے معنے نہ جان لے اور ہر وجود

کی پیدائش اور حکمت کے اسرار کو نہ پہچان لے تو استدلال کا کمال اسے حاصل نہ ہوگا"

آگے تحریر فرماتے ہیں:۔ "چوں سالک بجذبہ ارادت الٰہی از طبیعت اسفل قدم بہ علائے حقیقت نہد۔ باطن خویش را از ریاضت صاف گرداند۔ دیدہ او کشادہ گردد۔ بعد ازاں رفع حجاب و صفائے عقل و معانی معقولات زیادہ شود ایں را کشف نظر گویند۔ باید کہ سالک ازیں بگذرد وقدم پیشتر نظری گویند۔ باید کہ سالک ازیں بگذرد وقدم پیشتر زند' از طریق فلاسفہ مہمل۔ ودریں معقولات نماند کہ ضلالت راہ او باشد۔ بلکہ قدم پیشتر کند تابہ نور دل پیوند کہ آنرا کشف نوری گویند"۔

"جس وقت سالک خداوند کریم کے ارادے سے مقام اسفل سے اپنی ریاضت کے ذریعے اپنا باطن صاف کرلے اور اعلیٰ مقام تک پہنچ جائے تو اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور بعد ازاں پردہ اٹھ جاتا ہے اس کی عقل پاک و صاف ہو جاتی ہے اور معقولات کے معنوں کو زیادہ طور پر سمجھنے لگتا ہے اور اسے کشف نظری کہا جاتا ہے مگر سالک کے لئے لازم ہے کہ وہ اس مقام سے بھی اپنے قدم آگے بڑھائے اور مہمل فلاسفہ کے طریق کو یکسر چھوڑ دے کیونکہ یہ اس کو گمراہ کردے گا۔ اس لئے اس منزل سے گذر جائے تاکہ اس کو دل کی روشنی (نور) حاصل ہو اور اسی کو کشف نوری کہتے ہیں"۔

حضرت شیخ سعد قدس سرہ نے کئی دیگر مراتب کا ذکر بھی کیا ہے بہرحال اس سے ہماری یہ بات ثابت ہوگئی کہ کشف عقلی ادنیٰ ترین درجہ رکھتی ہے مطلب یہ ہے کہ جو لوگ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ رحمتہ اللہ علیہم کی قوتوں اور حسیات کو بھی اپنی عام قوتوں اور حسیات کی طرح سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء بھی ہماری طرح تھے اور اس حساب سے ایسے (برخود غلط) لوگوں نے ظاہری عقل

کے زور سے باقاعدہ اپنے "مذاہب" بنائے ہیں اور لوگوں کو اپنا تابع بھی بنایا ہے ان عقائد کے رو سے یہ سب گمراہ ترین لوگ ہیں بلکہ عقل و حواس سے بھی معرا ہیں ہم نے انبیاء اور خصوصا" حضور اقدس ﷺ کی حواس کی قوت کا ذکر معراج، اثبات معجزہ اور کرامت اولیاء کے ذیل میں کیا ہے۔

مثنوی

اشقیاء رادیدہ بیُنانہ بود   نیک و بد در چشم شاں یکساں نمود

اولیاء راہمچو خود پنداشتند   ہمسری با انبیاء برداشتند

گفتہ اینک مابشر ایشاں بشر   ماؤ ایشاں بستہ خوابیم و خور

ویں نہ دانستند ایشاں از عمیٰ   ہست فرقے درمیاں بے انتہا

ہردوگوں آہو گیا خوردند و آب   زاں یکے سرگیں شد و دیگر مُشک (۱)

صد ہزاراں ہمچناں اشباہ بیں   فرق شاں ہفتاد سالہ راہ بیں

مثنوی شریف کا دوسرا شعر خاص طور پر وہابیوں پر صادق آتا ہے کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو حضور اقدس ﷺ کو اپنی طرح ایک "عام" بشر سمجھتے ہیں اور آپ ﷺ کو محض ایک بڑے بھائی کی طرح بھی سمجھتے ہیں یہ لوگ حضور اقدس ﷺ کی محبت کو فرض نہیں سمجھتے تشہد میں **السلام علیک ایھا النبی** نہیں کہتے بلکہ السلام علی النبی کہتے ہیں۔

---

(۱) یہ درست نہیں۔ یہاں پر "آب" کے وزن پر کسی لفظ کو آنا چاہیے۔ میرے پاس مثنوی شریف نہیں ہے۔ قارئین کرام سے معافی اور درستی کی درخواست کی جاتی ہے مترجم

ان لوگوں کے نزدیک حضور اقدس ﷺ سے محبت فرض نہیں بلکہ بقول ان کے صرف آپ ﷺ کی اتباع ضروری ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کے راستے پر جا رہا ہو اور اس کی پیروی کی جائے تو منزل تک پہنچ جائے گا۔ اس سے محبت کی کوئی ضرورت نہیں صرف اس کی پیروی کی جائے۔ چاہے اس "رہبر" سے "بغض" اور "دشمنی" ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس لئے کہ یہ بغض اور دشمنی اس کو کوئی ضرر یا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ متاسفانہ یہی وہ لوگ ہیں جو بات بات پر مومنوں کو "مشرکین" کہتے ہیں جبکہ خود ہزار ہزار بار شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ لوگ "اتنے بڑے موحد" ہوں جو بقول ان کے خدا کے سوا کسی اور سے مدد لینا کفر و شرک سمجھتے ہوں تو ہر روز طبیبوں (وغیرہ) سے علاج و دوائی کی مدد کیوں لیتے ہیں۔ اور دوائی کو صحت کا ذریعہ کیوں سمجھتے ہیں۔ یہاں پر اگر یہ لوگ کہدیں کہ شفا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے تو غلط کہتے ہیں (اس لئے کہ پھر دوائی اور ڈاکٹروں کی کیا ضرورت) یعنی کہ اگر اللہ تعالیٰ کو شفا دینے والی ذات سمجھتے ہوں تو ظاہر ہے کہ دوائی کی کوئی ضرورت نہ ہوگی اور اگر یہ لوگ یہ جواب دے دیں کہ "یہ ایک سبب ہے" تو پھر انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کو بھی وسیلہ یا سبب بنانے میں کیا حرج ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ کیا انبیاء علیہ السلام و اولیاء ان ڈاکٹروں سے کمتر لوگ ہیں۔ خدا کی پناہ۔ بدیں عقل و دانش بباید گریست

مدعا یہ ہے کہ عقل انسانی بہت بڑی چیز ہے انسان کو اسی سے شرف بھی حاصل ہے کیونکہ اسی کے طفیل انسان دیگر حیوانوں سے ممتاز ہے اور اگر عقل نہ ہو تو خدا کو بھی نہیں پہچانا جا سکتا۔

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

مگر عقل مجازی اور عقل غریزی یہ قابلیت نہیں رکھتی کہ ذات حق تعالیٰ اور اس

کی صفت اپنے ادراک کے ساتھ، جو بالفعل ہے، پہچان لیں اس لئے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی علم کی محتاج ہیں اور اس پر مستزاد حادث ہیں جبکہ حق تعالیٰ قدیم ہے۔

حادث بہ قدیم کے برد راہ

اور اگر وہ صفت جو حق تعالیٰ نے ان کے اندر بالقوت رکھ دی ہے اسے حاصل کرلے اور اس کے ساتھ علم بھی رکھتی ہوں پھر بھی حدوث کی صفت اس سے زائل نہیں ہو سکتی اور عقل جب خود ہی خدا کی طرف خالصتاً متوجہ ہو جاتی ہے اور اس کی طرف سے ہدایت پا لیتی ہے تو کہیں جا کر اپنی حقیقت اور دوسری باتوں کو سمجھ لیتی ہے۔

اب جو لوگ اپنی موجودہ عقل پر اعتبار کرتے ہیں وہ عقلمند نہیں ہیں ایسے لوگ ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں یہی نیچری قسم کے لوگ خود حضور اقدس ﷺ کے دور مبارک میں بھی موجود تھے۔ اور ہم نے قبل ازیں بھی کہا ہے کہ روس کے علاوہ "ہندوستان" (۱) میں بھی نیچری اور ملحد لوگوں کی بہتات ہے یہ لوگ خدا اور رسول ﷺ کے ماننے والوں اور صوفیائے کرام اور علماء دین کی برحق پیروی کرنے والوں کو پرانے زمانے کے جاہل سمجھتے ہیں۔ ان ملاحدہ کا عقیدہ ہے کہ خدا کو ماننا "کمزوری" کی دلیل ہے درحقیقت یہ بھی قیامت کی نشانیوں میں ایک نشانی ہے ایک حدیث مبارک میں ارشاد ہوا ہے کہ جب پچھلی امت کے لوگ اگلی امت کے لوگوں کو برا کہے تو یہ قرب قیامت کی نشانی ہو گی مگر تعجب ہے کہ ان عقائد کے باوصف

---

(۱) جس زمانہ میں یہ کتاب (تجلیات محمدیہ ﷺ) تصنیف کی گئی تھی اس دور میں برصغیر کا بٹوارہ نہ ہوا تھا چنانچہ اس کا نام "ہندوستان" تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہاں پر "ہندوستان" لکھا گیا ہے۔ مترجم

بعض نیچری "مسلمانی" کا دعویٰ بھی کرتے ہیں مگر یہ ان کا فریب اور مکر ہے ان لوگوں سے حکمائے اشراقین بھی سخت نالاں تھے۔ جنہوں نے ریاضت کی برکت سے اشراق کی قوت حاصل کی تھی۔ جبکہ نیچری لوگ صرف فلسفہ کے چند ایک قواعد کی وجہ سے حد سے نکل گئے ہیں (جو علمی اور روحانی لحاظ سے کوئی وقعت نہیں رکھتے) اور طرہ یہ کہ یہی بر خود غلط نیچری تمام عقلا' حکماء' عرفا اور علماء کو نادان کہتے ہیں مسلمانوں کو چاہیے کہ حضور اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کو نبی برحق اور خاتم الانبیاء مانیں اور آپ ﷺ کے بعد کسی اور نبی کو قطعاً" نہ مانیں چاہے ایسا نبی صاحب شریعت ہو یا صاحب شریعت نہ ہو (۱)

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ خاتم الانبیاء یا خاتم النبین کے معنے ایسے نہ کریں جیسا قادیانی احمدی کرتے ہیں اور خاتم کے معنے مہر کرتے ہیں یعنی آنحضرت ﷺ کی مہر پر قیامت تک نبی آتے رہیں گے۔ آنحضرت ﷺ کو نبیوں کی مہر کہنا بھی مرزا صاحب کی خود غرضی پر مبنی ہے اور اب بھی جو قادیانی حضرات ایسا کہتے ہیں سب خود غرضی کی بنا پر کہتے ہیں ورنہ مرزا محمود "خلیفہ" اور اس کے دوسرے ہم مشرب مرزا صاحب کا علمی درجہ حضور اقدس ﷺ سے برتر سمجھتے ہیں انہوں نے قادیان میں بروزی کعبہ بھی تعمیر کیا ہے ان کے خیال میں خانہ کعبہ (بیت اللہ) جانے کی کوئی ضرورت نہیں (کیونکہ اپنا کعبہ جو بنا لیا ہے) اس کے علاوہ قادیان میں دمشق کا شرقی منارہ بھی کھڑا کیا ہے جس کے بارے میں حدیث نبوی ﷺ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنا اولین نزول وہاں فرمائیں گے۔ (ایسے مشرقی منارے تو یہ لوگ درجنوں بنا سکتے ہیں مگر حیرت یہ ہے کہ حضور اقدس نے تو دمشق کے مشرق منارے کا ذکر فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ قادیان۔ قادیان ہے دمشق نہیں) مگر حدیث مبارک میں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ مشرقی مینار پر نزول اجلال فرمائیں گے۔ (باقی اگلے صفحے پر)

اور حضور اقدس ﷺ فداہ امی وابی کو "بادشاہ" اور "عاقل" نہ جانیں۔ یعنی یہ خیال کریں کہ حضور اقدس ﷺ صرف عاقل تھے اور اپنی عقل کے ساتھ کار نبوت کو چلایا اور ایک مذہب کو روشناس ________

....

یعنی ان کے نزول کے وقت مینار موجود ہو گا (جو بعد میں تعمیر ہو گا) مگر قادیان کے "عیسیٰ" نے نزول پہلے کیا اور مینار بعد میں تعمیر ہوا۔ در اصل یہ ان لوگوں کی عادت ہے کہ ہر چیز کے الٹے معنے کرتے ہیں۔ مثلاً" خاتم النبین کے معنے ہیں سلسلہ نبوت کو ختم کرنے والا مگر یہ لوگ اس کے معنے انبیاء کو جاری کرنے والا کرتے ہیں ہم کہتے ہیں کہ

الیوم اکملت لکم دینکم

کے مصداق دین مکمل ہو گیا اور اصول یہ ہے کہ جب حکم مکمل طور پر تحریر کیا جائے تو اس کے آخر میں مہر لگا دی جاتی ہے مطلب یہ ہوتا ہے کہ بیان تکمیل کو پہنچ کر ختم ہو گیا ہے۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہاں! مگر یہ بیان پھر کون کھولے گا۔ ہم کہتے ہیں کہ ضرور کھولا جائے گا بلکہ اس کھولنے کے لیے" علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" فرمایا گیا ہے لیکن اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ نبی ہی اس کو کھولے گا۔ تو اس ضمن میں ہم نے کسی گذشتہ بیان میں تصریح کی ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے ہر نبی کو ایک خاص نشان ملا ہے جو اس نبی کو دوسروں سے ممتاز بناتا ہے مگر یہ نشان اس نبی کو متابعت کی وجہ سے نہیں دیا جاتا بلکہ یہ خدا کی خاص مہربانی ہوتی ہے اس لئے کہ اگر یہ نبی کی متابعت کا نتیجہ ہوتی تو ضروری تھا کہ وہ نشانی اس نبی کے متبوع کے پاس بھی ہوتی۔ لیکن اس صورت میں اگر تابع و متبوع دونوں کے پاس ایک ہی قسم کے نشانات ہوں تو امتیاز کا معیار قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ پھر تو تابع و متبوع برابر ہو جائیں گے اس لئے ہم کہتے ہیں کہ قادیانی ہمیں مرزا صاحب کی ایسی کوئی خاص نشانی بتا دیں جو ان کو حضور اقدس ﷺ سے (خدانہ خواستہ) ممتاز کرتی ہو یا مرزا صاحب اور حضور اقدس ﷺ (بقیہ اگلے صفحے پر)

کیا۔ بلکہ حضور اقدس ﷺ کو عقل اول و عقل کل و سید المرسلین اور خاتم النبین جانے (اور اس پر ایمان لائے) غرضیکہ خاتم النبین کے معنے و مفہوم کو الٹانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی "امت" دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی جن میں

....

میں فرق واضح کرتی ہو یا وہی نشان حضور اقدس ﷺ کے وجود میں نہ ہو۔ اس لئے کہ اگر

حضور اقدس ﷺ میں

بھی وہی چیز ہو تو پھر امتیاز کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ اب اگر قادیانی مرزا صاحب کے وجود میں کوئی وجہ امتیاز ثابت کر دیں تو اس ضمن میں میرا جواب یہ ہو گا کہ مرزا صاحب نے اپنی اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ میں محمد ﷺ کا بروز اور عکس ہوں۔ تو فرمایئے جو چیز اصل میں نہ تھی وہ بروز میں کیسے اور کہاں سے آگئی۔ جبکہ یہ بات ظاہر ہے کہ جو چیز اصل میں نہیں ہوتی وہ کسی طرح سے بھی بروز نہیں آسکتی۔ اور اگر قادیانی یہ کہہ دیں کہ جو کچھ حضور ﷺ کے وجود میں تھا وہی مرزا صاحب کے وجود میں بھی ثابت ہے۔ تو یہ بات سنت الہی کے بالکل خلاف ہے کیونکہ سنت الہی تو یہ ہے کہ ہر نبی دوسرے نبی سے ایک خاص نشانی کی وجہ سے ممتاز ہوتا ہے یعنی ایک خصوصیت اس میں ایسی ہوتی ہے جو دوسرے کسی نبی میں نہیں ہوتی۔ چنانچہ قرآن مجید کو مناسب وقت پر علماء نے کھول دیا ہے اور اس سے اپنے علم کے مطابق استفادہ کیا ہے اور بعد ازاں حضرت امام مہدی علیہ السلام اس کو کھولے گا جو بقول مرزا صاحب ایک مکمل بروز ہیں۔ اس لئے کہ اگلے نبی علیہم السلام خاص وقتوں میں ایک خاص قوم کی طرف آتے رہے ہیں چونکہ وہ ایسا کامل دین نہ لائے تھے۔ جو تمام مخلوق کے لئے قابل عمل ہو یہی وجہ ہے کہ اس کا سلسلہ آمد بھی ختم نہ ہوتا تھا مگر جب آنحضرت ﷺ مبعوث ہوئے تو کل عالم کے لئے ایک کامل اور مکمل دین لے آئے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا دین کو مکمل فرمانا اور کل عالم کے لئے ایک کامل ترین دین کا لانا ثابت کرتا ہے کہ انبیاء علیہ السلام کا کام ختم ہو گیا ہے (مصنف)

ہے ایک کو لاہوری اور دوسرے کو قادیانی کہا جاتا ہے اور امید ہے کہ ان میں بہت سے دیگر فرقے بھی پیدا ہو جائیں گے۔

آج کل ایک اور صاحب نے بھی "تولد" فرمایا ہے جس کا نام عبد اللہ تیما پوری ہے وہ بھی نبوت اور امامت کا دعویٰ کرتا ہے اور عجب یہ کہ مرزا صاحب کی "نبوت" کو بھی مانتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی عبد اللہ تیما پوری کو اس کے مخالفین نے مناظرے کی دعوت دی مگر چونکہ اس کو اپنی جان کا خطرہ تھا تو لوگوں کو کہہ دیا کہ مجھ پر خدا نے الہام کیا ہے کہ **"یاایھا النبی تیماپور میں رہو"**

یعنی تیما پور سے باہر قدم نہ رکھنا مدعا یہ کہ یہ سب ناقص عقل کے کھیل تماشے ہیں اور فی الحقیقت اس کی بھرپور وجہ بے جا تاویلیں ہیں۔ اس لئے کہ تاویل کا فریضہ بھی عقل ہی ادا کرتا ہے اور جب نفسانیت عقل پر غالب آجاتی ہے یعنی عقل مغلوب ہوتی ہے تو یہی مغلوب نفس عقل کی منشا اور رضا کے مطابق تاویل گڑھ لیتی ہے۔ مثلاً مرزا صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزات کو مسمریزم اور علم الترٰاب سے تعبیر کیا ہے اور یہ اس لئے کہ خود مرزا صاحب کا نفس اسی پر خوش ہو رہا تھا کہ

ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو — اس سے بہتر غلام احمد ہے

یا یہ کہ۔ — اینک منم کہ حسب اشارت آمدم

عیسیٰ کجاست تا بنہد پا بہ مِنْبَرم

تو ان کی عقل نفس کی مخالفت کیسے کرتی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو کیونکر معجزے تسلیم کرتے جبکہ وہ ان معجزات کو علم الترٰاب یا مسمریزم سمجھتے تھے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عقل ایک بڑی چیز ہے اور اس کو بڑی چیز ماننا بھی چاہیے

مگر ہمارا مطلب یہ ہے کہ اس کو ایک حد تک بڑی چیز ماننا چاہیے یعنی اس حد تک جہاں تک اس کی رسائی ہو سکتی ہو یا پھر اسی عقل کی رائے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے خلاف نہ ہو یا وہ مردود نفسانیت کی اشتعال کی وجہ سے نہ ہو۔ اور چونکہ ہم نے یہ بات ثابت کی ہے کہ عقل غریزی اور عقل مجازی یکسر ناقص اور حادث ہیں تو ضروری ہے کہ مسلمان لوگ انبیاء علیہم السلام کے معجزات کی کوئی تاویل نہ کریں اور جس رنگ اور طور پر حضرت قرآن مجید میں ان کا ذکر ہوا ہے بس اسی طرح ان پر ایمان لے آئیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ عقل اس لئے نہیں ہوتی کہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات کی تاویلات پیش کرتی پھرے۔ بلکہ خدا نے انسان کو عقل اس لئے عطا فرمائی ہے کہ جو کچھ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اس کی پیروی کرے اور اس کو سمجھے اور ارشادات الٰہی کو اپنے لئے مفید جانے۔ مگر سمجھنے سمجھانے کا مطلب یہ بھی نہیں کہ مثلاً" میں یہ معلوم کرنا چاہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کس طرح اور کیونکر آسمان پر چڑھ گئے یا وہ کس طریقے پر مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ یہ اقتضائے عقل ہے اور بزعم خود عقل ناقص ہے یعنی اگر ایسے معاملات میں عقل و فکر کو استعمال کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ ناقص چیز (عقل) کا ادراک بھی ناقص ہی ہو گا۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچ جائے گی کہ نہ عیسیٰ علیہ السلام نے مردوں کو زندہ کیا ہے اور نہ ہی اپنے وجود عنصری کے ساتھ آسمان پر گئے ہیں۔ مگر (ایسے لوگ) صاف طور پر یہ بھی نہیں کہتے۔ اس لئے کہ پھر تو (ظاہراً") نص کی مخالفت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ نص کو تو تسلیم کر لیتے ہیں مگر اس کی تاویل اس طرح پیش کر دیتے ہیں کہ احیائے موتی سے مراد کافروں اور گنہگاروں کی گمراہ روحوں کو مسلمان اور پاک کرانا ہے اور رفع سماوی سے مراد بلندئی درجات ہے۔ (مگر سچی بات یہ ہے) کہ یہ اور اس قسم کی تمام تاویلات قطعاً" فضول ہیں۔ ایسی فضول تاویلات سے جو نقصان اسلام کو پہنچا ہے وہ ظاہر ہے اور

غضب یہ کہ ایسے لوگ یہ بھی نہیں کہتے کہ "اس قسم کی لایعنی تاویلات ہم نے نیچری لوگوں کے جواب یا مقابلے کے لئے پیش کی ہیں" حالانکہ درست بات یہ ہے کہ نیچریوں ہی کے خوف سے یہ سب کچھ کیا گیا ہے تاہم اگر یہ لوگ کچھ عرصے کے لئے خاموش رہتے تو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ نیچری لوگ اپنے اعتراضات خود بخود واپس لے لیتے۔ اور اگر خواہ مخواہ جواب دینا ہی ضروری تھا تو معترض کو جسم انسانی میں عجائبات کا حوالہ دیتے کیا اس سے زیادہ عجیب تر کوئی اور چیز ہے۔ نیز ان کو یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ اور یہ کہ انسان خدا کی مخلوقات میں کتنی عجیب چیز ہے اور جہاں تک اس کے پیدا کرنے والے کا تعلق ہے تو وہ اس سے بھی زیادہ عجیب مخلوق تخلیق کر سکتا ہے۔ جبکہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات بھی یہی قادر مطلق ہی ظاہر فرماتا ہے۔ اور ایسی باتوں کے سلسلے میں عقل ناقص کی کوئی بات نہیں مانی چاہیے عقل کی نقص کا یہ عالم ہے کہ جب انسانی جسم پر ایک معمولی سی آفت آجائے تو انسانی حس باصرہ کی بصیرت، سامعہ کی سماعت اور متفکرہ کی فکر رخصت ہو جاتی ہیں۔ یعنی عقل کے ان "جاسوسوں" کا دور دور تک پتہ نہیں لگتا۔ اور ایسے حالات میں انسان کو خود معلوم نہیں ہوتا کہ میں کون ہوں۔ ابلیس نے اسی عقل کو استعمال کیا تھا اور حق تعالیٰ کو کہا تھا۔ کہ "خلقتنی من نار" اور مردود ہو گیا۔ اس لئے کہ اس نے عقل کی بات مانی تھی۔ دوسری جانب حضرت آدم علیہ السلام کی مثال ہے۔ آپ علیہ السلام نے "**ربنا ظلمنا**" عرض کر دیا لہٰذا حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے نوازا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحبت ہی میں نہ بیٹھنا چاہیے جو خدا اور رسول اللہ ﷺ کے اقوال و آیات کی تاویل اپنے نفس کے مطابق کرتے ہوں۔ ایسے لوگوں کی صحبت زہر قاتل ہوتی ہے تعجب یہ کہ ایسے لوگ اپنے آپ کو "مسلمان" بھی کہتے ہیں اور اسی لباس میں لوگوں کو اس طرح دھوکہ دیتے ہیں کہ اللہ

تعالٰی کی ایتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کی تاویلات اپنے نفس اور عقل کے مطابق پیش کرتے ہیں، ان کے معنے بدلتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں مثلاً اس ایت مبارک **وبالاخرۃ ھم یوقنون** (مومن وہی ہیں جو آخرت پر ایمان و ایقان لاتے ہیں) کے معنے یہ کہہ کر بدل لیتے ہیں کہ آخرت سے مراد "آخر" ہے اور انسان کا آخر "موت" ہے چنانچہ بقول ان کے "دوبارہ زندہ ہونا اور حساب کتاب کا لینا دینا سب جھوٹ ہے" اور یہ وہ دہریہ لوگ کہتے ہیں جو دنیا کی قدامت کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک دنیا کبھی بھی فنا نہ ہوگی۔ نیز کہتے ہیں کہ یہ دنیا مادے کی ترکیب سے پیدا ہوئی ہے اور یہ سب کچھ خود بخود پیدا ہوا ہے اور کہتے ہیں کہ جب مادے کی ایک صورت فنا ہو جاتی ہے تو دوسری صورت میں نمودار ہو جاتی ہے۔ بہر حال دنیا کی قدامت ہم نے کسی گذشتہ بیان کے حاشیہ میں تناسخ کے ذیل میں زیر بحث لاکر باطل ثابت کی ہے۔ مادے کے حدوث کے اثبات میں محض اتنا کہدینا بھی کافی ہے کہ مادہ ایک قابل تقسیم شے ہے۔ اور اسی مادہ کی ایک صورت کا ختم ہونا اور دوسری صورت اختیار کرنا بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ مادہ قابل تقسیم چیز ہے اور جو چیز قابل تقسیم ہو وہ حادث ہوتی ہے اسے قدیم کہنا اپنے پاگل پن کا ثبوت فراہم کرنے کے مترادف ہے۔ مثال یہ ہے کہ تین ذرے اس طرح رکھ دیئے جائیں کہ درمیانہ ذرہ باقی ماندہ دو ذروں سے بڑا ہو (• ● •) اب سوال یہ ہے کہ درمیانی (بڑا) ذرہ باقی ماندہ دو ذروں کے ملانے میں مانع ہے کہ نہیں ہے۔ اگر کہدیا جائے کہ "نہیں ہے" تو تداخل جوہر لازم آئے گا۔ یعنی یہی درمیانی ذرہ اپنی لطافت کی وجہ سے دونوں ذروں میں شامل ہوا ہوگا اور اگر کہا جائے کہ مانع ہے تو تقسیم لازم آئے گی ورنہ مانع کیا معنے رکھتا ہے۔ مدعا یہ کہ مادہ قابل تقسیم ہے اور عقل کے رو سے قابل تقسیم شے ہرگز "قدیم" نہیں ہو سکتی۔

سوامی دیانند نے سیتارتھ پرکاش میں قدیم اشیاء کی صفت یہ بیان کی ہے کہ "قدیم" شے کبھی دور نہیں ہوتی" (قدیم خیز هیچرے نه لرے کیزی) یعنی انفصال اور اتصال سے پاک ہوتی ہے اور مادے کی صورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ انفصال اور اتصال کی دونوں حالتیں قبول کرتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ حالتیں مادہ ترکیب کے بعد قبول کرتا ہے لیکن اگر ہم مادے کو پیس کر اس حد تک باریک بنالیں کہ اس کی حد ختم ہو جائے تو پھر کیا وہ نہ کٹ سکے گا۔ اور نہ ترکیب قبول کرے گا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مادے میں اصلاً" ترکیب قبول کرنے کی صفت موجود نہ ہوتی تو اس کے جزو میں بھی یہ صفت نہ ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ مادے کے ذرے کو اگر انتہائی باریک اور لطیف بھی بنایا جاوے اور بظاہر وہ نہیں کٹ سکتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کٹ ہی نہیں سکتا۔ بلکہ اس کو کاٹنے کے لئے ہمارے پاس ایسا کوئی باریک آلہ نہیں کہ اسے کاٹ لے۔ ورنہ اس کی اصل میں کٹنے کی قابلیت کہاں سے آتی۔ مطلب یہ کہ عقل کے رو سے بھی مادہ حادث ثابت ہوتا ہے اور جب حادث ٹھہرا تو حادث کی فنا کے لئے ایک وقت کی ضرورت ہو گی۔ اس لئے کہ ہر حادث چیز کے لئے ایک ایسا ابتدائی وقت بھی چاہیے جس سے قبل وہ موجود ہی نہ تھی۔ دوسری بات یہ کہ ہر علت کے لئے ایک معلول کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ علت بغیر معلول کے ممکن ہی نہیں۔ پس ان سب کی علت مٹی اور پانی ہے او سوچنے کی بات ہے کہ مٹی اور پانی کے لئے بھی علت موجود ہو گی بعد ازاں پھر بھی اس کے لئے علت ضروری ہو گی کیونکہ علت بغیر معلول کے ناممکن ہے۔ عقل بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ کسی علت کے بغیر ہی معلول موجود ہو جائے لہٰذا اگر ہم مادے کو قدیم بھی مان لیں تو ناممکنات کا ایک لامحدود سلسلہ بھی تسلیم کریں گے اور

فصل ۹

(۱) حضور اقدس ﷺ کو ندا کرنا۔

(۲) مرشد کے پاؤں چومنا۔

(۳) گنبد کی تعمیر۔

(۱) حضور اقدس ﷺ کو ندا کرنا۔

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو حرف ندا کے ساتھ یاد کرنا۔ مثلاً"

یا رسول اللہ ﷺ

یا نبی اللہ ﷺ

یا حبیب اللہ ﷺ

اور ان کے علاوہ دیگر بہترین القاب کے ساتھ آپ کو ندا کرنا بالکل صحیح اور جائز ہے اور یہی محبان نبوی ﷺ کے ایمان اور محبت کا تقاضہ ہے اسی طرح ایک حدیث مبارک میں بھی وارد ہے۔

وقیل الرسول اللہ (ﷺ) ارایت الصلوۃ المصلین علیک فمن غاب عنک و من یاتی بعدک ما حالھا فقال اسمع صلوۃ اہل محبتی و اعرفھم و تعرض علی صلوٰۃ غیرھم عرضا"

یعنی حضور اقدس ﷺ سے پوچھا گیا کہ آیا آپ ﷺ ان لوگوں کے درود کو بھی سماعت فرماتے ہیں جو آپ ﷺ کے سامنے نہ ہوں (کہیں دور

غائب ہوں) اور وہ لوگ جو آپ ﷺ کے بعد اس دنیا میں آئیں گے' ان دونوں گروہوں کی کیا حالت ہو گی۔ تو حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنے محبین کے درود کو سنتا ہوں اور ان کو پہچانتا بھی ہوں ان کے علاوہ میں دیگر تمام لوگوں کے درود کو سنتا ہوں جو مجھ پر درود بھیجتے ہیں"۔

علاوہ ازیں حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

"میں وہ بھی سنتا ہوں جو تم لوگ نہیں سن سکتے" اور "میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے"۔

چنانچہ مدینہ منورہ سے خانہ کعبہ کو دیکھنا اور قبلے کی رخ کو درست کرنا' آپ ﷺ کے پیچھے نماز ادا کرنے والے مقتدیوں کو دیکھنا' آسمان کے دروازے کے کھلنے کی آواز سننا اور سورہ انعام کے نزول وغیرہ کے صحیح' مستند اور معتبر روایات سے بھی یہ سب کچھ ثابت ہے۔ اگر چہ روح تو ہر شخص کی زندہ ہوتی ہے مگر (بعد از وفات) انبیاء علیہم السلام کی ارواح تو جسم کے ساتھ زندہ ہوتی ہیں اور یہ حقیقت تو از روئے عقائد بھی ثابت ہے۔ اور جہاں تک حضور اقدس ﷺ کی روح اقدس کا تعلق ہے تو وہ دیگر تمام روحوں سے اعلیٰ و بہتر ہے اور آپ ﷺ کا جسم اطہر بھی روح ہی کی طرح قدسی اور مبارک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کا سایہ نہ تھا۔ جہاں تک آپ ﷺ کی صفات کا تعلق ہے یعنی دیکھنے یا سننے وغیرہ کی صفات جن کا ذکر ہو چکا ہے وہ بدستور قائم و دائم ہیں وہ ہر وقت اپنا کام کرتی ہیں اور (خدانخواستہ) وہ ہرگز معطل نہیں ہیں ارشاد نبوی ﷺ ہے:۔

علمی بعد وفاتی کعلمی فی حیاتی

وفات کے بعد بھی میرا علم میری زندگی کی طرح برقرار ہو گا"

اور حق سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

ان رحمته اللہ قریب من المحسنین

یعنی اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے بہت قریب ہے

اور نیز:۔

وما ارسلنک الا رحمته اللعلمین

یعنی اور ہم نے آپ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تو جب رحمت خداوندی نے حضور اقدس ﷺ کی ذات اطہر میں ظہور فرمایا اور آپ ﷺ مجسم طور پر خدا کی بے پایاں رحمت کی صورت میں متشکل ہوئے اور اس کا مظہر بن گئے تو ثابت ہو گیا کہ حضور اقدس ﷺ ہر وقت محسنین کے قریب ہوتے ہیں۔ ویسے اگر رحمت کے عام معنے بھی لئے جائیں تو عام معنوں میں بھی سب سے آگے آپ ﷺ ہی کی ذات مبارک ہو گی اس لئے کہ آپ ﷺ ہی رحمتہ اللعالمین ہیں۔ اب جبکہ قرآن و حدیث سے یہ دونوں باتیں ثابت ہیں اور اس کے باوجود بھی جو لوگ حضور نبی کریم ﷺ کو مردہ یا غائب سمجھتے ہیں تو بخدا ایسے لوگ خود مردہ اور غائب ہیں اور جو لوگ صرف اس کو دیکھتے ہیں کہ انک میت وانھم میتون یعنی بہ تحقیق آپ ﷺ کو بھی مرنا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے تو ایسے لوگوں کی نظریں پختہ نہیں کچی ہیں اس لئے کہ جب حضور اقدس ﷺ کی حیات مبارک ہماری طرح نہیں مثلاً" آپ ﷺ کی قوت بصارت و سماعت وغیرہ ہم جیسی نہیں بلکہ عظیم الشان ہیں تو آپ ﷺ کی وفات کیسے ہماری طرح ہو گی۔ آیا اس دنیا میں کوئی ایک بھی ایسا مسلمان ہو سکتا ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ حضور اقدس ﷺ ذات و صفات میں ہم جیسے تھے۔ یا آپ ﷺ کی بشریت ہم جیسی تھی۔ اگر چہ بمصداق قل انما انا بشر مثلکم کہا جاتا ہے کہ نفس بشریت میں ہماری طرح تھے مگر کیا حقیقت میں بھی ایسے تھے یعنی

جس طرح بشریت کا اطلاق ہم پر ہوتا ہے تو کیا حضور اقدس ﷺ ایسے ہو سکتے ہیں اسی طرح حقیقت کو لیجیے تو کیا حقیقت میں ہماری بشریت آپ ﷺ کی بشریت کے برابر ہو سکتی ہے۔ حاشا وکلا۔ ایسا عقیدہ رکھنے والے وہ لوگ ہوں گے جن کو شیطان نے "نام نہاد توحید" کی ایسی تعلیم دی ہوتی ہے جس کے اثر سے ان کے دلوں میں حضور اقدس ﷺ کی محبت کی رمق بھی نہیں رہتی اور اس ایت مبارک:۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات

(اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں ان کی نسبت یوں مت کہو کہ وہ (معمولی مردوں کی طرح) مردے ہیں بلکہ وہ تو ایک ممتاز حیات کے ساتھ زندہ ہیں.............)

کی تاویلیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کا نام اور تعلیم زندہ ہیں حالانکہ اس ایت مبارک کے آخر میں صاف طور پر ارشاد ہوا ہے (۱) کہ:۔

ولکن لا تشعرون لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے

ایک اور مقام پر "شعور" سے قطع نظر پوری وضاحت کے ساتھ **یرزقون**

فرمایا گیا ہے ارشاد ربانی ہے

---

(۱) اس مقام پر اس حقیر و فقیر مترجم نے متن میں کسی قدر تصرف (اگر یہ تصرف ہو) کی جسارت کی ہے اور مقصد صرف اپنے مشائخ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی ارواح مقدسہ کو خوش کرنا ہے۔ اسی طرح سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۶۹ اور ۱۷۰ دونوں آیتیں لکھ دی ہیں تاکہ قارئین تشعرون اور یرزقون کے مفاہیم کو مزید سمجھ سکیں تاہم ہمدان مترجم اس تصرف کے لئے اپنے ہادی (حمزہ بابا رحمتہ اللہ علیہ) کی روح سے معافی کا خواستگار ہے (حقیر مترجم)

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین بما اتھم اللہ من فصلہ و یستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم الا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (سورۂ آل عمران آیت ۱۶۹-۱۷۰)

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ان کو مردہ نہ سمجھو۔ وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہل ایمان ان کے پیچھے رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لئے بھی کسی خوف اور رنج کا موقعہ نہیں ہے۔ بہرحال مطلب یہ کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے ہیں ان کو باقاعدہ رزق دی جاتی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی یہ لوگ (منکرین) کیا تاویل کریں گے۔ بات یہ ہے کہ منکرین چاہے کیسی بھی تاویلات پیش کریں مگر حقیقت یہ ہے کہ **یرزقون** کی اصلیت تو کسی طور پر بھی معدوم نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یا تو ان کو رزق دینے کی بات تسلیم کریں گے اور اگر صرف ایک ہی کو بھی رزق دینے کی بات مان لیں تو بھی حیات ثابت ہو جاتی ہے۔ بہرنوع "یرزقون" سے حیات انبیاء اولیاء اور شہداء ثابت ہے۔(۱

---

(۱) حضرت حمزہ بابا کا مطلب صاف ہے اور درست بھی مگر یہاں پر بہتر ہو گا کہ حضور اقدس ﷺ کی ایک حدیث بھی نقل کی جائے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "مومن مرتے نہیں البتہ دار فنا سے دار بقاء کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں" خیال رہے کہ "بقاء" حاصل کرنے میں ترقی کا ایک مکمل راز مضمر ہے یہ نعمت عظمیٰ تمام مومنین کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ سب شہید ہوتے ہیں اور شہید وہ ہوتا ہے۔ جو اللہ کی راہ جان دے دے اور حق تعالیٰ کی واحدنیت کی گواہی دے دے۔ اولیاء بھی ایسے ہی ہوتے ہیں اور معلوم ہو گا کہ نفس کے ساتھ جہاد کو جہاد اکبر فرمایا گیا ہے (مترجم)

اس ایت کے مابقایا حصہ کی جو تاویل یہ لوگ کرتے ہیں تو ضرورت اس امر کی ہے کہ جیسا کہ وہ ہر لحاظ سے حق ہے اور اس کی تاویل جائز نہ ہوگی کیونکہ فی الحقیقت حیات النبی ﷺ یا حیات مومنین کے منکرین تو ایت کی تاویل اس لئے پیش کر رہے تھے کہ ان کی وفات ثابت ہو جائے مگر دیکھئے یرزقون سے تو بہر حالت "حیات" ہی ثابت ہوتی ہے چنانچہ ایسے منکرین کی تمام تاویلیں بے موقعہ اور ناجائز ہیں بلکہ ہمارے نزدیک تو یہ کلام اللہ میں تحریف کے برابر ہے (خدا کی پناہ)

ان حقائق کے پیش نظر اگر وہابی عقیدہ رکھنے والے پھر بھی تاویلات پیش کریں اور حیات النبی ﷺ کے منکر ہوں تو پھر قادیانیوں کو بھی حق پہنچتا ہے کہ وہ رفع عیسیٰ علیہ السلام کی تاویل پیش کریں۔ قادیانی "رفع" کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ اس لفظ کو موت یا وفات کی معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ وہابی طبقہ قادیانیوں کا بدترین مخالف ہے۔ ہم حیران ہیں کہ پھر ایسا کیوں ہے۔ (کیونکہ تاویلات پیش کرنے میں دونوں کوئی کسر نہیں چھوڑتے)۔

بات یہ ہے کہ "رفع" کا لفظ کہیں کہیں وفات کے معنوں کے لئے بھی مستعمل ہے۔ مگر دوسری جانب "یرزقون" ہے جس کی کوئی تاویل ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کہ رزق کا تعلق تو صرف اور صرف زندہ چیزوں سے وابستہ ہوتا ہے مردہ کو تو رزق دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ یہ لوگ روح کے اثر اور حیات کے منکر ہیں بلکہ ان کو اس حقیقت کا علم ہی نہیں۔ اس لئے یہ لوگ نبی ﷺ یا کسی ولی یا شہید کو ندا دینے کے منکر ہیں بلکہ وہ تو حیات میں بھی ندا کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ اس بات کو مانتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ پشت مبارک سے بھی چیزیں یوں دیکھا کرتے تھے جیسے سامنے سے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر وقت حضور اقدس ﷺ ایسا نہیں کر سکتے تھے الا جب تک خدا آپ ﷺ کو آگاہ

نہ فرماتے۔ یعنی جب اللہ کو منظور ہوتا (تو ایسا ہو جاتا) اور اگر اللہ کو منظور نہ ہوتا تو آپ ﷺ معجزہ نہ دکھا سکتے تھے بے شک یہ ہم بھی مانتے ہیں مگر یہ نہیں مانتے کہ وہ معجزات حضور اقدس ﷺ کی روح میں بھی نہ تھے کیونکہ ان تمام معجزات (جن کا ظہور فرمایا گیا ہے) کے اظہار کی طاقت حضور اقدس ﷺ کی روح میں موجود تھی اگرچہ یہ طاقت حق تعالیٰ نے دی تھی جبکہ منکرین یہ کہتے ہیں کہ جب حضور اقدس ﷺ کو معجزات دکھانے کی قوت حاصل تھی۔ تو ہر وقت ان کو ظاہر کرنے سے کیوں "معذور" تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ روح کی صفات متغیر بھی ہو جایا کرتی ہیں یعنی محض ایک وقت میں روح صرف ایک ہی خیال کرتی ہے یا صرف ایک ہی صفت کا اظہار کر سکتی ہے۔ فرض کیجیے روح پر حق تعالیٰ عز اسمہ کی محبت کا غلبہ ہے تو ایسے لمحات میں وہ کوئی دوسرا فکر نہیں کر سکتی۔ دوسری بات یہ کہ حضور اقدس ﷺ کا کام صرف معجزات دکھانا نہیں تھا بلکہ اس دنیا میں دین حق کا ایک عالمگیر نظام قائم کرنا تھا۔ علاوہ ازیں معجزہ کے اظہار کے لئے بھی ایک وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور صاف ظاہر ہے کہ حضور اقدس بس یونہی بے موقع تو معجزہ کا اظہار نہیں فرما سکتے تھے۔

بہرحال معجزہ کا دکھانا روح قدس کا کام ہے اور حضور اقدس ﷺ کی روح قدسی صفت کی حامل ہے اور زندہ ہے اور جن صفات سے متصف ہے اب بھی انہی صفات کا حامل ہے اور اگر وہابی یا دوسرے لوگ یہ کہدیں کہ آپ کی روح اقدس اور جسم اطہر دونوں فوت ہو چکے ہیں تو بہتر یہی ہے کہ اس عقیدے سے توبہ کریں۔ اس لئے کہ یہ بات کلمہ کفر سے کسی صورت میں بھی کم نہیں اور اگر لامحالہ حضور اقدس ﷺ کی روح کی وہ صفات بھی تسلیم کریں گے جو اس مقدس و منور روح میں موجود تھیں۔ یعنی پشت اور سامنے سے ایک برابر دیکھنا کسی کے دل کے حالات سے باخبر

ہونا، دور دراز ملکوں کے حالات سے باخبر ہونا اور آئندہ آنے والے زمانے کے حالات سے بھی باخبر ہونا وغیرہ وغیرہ اور الحمدللہ حضور اقدس ﷺ کے غلاموں میں بھی ایسے لوگ گذرے ہیں جو اسی قسم کی صفات سے متصف تھے بلکہ اب بھی موجود ہیں تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ میں کیونکر نہ ہوں گی۔ **یا نبی اللہ السلام علیک۔ انما الفوز والفلاح علیک**

بسلام آدم جوابم دہ — مرہمے بر دل خرابم نہ

بس شود جاہ و احتشام مرا — یک علیک از تو صد سلام مرا

سویم افگن ز مرحمت نظرے — باز کن بر رخم زلطف درے

گر نہ رفتیم بر طریق سنت تو — ہستم از عاصیان امت تو

مرشدوں کے پاؤں چومنا۔

جو مرید اپنے مرشد کے پاؤں چومتا ہے یا اس کے پاؤں پڑتا ہے تو ضروری ہے کہ اس کا سر نیچے ہو گا۔ مگر یہ نماز میں سجدے یا رکوع کی طرح عبادت کا سجدہ نہیں ہے نہ ہی یہ تعظیم کا ہے کیونکہ ہر عمل نیت پر موقوف ہے انما الاعمال بالنیات اور اگر کوئی شیخ کے پاؤں نہ چومے اور صرف اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یا شیخ آپ کا قدم اور میرا سر۔ جیسے عبد الرحمان بابا رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا

ہمیشہ د زما سر او ستا قدم وی
تر هغه ساعته پورے څو مے دم وی

ترجمہ:۔ اے شیخ (محبوب) جب تک میرے جسمانی وجود میں آخری دم باقی ہو تو خدا کرے اس وقت تک میرا سر آپ کے قدموں میں پڑا رہے۔

اور اس سجدے سے مقصود سجدہ عبادت نہیں ہوتا اور یہ فعل مشائخ سلف کی طرف سے ہوتا آیا ہے حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء قدس سرہ کے ملفوظات میں لکھا ہے۔ کہ حضرت بابا فرید الدین شکر گنج قدس سرہ کے حضور میں اکثر مریدین ایسا کیا کرتے تھے۔ (۱) اور حضرت شیخ سعد قدس سرہ (جن کو شیخ عبد الحق محدث قدس سرہ اپنی کتاب اخبار الاخبار میں حدود احکام شریعت کے حافظ کہتے ہیں) نے مجمع السلوک میں اپنے متعلق تحریر فرمایا ہے:۔

....

(۱) خیال رہے کہ سجدہ بذاتہ حرام نہیں ہے بلکہ جس نیت سے کیا جاتا ہے تو نتائج اسی نیت پر مرتب ہوتے ہیں ذاتاً" سجدہ حرام نہیں مگر اس سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ غیر اللہ کو سجدہ کیا جائے۔ بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر سجدہ کی ذات حرام ہوتی تو حضرت آدم علیہ السلام کی بابت فرشتوں کو کیوں کر حکم دیا جاتا

واذ قلنا للملئکته اسجدوا لادم فسجدوا الا ابلیس

(اور بس جس وقت ہم نے حکم دیا فرشتوں اور جنات کو کہ سجدے میں گر جاؤ آدم کے سامنے سو سب سجدے میں گر پڑے بجز ابلیس کے)

اور پھر اس فعل کے نہ کرنے کی وجہ سے عزازیل لعنت میں کیوں گرفتار ہوا یہ بات تو معلوم تھی کہ فرشتوں کا یہ سجدہ تعظیم کا سجدہ تھا سجدہ عبادت نہ تھا۔ اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ فی الاصل یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کے نور کو ہو رہا تھا جو ان کی پیٹھ میں داخل کر دیا گیا تھا بہر حال غیر اللہ کو (تعظیمی) سجدہ کرنا حرام نہیں اس لئے کہ وہ سجدہ عبادت نہیں ہوتا البتہ اگر کوئی یہ کہدے کہ بت پرست بھی بت کو محض وسیلہ بناتا ہے۔ اور اس کی نیت خدا کو سجدہ کرنے کی ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے (باقی ، گلا ص:

کہ جب وہ اپنے شیخ حضرت شاہ مینا قدس سرہ کے دربار میں حاضر ہوتے تو تحریر

....

کہ بت پرستوں کی دیگر تمام باتیں اسلام کے احکام کے مطابق نہیں ہیں نہ بت پرست
اسلام کے کسی اصول کو تسلیم کرتے ہیں چاہے اگر وہ نماز پڑھ لیں یا حج کر لیں (یعنی
بت پرست) تو بھی ان کے کام نہیں آسکتے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ایک اونٹ
نے بھی سجدہ کیا تھا۔ اور اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا تھا کہ اگر
اجازت ہو تو ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کریں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
اجازت نہ دی تھی۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا حرام
ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منع کرنا دو وجوہات کی بنا پر ضروری تھا۔ ایک تو یہ کہ اگر
اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سجدہ تعظیم کی اجازت مل جاتی تو ان کے اسلام لانے کے بہت
تھوڑے دن (عرصہ) ہوا تھا۔ اور قدیم بت پرستی کی یادیں ان کے دلوں میں موجود
تھیں۔ چنانچہ اگر ان کو اجازت ملتی تو (خطرہ تھا) کہ وہ دوبارہ بت پرستی کی طرف راجع
نہ ہو جائیں۔ دوسری وجہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے ممانعت فرمائی تھی کہ
غیر اللہ کے سامنے سجدہ عبادت نہ ہو۔ یعنی سجدہ تعظیم سے منع نہ فرمایا تھا۔ کیونکہ
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا گیا تھا۔ اور
عزازیل کو اس لئے سزا دی گئی کہ اس نے نہ کیا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں کر سجدہ
تعظیم سے منع فرماتے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ سجدہ عبادت میں تو گھٹنوں' ہاتھوں اور
پیشانی کو زمین پر لگانا لازمی ہوتا ہے بلکہ ناک بھی زمیں پر لگائی جاتی ہے اور تعظیم کا سجدہ
محض پاؤں میں گرنے کی حد تک محدود ہوتا ہے' پاؤں چومنا یا فرش ادب چومنا ہوتا
ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا بلکہ اس سے آگے جانا منع بھی ہے جب تک
سالک کی سمجھ بوجھ میں (علم) میں تبدیلی نہ آجائے اور جب تک بے اختیار نہ ہو(مؤلف)

فرمایا ہے۔ "درپائے ے افتادم" یعنی ان کے پاؤں میں گر جاتا تھا اور اس کی سند یہ ہے کہ جب عبد القیس کا وفد حضور اقدس ﷺ کے حضور میں حاضر ہوا تھا تو اس میں شامل ہر فرد آنحضرت ﷺ کو دیکھنے کے لئے بے تاب اور مشتاق تھا اور عملاً ان متبرک افراد نے اپنی بے تابی اور وارفتگی کا اظہار بھی کر دیا کہ آنحضرت ﷺ کو دیکھتے ہی اپنی سواریوں سے اتر گئے' آپ ﷺ کے دست ہائے مبارک کو چوم چوم لیا پھر آپ ﷺ کے پیروں میں گر پڑے یہاں تک کہ حضور اقدس ﷺ نے ان کے سروں کو اٹھایا۔ مگر ان کو اس فعل سے منع نہ فرمایا۔ (کہ ایسا نہ کیا کرو)۔

حضرت شیخ عبد الحق محدث قدس سرہ نے مدارج النبوہ میں تحریر فرمایا ہے۔

و آوردہ اند کہ چوں آں گروہ بملازمت شرف آنحضرت ﷺ رسیدند۔ و جمال باکمال او دیدند از مراکب بر زمین افتادند و دست وپائے او را بوسہ داد ند و داد عاشق و شوق داد ند۔ آنحضرت ﷺ تقریر کردہ ایشانرا برآں و منع نہ کرد ازاں۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس فعل سے حضور اقدس ﷺ نے وفد کے پاک افراد کو منع نہ فرمایا تھا۔ اور فتح طائف کے بعد انصارؓ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔

" انصاری اکابر و بزرگان نے رونا شروع کیا اور نبی کریم ﷺ کے دست مبارک اور زانوئے اقدس کو چومنے لگے (۱)

اور ایک مقام پر حضرت شیخ محدث نے ان دونوں باتوں میں سے ایک تحریر فرمائی ہے اور بعد ازاں لکھا ہے:۔

---

(۱) اصل کتاب "تجلیات محمدیہ" کے صفحہ ۳۵۵ پر مدراج کا فارسی جملہ چھپائی کی خرابی کے وجہ سے سمجھ میں نہیں آتا چنانچہ مترجم نے مدراج النبوت کے اردو ترجمہ سے یہ فقرہ نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ مدارج النبوت مترجمہ اردو جلد دوئم از مولانا عبد المصطفے محمد اشرف نقشبندی صفحہ نمبر ۵۱۸

"ومشائخ کہ تجویز پائے بوسی کردہ اند۔ شاید' از ہمیں جاست"

"یعنی مشائخ کا پیروں کو چومنے کی تجویز شاید اسی وجہ سے ہو"

قبر کو چومنے کا بھی یہی حکم ہے۔ اور روایات میں ماں باپ اور استاد کی قبر کو چومنے کا ذکر موجود ہے اور اسے جائز فرمایا گیا ہے۔ مرقاۃ اور شیخ کی شرح مشکوٰۃ' معدن المعانی اور خزانۃ الروایات میں بھی اس کا جواز تحریر کیا گیا ہے۔ یعنی قبر پر بھی اسی طرح مودب رہنے کی ضرورت ہوتی ہے جیسا ادب صاحب قبر کی حیات میں ہوا کرتا تھا۔ کتاب زاد اللبیب میں لکھا ہے

گفتہ اند علماء کہ زیارت میت حکم زندہ میدارد":۔

"علماء نے کہا ہے کہ میت کی زیارت بالکل زندگی میں زیارت کا سا حکم رکھتی ہے"۔ یعنی میت کے پاس ادب کے ساتھ آنا اور اس کا خیال رکھنا ادب میں شامل ہے۔ لہذا یہ بات دلیل ہے اس امر کی کہ وہی میت ایک زندہ فرد کا حکم رکھتی ہے۔ اور شیخ محدث قدس سرہ نے اپنی کتاب "جذب القلوب" میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضری کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"و روئے نیاز بر خاک مالید"

یعنی روئے نیاز کو خاک پر رکھ کر مل دیا"

بہرحال ہمارا یہ ایمان ہے کہ یہ فعل اگرچہ صورت تو سجدے ہی کا رکھتا ہے مگر فی الحقیقت سجدہ نہیں ہے۔ جیسے نماز جنازہ۔ جو صورت تو بت پرستی کی رکھتی ہے مگر حقیقت میں بت پرستی نہیں ہے۔ ویسے بھی اعمال کی جزا و سزا نیت پر موقوف ہے۔ بالکل اس طرح جیسے ایک شخص نماز کی نیت نہ کرے اور اس کے باقی ارکان پورے کر لے تو ایسی نماز ہرگز قبول نہیں ہوتی اگرچہ بہ ظاہر اس کیصورت نماز ہی کی ہو گی۔ بعینہ اسی طرح اولیاء کے مزارات کی حیثیت بھی جداگانہ اور طواف کعبہ کی جداگانہ

حیثیت رکھتی ہے۔ مولوی ولی اللہ محدث رحمتہ اللہ علیہ نے رسالہ انتباہ میں کشف القبور کے طریقے کے بارے میں لکھا ہے:۔

و بعدہ ہفت کرت طواف کند و در آں تکبیر خواند و آغاز از دست رات کند بعدہ طرف پایاں رخسارہ بنہد و فی دستور القضاۃ من الملتقط و ان کان قبر عبد الصالح یمکنہ ان کطواف حولہ ثلث مراۃ قبل ذالک کذافی خزانتہ الروایات و زاد اللبیب و وسیلتہ القلوب"۔

یعنی دستور القضاۃ میں ملتقط سے نقل ہے کہ اگر خدا کے کسی نیک بندے کی قبر ہو تو اس کے گرد سات بار طواف کیا جائے اور اس کو خزانتہ الروایات' زاد اللیب اور وسیلتہ القلوب نے بھی نقل کیا ہے اور فتاوئی برہنہ میں ہے کہ:۔

اما گور صالح سہ بار رواست کذا فے المطالب و محک الطالبین

یعنی کسی صالح بندے کی قبر کا تین بار طواف جائز ہے۔ یہی مطالب و محک الطالبین میں بھی لکھا ہے:۔

اور جہاں تک اس حدیث مبارک کا تعلق ہے:۔

"لعن اللہ الیہود و النصارٰی اتخذوا قبور انبیاء ھم مساجد"

یہود۔ نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہے کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبور سے مسجدیں بنوائیں تھیں یا بنوائی ہیں"۔

لیکن یہ حدیث مبارک ان لوگوں کے بارے میں ہے جو میت کی قبر کی طرف رخ کرکے خاص کر اسی صاحب قبر کے لئے نماز پڑھے۔ فنعوذ باللہ من ذالک چنانچہ شیخ محدث عبد الحق رحمتہ اللہ علیہ نے شیخ ابن حجر ہاشمی مکی کے حوالے سے اپنی شرح مشکوۃ میں لکھا ہے:۔

"واین بر تقدیریست کہ نماز گذارد بجانب قبر از جہت تعظیم وے

کہ آں بہ اتفاق حرام است"

"یعنی صاحب قبر کی تعظیم کے لئے قبر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا متفقہ طور پر حرام ہے"۔

اسی طرح حضور اقدس ﷺ نے دعا فرمائی ہے

الھم لا تجعل قبری وثنا یعبد اللہ

"یا الٰہی! میری قبر سے ایسا بت نہ بنا جس کی عبادت کی جائے (جس طرح یہود و نصاریٰ کرتے ہیں)۔ مختصر یہ کہ سلف کے اکثر مشائخ و مریدان جو پائے کے علما تھے' سے ایسی روایات مروی ہیں اور بعض عوام کے خیال میں بعض علمائے ظاہری انتہائی تغلیظ سے کام لیتے رہے ہیں اور بعض نے افراط و تفریط کو دفع کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور سب نے تمسک قرآن مجید و احادیث سے کیا ہے۔ وہابی فرقہ میں زرقہ نجدی اس بارے میں انتہائی غلو سے کام لیتا ہے۔ تابہ حدیکہ کہ انہوں نے عبد الوہاب نجدی کے غلبہ حکومت کے دور میں درود شریف پڑھنا بھی حکما" بند کیا تھا۔ عبد الوہاب نے حکم جاری کیا تھا کہ حضور اقدس پر درود بھیجنے کی جگہ قرآن مجید کو "پڑھا" جائے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ لوگ بہت بڑے موحد ہیں اور خدا سے محبت رکھتے ہیں۔ مگر اصل وجہ کچھ اور تھی اور وہ یہ کہ یہ لوگ حضور اقدس ﷺ کا نام نامی اور اسم گرامی ان کی وفات کے بعد ایسی صفت کے ساتھ لینا نہیں چاہتے تھے۔ اور اب جبکہ ابن سعود نجدی نے اپنی حکومت قائم کی ہے تو فتح کے موقع پر نجدیوں نے حضرت ام المومنین خدیجتہ الکبریٰ سلام اللہ علیہا کی قبر شریف پر رائفلوں کے کئی فائر کئے اور یہی کہتے رہے کہ

"بہت عرصہ تم نے بادشاہی کی۔ اب باہر نکلو۔ اب تم کہاں ہو"۔

خداوند ذوالجلال کی شان دیکھیے کہ جس قدر یہ نجدی ندائے موتی کے فعل

کے بر خلاف ہیں وہی فعل خود بخود ان سے ظاہر و صادر ہوتا ہے اگر چہ انہوں نے بے حرمتی اور بے عزتی کی انتہا کر دی ہے مگر اس بے حرمتی اور بے عزتی کا جو خیال اور علت غائی ان کے دلوں تھی۔ وہی فعل حق تعالیٰ نے ان کی اپنی زبانوں سے ظاہر کر دیا۔ اور وہ "حضرت ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیھا کو ندا کرنا تھی جو یہ کر چکے اگر چہ اس کی صورت کچھ بھی ہو۔

تعجب یہ ہے کہ یہ لوگ اگر اپنی شہوت میں اضافہ کرنے کے لئے اپنی بیویوں کے ہاتھ یا گال چوم لیں تو اسے جائز سمجھتے ہیں لیکن اگر کوئی عاشق حقیقی وفور محبت سے اپنے مرشد' اہل بیت سید یا کسی عالم حق کے ہاتھ یا پیر چوم لے تو یہ فرقہ اس کو شرک کہتا ہے اور چونکہ ابلیس نے بھی حضرت آدم علیہ السلام کے ادب کا پاس نہ کیا تھا اور کافر و مردود ہو گیا تو عجب نہیں کہ نجدی بھی حضور اقدس ﷺ اولیاء کرام قدس اسرارہم اور اہل بیت کے ترک ادب کی پاداش میں ایسے ہی ہو جائیں۔ اور ابلیس لعین سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتا تھا کہ "میں موحد ہوں اور خدا کے علاوہ کسی اور کو نہ سجدہ کرتا ہوں نہ اس کی تعظیم کرتا ہوں" ہو بہ ہو نجدی بھی اسی ثبوت کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس قسم کا ادب شرک ہے (چنانچہ اگر دیکھا جائے) تو اس حیثیت سے ابلیس لعین اس فرقہ سے بھی بڑا موحد ہے۔

دوسرا بڑا فرقہ اہل حدیث کا ہے مگر حقیقتاً" وہ اہل حدیث نہیں ہیں اس لئے کہ اہل حدیث بہت اچھے لوگ ہیں اور ان میں اکثر اہل تصوف اور صاحبان طریقت لوگ بھی ہیں البتہ بعض باتیں وہ بھی ایسی کرتے ہیں کہ غلطی سے مبرا نہیں ہوتیں۔ پھر بھی یہ لوگ نجدیوں لی طرح بے ادب و گستاخ نہیں ہوتے۔ کیونکہ بایں ہمہ یہ لوگ (اہل حدیث) حضور اقدس ﷺ' آپ ﷺ کے اہل بیت رضی اللہ عنہم اور اولیاء سے بہت محبت رکھتے ہیں۔

ظاہری علماء کے ہر فرقہ میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں چاہے اہل سنت و الجماعت کے ہوں یا شیعہ مذہب وغیرہ کے ان تمام فرقوں کے ظاہری علماء اسی رنگ (بے ادبی) کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں اور ان سب سے گلہ شکوہ کرنا بے کار ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمہ آفتاب راچہ گناہ

علاوہ ازیں بعض ایسے مکار اور ٹھگ بھی ہوتے ہیں جو بظاہر اپنے آپ کو صوفیاء کے طور پر دکھاتے ہیں مگر طہارت و نماز کو فضول سمجھتے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں اسی طرح روزوں' زکواۃ اور حج کو ڈھکوسلوں میں شمار کرتے ہیں اور بخدا ایسے لوگ ہی اسلام کے بدترین دشمن ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو اسلام میں رخنہ اندازی کے مرتکب ہوتے ہیں اور یہی اخوان الشیطین ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اولیاء کرام اور صوفیائے عظام رحمتہ اللہ علیہم کا دامن اس قسم کے بدنما داغوں سے بالکل پاک ہے۔ اس ضمن میں ہمارے علمائے کرام کے لئے بھی لازم ہے کہ صوفیائے کرام کو ایسے نجس لوگوں کے کرتوتوں کا ذمہ دار نہ ٹھہرائے۔ بلکہ ہمارے عوام کو بھی چاہیے کہ ایسے شیطانوں سے اپنے آپ کو بچائے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بعض اوقات سالک سے بھی نماز رہ جاتی ہے مگر وہ حالت سکر (نشہ یا بے ہوشی) کی ہوتی ہے اور شریعت کے رو سے ایسا سالک معذور ہوتا ہے تاہم یہ حالت کبھی کبھی طاری ہوتی ہے اور جب یہ حالت نہیں رہتی (یعنی سالک صحو کی طرف واپس آجاتا ہے) تو وہ بہرحال احکام شریعت کی پابندی لازمی طور پر کرے گا۔

گنبد کی تعمیر اور مزار پر غلاف چڑھانا۔

اولیائے کرام کے مزارات پر جو عمارتیں یا گنبدیں تعمیر ہوتی ہیں وہ بالکل جائز ہیں۔ حرمین شریفین میں ایسی عمارتیں موجود تھیں۔ مگر جب ابن سعود نجدی نے حجاز مقدس پر قبضہ کیا تو ایسی تمام عمارتوں کو منہدم کر دیا۔ یہاں تک کہ حضور اقدس ﷺ کے مزار اقدس کی گنبد سبز کو بھی مسمار کرنے پر تلا ہوا تھا۔ مگر ایسے وقت میں ساری اسلامی دنیا میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ چنانچہ خوفزدہ ہو کر ابن سعود، حضور اقدس کی گنبد سبز کو مسمار کرنے سے باز رہا۔ ورنہ اس نے تو اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ تاہم جو قبے اور گنبدیں منہدم کی گئیں ان میں حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قبے بھی شامل تھے۔ جو صدر اول میں قدیم علمائے حرمین شریفین کے نزدیک جائز تھے اور بعض نے ادب کو ملحوظ خاطر رکھ کر سکوت اختیار کیا تھا اگر چہ وہ بھی قبوں کے تعمیر کے حق میں نہ تھے۔ بعض نے ان کی ممانعت کا حکم بھی دیا تھا جیسے کہ فقہ میں بعض مسائل ایسے موجود ہیں۔ مگر وہابیوں کی طرح کتابیں نہیں لکھی تھیں۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان قبوں اور گنبدوں کی تعمیر کا جواز موجود ہے۔ اس لئے کہ مسئلہ اختلافی ہے۔ مولانا سلامت اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ "ہندوستان میں خصوصی طور پر گنبدیں تعمیر کروانا ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہاں ہندوؤں کی یادگاریں بکثرت پائی جاتی ہیں اور ان کے مقابلے میں اولیاء کے مزارات پر تعمیر شدہ گنبدیں جبروتی شان و شوکت کا نظارہ پیش کرتی ہیں"۔

اسی طرح مزار پر پھولوں کی چادر یا غلاف چڑھانا بھی مستحب ہے اس سلسلے میں سند کے طور پر چند کتابوں کے حوالے نقل کئے جائیں گے (بات اصل میں یہ ہے کہ کہ کفار کے ملک میں اولیاء کے مزارات پر گنبدیں تعمیر کرانا ضروری ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ صدر اول میں مساجد میں میناروں کا رواج نہ تھا اور مینار اس لئے تعمیر کئے

جاتے ہیں تاکہ دور سے بھی یہ معلوم ہو کہ یہاں مسجد ہے۔ مدعا یہ کہ اگلے وقتوں میں مساجد میں مینار تعمیر کرنے کا رواج نہ تھا اور ایک حدیث شریف میں ارشاد ہوا ہے۔
ابنو المساجد واتخذو وھاجما رواہ ابن ابی شیبتہ والبیھقی فی سنن عن انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک اور حدیث مبارک میں ہے ابنو مساجد کم جما و ابنو مدائنکم مشرفہ رواہ فی المصنف عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کو ایسی نہ بناؤ جن میں مینار ہوں۔ مگر اب انہی میناروں کو تمام علماء جائز مانتے ہیں اور مساجد میں مینار تعمیر کئے جاتے ہیں (کیونکہ) ایک حدیث مبارک میں ارشاد ہوا ہے

"ماراہ المومنون حسنا" فھو عند اللہ حسن"

"جس چیز کو مومنین اچھا جان لیں خدا کے نزدیک بھی وہ چیز اچھی ہوتی ہے"۔

ایک اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:۔

لا یجتمع امتی علے الضلالتہ

یعنی میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی ان احادیث مبارکہ سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مومنین علماء و صلحا جس کام کو جائز اور بہتر جان لیں اور اس کام کی بہتری اور اچھائی پر اجماع کر لیں وہ جائز ہوتا ہے صحیح مسلم میں ہے:۔

من سن فی الاسلام سنتہ حسنتہ فعمل بھا بعدہ کتب لہ مثل اجر من عمل بھا ولا ینقص من اجورھم شیئی

مثال کے طور پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جمع کے ساتھ نماز تراویح کی بیس رکعتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں۔ بیس رکعت نماز تراویح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قائم کی اور فرمایا نعم البدعتہ ھذہ یعنی جمع کے ساتھ تراویح پڑھنا

اچھی بدعت ہے۔ مراد یہ کہ جس بدعت کو ضلالت اور گمراہی کہا گیا ہے وہ یہ نہیں ہے۔ گمراہی اور ضلالت تو وہ ہوتی ہے کہ کوئی کام قرآن و سنت کے خلاف ہو۔ علامہ عزالدین بن عبد السلام رحمتہ اللہ علیہ نے خراب بدعت کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں

البدعته اما واجبته کتدوین اصول فقته و اما محرمته کمذهب الجبریته واما مندوبته کاحداث المدارس و اما مکروهته کزفرنته المساجد و اما مباحته کالتوسیع فی لذین الماکل والمشارب

یعنی بدعت یا تو واجب ہو گی جیسے اصول فقہ کی تدوین۔ یا حرام ہو گی جیسے مذہب جبریہ کے عقائد یا مستحسن (بہترین) ہو گی جیسے مدارس کا اجراء و تعمیر یا مکروہ ہو گی جیسے مساجد کا مزین کرنا (یعنی نقش و نگار بنانا) یا مباح ہو گی جیسے اکل و شرب کی چیزوں کو تکلف سے لذیذ بنانا۔

غرضیکہ ان تمام روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر بدعت کو گمراہی نہیں کہا جا سکتا لہذا ہر بدعت کو گمراہی اور ضلالت سمجھنا یا کہنا صریح بے عقلی کی دلیل ہے۔ امام ابن منیر رحمتہ اللہ علیہ نے جامع صحیح کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ بات حدیث سے ثابت ہے کہ مساجد کی آرائش و زیبائش مکروہ ہے۔ اس لئے کہ نماز گذار کا خیال مسجد کی نقش و نگار کی طرف مبذول ہو جاتا ہے۔

اور نماز میں حضوری کو نقصان پہنچتا ہے۔ یا اس کی کی کراہت کی وجہ یہ ہو گی کہ ایک لحاظ سے یہ بے جا مصرف کے زمرے میں آتی ہے۔ البتہ اگر مسجد کی زینت و آرائش پر بیت المال سے خرچہ نہ ہوا ہو تو اس میں کوئی باک نہیں اور روا ہو گی اور اگر کوئی وصیت کر دے کہ میرے ترکہ کو مسجد کی گچ کاری' زینت و آرائش پر خرچ کیا جائے تو وصیت نافذ ہو گی۔ لہٰذا انہی دلائل و روایات کے رو سے اولیائے کرام رحمتہ اللہ علیہم کی قبروں پر گنبد اور قبے تعمیر کرانا جائز ہیں احادیث کی مستند مجموعوں مثلاً" مسلم' ابوداؤد' نسائی اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث مبارک مروی ہے نھی النبی ان یقعد علی القبرو ان یجصص وان ....(۱) علیه

یعنی اس کام کو صراحت سے منع فرمایا گیا ہے۔ مگر سلفا" اور خلفا" ائمہ کرام اور علماء نے اس کے جواز کی اجازت دی ہے۔ مجمع البحار الانور کی تیسری جلد میں ہے۔

"قد اباح السلف البناء علی القبور الفضلاء والاولیاء ولعلماء لیزورھم الناس و یستریحون بالجلوس فیه"

"یعنی بے شک اکابرین سلف نے امت کے فضلاء' اولیاء اور علماء کی قبروں پر عمارتیں تعمیر کروانے کو جائز اور مباح کہا ہے کیونکہ مخلوق خدا ان کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور وہاں بیٹھ کر راحت حاصل کرتے ہیں"۔

حضرت ملا علی قاری رحمتہ اللہ علیہ اپنی مرقاۃ شرح مشکوۃ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

" و قد اباح السلف البنا علیٰ قبر المشائخ والعلماء

....

(۱) خراب چھپائی کی وجہ سے یہاں پر تحریر شدہ حرف لکھنے کی جرات نہ کر سکا مترجم۔

المشہورین یزورھم الناس و یستریحون بالجلوس تحتہ"

"یعنی اکابرین علمائے سلف (رحمہم اللہ اجمعین) نے امت کے مشہور و معروف مشائخ اور علماء کی قبور پر عمارات تعمیر کروانے کو مباح کہا ہے۔ اس لئے کہ لوگ ان کی زیارت کے لئے آئیں اور ان عمارات میں آرام کریں"۔

چنانچہ انہی وجوہات کی بناء پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی قبر مبارک پر قبہ تعمیر کروایا۔ اسی طرح حضرت سیدنا محمد بن الحنیفہ ابن علی المرتضی علیہ السلام نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی قبر مبارک پر بھی قبہ تعمیر فرمایا۔

یہ عینی شرح بخاری میں تحریر ہے اور مجامع الفتاویٰ میں احکام کے بیان میں منقول ہے کہ قبروں پر عمارات تعمیر کروانا مکروہ نہیں ہے خواہ صاحب قبر عالم دین ہو یا ولی اللہ ہو۔ در مختار میں تحریر ہے لا یرفع علیہ بناء و قیل لا باس بہ یعنی قبروں پر بلند و بالا عمارت تعمیر نہیں کرنا چاہیے مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ تعمیر کروانا چاہیے کیونکہ اس میں کوئی حرج نہیں اور یہی مختار ہے یعنی مذہب ہے۔ یہاں پر سوچنے کی بات یہ ہے کہ در مختار کی مذکورہ روایت کی رو سے قبروں پر تعمیرات منع ہیں پھر بھی علمائے سلف نے زمانے کے مطابق مصلحت جان کر اس کو جائز فرمایا۔ اور جواہر اخلاطی میں ہے کہ قبروں پر تعمیرات ایک نیا فعل ہے لیکن یہ بدعت حسنہ ہے۔۔۔۔۔۔

غلاف چڑھانا

بعینہ اسی طرح قبور اولیاء رحمہم اللہ پر غلاف چڑھانا یا چراغ وغیرہ روشن کرنا بھی جائز اور مباح ہیں۔ فتاویٰ برہنہ میں تحریر ہے:۔

"گل و ریحان بر قبر نہادن نیکوست کہ تا تراست تسبیح میگوید۔

میت ازاں انس میگرد۔ و ازیں جا گفتہ اند کہ گیاہ تر از قبر دور نشاید کرد۔ ہر جا گیاہ تر بود اثر رحمت بیشتر باشد۔ و تصدق بہ قیمت گل اولیٰ تر"۔

ترجمہ:۔ گلاب و ریحان قبر پر رکھنا بہت اچھی بات ہے اس لئے کہ جب تک وہ تازہ ہوتے ہیں تو تسبیح خداوندی میں مصروف ہوتے ہیں اور میت اس سے انس (محبت الہٰی) حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ اس لئے کہا گیا ہے کہ سبزہ قبر سے ہرگز نہیں ہٹانا چاہیے۔ کیونکہ سبزہ جتنا تر ہو گا رحمت خداوندی بھی زیادہ ہو گی۔ اور پھولوں کو قیمۃً خرید کر صدقہ کرنا بہتر ہے۔

مولانا نور الحق ابن حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضور اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ دو عدد قبروں پر تشریف لائے اور ان پر خرما کی دو سبز شاخیں رکھ دیں (۱) (سبحان اللہ۔ مترجم) اور مزید برآں تحریر فرمایا ہے:۔

آنکہ گل انداختن بر قبرہا متعارف شدہ ست۔ ہمیں سند آں مے تواند شد۔ واللہ علم (شرح بخاری)

ترجمہ:۔ "قبروں پر پھول ڈالنا مشہور بات ہے اور یہی اس کی سند ہے"

اور حضرت شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ نے سفر السعادت کی شرح میں لکھا ہے:۔

"آنچہ مصنف ذکر کردہ است حق است و احادیث صحیحہ دریں

---

(۱) خدا جانے یہ کن عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم کی قبریں ہوں گی۔ رضی اللہ عنہم۔ خداوند کریم ان عظیم و محبوب صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسی اعزاز کے طفیل مولف و مترجم و قارئین کو اپنی اور اپنے حبیب ﷺ کی محبت اور معرفت سے نوازے۔ آمین (مترجم)

باب وارد و داخل سنت است۔ در زمان نبوت و خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ و صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمیں بود۔ و لیکن بعد ازاں ایں تکلفات در مقابر پیدا شد و مفاخرت و مباہات بداں راہ یافت و در آخر زمان بجہت اقتصار نظر عوام بر ظاہر مصلحت در تعمیرو ترویج مشاہد و مقابر مشائخ و علماء دیدہ چیزہا افزودند۔ تا ازیں جاہبیت و شوکت اہل اسلام و ارباب صلاح پدید آید۔ خصوصاً" در دیار ہندوستان کہ اعدائے دین از ہنود و کفار بسیار اند۔ و ترویج و علائے شان این مقامات باعث انقیاد ایشان است و بسا اعمال و افعال و اوضاع کہ در زمان سلف از مکروہات بود در آخر زمان مستحسنات گشتہ اگر جہال و عوام چیزے کنند یقین کہ ارواح بزرگان ازاں راضی نخواہد بود و ساحت کمال ایشاں منزہ است ازاں"۔

اس تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ قبہ تعمیر کروانا جائز ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وقت میں بھی یہ فعل جائز تھا۔ متاخرین نے تو باقاعدہ اس کی اباحت کا فتویٰ دے دیا۔ اس لئے کہ عظمت اور شوکت اسلام مزید آشکار ہو خصوصاً" اس لئے کہ ہندوستان میں دین کے دشمن ہندو و کفار بہت زیادہ ہیں اور ان کو عظمت اسلام اور عظمت اولیاء دکھانا بہت ضروری ہے۔ وغیرہ اور شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ نے جو یہ فرمایا ہے کہ زمانہ سلف میں بہت سی چیزیں مکروہ تھیں مگر بعد میں ان کو بہتر جانا گیا جبکہ کنز الدقائیق کی محشی میں اس عبارت کے بعد تحریر ہے:۔

چنانچہ اداختن غلاف بر قبر شریف و افروختن چراغ وغیرہ کہ بر مزار ہائے اولیاء میکنند جملہ از مستحسنات اند۔ کما فہم من کلام الشیخ ترجمہ:۔ یعنی قبر پر غلاف چڑھانا اور چراغ روشن کرنا جیسا کہ اولیاء کے مزارات پر دیکھنے میں آتا ہے یہ سب چیزیں مستحسن

(اچھی) ہیں۔ جیسا کہ شیخ کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے۔

اور جو احادیث قبروں کو بنانے یا قبوں کی تصاویر کے خلاف مروی ہیں وہ کفار کی قبروں وغیرہ سے متعلق ہیں وجہ یہ ہے کہ کفار نے قبور سے معبود بنا لئے تھے۔ امام جلیل رحمتہ اللہ علیہ کشف النور اور علامہ شامی رحمتہ اللہ علیہ رد المختار کے باب اللبس وغیرہ میں اولیاء کے مزارات پر غلاف چڑھانے کے متعلق اسی نسبت سے تعظیم کے ساتھ دلیل دیتے ہیں کہ جیسے اولیاء اللہ کے مزارات میں دیا جلانا ان کی تعظیم کی خاطر جائز ہے اسی طرح غلاف چڑھانا بھی ان کے نزدیک جائز ہے۔ امام جلیل رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب مستطاب "کشف النور عن اصحاب القبور" اور اسی طرح علامہ شامی رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب "رد المختار" کے عقود الدریہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"فی فتاوٰی الحجته تکره الستور علی القبور و لکن نحن آلان نقول ان کان القصد بذالک التعظیم فی اعین العامته حتی لا یحتقروا صاحب هذا القبر و الجلب الخشوع والادب لقلوب الغافلین الزائرین لان قلوبهم فافرة عن الحضور فی التادب بین یدی اولیاء الله تعالٰی المدفونین فی تلک القبور لما ذکرنا من حضور روحا نیتهم المبارکته عند قبورهم فهو امر جائز لا ینبغی النهصی عنده لان الاعمال بالنیات ولکل امرء ما نوٰی"۔

ترجمہ:۔ فتاویٰ حجتہ میں لکھا ہے کہ قبروں پر غلاف چڑھانا مکروہ ہے مگر ہم کہتے ہیں کہ اگر اس سے عوام کی نظروں میں اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی عزت وادب پیدا کرنا مقصود ہو اور نیز یہ کہ صاحب مزار کی تحقیر نہ ہو اور یہ کہ غافل لوگ ان کی زیارت کے لئے آئیں تاکہ ان کے دل نرم ہوں اور ان کا ادب کریں حال یہ کہ ان کی ارواح

قبر کے قریب حاضر ہوتی ہیں تو اس غرض سے مزار پر غلاف چڑھانا بالکل جائز ہے اور اس کو منع نہیں کرنا چاہیے اس لئے کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے اور ہر شخص نیت کے مطابق اجر پائے گا"۔

ہم نے قبل ازیں بھی عرض کیا ہے کہ اس سلسلے میں مخالفت و نہی کے احکام خالصتاً کفار کے قبور کے متعلق صادر ہوئے ہیں اور کفار نے ایسی قبور کو معبودوں کا درجہ دیا تھا۔ ان سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی کہ اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے مزارات پر قبے اور گنبدیں جو فی الحقیقت شوکت و عظمت اسلام کی زندہ جاوید علامتیں ہیں "نام نہاد توحید" کے نشہ میں منہدم کر دیئے جائیں۔ اگر ایسا جائز ہوتا کہ (خدانخواستہ) جناب رسالت ماب ﷺ خانہ کعبہ کو بھی مسمار (۱) فرماتے۔ کیونکہ وہی شرک و بت پرستی کا مقام تھا۔ اور پورے تین سو ساٹھ بت وہاں پڑے تھے۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی قبر پرستی کرتا ہو یا کسی نبی یا ولی کی قبر کو "عبادت کا سجدہ" کرتا ہو تو مناسب ہے کہ اس کو ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔ باقی گنبد یا قبہ منہدم کروانا جائز نہیں ہے اس لئے کہ احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ مومن کی حرمت بعد از وفات بھی ہوتی ہے جبکہ ان کی قبور وغیرہ کو منہدم کرنا ان کی حد درجہ بے عزتی اور بے حرمتی ہے۔ اور نیز یہ بھی کہ ہر فعل نیت پر موقوف ہوتا ہے۔

---

(۱) حضور اقدس ﷺ نے کعبہ میں نصب شدہ بتوں کو توڑ دیا مگر خانہ کعبہ کی دیواروں پر حضرت سیدنا ابراہیم اور حضرت سیدنا اسماعیل علیہم السلام کی بنی ہوئی تصاویر کو پانی میں مشک و عنبر گھول کر مٹا دیا۔ مقصد کفار کی نشانیوں کو ختم کرنا تھا مگر پیغمبرانِ خدا علیہم السلام خدا کی عظمت اور ادب کا لحاظ رکھا گیا۔ حالانکہ وہ محض تصاویر تھیں سوچنے کا مقام ہے (مترجم)

جبکہ ایک جاہل مسلمان کی بھی یہ نیت نہیں ہوتی کہ انبیاء علیہم السلام یا اولیاء رحمتہ اللہ علیہم عبادت کے لائق ہیں بلکہ ان کے نزدیک یہ بزرگ ہستیاں تعظیم کے لائق ہوتی ہیں جس کے وہ حقدار ہوتی ہیں۔ مراد یہ کہ جو آداب و تعظیمات ذات باری تعالیٰ جل جلالہ کے لئے مخصوص ہیں ان میں کسی غیر اللہ کو شریک نہیں کرنا چاہیے۔ مابقایا انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رحمتہ اللہ علیہم کی ہر قسم کی مستحسن تعظیم اور ادب جائز ہے۔ حضرت مولانائے روم قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں:۔

اولیاء را ہست قدرت از الٰہ
تیر جستہ باز گرداند زراہ
شیر عالم اند در عالم مدد
کان زمان کا فغان مظلومان رسد
بانگ مظلومان زہر جا بشنوند
آں طرف چوں رفت حق میدوند
آں طبیبان مر ضہائے نہاں
اں ستونہائے خللہائے جہاں
محض مہر و داری و رحمت اند
ہمچو حق بے علت وبے زحمت اند

فصل ۱۰

وحدۃ الوجود اور تقدیر۔

وحدۃ الوجود حق ہے۔ مگر فی الواقعہ یہ مسئلہ محض ذاتی اور وجدانی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب تک قلب سالک اس کا مزہ چک نہ لے زبانی کلامی اس سے کوئی لطف حاصل نہیں کر سکتا اور بات چیت کی حد تک اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ حضرت مولانائے روم قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں۔

صد کتاب و صد ورق در نار کن
سینہ را از عشق او گلزار کن

اور اس کا ادنیٰ ترین درجہ علم الیقین ہے۔ یعنی جونہی مرشد کی تعلیم سے سالک یقین کی دولت حاصل کر لے اور سمجھ لے کہ یہی حق ہے' شکوک و شبہات سے فراعت حاصل کر لیتا ہے' اسی طرح اس (سالک) کا دل دو رخی کے فعل سے باز آجاتا ہے فاستقم کما امرت پر اس کا ایمان پختہ ہو جاتا ہے اور قل اللہ ثم ذرھم فی حوضھم یلعبون (۱)۔ کی منشا اس کے دل پر نقش ہو جاتی ہے اور الاستقامتہ فوق الکرامتہ کے معنے حل ہو جائیں یعنی استقامت کرامت سے بھی بڑی چیز ہے اور اوسط درجہ علم الیقین ہے یعنی یہ کہ مرشد تعلیم کے دوران سالک کو کچھ نہ کچھ بتادے یا دکھادے۔

---

(۱) ترجمہ:۔ بس اتنا کہہ دو کہ اللہ۔ پھر انہیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لئے چھوڑ دو۔ سورہ الانعام ایت نمبر ۹۱

اور وہ بھی مشاہدہ کے ساتھ۔ چنانچہ سالک پہلے سے بھی زیادہ قوی اور پختہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کا اعلیٰ درجہ حق الیقین ہے مراد یہ کہ دیکھنے یا مشاہدہ کرنے والا اس قدر مستغرق ہو جائے کہ اپنے آپ کو بھی نہ دیکھ سکے اور صرف وحدۃ الوجود کا احساس کرے۔ ہمارے عقیدے میں علم الیقین حقیقی ایمان کو کہتے ہیں اور عین الیقین کشف ہے اور اس مقام تک رسائی کی مثال ایسی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ ولکن لیطمئن قلبی (یعنی اس لئے عرض کرتا ہو کہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہو) اور جہاں تک حق الیقین کا تعلق ہے تو وہ کرامت ہی ہے مطلب یہ کہ انسان جتنا ہو سکے زیادہ سے زیادہ حق تعالیٰ پر عاشق ہو روز و شب اسی کے خیال میں غرق ہو اسی قدر اس میں کمالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر غافل ہو جائے تو علم الیقین یا عین الیقین کے درجوں میں ہوتا ہے مگر یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جب تک مرشد اس کو اپنی خاص توجہ سے قائم نہ کر دے سالک کو اس پر استقلال حاصل نہیں ہوتا۔ مدعا یہ کہ کہنے سننے یا کتابوں میں اس کے متعلق لکھنے لکھانے کی بات تو سہل ہے مگر عین الیقین اور حق الیقین کے مراتب تک پہنچنا آسان کام نہیں ہے۔ اسی معاملے میں سب سے پہلے ایک کامل مرشد کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعد ازاں اس کی توجہ اور سالک کا موتوا قبل ان تموتوا کے مراحل کو طے کرنا ہے یعنی جب زندگی میں فوت ہو جائے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

بہر حال اولیائے "برحق" کامل مشائخ اور عارفین علماء کا یہی موقف (وحدۃ الوجود) ہے۔ ان سب کا اسی پر اتفاق ہے اگرچہ ان کا طرز بیان ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ حضرت امام غزالی قدس سرہ نے کیمیائے سعادت کے دیباچہ میں لکھا ہے "ہمہ ازوست بلکہ ہمہ اوست" یعنی "سب کچھ اسی سے ہے بلکہ سب کچھ وہی ہے" اور حضرت شیخ عبد الحق محدث قدس سرہ نے مرج البحرین کی ابتداء میں لکھا ہے کہ

"حقیقتہ الحقائق خدا کی ذات پاک ہے"۔ شاہ عبد القادر رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر (بزبان اردو) میں لکھا ہے کہ "ہر چیز کی اصل حق تعالیٰ ہے" مولانا عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے ایک استفتاء میں کسی مستفتی کو لکھا ہے کہ میرا اور میرے صوری اور معنوی اساتذہ کا مذہب وحدۃ الوجود ہے اور بحر العلوم کے مولانا عبد العلی صاحب اور مولانا ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے خصوصی طور پر وحدۃ الوجود کے اثبات میں ایک ایک رسالہ لکھا ہے۔ وعلیٰ ھذا القیاس اور تمام متقدمین و متاخرین کی کتابوں میں اس مسئلے کی تحقیق و تشریح موجود ہے۔

وحدۃ الوجود کی اصل یعنی توحید علمی کا بیان۔

جو لوگ حضور اقدس ﷺ کے دکھائے ہوئے راستے سے الگ تلگ ہیں اور وحدۃ الوجود کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کی توحید بے اصل ہے۔ اس لئے کہ وحدۃ الوجود کی اصل کلمہ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے یعنی کوئی موجود نہیں نہ ہی کسی کا وجود ہے مگر اللہ اور اسی اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات و صفات کو حضور اقدس ﷺ کی صورت میں ظاہر فرمایا۔ حدیث صحیح میں ہے کہ انا من نور اللہ وکل شئی من نوری یعنی میں اللہ کے نور سے ہوں اور باقی ہر چیز میرے نور سے ہے۔ اور حق تعالیٰ کی تنزیہہ کا ذکر ہم نے قبل ازیں کیا ہے۔ فقرائے کاملین نے اپنی اصطلاحات میں اس ذات کو غیب اور غیب الغیوب۔ ازل الازال۔ ابد الاباد۔ عین الکافور۔ طوزان محض۔ ھویت مطلقہ۔ غیب مطلق۔ کنز مخفی۔ جمع الجمع، مجھول النعت، لامکان اور لاہوت کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس مرتبہ میں اس کو پہچاننا ممکن نہیں ہے اس لئے کہ اس وقت نہ عارف تھا نہ معروف تھا اور نہ معرفت تھی۔ بلکہ "وقت" بھی نہ تھا (اس مقام پر نامکمل جملہ لکھا گیا ہے جو سمجھ میں نہیں

آتا۔ مترجم) تاہم معروف کی غیر موجودگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا وجود نہیں تھا۔ بلکہ یہ کہ تعینات کا ظہور نہیں ہوا تھا۔ اور کوئی چیز نہ تھی۔ حدیث نبوی ﷺ میں ہے کان اللہ ولم یکن شئی غیرہ وکان عرشہ علی الماء (یہ حدیث پاک رسالہ مکیہ میں بھی انہی الفاظ میں منقول ہے) مطلب اس کا یہ ہے کہ ایک وقت ایسا تھا کہ صرف اللہ کی ذات موجود تھی اور اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہ تھی۔ اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ یہ حدیث مبارک ابتدائے آفرینش پر دلالت کرتی ہے۔ اس سے قبل صرف اتنا معلوم ہے کہ کنت کنزا مخفیا" یعنی میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ پھر جب اس نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں اور اپنی خدائی ظاہر کروں تو مقام احدیت سے وحدت اور مقام وحدت سے مقام واحدیت کو نزول فرمایا اور اپنے نور کو مخاطب فرما کر

"کن محمدا"

فرما دیا۔ اور انسانی صورت ظاہر فرما دی یہ تشبیہ کا مرتبہ ہے اور حقیقتاً" آنحضرت ﷺ کی ذات پاک ہی ظہور اول، مظہر اول اور منشائے کثرت ہے اور اسی طرح قدم اور حدوث، عدم اور وجود، ممکن اور ممتنع اور یقین اور اطلاق کے درمیان ایک واسطے اور حد فاصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مرج البحرین یلتقیٰن بینھما برزخ الا یبغین "اسی نے دو دریاؤں کو (صورۃ) ملایا کہ (ظاہر میں) باہم ملے ہوئے ہیں اور حقیقتاً" ان دونوں کے درمیان ایک حجاب (قدرتی) ہے جو دونوں بڑھ نہیں سکتے"۔ اور ہمارے خیال کے مطابق احدیت اور وحدت کا مرتبہ ایک ہے۔ شمائل الاتقیاء میں رسالہ جنیدیہ سے منقول ہے:۔

"فی الکلمات القدسی انت وانا و ماسواک خلق"

"اگر تو نہ بودی ما ربوبیت خود ظاہر نمے کردیم"

"یعنی تم ہو اور میں ہوں اور جو تم سے سوا ہے وہ مخلوق ہے"۔

اور اگر تم نہ ہوتے تو میں اپنی ربوبیت کو ظاہر نہ فرماتا"۔

اسی طرح تمہیدات عین القضات میں ہے "قال علیہ السلام ان اللہ خلق نوری من نور عزتہ خلق ایں جا بمعنے ظہور دید اوست" یعنی حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ جل جلالہ نے اپنے نور سے میرے نور کو تخلیق فرمایا۔ خلق یہاں ان کے ظہور کے معنوں میں ہے۔ اس مقام تک مغائرت تامہ نہیں ہے۔ وحدت وجود کے لفظ کا مطلب بھی یہی ہے اور من بعد حضور اقدس کے نور مکرم سے جملہ مخلوقات تخلیق ہوئیں یہی تمام کے تمام معتبر کتابوں میں بھی لکھا گیا ہے اور اس باب میں تمام علماء اور فقراء یک زبان و متفق ہیں۔ کوئی طبقہ بھی دوسرے سے اختلاف نہیں رکھتا۔

بہرحال جب حضور اقدس ﷺ کی ذات قدسی کا ظہور ہوا تو اسمائے الٰہی، صفات الٰہی، ملائک، عرش، کرسی، لوح، قلم اور اعیان ثابتہ کے علاوہ عقول و نفوس غرضیکہ تمام کے تمام موجودات موجودہ حقیقت کے ساتھ ظہور پذیر ہوئیں اور ظہور پذیر ہوتی رہیں گی اور ابدالاباد تک ظہورات کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا لہٰذا۔

لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ

کے حقیقی معنے بھی یہی ہیں اور اس کے مجازی معنے ابتدائے بحث میں تحریر کئے جا چکے ہیں میرے **مرشد پاک** (قدس سرہ) کا ارشاد ہے کہ "جو کچھ بھی ہے سب کچھ اسی انسان کے وجود میں ہے اور انسان کا وجود یا صورت، صورت محمدی ﷺ ہے اور کوئی چیز اس سے باہر نہیں ہے" (انتہائی دقیق اور تشریح طلب بات ہے۔ کاش! میرے پاس اس کے لئے کچھ وقت ہوتا۔ مترجم)

شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے

تو اصل وجود آمدی از نخست

دگر ہر چہ موجود شد فرع تست

اب ہم اس کی سند حضرت قطب الدین دمشقی کے "قول اور حضرت مخدوم شیخ سعد قدس سرہ کی کتاب مجمع السلوک سے بھی پیش کرنا پسند کریں گے:۔

فان قیل ما اصل التوحید یقال اثبات ما لم یزل و اسقاط مالم یکن۔ پس اگر گفتہ شود در جواب ان توحید اثبات چیزے کہ ہمیشہ بود و ھواللہ تعالیٰ۔ و دور کردن چیزے کہ نبود ھو الدنیا وما فیہا بل نفسہ تاور وجود جزیکے راننہ بیند و این اشارت است بر تصدیق صدیقان:۔

مگو با من چہ دینداری خوشم بادین توحیدش

کہ در دین یکے گویاں دو گفتن نا روا دیدن

پس موحد کسے بود کہ از نفس خوف فانی گردد۔ تاوی را آرزوئے نماندہ جز او رانہ بیند قال بعضھم التوحید تمیز الحدث عن القدم والا عراف عن الحدث والاقبال علی القدم حتی لایشھد نفسہ فضلا لمن خیرہ لانہ لو شھد نفسہ فی حال التوحید الحق لکان مشیئا لا موحدا" و گفتہ اند بعضے صوفیان۔ توحید جدا کردن است حادث را وھوالممکنات از قدم و ھواللہ تعالیٰ واعراض کردن است از حادث واو آوردن است بر قدم تا نہ بیند نفس خود را از نفس خود رازیادت از نفس

خویش۔ یعنی موحد آنست غیر را در نظر نیارد۔ بلکہ موحد آنست کہ نہ بیند نفس خود را۔ از نفس خود فانی گردد۔ بدو باقی گردد تا جزو او را نہ بیند زیرا کہ موحد اگر بہ بیند نفس خود را حال توحید حق بر آئینہ باشد دو گوینده و دو بیننده۔ نہ یکے گوینده و نہ یکے بیننده۔ و این در دین موحد درست نیاید۔ یعنی اگر پوچھا جائے کہ توحید کی اصلیت کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ توحید اس ذات کا اثبات کرنا ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے اور وہ حق تعالیٰ ہے اور دور کرنا اس چیز کا جو موجود نہیں یعنی یہ دنیا اور جو کچھ اس دنیا میں ہے یا اس کا نفس یہاں تک کہ وجود میں سوائے اللہ کے اور کچھ نہ دیکھے۔ اور یہ صدیقین کی تصدیق کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ موحد وہی ہے جو اپنے نفس سے فانی ہو۔ اس کی کوئی خواہش باقی نہ رہے۔ حق کے سوا کچھ نہ دیکھے اور بعض صوفیائے کرام رحمتہ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ توحید حادث یا ممکنات کو قدیم سے جدا کرنے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حادث ممکنات ہیں اور قدیم حق تعالیٰ ہے اور حادث سے روگردانی ہے اور قدم کو قائم کرنا ہے تاکہ نفس کو بھی نہ دیکھ سکے یعنی نفس سے فانی ہو اور حق کے ساتھ باقی ہو اور اس کے بغیر (حق تعالیٰ کے) کچھ بھی نہ دیکھے۔ ورنہ اس کی توحید درست نہ ہوگی"۔

شمائل الاتقیاء میں تمہیدات عین القضات سے منقول ہے:۔

"وحدت بر دو نوع است۔ وحدت کثرت۔ وحدت صرف وحدت کثرت چنانکہ ذات تو یکیست ولے اعضائے بسیار دارد۔ پس

بہرچہ در اشیائے موجودات حق را بینی وحدت کثرت باشد۔ فاما وحدت صرف آنست کہ جمیع مخلوقات و موجودات را معدوم دانی و نفی دانی۔ خود را و افعال و اقوال خود را از میانہ برداری۔ آنگاہ وحدت صرف شود۔ مارایت شیئا سوی اللہ سر این معنی است"۔

یعنی "وحدت دو قسموں پر مشتمل ہے:۔

(۱) وحدت کثرت (۲) وحدت صرف

وحدت کثرت یہ ہے کہ تمہاری ذات تو ایک ہی ہے مگر یہی ذات کئی اعضاء پر مشتمل ہے پس جب ہر چیز میں حق تعالیٰ نظر آتا ہو تو یہ وحدت کثرت ہے۔ اور وحدت صرف یہ ہے کہ تمام موجدات و مخلوقات بلکہ ہر چیز کو معدوم جانے اور اس کی نفی کرنے بلکہ یہاں تک کہ خود اپنے نفس' اپنے افعال و اقوال کو بھی درمیان سے ہٹا دے (احساس نہ کرے) تو یہ وحدت صرف ہے (اور یہ کہے) کہ سوائے اللہ کے میں نے کچھ بھی نہ دیکھا"۔

قول محقق کا اشارہ بھی اسی طرف ہے "نزدیک موحد در توحید بیگانگی اشنائیست و اشنائی بیگانگی است یعنی ہر دو یکے باشد:۔

نہ فرواں نہ اند کے باشد

یکے اندر یکے یکے باشد

سر ایں رمز است" یعنی موحد کے نزدیک بیگانگی اشنائی اور اشنائی بیگانگی ہے۔ یعنی ہر دو برابر ہیں کم و بیش کا راز بھی یہاں سے معلوم کرنا چاہیے۔ یعنی کم و بیش کیا سب ایک ہے۔

خواجہ حسین بن منصور حلاج قدس سرہ کا قول ہے:۔

موحد را توحید کثرت حجاب است۔ التوحید حجاب الموحد عن کما الاحدیت غمض ایں معنے است"۔

یعنی موحد کے لئے توحید کثرت حجاب کا درجہ رکھتی ہے یعنی توحید احدیت اور موحد کے درمیان حجاب ہے" (سبحان اللہ' مترجم)

توحید صرف کی تعریف رسالہ قشیریہ میں یوں کی گئی ہے:۔

"حقیقت توحید فراموش کردن توحید است۔ ایں حالتے باشد کہ بندہ بہ یگانگی حق قائم گردد و در مشاہدہ افتد"۔

"یعنی توحید کی حقیقت یہ ہے کہ سرے سے توحید ہی کو فراموش کیا جائے۔ چنانچہ یہ ایک ایسی حالت ہو گی کہ بندہ حق تعالیٰ کی یگانگی (یکتائی) سے قائم ہو اور اس کا مشاہدہ کرے"۔

آگے تحریر ہے:۔

" توحید خالص سیر کردن ست در شواہد صورت در روح و عالم صغریٰ کہ چند حق و باطل آنجا اندازد نایم و عماید و از خود رفتن است بحق کہ صورت آدم عالم معانی است و جمیع کون بوجود حق محو بیند۔ و موجودات را در ربوبیت او معدوم داند و فرق میان توحید عام و خاص آنست کہ عوام توحید را بہ شواہد عقل باز یا بند و خواص چوں حق را دانستند فنائے خود را دربقائے حق یا بند"۔

"یعنی توحید خالص روح' شواہد صورت عالم صغریٰ کی سیر کرنا ہے .... اپنے آپ سے باہر نکلنا اور حق کے ساتھ ملنا۔ اس لئے آدم (انسان) کی صورت عالم معانی ہے اور ہر چیز کو ذات حق میں محو دیکھے اسی طرح تمام موجودات کو اسی کی ربوبیت میں فنا سمجھے

اور توحید عام اور توحید خاص میں یہی فرق ہے کہ عوام توحید کو
عقل کے ساتھ قائم کرتے ہیں اور خواص حق میں فنا ہو کر بقا
حاصل کرنے کو توحید کہتے ہیں"۔

رسالہ کشف الاسرار میں لکھا ہے:

"حقیقتہ التوحید فنا فی التوحید۔ یعنی وجود را بہ موجودئی حق فانی
داند۔ کہ دریگانگی دوئی نہ گنجد"۔

توحید کی حقیقت ۔ توحید ہی میں فنا ہونا ہے۔ یعنی اپنا وجود حق تعالٰی کے وجود
میں فنا کرنا اور جاننا ہے اس لئے کہ یگانگی میں دوئی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

شریعت میں وحدت الوجود کا مقام۔

جو لوگ عقیدہ وحدۃ الوجود کو ایک ثقہ عقیدہ نہیں سمجھتے اور اس سے انکار
کرتے ہیں ان کی توحید اس قدر بے وزن ہے کہ مزید کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ در اصل
ایسے لوگ اولیاء اللہ رحمہم اللہ کی روش پر نہیں ہوتے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے قول و
فعل پر کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی کے حواس سلامت نہ ہوں۔ یا حواس
سلامت ہوں مگر دل سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اس پر بے خودی کا غلبہ ہو جائے۔ پھر اسی
حال میں کچھ باتیں اس کی زبان سے نکل جائیں۔ تو ظاہر ہے کہ ایسا شخص از روئے
شریعت معذور ہو گا اور ایسے معذور شخص کی ہتک کرنا یا رسوا کرنا کوئی نیکی نہیں ہے
شطحیات کے باب میں بھی ہم نے ایسی باتوں کا تصفیہ کیا ہے کہ اولیاء سے ایسی
باتیں سنی گئی ہیں مثال کے طور پر حضرت سیدنا علی علیہ السلام کا فرمان ہے انا الحی
الذی لایموت" یعنی "میں وہ زندہ ہوں جس کے لئے موت نہیں ہے" اور
حضرت ابو سعید ابوالخیر قدس سرہ نے فرمایا ہے۔ لیس فی جبتی سوی اللہ"

یعنی "میرے جبہ میں اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے" حسین بن المنصور نے فرمایا ہے کہ "انا الحق" علیٰ ھذا القیاس مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب بزرگ احکام شریعت کے ایسے پابند تھے کہ دوسرے لوگ ایسی پابندی نہیں کر سکتے۔ تاہم وحدۃ الوجود اس کو بھی نہیں کہا سکتا کہ ماں کو ماں نہ کیا جائے اور بہن کو بہن لاحول ولا قوۃ الا باللہ

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی"

اور جو لوگ وحدۃ الوجود کو شریعت سے الگ ایک اور چیز سمجھتے ہیں ان کو حقیقت کا علم ہی نہیں۔ کہ اس امت میں بے شمار اولیاء گذرے ہیں جو متجر عالم بھی ہوا کرتے تھے ان کا زھد و تقویٰ بے مثال تھا اور ان کے کشف و کرامت کو شہرت دوام حاصل ہے بلکہ آج تک بھی زبان زد عام ہیں۔ اور ایسی بزرگ ہستیوں کا یہی عقیدہ ہے کہ وحدۃ الوجود ہرگز شریعت کے خلاف نہیں غور فرمائیے اگر یہ عقیدہ شریعت کے خلاف ہوتا تو ایسے لوگ کیونکر اولیاء کہلاتے۔ ایسا سمجھنا (کہ عقیدہ وحدۃ الوجود خلاف شریعت ہے) عقل کے بھی خلاف ہے (دوسری بات یہ کہ چونکہ یہ اولیاء امت کا عقیدہ ہے) اس لئے اولیاء کے عقیدہ سے انکار کوئی اچھی بات نہیں۔ تاہم اصل اور طے شدہ بات یہ ہے کہ توحید اسلامی کی بنیاد قرآن شریف ہے یا احادیث مبارکہ اور یہی دونوں اصل شریعت ہیں۔ دوسری جانب شریعت ہو یا وحدۃ الوجود ہر دو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے امت کو عطا ہوئے ہیں۔ صاحب گلشن راز فرماتے ہیں۔

از احمد تا احد یک میم فرق است

جہانے اندر آں یک میم غرق است

چوں جاناں دید کز من دیدہ بستند

سراسر غافل از روز الست اند

لباس انبیاء را کرد در بر

شد ا-نہا رابسوئے خویش رہبر

اور حضرت مولانائے روم قدس سرہ فرماتے ہیں۔

چوں محمد پاک شد از نار و دود

ہر طرف رو کرد وجہ اللہ بود

البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ شریعت و طریقت میں کچھ فرق ہو اس لئے کہ توحید کے چار درجے ہیں اور ان میں سے ارباب شریعت دوسرے درجے میں ہیں جبکہ ارباب طریقت تیسرے اور صاحبان حقیقت چوتھے درجے میں ہیں اگر چہ ارباب طریقت بھی وحدۃ الوجود سے بے بہرہ نہیں ہوتے مگر اس سلسلہ میں کمال صاحبان حقیقت کو حاصل ہوتا ہے کیونکہ انہی لوگوں نے فناء الفناء کی منزل سے آگے جا کر بقا باللہ کا مرتبہ حاصل کیا ہوتا ہے جیسے حضرت مخدوم سعد قدس سرہ کے ارشاد سے بھی واضح ہوتا ہے۔ حضرت مخدوم لکھتے ہیں:۔

"توحید راچہار مرتبہ است۔ مرتبہ اول از توحید آنست کہ آدمی بہ زبان گوید لاالٰہ الا اللّٰہ و دلش ازاں غافل باشد یا منکر بود، چوں توحید منافق۔ دوم آں کے معنے لفظ رابدل تصدیق نماید۔ چنانچہ عموم مسلماناں تصدیق نمودند۔ آں اعتقاد است۔ سوم آنکہ بطریق کشف بواسطہ نور حق کہ یکے در بسیار ظاہر شدہ است۔ چہارم آنکہ در وجود جز یکے رانہ بیند و آں مشاہدہ صدیقانست۔ و صوفیاں آنرا فنا خوانند۔ در توحید چہ ازاں روئے کہ جز یکے رانہ بیند نفس خود را ہم نہ بیند و چوں نفس خود رانہ بیند بدانچہ

مستغرق یکے باشد از نفس در او فانی شود۔ یعنی آنکہ از دیدن نفس
خود فانی شدہ است۔ توحید اول چوں پوستے کہ بالائے جوز باشد
دوم چوں پوستے کہ فرود باشد۔ سوم چوں مغز جوز است۔ چہارم
چوں روغنے کہ از مغز بیروں آید"

مختصر یہ کہ وحدۃ الوجود توحید شریعت کا خلاصہ ہے اور ان لوگوں یعنی قائلین
وحدۃ الوجود سے زیادہ کوئی بھی حق تعالیٰ اور حضور اقدس ﷺ سے واسطہ نہیں
رکھتا:

از درون پردہ از رندان مست پرس
کیں حال نیست صوفی عامی مقام را

شمائل الاتقیاء میں مرقوم ہے

"بر متقضی کلام ربانی کہ قل کل من عند اللہ ہر گاہ کہ
فرمان مے شود کہ ہر چہ ہست از نزدیک حق ست۔ پس موحد
اوست کہ بر فراہم کفر و عیوب و باطن ہیچ کس طعنہ نہ کند و نظر
خود بر علم و حکم و اراوت و مشیت حق دارد نہ بر صاحب عیوب تا
اگر معیوب داند مشترک باشد۔ فاما از روئے امر تنبیہہ کردن
واجب است کہ جمیع انبیاء علیہم السلام اولیاء رحمتہ اللہ و اہل
دعوت عمل برآں کردہ اند۔ وگرنہ در شرائع خلل افتد۔ کما
قال اللہ تعالیٰ کنتم خیر امتہ اخرجت للناس
تامروں بالمعروف و تنہون عن المنکر"۔

مقصد یہ کہ جو کچھ بھی ہے حق تعالیٰ کے فرمان کے مطابق اللہ ہی کی طرف سے
ہے اور موحد وہ ہے کہ کسی کے عیب یا کفر وغیرہ پر طعن نہ کرے۔ اس لئے کہ خدا

نے ان کو اسی لئے پیدا کیا ہے البتہ مبلغین کو حق حاصل ہے کہ لوگوں کو بدکاری سے باز آنے کی تلقین کریں۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہو تو شریعت میں خلل پڑ جائے گا اور خداوند عالم کے اس حکم کی نافرمانی ہو جائے گی کہ تم بہترین امت ہو تمہیں اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ امر بالمعروف پر عمل کرو اور برائیوں سے منع کرتے رہو۔

مندرجہ بالا عبارت میں وحدۃ الوجود کا تعلق صرف اس ایتؐ مبارک کے ساتھ ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے قل کل من عند اللّٰہ ما بقایا بیان مسئلہ تقدیر سے وابستہ ہے جس کا بیان آگے آنے والا ہے۔

عالم کثرت۔

عالم کثرت میں چاہے اجناس ہوں یا اضداد' اعراض کہ جوہر اور اسی طرح علویات اور سفلیات سب کے سب مظاہر قدرت میں شامل ہیں۔ یعنی یہ کثرت وحدت سے ظاہر ہوئی ہے اور اسی کثرت کا باطن وحدت ہے اور وجود محض ان سب پر محیط ہے اسی وجود محض سے یہ تمام موجودات ظاہر ہوئی ہیں اور وجود محض کو حقیقتہ الحائق' جمع الجمع' نور حقیقی' ذات مطلق' کنز مخفی اور غیب الغیوب بھی کہا جاتا ہے۔ نیز موجودات و معینات کے ناموں کا اندازہ لگانا قطعا" ناممکن ہے مگر یہ سب محض دو ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ دنیا و آخرت! اور یہ تمام اشکال اس کے مظاہر ہیں (یعنی حق تعالیٰ کے)

بہ ہر نامے کہ خواہی سر بر آرد

وہ ذات واحد مرتبہ یقین میں مشبہ اور مرتبہ اطلاق میں منزہ ہے (۱)

---

(۱) مشبہ یعنی تشبیہ اور منزہ یعنی تنزیہہ اگر چہ وحدۃ الوجود کا (بقیہ اگلے صفحے پر

ہر مرتبہ ز وجود حکمے دارد　　گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

....

اصل منشا ہے اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ روحانی یا وجدانی طور پر محسوس ہوتا ہے یہ کیفیت تقریر و تحریر کے احاطہ سے بالکل باہر ہے تاہم کسی صاحب قدس سرہ کا ایک بہترین شعراسی مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے۔

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست

اما نمی تواں کہ اشارت بہ اوکنند

ترجمہ:۔ انتہائی مشکل مسئلہ تو یہ ہے کہ ہر ذرہ عین وہی ہے یا ہر ذرہ اسی کا عین ہے لیکن یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کسی (ایک) کی طرف اشارہ کیا جائے"

یعنی اشارہ کرنا کفر کے مترادف ہے اس لئے کہ وہ لاتعین اور لامحدود ذات محدود ہو جائے گی۔ مراد یہ ہے کہ ذرہ اس کے بغیر نہیں مگر اشارہ کرکے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ وہی ہے۔

اور یہاں سے تشبیہہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ ہر ذرہ کو "ہے" اور "نہیں ہے" کے محیط میں رکھا جائے گا۔

"ہے" تشبیہ اور "نہیں ہے" یعنی اس سے "وراء" ہے۔ "لامحدود" کو تنزیہہ کہا جائے گا۔ حضرت سیدنا شیخ اکبر محی الدین ابن العربی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسئلہ وحدۃ الوجود کو کھول کر بیان فرمایا ہے۔ آپ کے نزدیک تنزیہہ حق تعالیٰ عز اسمہ پر قید لگانا ہے اور تشبیہہ حق تعالیٰ پر حد لگانا یا محدود کرنا ہے۔ چنانچہ تشبیہہ محض اور تنزیہہ محض دونوں ناپسندیدہ اور ناقص ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت شیخ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عقیدہ انتہائی محفوظ اور مقبول ہے آپ کا ارشاد ہے کہ حق بات یہ ہے کہ کامل وہی سالک ہو گا جو تشبیہہ اور تنزیہہ دونوں کا قائل ہو گا۔ اور اس کا مطلب (بقیہ اگلے صفحے پر)

بقایا تنزیہہ ہو یا تشبیہہ حق تعالیٰ دونوں سے پاک ہے۔

....

یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے وجود اقدس کو حقیقت یا کنہ کے اعتبار سے منزہ اور ظہور یا شہود کے اعتبار سے مشبہ سمجھ لیا جائے۔ اس کی دلیل بھی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی ایت سے دیتے ہیں :

لیس کمثلہ شئی و ھوالسمیع البصیر" کوئی شے اس جیسی نہیں اور وہی دیکھنے اور سننے والا ہے۔

شیخ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بقول اس ایت مبارک کا پہلا حصہ "لیس کمثلہ" (اس جیسی کوئی شے نہیں) تنزیہہ ہے اور وھو السمیع البصیر (اور وہی دیکھنے اور سننے والا ہے) تشبیہہ ہے۔ اور موحد کو چاہیے کہ ان دونوں کا قائل ہو

یہ یہاں پر واجب اور ممکن کا مسئلہ جنم لیتا ہے ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ واجب ہے اور واجب کا مطلب یہ ہے کہ جو ذات اپنے وجود کے لئے کسی غیر کا محتاج نہ ہو اور ممکن اس کو کہا جاتا ہے جو اپنے وجود کے لئے دوسرے (یعنی غیر) کا محتاج ہو۔ مثلاً" عالم شہادت۔ پھر یہ بھی عرفا کا عقیدہ ہے کہ حق محسوس ہے اور عالم خلق معقول ہے۔

لہٰذا حضرت شیخ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ

فالخلق معقول و الحق محسوس مشہود"

یعنی خلق معقول ہے اور حق محسوس و مشہود ہے

بہرحال یہ ایک وجدانی کیفیت ہے کہنا یہ تھا کہ تنزیہہ اور تشبیہ کے متعلق حضرت شیخ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمودات حق ہیں۔ فرماتے ہیں (بقیہ اگلے صفحے پر)

تعالی الله علواً کبیرا

اے ہمہ و بے ہمہ و باہمہ   ازہمہ تنہا و بہ تنہا ہمہ

کل عالم اس کا محتاج ہے اور وہ خود ان کی ہستی کا محتاج اور یہ تمام مظاہر اور تعینات اس کی ہستی کے طفیل ظاہر و متعین ہیں اور اسی کی ہستی میں نیست ہیں جبکہ وہ ان سب کی ہستی اور نیستی سے بے نیاز ہے۔

تو جب یہ حقیقت ثابت ہو گئی کہ یہ تمام عالم شہادت مجازی اور فرضی ہے اور صرف حق سبحانہ و تعالیٰ کی ہستی حقیقی ہے۔ اسی طرح تمام اشیاء کی مجازی اور فرضی ہستی حق سبحانہ و تعالیٰ کی ہستی میں فانی ہے ــــــــــــــــــــــــــــ

....

فان قلت بالتزیہ کنت مقیدا"   وان قلت باتشبیہ کنت محددا"

اگر تو تنزیہہ محض کا قائل ہو گا تو حق تعالیٰ کو مقید کرنے والا ہو گا اور اگر تشبیہہ محض کا قائل ہو گا تو حق تعالیٰ کو محدود کرنے والا ہو گا

وان قلت بالامرین کنت مسددا"   وکنت اماما" فی المعارف سیّدا

اور اگر تو دونوں کا قائل ہو گا تو صحیح راستے پر چلنے والا اور معارف کا سردار ہو گا۔

فمن قال بالاشفاع کان مشرکا"   ومن قال بالافراد کان موحدا"

جو شخص حق اور خلق کو دو سمجھنے والا ہو گا تو وہ مشرک ہو گا اور جو شخص افراد کہنے والا ہو گا یعنی خدا کو ایک کہنے والا ہو گا وہ موحد ہو گا جہاں تک وحدۃ الوجود پر مکمل بحث کرنے کا تعلق ہے تو اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ وجود صرف حق کا موجود ہے اور بس۔

(سید طاہر چشتی نظامی نیازی)

اور قرآن مجید نے بھی وکل الینا راجعون فرمایا ہے تو غیر کہاں۔

غیر تش غیر در جہاں نگذاشت لاجرم عین جملہ اشیا شد

لیکن خیال رہے کہ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے حلول کیا ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ عزاسمہ حلول' اتحاد اور اتصال سے مبرا ہے۔ اس لئے کہ ان کی گنجائش تو وہاں نکل سکتی ہے کہ اس کے غیر کو بھی مان لیا جائے یا بہ الفاظ دیگر اس کے بغیر دوسرے وجود کو مان لیا جائے حالانکہ اس کے وجود کے علاوہ اور موجود ہی نہیں اور جب دوسرا وجود ہے ہی نہیں تو اس نے حلول کس شے میں کیا۔ یا کس سے اتحاد کیا اور نیز اتصال کس سے کیا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ حلول' اتحاد اور اتصال کے لئے تو کسی دوسرے وجود کی ضرورت ہو گی۔ جبکہ دوسرا وجود ہے ہی نہیں اور وجود واحد میں ان افعال کا امکان ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جبکہ لحہ بہ لحہ کروڑہا صورتیں عالم غیب سے عالم شہادت میں آتی ہیں اور کوئی ایک بھی کسی دوسرے کی مانند نہیں ہوتی یہاں تک کہ ہر آواز اپنے انداز میں جدا جدا پہچانی جاتی ہے ہر ذرہ یہی صفت رکھتا ہے اور اسی کو تجدد امثال کہتے ہیں۔ یہی تنزیہ مشبہ اور یہی تشبیہہ منزہ ہے۔ اللہ۔ اللہ! لیس کمثلہ شیئا ابتدا" کثرت وحدت میں پوشیدہ تھی اور اب وحدت کثرت سے ظاہر ہے اور اس کی ایک دلیل عقلی یہ ہے کہ جونہی پشاور کے ڈاک خانے سے دہلی میں کسی زید یا عمر کو تار ارسال کیا جا رہا ہو تو جب وہ آلہ ٹیلیگراف کو ایک کھٹکا دے دیتا ہے تو پشاور سے دہلی تک تمام ڈاکخانوں میں وہی کھٹکا ظاہر یا سنا جاتا ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ کثرت وحدت میں نہیں ہے کیونکہ اصل کھٹکا تو ایک ہی تھا جو پشاور کے ڈاکخانے سے ہوا تھا اور وہی ایک کھٹکا بہت سی جگہوں پر ظاہر ہوا اور چاہے وہ کثیر تعداد میں ظاہر ہوا ہو پھر بھی وہ ایک ہی تھا دو نہیں ہو سکتے۔ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ مخفی بھی ہے اور ظاہر بھی۔ والظاہر والباطن۔

اے کہ درپردہ بہ بازار جہاں مے آئی

ماتو بودیم ازیں پیش و تواکنوں مائی

اور اس کی سند حضرت شیخ سعد مخدوم قدس سرہ کے قول میں بھی موجود ہے:

"اکنوں بداں کہ ایں نور حقیقی ست نامحدود و نا متناہیست ذات و وجہ نفس دارد۔ و نظر بہ ہستی ایں نور دیگر است و نظر بر ایں نور کہ عام است موجودات را دیگر است و نظر بر مجموع ہر دو مرتبہ دیگراست۔ چوں ایں نظر را دانستی ہستی ایں ذات نور است و مجموع ہستی ہر دو مرتبہ نفس ایں نورست و صفات ایں نوردر مرتبہ ذات اند۔ و اسامی ایں نور در مرتبہ وجہ اند۔ و افعال ایں نور در مرتبہ نفس اند۔ اے عزیز ایں نور عام است۔ تمام موجودات ازیں نور است۔ ہیچ ذرہ از ذات موجودات نیست کہ نور خدائے بہ آں نیست و برآں محیط نیست۔ ایں عموم راو ایں احاطہ را وجہ ایں نور گویند۔ پس بہر کہ روئے آوری بوجہ ایں نور روئے آوردہ باشی۔ فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ ہر کہ بدیں نور حقیقی رسید چنانچہ رسید کہ پیشتر معلوم خواہد گشت و بالایضاح خواہد پیوست۔ کارہائے دشوار بروے آسان شود۔ و درہائے علم بروے کشادہ گردد باخلق عالم باصلاح روئے نماید و از اعتراض و انکار آزاد آید۔ و رمز ایں گفتار از علم ظاہر از کتاب النکاح و باب الطلاق دست نہ دہد و از باب اللقط و فصل العتاق حل نہ گردد۔ و عارفے کامل باید کہ بداند کہ بر وجہ خدائے

رسیدہ وجہ خدائے رادید۔ خدائے رامی پرستد اما مشرک است۔
وما اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون ہمہ روز بامردم
جنگ است۔ و در اعتراض و انکار است۔ وہرکہ از وجہ خدائے
درگذشتہ و بذات خدائے رسیدہ و ذات خدائے رادید ہم خدائے
رامے پرستد۔ اما موحداست واز اعتراض و انکار آزاد است۔
اے عزیز اگر از دریائے کثرت در گذری و بہ دریائے وحدت
خوض کنی۔ عاشق و معشوق و عشق را یکے بنی۔ و عالم و معلوم را
یکے یابی۔ ایں اسامی جملہ در مرتبہ وجہہ اند۔ و چوں از وجہہ در
گذری وبہ ذات رسی ہیچ رسامے نہ باشد۔ جملہ ذات مجرد باشد

نیست غیراز تو کسے غیر کرامے شمری

پس اگر بگویند کہ مایم کہ ہیستم ومایم باشیم ہمہ درست
باشد و اگر گویند نہ مایم کہ بودیم و نہ مایم کہ ہستیم و نہ مایم کہ
باشیم ہم راست بود۔ پس اے عزیز ایں بحر محیط بے پایاں باید
دید۔ وبہ ایں نور نامحدود و نامتناہی مے باید رسید۔ وایں نور رامے
باید دید۔ وایں نور در عالم نگاہ مے باید کرد۔ تااز شرک ابدی
خلاص شود۔ و اعتراض و انکار بکلی برخیزد۔

کہ جہاں صورت است و معنی دوست

دربمعنے نظر کنی ہمہ اوست

اور اس سے قبل میں نے اپنے **مرشد پاک** (قدس سرہ) کا قول نقل کیا ہے
کہ یہ جو کچھ ہے سب کچھ صورت محمدی ﷺ ہی میں ہے اور کچھ بھی اس سے
باہر نہیں۔

وحدۃ الوجود اور آنحضرت ﷺ کی فضیلت۔

وحدۃ الوجود کے رو سے حضور اقدس ﷺ کو تمام موجوات پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسی بدن کے تمام اعضاء میں سے آنکھوں کو حاصل ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمان جزولی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل خیرات میں لکھا ہے کہ:۔

"انسان عین الوجود":۔

اور حضرت عبد الرحمان جامی قدس سرہ کا ارشاد ہے :

اے مدنی برقع و مکی نقاب

سایہ نشیں چند بود آفتاب

اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

الم تر الی ربک کیف مد الظل ولو شاء لجعله ساکنا ثم جعلنا الشمس علیه دلیلا سورہ الفرقان آیت نمبر ۲۵

ترجمہ:" اے مخاطب ﷺ ! کیا تو نے پرورگار کی اس قدرت پر نظر نہیں کی کہ اس نے سائے کو دور تک پھیلایا ہے اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ایک حالت پر ٹھہرایا ہوا رکھتا پھر ہم نے آفتاب کو اس سایہ کی درازی اور کوتاہی پر علامت مقرر کیا"

اور "صاحب گلشن راز" نے اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔ قدس سرہ

"چوں نور افتاب از او جدا شد	ز صبح او طلوع واستوا شد
دگر بارہ ز دور چرخ دوار	زوال و عصر و مغرب شد پدیدار
بود نور نبی خورشید اعظم	گہ از موسیٰ پدید و گہ ز آدم
اگر تاریخ عالم را بخوانی	مراتب رایکایک باز دانی

ظہور خواجہ وقت استوا بود (۱) که از ہر ظل و عظمت مصطفےٰ بود

....

(۱) ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا سایہ نہ تھا اور یہ آپ ﷺ کا معجزہ تھا۔ معجزہ اور کرامت کے بارے میں ہم نے گزشتہ اوراق میں بحث کی ہے۔ یہاں پر یہ کہنا مقصود ہے کہ جو جو معجزات ہم حضور اقدس ﷺ سے منسوب کرتے ہیں اور دہری عقیدہ رکھنے والے لوگ ان سے انکار کرتے ہیں ان میں دو باتیں قابل غور ہیں ایک یہ کہ کیا واقعتاً" ان معجزات کا اظہار ہوا تھا یا نہیں ہوا تھا اور یہ بات تاریخ سے تعلق رکھتی ہے دوسری بات نفس معجزہ ہے اور اس سے انکار ناممکن ہے بلکہ حضور اقدس ﷺ کی ذات اطہر بزعم خود ہی ایک معجزہ ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن شریف آپ ﷺ ہی کی زبان مبارک کے ذریعے ظاہر ہوا ہے اور پھر قرآن مجید بھی حضور ﷺ کا ایک ایسا معجزہ ہے کہ آج تک کوئی بھی اس کا جواب نہیں پیش کر سکا۔ اور یہی قرآن مجید آج بھی اپنے مخالفین کو چیلنج دیتا ہے کہ اس کی صرف ایک آیت کی طرح کوئی کلام پیش کر دے اگر یہ لوگ سچے ہوں مگر ابھی تک کوئی بھی ایسا نہیں کر سکا ہے۔ دراصل یہ معجزانہ کلام الٰہی ہے اور یہ انداز عام انسانی عادت میں مطلق موجود نہیں ہے چنانچہ یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ذات مقدس اسی کلام الٰہی کے لئے ایک برزخ ہے۔ تو سوچنا چاہیے کہ کیا حضور اقدس ﷺ کی ذات اطہر بذات خود ایک معجزہ نہ ہو گی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ حضور اقدس ﷺ امی تھے جبکہ قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک چیز کے ساتھ دوسری چیز شامل ہو جاتی ہے تو وہ سڑ کر خراب ہو جاتی ہے۔ مراد یہ کہ اگر حضور اقدس ﷺ کے وجود پاک میں کوئی اپنی علمیت ہوتی اور اگر اس کے ساتھ وحی۔

(باقی اگلے صفحے پر)

بحظ استوا بر قامت راست　　ندارد سایہ پیش و پس چپ و راست

چو کرد او بر صراط حق اقامت　　بامر فاستقم میداشت قامت

نہ بودش سایہ کاں دارد سیاہی　　زہے نور خدا ظل الٰہی

اللم صلی علی محمد وعلی آل محمد شمس الحقیقتہ وعین الوجود

تقدیر

حق تعالیٰ کو تمام موجودات و مخلوقات کے پیدا فرمانے سے قبل مکمل طور پر اندازہ تھا اور ان کی ہستی و نیستی کے لئے وقت مقرر فرمایا تھا۔ ذات الٰہی کو سب کے افعال کا بھی اندازہ اور علم تھا اور کائنات کے ہر ذرہ کی

شامل ہوتی تو ناممکن ہے کہ اس وحی یا وحی کے لفظوں میں فرق نہ آتا یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ عزاسمہ نے حضور اقدس ﷺ کو امی پیدا فرمایا۔ آیا اس دنیا میں کوئی ایسی مثال موجود ہے کہ امی تو رہا ایک طرف کسی بڑے سے بڑے عالم و فاضل کا ایسا کلام پیش کیا جا سکے چنانچہ حضور اقدس ﷺ کے متعلق ہمارا عقیدہ کہ آپ ﷺ کا سایہ نہ تھا بالکل حق ہے۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کی ذات اقدس بحیثیت مجموعی معجزہ تھی۔ بلکہ ایک ایسے زندہ معجزہ کی برزخ تھی جس کے لئے حق تعالیٰ نے مومنین کے سینوں کے محفوظ صندوق کو پسند فرمایا اور تا روز قیامت اس میں ایک حرف کی کمی بیشی واقع نہیں ہو سکتی اور اس سے حق تعالیٰ کے اس ارشاد کی سچائی واضح ہے کہ

وانا لہ لحافظون

اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں (مولف کتاب

حرکت و سکون کے لئے بھی ایک اندازہ مقرر فرمایا تھا ذات الٰہی نے ملائک کو بدی سے
بچا لیا اور سب کو ابدی عصمت عطا فرمائی گئی۔ اور ارشاد ہوا لا یعصون اللہ ما
امرھم و یفعلون مایومرون (۱)۔ یعنی وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی
کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں انبیاء علیہم السلام کو بھی حق تعالیٰ
نے معصوم بنایا' نیز جنت اور دوزخ کو بھی بنایا' جنات اور انسانوں کو بھی پیدا فرمایا۔ ان
کو ہاتھ' پاؤں اور آنکھیں دیں اور ایک حد تک ان کو انہیں اعضاء پر اختیار بھی عطا
فرمایا جبکہ ان کے دلوں کو اپنے قبضے میں رکھا۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے ان
قلوب بنی آدم کلھا بین اصبعین من اصابع الرحمان کقلب
واحد یصرف کیف یشاء "یعنی بنی آدم کے قلوب خدا کی انگلیوں میں سے
دو انگلیوں کے درمیان ہیں ایک دل کی طرح' اور جیسی اس کی مرضی ہوتی ہے اسی
طرف کر دیتا ہے" حق تعالیٰ نے نیک و بد اعمال پیدا فرمائے۔ ان اللہ خلقکم وما
تعملون "یعنی اللہ نے تم کو بھی پیدا فرمایا اور تمہارے اعمال کو بھی پیدا فرمایا" جو
اطاعت سے راضی اور نافرمانی سے ناراض ہوتا ہے ولا یرضی عبادہ الکفر
یعنی حق تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں فرماتا۔ برے اعمال کرنے والوں کے
لئے دوزخ کی سزا مقرر فرمائی ہے اور نیک اعمال کرنے والوں کے لئے جنت۔ من
یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ
"یعنی جو شخص (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کرے گا اس کو دیکھ (پا) لے گا اور جو شخص ذرہ
برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا" حق تعالیٰ نے ہر ایک کی تقدیر میں اس کی نیکی

---

(۱) ایت مبارک لا یعصون اللہ ما امرھم یفعلون مایومرون سورہ تحریم
ایت نمبر ۶

اور بدی لکھ دی ہے کہ کوئی تو نیکی کرے گا کوئی بدی اور کوئی نیکی اور بدی دونوں کریں گے۔ حق تعالیٰ نے جنات و انسانوں میں ایک گروہ کو جنت اور دوسرے کو دوزخ کے لئے مخصوص فرمایا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہے کہ ھٰؤلاء للجنتہ و ھٰؤلاء للنار ولا ابالی" یعنی یہ (لوگ) جنت کے لئے ہیں اور یہ لوگ دوزخ کے لئے ہیں اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں" بعض کی تقدیر میں اعمال سمیت جنت لکھ دی۔ وہ آخر میں نیک ہو جائیں گے اور بعض کی تقدیر میں نیک اعمال کے باوجود دوزخ لکھ دی کیونکہ وہ آخر میں بدعمل ہوں گے ایک حدیث شریف میں ہے وانما الاعمال بالخواتیم یعنی اعمال کا مدار خاتمہ پر موقوف ہے۔ خدا نے اپنے انبیاء علیہم السلام لوگوں کو سیدھا راستہ دکھانے کے لئے مبعوث فرمائے۔ انبیاء علیہم السلام بھی ان لوگوں کو راہ راست پر لاتے ہیں جن کی تقدیریں جنت لکھی ہوتی ہے۔ فرمان الٰہی ہے انک لا تھدی من احببت "یعنی آپ ﷺ ان لوگوں کو راہ راست پر نہیں لا سکتے چاہے آپ کو پسند ہی کیوں نہ ہوں" خدا نے ابلیس کو ملعون کر دیا اسے اور اسکے تابعداروں کو قیامت تک مہلت دی۔ اور نیز ابلیس کو بھی دلوں میں وسوسہ ڈالنے کی قوت دیدی۔ اور ابلیس یا شیطان ان لوگوں کو گمراہ کر سکتا ہے جن کی نصیب میں دوزخ لکھی ہوتی ہے۔ الا عبادک منھم المخلصین یعنی بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں سے منتخب کئے گئے ہیں (یعنی نیک بندے) مراد یہ ہے کہ ایسے نیک لوگوں پر شیطان کی شیطانی کارگر نہ ہوگی

مختصر یہ کہ حق تعالیٰ نے جنت اور بہشتی لوگ اس لئے پیدا فرمائے کہ اس کا لطف و جمال ظاہر ہو اور اپنی رحمت کا تماشا دیکھے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بمطابق ارشاد ن رحمتی وسعت کل شئی یعنی میری رحمت ہر چیز سے زیادہ فراخ ہے۔ دوزخ اور دوزخی لوگ اس لئے پیدا فرمائے کہ اپنے قہر و جلال کو ظاہر فرمادے اور اس

کا تماشا بھی دیکھے ان عذابی هو العذاب الالیم "یعنی میرا عذاب انتہائی سخت ہے" یہ وہ باتیں ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور بندے کی بندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور خود حق تعالیٰ

یفعل مایشاء ویحکم مایرید

جو چاہتا ہے کر دیتا ہے اور اپنی مرضی سے حکم کرتا ہے

اسی طرح فرمایا ہے:۔

لایسئل عما یفعل وهم یسئلون

وہ (اللہ) جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا۔ اور دیگر لوگوں سے باز پرس کی جا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس مسئلے کے بارے میں بحث مباحثہ وغیرہ کی اجازت نہیں دی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے من تکلم فی شیئی من القدر سئل عنه یوم القیامته ومن لم یتکلم فیه لم یسئل عنهٗ" یعنی جس نے تقدیر کے بارے میں گفتگو کی تو قیامت کے روز اس سے باز پرس ہو گی اور جس نے کوئی گفتگو نہ کی (خاموش رہا) تو اس سے باز پرس نہ ہو گی

کرا زہرۂ آنکہ از بیم تو

کشاید زبان جز بہ تسلیم تو (۱)

---

(۱) یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ تقدیر کے بارے میں بات ہی نہ کی جائے اس لئے کہ اگر اس بارے میں کچھ بھی نہ کہا جائے تو پھر اس کے مسائل وغیرہ کیسے بیان ہوں گے۔ مراد یہ کہ جب اس میں شک یا شبہ پیدا ہو یا کوئی اور تردد ہو تو یہ جائز نہیں کہ شک قائم رہے یا تقدیر الٰہی کے بارے (باقی اگلے صفحے پر)

بہر حال تقدیر کے دو اقسام ہیں ایک مبرم جو قطعاً" نہیں بدلتی اور دوسری معلق جو بعض وجوہات کی بنا پر بدل جاتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے یمحو اللہ مایشاء و یثبت عندہ ام الکتاب یعنی اللہ موقوف یا مٹا دیتا ہے جو چاہتا ہے اور جس حکم کو چاہے قائم رکھ دیتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔

تقدیر کا مسئلہ اس قدر نازک اور دقیق ہے کہ بہت بڑے بڑے عالم اس میں سرگرداں ہیں۔ میری کیا ہستی کہ اس بارے میں کچھ کہوں۔ البتہ بعض گروہوں کے عقائد کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ معلومات پیش کر دوں گا۔ ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو سرے سے تقدیر ہی کو نہیں مانتا اور یہ گروہ اسلام سے باہر ہے۔ ایک اور گروہ جبریہ کا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسان بالکل مجبور ہے اور جو کرتا ہے۔ خدا کرتا ہے۔ ایک تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ ایسا نہیں بلکہ خدا نے یکبارگی سب کچھ کیا ہے یعنی اس نے ہر چیز کو اپنی اپنی استعداد کے مطابق کام کرنے کی قوت عطا کی ہے (چنانچہ ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگا ہوا ہے) اور خدا اب کچھ نہیں کرتا۔ کیونکہ ہر معاملہ اندازے کے مطابق چل رہا ہے اس زمانے میں اس عقیدے کے لوگ دہریت کے دہانے تک پہنچ گئے ہیں چونکہ یہ لوگ مادے کے کمالات پر اعتقاد رکھتے ہیں ۔۔۔

کچھ کہا جائے مثلاً" یہ کہنا جائز نہیں کہ "خدا نے ایسا کیوں کیا۔ یا یہ کہ خدا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا وغیرہ وغیرہ" فی الحقیقت اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے قدوسی عقل کی ضرورت ہوتی ہے اور جب تک ایک شخص یا سالک وحدۃ الوجود کو نہ سمجھ پائے اس وقت تک اس مسئلہ کو کماحقہ' نہیں سمجھ سکتا۔ وحدۃ الوجود مسئلہ قدر کو سمجھنے کے لئے بے حد ضروری ہے مطلب یہ کہ تقدیر الٰہی پر مکمل ایمان و ایقان اس وقت آجاتا ہے جب وحدۃ الوجود پر یقین آجائے (مولف)

اور کہتے ہیں کہ مادہ ہی سب کچھ کرتا ہے یہ گروہ یہ بھی یہی کہتا ہے کہ مادے کو خدا نے پیدا کیا ہے اور جو اثر مادے کے اندر موجود ہے اس کا خالق بھی خدا ہے۔ مگر یہ گروہ روح یا روحانیت کا قائل نہیں۔ اس لئے کہ ان کا بنیادی عقیدہ یہی ہے کہ خدا کچھ بھی نہیں کرتا۔ نہ رحم اور نہ قہر کرتا ہے۔ نہ وہ ناراض ہوتا ہے اور نہ خوش ہوتا ہے۔ اس گروہ میں بعض لوگ مکمل طور پر دہری یا نیچری ہیں۔یہ ایسے لوگ ہیں جو حق تعالیٰ کی برحق ہستی کو نہیں مانتے۔ انہی میں سے جو لوگ حق تعالیٰ کی ہستی کے قائل ہیں علماء ان کو قدریہ کہتے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ اگر تقدیر کے بارے میں جبریہ عقائد کو دیکھا جائے تو ان کے رو سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ اگر چور چوری کرے' یا کوئی زانی زنا کرے' کوئی قاتل قتل کرے اور یا کوئی شرک و بت پرستی کرے تو یہ سب مجبور ہیں کیونکہ ان پر یہ سب کچھ خدا خود کراتا ہے جس طرح قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ و لھم عذاب عظیم یعنی اللہ نے ان کے دلوں' کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے اور ان پر پردے ڈالے ہیں اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب یہ سب برے افعال ان سے مجبوراً" کراتا ہے تو پھر عذاب کیوں دیتا ہےاور دوزخ میں کیوں ڈالتا ہے اس سوال کا جواب جبریہ یہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی مرضی ہوتی ہے اور یہ ظلم نہیں ہے وہ فعال لما یرید ہے اور ظلم اس چیز کو کہتے ہیں جب پرایا مال کسی غلط جگہ یا کام میں صرف کیا جائے (یا حرام طور پر کام میں لایا جائے) مگرچونکہ یہ سب کچھ اسی (اللہ) کا ہے تو جو اس کی مرضی ہوتی ہے وہی کرتا ہے۔ یہاں پر میں (مولف) کہتا ہوں۔ کہ چلو مان لیتے ہیں کہ اس کی جو مرضی ہوتی ہے وہی کرتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ پھر خدا نے کیوں اور کس لئے اس جہان کو "عالم اسباب" بنا

دیا ہے (۱)۔ خصوصاً" انبیاء علیہم السلام کو کیوں بھیجا۔ اور نیز یہ کیوں ارشاد فرمایا کہ لیس للانسان الا ما سعٰی انسان کے لئے کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ اس کا جواب یہ لوگ یہ دیتے ہیں کہ قل کل من عند اللّٰہ یعنی کہدے اے نبی ﷺ کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ نیز یہ کہ انّ اللّٰہ خلقکم وما تعملون بہ تحقیق تم اور تمہارے اعمال کو خدا نے پیدا فرمایا ہے۔ اب اگر اس بحث کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ کس قدر نازک اور دقیق بحث ہے اور اس مسئلے کا حل کس قدر مشکل ہے اس لئے کہ قرآن حکیم میں دونوں قسم کے احکام موجود ہیں۔ ما اصاب من مصیبتہ الا باذن اللّٰہ (۲) یعنی تم پر مصیبت خدا کے حکم سے آتی ہے۔ مگر ارشاد ربانی یہ بھی ہے کہ وما اصابکم من مصیبتہ فبما کسبت ایدیکم (۳) اور جو مصیبت تم پہنچتی ہے تو وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے"۔ مراد یہ کہ جبریہ اور ہم اگر ایک سو سال بھی بحث و تمحیص کرتے رہیں جیسا کہ ہوتا بھی آیا ہے تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا

---

(۱) اس سے یہ ثابت ہوتا کہ انسان بے اختیار ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ (انسان) جو کچھ کرتا ہے۔ وہ خدا کرتا ہے اور اختیار بھی خدا نے دیا ہوتا ہے (مولف)

(۲) ما اصاب من مصیبتہ الا باذن اللّٰہ التغابن ایت نمبر ۱۱

(۳) سورہ شوریٰ ایت نمبر ۳۰ پارہ نمبر ۲۵ رکوع نمبر ۵

دوسرا سوال یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ کیا قرآن عظیم الشان میں تقدیر کے بارے میں اس قسم کی آیتوں کو متضاد مانا جائے۔ (نعوذ باللہ) متضاد یا مخالف تو اس لئے نہیں کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (۱) اور اگر یہ (قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت اختلاف (تفاوت) پاتے" لہٰذا میں (مولف) کہتا ہوں کہ قرآن مجید کی ہدایت اپنا اپنا موقعہ اور محل رکھتی ہے۔ جو لوگ اپنی خواہشات نفس کے پابند ہوتے ہیں اور اسباب ظاہری کے چکر میں گرفتار ہوتے ہیں اور ان پر دنیاوی خواہشات ایسے سوار ہوتے ہیں کہ یاد الٰہی سے غافل ہوتے ہیں جب ایسے لوگوں کی خواہش زور پکڑ لیتی ہے تو ان کی عقلیں مغلوب ہو جاتی ہیں اور اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے تدبیر بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں چنانچہ ان کے اعضاء وہی فعل شروع کر دیتے ہیں ایسے لوگ مجبوراً" وسیلہ مانیں گے۔ اور اگر یہ لوگ یہ کہدیں کہ بغیر کوشش اور عمل کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر ایسے لوگ زبانی طور پر یہ کہدیں کہ سب کچھ خدا کرتا ہے۔ مگر ان کے دل یہ بات قبول نہ کریں گے کیونکہ بغیر کوشش کے یہ لوگ کسی چیز کے حصول کے قائل نہیں ہوتے۔ اور یہی عام لوگ ہوتے ہیں اس لئے کہ لوگ چار اقسام پر مشتمل ہیں۔ (جن میں سے پہلی قسم یعنی عوام کا ذکر ہو چکا) دوسری قسم کے لوگوں کو "خاص" کہا جاتا ہے یہ مومنین ہوتے ہیں جو محض اسباب کے پابند نہیں ہوتے بلکہ تقدیر کو بھی مانتے ہیں (گویا یہ لوگ تقدیر اور سبب دونوں کو مانتے ہیں) دوسرے الفاظ میں بغیر وسیلے کے بھی کسی چیز کا حصول مانتے ہیں مگر اس کے ساتھ سبب کے منکر بھی نہیں ہوتے۔ تیسرے قسم کے لوگ خاص الخاص کہلاتے ہیں یہ

---

(۱) سورہ النساء ایت نمبر ۸۲

اولیاء اللہ رحمہم اللہ ہوتے ہیں یہی لوگ ہیں جو سب کچھ حق تعالیٰ عز اسمہ کی طرف سے جانتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ سبب کو بالکل نہیں مانتے (۱)۔ چوتھی قسم اخص کہلاتے ہیں اور یہ گروہ انبیاء ہے اور قرآن عظیم الشان کے احکام بھی چار اقسام پر مشتمل ہیں۔ اکثر علماء کو یہ خیال نہیں رہتا کہ کونسی ایت کس قسم کے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رحمہم اللہ وہ قدسی لوگ ہیں۔ جن کے قلب و روح کے آئینوں پر اللہ کی الوہیت نقش ہوتی ہے۔ یہ لوگ اللہ کی یاد میں اس قدر محو در محو ہوتے ہیں کہ ماسوی اللہ ان کو یاد ہی نہیں ہوتا۔

اس لئے کہ اگر ذات حق کے علاوہ ماسوئی اللہ بھی ان کے تصور میں آجائیں تو یہ مکمل طور پر فنا فے اللہ نہیں ہوتے نہ کہلائے جاسکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہی لوگ ہر معاملہ کو اللہ کی طرف سے جانتے ہیں۔

تقدیر کے متعلق جتنے اختلافات ہیں۔ ان کی وجہ یہ ہے کہ ہر گروہ اپنی علمی

---

(۱) غور فرمائیے جو لوگ "عوام" کے گروہ میں شامل ہوتے ہیں اور اسباب سے فارغ نہیں ہوتے مگر پھر بھی چلاتے ہیں کہ "سب کچھ اللہ کرتا ہے" کیا جھوٹے نہیں ہوتے۔ مصیبت یہ ہے کہ ایسے لوگ گلیوں سے لے کر مساجد تک عوام کو یہی تلقین کرتے ہیں کہ اسباب کو چھوڑو کیونکہ سب اللہ کرتا رہے گا۔ جبکہ وہ خود اور عام آدمی بھی سبب سے غافل نہیں ہوتا۔ مگر کہتے چلے جاتے ہیں کہ سب خدا کرتا ہے۔ حالانکہ یہ مقام اولیاء اللہ کا ہے اور وہ اپنے قول و فعل میں سچے اور مخلص ہوتے ہیں یعنی جب وہ کہہ دیتے ہیں کہ "خدا کرتا ہے" تو سبب کو یکسر چھوڑ دیتے ہیں اور کہنے کو تو یہ آسان ہے مگر فعلاً" بڑا مشکل ہے۔ اس کے لئے ریاضت و مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے اور عوام اس قسم کے مجاہدہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے (مترجم)

استعداد کے مطابق اس کی تعبیر و تشریح کرتا ہے اور اسی کو صحیح مانتا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ بنی نوع بشر میں حق تعالیٰ نے سب سے زیادہ علم و عقل انبیاء علیہم السلام کو دی ہوتی ہے لہٰذا انبیاء کی بات اور تقدیر کا عقیدہ سب سے اعلیٰ ہوتا ہے ان کے بعد اولیاء کا درجہ ہے اور ان کے بعد عوام ہیں۔

اب ہم اس گروہ کی بات کریں گے جس کا دعویٰ ہے کہ حق تعالیٰ کچھ بھی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس نے ایک بار سب کچھ پیدا کر کے معاملہ چھوڑ دیا ہے۔ ان کا ایک دعوی یہ بھی ہے کہ خدا نے ہر انسان میں (مختلف امور کی) استعداد رکھ دی ہے۔ جیسے دہریہ کہتے ہیں کہ سب کے سب انسان برابر ہیں مگر سوال یہ ہے کہ اگر خدا نے تمام انسانوں کو برابر پیدا کیا ہو تو بنی آدم میں بعض لوگ عقلمند اور بعض لوگ بے عقل کیوں ہوتے ہیں اگر دہریہ اس کا جواب یہ دے دیں کہ ایسے لوگوں کی بے عقلی کی وجہ علم کا فقدان یا مجلس کی تاثیر ہوتی ہے۔ تو جہاں تک مجلس کی تاثیر کا تعلق ہے تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ جو بری مجلس ایسے شخص پر اثر کرتی ہے تو کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایسے شخص کی قوت ارادی یا عقل کمزور ہوتی ہے ورنہ وہ کیوں ایسی بری مجلس کی تاثیر قبول کرتا۔ مراد یہ کہ اگر یہی شخص بھی دوسرے انسانوں کی طرح "مکمل انسان" ہوتا تو خراب مجلس کے اثر کو کیوں قبول کرتا۔

جہاں تک فقدان علم کا تعلق ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ اس شخص کو والدین نے بچپن میں تعلیم نہیں دی ہو گی تو اس وجہ سے وہ بے علم رہ گیا ہو گا اور اگر والدین نے تعلیم دی ہوتی تو بے عقل نہ رہتا۔ تو اس کا ایک سادہ سا جواب یہ ہے کہ فی الحقیقت اس کے والدین میں یہ استعداد ہی نہ تھی کہ اپنے بچے کو تعلیم سے آراستہ کریں یعنی اس کے والدین بچے کے لئے تعلیم ضروری نہیں سمجھتے تھے وہ خود ہی علم کی افادیت سے بے بہرہ تھے میرا مطلب یہ ہے کہ تمام بنی آدم استعداد کے ضمن

میں ایک برابر نہیں ہیں۔ یعنی (مذکورہ بالا) شخص کے والدین ہی میں استعداد کی کمی تھی
چنانچہ اپنے بچے کو تعلیم نہ دی۔ الغرض اگر استعداد کے لحاظ سے سارے بنی آدم برابر
ہوتے تو دنیا کا یہ سلسلہ رک جاتا۔ اس لئے کہ ہر ایک آدمی عقلمند ہوتا' ایک جیسا
دولتمند اور خوشحال ہوتا۔ کسی ایک کو بھی کسی دوسرے کی ضرورت نہ ہوتی اس لئے
کوئی بھی کسی دوسرے کا کوئی کام نہ کرتا۔ چنانچہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ
نے ہر شخص میں ایک اندازے کے مطابق استعداد رکھی ہے اور اگر ایک معترض
ہماری اس بات پر اعتراض کر دے کہ جب استعداد کا اندازہ مقرر ہے اور ایک شخص
میں یہ استعداد رکھ دی گئی ہے کہ وہ بری مجلس کی تاثیر کو قبول کرے گا تو ایسا شخص
اس دنیا کو چھوڑ کر بھاگ تو نہیں سکتا۔ چنانچہ برے لوگوں سے بہر حال اس کی ملاقات
ہوتی رہے گی اور ان سے ملتا رہے گا۔ اس لئے دنیا میں بحیثیت مجموعی سارے لوگ
نیک نہیں ہوں گے تو ایسا شخص بالضرور تاثیر بھی قبول کرے گا اور گناہ بھی کرے گا لہٰذا
اس بچارے کا قصور کیا ہو گا۔ کیونکہ خدا نے اسے خود ہی ایسا پیدا کیا ہو گا۔ البتہ اس
کے مقابلے میں کسی دوسرے شخص کو ایسا پیدا کیا ہو گا کہ اس پر کوئی بری مجلس کوئی اثر
نہ کرے گی کیونکہ اس میں نیکی کی استعداد ہو گی اور وہ ہمیشہ نیک ہی رہے گا تو اس
میں ایسے شخص کے کمال و جوانمردی کا کیا حصہ۔ اس لئے کہ اگر پہلے شخص میں خدا
نے نیکی اور بری مجلس سے متاثر نہ ہونے کی استعداد رکھ دی ہے (تو پہلا شخص قصور
وار اور دوسرا جوانمرد کیسے ہو گیا) اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالا نے بنی آدم بلکہ جملہ
موجودات کو ایک دوسرے کا محتاج پیدا فرمایا ہے۔ ایک شخص کا کام دوسرے کے وسیلے
سے ہوتا ہے اب اگر حق نے تمام بنی آدم کو ایک جیسی استعداد دی ہوتی تو دنیا کے
کاروبار کا سلسلہ کب سے بند ہوا ہوتا۔

(اس مقام پر کم عقل رکھنے والے شخص کے معاملہ میں ایک مثال سے واضح کرنا

چاہتا ہوں) مثلاً" ایک شخص اپنے لئے گھر تعمیر کروا رہا ہو تو ظاہر ہے کہ اس گھر میں دروازہ، روشندان، کھڑکی، غسل خانہ، باورچی خانہ اور ضروری طور پر بیت الخلاء بنانا بھی ضروری ہو گا۔ اس لئے کہ اس کے بغیر مکان یا گھر مکمل نہ ہو گا اب اگر کوئی شخص اعتراض کر دے کہ جس جگہ بیت الخلا بنانے کا ارادہ ہے تو اس میں اس جگہ کا کیا قصور ہے۔ کیونکہ جگہ تو کافی تھی کہیں اور بنا لیتا۔ مگر یہی اعتراض پھر بھی وارد ہو گا کہ اچھا تو اس جگہ کا کیا قصور۔ مراد یہ کہ سچی بات اور اچھی بات یہی ہے کہ بیت الخلا گھر کی ایک اہم ضرورت ہے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں اس لئے یہ مکان کے مالک کی مرضی پر منحصر ہے کہ جہاں موزوں سمجھتا ہو اسی جگہ بیت الخلا تعمیر کر دے وجہ یہ ہے کہ خواہ بیت الخلا کتنی گندی جگہ بھی ہو مگر مکان کی تکمیل کے لئے اس کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ یہ اعتراض قطعاً" ناقص ہے کہ مکان میں بیت الخلا کیوں بنایا جا رہا ہے (چنانچہ قابل غور بات یہ ہے) کہ حق تعالیٰ نے بلاشبہ برے لوگ پیدا کئے ہیں ان سے بھی اپنے مقام پر کام لیا جا رہا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی تخلیق کے بغیر یہ دنیا مکمل نہ ہوتی

ہر کسے را بہر کارے ساختند

میل اور اندر دلش انداختند

لہٰذا اس مسئلہ میں چون و چرا کی کوئی گنجائش نہیں۔ تقدیر کا ماننا فرض ہے اور یہ فکر نہ کرنا چاہیے کہ یہ کیا ہے یا کیسی ہے۔ اس سلسلے میں اوسط عقیدہ یہ ہے کہ ایک آدمی کو ایک خاص حد تک اپنے فعل کا مختار مانا جائے اور کلی طور پر مجبور نہ مانا جائے اسی طرح کلی طور پر مختار بھی نہ سمجھا جائے۔ حدیث مبارک الایمان بین الخوف والرجاء اس پر صادق آتی ہے جن لوگوں نے انسان کو کلی طور پر مختار سمجھ لیا ہے۔ انہوں نے سخت غلطی کی ہے اور یہی لوگ آخر کار دہریہ بن گئے ہیں اس

کے برعکس جو لوگ انسان کو مجبور محض سمجھتے ہیں وہ بھی زیادتی کرتے ہیں۔ البتہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طور پر اولیاء اللہ رحمہم اللہ انسان کو مجبور سمجھتے ہیں وہ جبریہ عقیدہ رکھنے والوں سے قطعاً مختلف ہے اولیاء اللہ کے عقیدہ تقدیر کو سمجھنے کے لئے علم "قال" کی نہیں بلکہ "حال" کی ضرورت ہوتی ہے۔

ختم

ورخ زیارت

وخت سحر ۴۵ منٹ۔ ۶ بجے

تاریخ ۱۶ جمادی اول ۱۴۱۶ ہجرت

بمطابق ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۹۵ء

کتاب تجلیات محمدیہ (پختو)

مولف حضرت امیر حمزہ بابا شنواری

چشتی' نظامی' نیازی

ترجمہ سید طاہر چشتی 'نظامی' نیازی

بزبان اردو

وصلی اللہ تعالٰی علٰی خیر خلقہ محمد و آلہ واصحابہ

اجمعین

تاریخ دہرائی:۔ جمعرات ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۹۵ء مطابق ۲۳ جمادی اول ۱۴۱۶ھ مطابق ۳ کاتک ۲۰۵۲ بکری

از قلم مولانا محمد روشن خان صاحب

معروضات

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

اما بعد۔ قال اللہ تعالیٰ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ جان لینا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے تمام انسان او رجنات عبادت کرنے کے لئے پیدا کئے ہیں اور عبادت سے مراد معرفت حق ہے کہ حق تعالیٰ کو پہچان لیں۔ چنانچہ ہر سالک کے لئے یہ ضروری ہے کہ راہ طریقت اختیار کرنے سے پہلے شریعت محمدی ﷺ کی پیروی اختیار کرے۔ بعض محققین کے نزدیک عبادت مقصود آخری ہے اور اگر عبادت کو مقصود آخری سمجھ لیا جائے تو اس کے ساتھ چند دیگر لوازمات بھی وابستہ ہیں تاکہ ان کے ذریعے حق تعالیٰ کی تعظیم کی جا سکے اور وہ پنج بنا ہیں۔ علاوہ ازیں جس چیز کے ذریعے لوگوں یا مخلوق خدا پر شفقت کی جاتی ہے وہ اخلاق حسنہ ہیں۔ جب یہ طے ہو گیا کہ انسان کو حق تعالیٰ نے اپنی عبادت اور اپنی مخلوق پر شفقت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے تو حق تعالیٰ نے اسی انسان کو اس کے نشوونما اور بقا کے لئے چند قوتیں عطا فرما دیں ان میں کھانے پینے کی قوتیں بھی شامل ہیں اور بعض مشترک ہیں جن کے ذریعے تعظیم الٰہی بھی کی جا سکتی ہے اور انسانی بدن کی بقا کے لئے بھی مفید ہیں۔ مثال کے طور پر تکلم حرکت یا سکون کو لے لیجے۔ چنانچہ تکلم کے ذریعے حق تعالیٰ کی تعظیم یوں ہوتی ہے کہ کلمہ توحید لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ورد زبان ہو۔ یہ عجیب و غریب کلمہ ہے اس کے کملات میں چند ایک یہ ہیں کہ اس میں وحدت الٰہی، طریقت اور شریعت تینوں بیک

وقت شامل ہیں وہ ایسے کہ لا الہ الا اللہ وحدت و حقیقت ہے اور محمد رسول اللہ شریعت ہے جبکہ اگر بہ نظر عمیق دیکھا جائے تو طریقت ہے۔ اس لئے اس کی تصدیق دل سے ہوتی ہے اسی لئے تو اس کو کلمہ طیبہ کہا جاتا ہے چنانچہ اسی کے طفیل انسان کا دل پاک ہوتا ہے اور کفر کا میل دور ہو جاتا ہے۔ ایسا ہے کہ عبادات کے نور سے ہی انسان گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسی کلمہ کو پنج بنا میں اولین حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے بھی کہ تاثیر کے لحاظ سے اس کلمہ کو دیگر ارکان کی بہ نسبت فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ قلبی تصدیق پر دلالت کرتا ہے اور یہی چیز اسلام کا بہترین جزو ہے اس کو بدیں وجہ کلمہ توحید کہتے ہیں کہ اس میں بذاتہٖ توحید کا اظہار موجود ہے۔ جبکہ توحید کی تعریف ہم یوں کر سکتے ہیں مثلاً" لب اور پھر لب کا لب اور

تیسرے درجے میں

قشر اور چوتھے درجے میں قشر کا قشر سمجھ لیجیے۔ فرض کیجیے اخروٹ میں چار چیزیں ہوتی ہیں سب سے پہلے کچا سبز چھلکا جسے قشر کہا جاتا ہے دوسرا ذرا سخت چھلکا ہوتا ہے جس کو قشر قشر کہتے ہیں تیسری چیز کو لب کہتے ہیں (یعنی مغز) اور چوتھی چیز روغن ہے جو مغز سے نکلتا ہے۔ جس چیز کو لب کہا جاتا ہے تو اس کو توحید کا پہلا مرتبہ سمجھ لیجیے ایسے لوگ زبانی طور پر لاالہ الااللہ کہتے ہیں مگر ان کا دل ایک منافق کی طرح اس کی حقیقت سے منکر ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ زبان سے اقرار اور دل سے حقیقی معنوں کے ساتھ تصدیق بھی کرتے ہیں اور یہ عوام الناس کا مرتبہ ہے۔ تیسرے مرتبے میں بواسطہ نور اور طریقہ کشف وحدت الہی کا تماشہ دیکھ لے یہ مرتبہ مقربین کو حاصل ہوتا ہے اس مقام پر دیکھتا تو کثرت ہی ہے مگر ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صادر سمجھتا ہے۔ توحید کا چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ سوائے ذات واحد کے اور کچھ بھی ملاحظہ نہیں کرتا۔ نہ غیر اور نہ خود اپنے آپ کو وجہ یہ ہے کہ اگر وہ خود کو دیکھے تو اپنے

نفس سے فانی نہ ہو گا اور اسی بنا پر مکمل موحد نہ ہو گا۔

لہٰذا موحد کی اولین قسم لسانی ہے اور یہی موحد اس کلمے کے طفیل مختلف قسم کی آفات مثلاً" قتل اور حبس (قید) سے بچا ہوا ہوتا ہے جیسے اخروٹ کا سبز چھلکا کچھ عرصے کے لئے اس کے مغز کو محفوظ رکھتا ہے۔ توحید کے دوسرے مرتبے کی مثال سخت چھلکے کی طرح ہے۔ اس لئے کہ وہ مغز کے لئے کافی عرصے تک حفاظت کرتا ہے اور تصدیق قلبی اور اقرار زبانی کے طفیل دنیاوی اور اخروی نجات حاصل کرتا ہے چنانچہ معلوم ہوا کہ اصلی نجات توحید پر موقوف ہے اور توحید لاالٰہ الااللہ کی برکت سے حاصل ہوتی ہے۔ توحید کا تیسرا مرتبہ اخروٹ کے مغز کی طرح ہے۔ یہ مغز تو فی نفسہ ایک اعلیٰ اور نفیس چیز ہے تاہم اس میں کچھ نہ کچھ فضلہ بھی ہوتا ہے اور یہ مرتبہ حق تعالیٰ کے اس ارشاد فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام کا متقاضی ہے۔ اسی مقام کو توحید عشقی اور توحید شوقی کہا جاتا ہے اور توکل بھی اسی توحید سے مکمل ہوتا ہے۔ توحید کے چوتھے درجے کی مثال روغن یا گھی کی طرح ہے اور یہی مقصود آخری ہے .... (۱)

اب اس میں جس قدر لذت اور ذوق محسوس ہوتا ہے وہ اسی کلمہ طیبہ ہی کی برکت سے پیدا ہوتا ہے۔ باقی اسی کلمہ کی تفصیل ہے۔ اور حق تعالیٰ نے چونکہ بندہ کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور جو ذوق اور شوق عبادت میں پیدا ہوتا ہے وہ بھی اسی کلمہ کی برکت ہوتی ہے اسی لئے جب مسلمان بالغ ہو جاتا ہے تو اسے کلمہ توحید سکھا دیا جاتا ہے۔

---

(۱) اس مقام پر نامکمل قسم کا جملہ ہے جو سمجھ میں نہیں آتا۔ چنانچہ اس کا ترجمہ نہیں کیا گیا (مترجم)

انسان میں ایک اور قوت کھڑا ہونے، جھکنے اور جھک کر گرنے کی بھی پائی جاتی ہے۔ بیٹھنے کا کمال تعظیم یہ ہے کہ تمام اعضاء کے ساتھ خدا کی تعظیم کی جاسکے اور اس کو صلوٰۃ کہتے ہیں اور صلوٰۃ میں قیام، رکوع اور سجود شامل ہیں۔ اور اگر میں نماز کے اخروی اور دنیائی فوائد بیان کرنا شروع کر دوں جو اس کے پڑھنے اور نہ پڑھنے سے مرتب ہوتے ہیں تو یہ بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ یہاں پر میرا مطلب صرف یہ بتلانہ کرنا ہے کہ ایک سالک کے لئے یہ بات انتہائی ضروری اور لابدی ہے کہ وہ نماز کی پابندی اختیار کرے اور بعد ازاں طریقت میں قدم رکھے۔ اس لئے کہ جب تک شریعت کے احکام بجا نہ لائے۔ تو ایسے شخص کے لئے طریقت اختیار کرنا بالکل مفید نہیں ہے۔ چنانچہ اب خیال رکھنا چاہیے کہ انسان کی فطرت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے ملے تو شیریں زبانی اور خوش اخلاقی سے ملے یا اگر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ملاقات کرے اور اسے سلام بھی کرے تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ملنے والا شخص بے حد خوش ہو گا۔ تو جس وقت زبان سے خدا کی ثنا بیان کی جائے جوارح سے عبادت کی جائے اور اسی طرح قلب سے اخلاص کا اظہار کیا جائے تو خدا خوش ہو گا۔ کیونکہ درحقیقت عبادت کا مقصود اعلیٰ بھی رضائے الٰہی ہے لیکن اگر مقصود معرفت ہو تو معرفت میں بھی اضافہ ہو گا۔ اور جتنا کوئی سالک خدا کو زیادہ طور پر جانے گا اسی قدر اسی سالک کا خوف الٰہی زیادہ ہو گا انما یخشی اللہ من عبادہ العلمٰؤ اور جب خدا سے زیادہ خوف محسوس کرے گا اتنی زیادہ عبادت کرے گا۔

سب سے پہلے وضوء ہے۔ جو طبی اصولوں سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ ہر انسان کو شب و روز میں سر اور رقبہ پر پانچ بار پانی ڈالے یا تر کرے اور اگر یہ نہ کرے تو ہو سکتا ہے کہ اس پر ایک پھوڑا نکل آئے جس کو "زنجیری پھوڑا" کہتے ہیں اس کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان ہر وقت پاک و صاف رہتا ہے اس کے بدن پر میل

پھیل نہیں ہوتا لہٰذا اس کے بدن سے بدبو بھی نہیں آتی لوگ رغبت کے ساتھ اس سے ملتے ہیں اور اس سے کوئی بھی نفرت نہیں کرتا۔ دوسری بات یہ کہ جب خدا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو پاک و صاف ہو کر کھڑا ہوتا ہے ان اللہ یحب المطھرین دن میں پانچ نمازیں فرض کی گئی ہیں ان نمازوں کی وجہ سے جسم انسانی کو بھی بہت سا فائدہ پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جسم کے لئے ورزش کرنا بھی ضروری ہوتا ہے لیکن اگر ایک شخص پانچ وقتوں کی نمازیں پڑھتا ہے تو اسے ورزش کی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑتی۔ مگر ایک سالک کے لئے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ پابند صلوٰۃ ہو اس لئے کہ

الصلوٰۃ معراج المومنین

(نماز مومنین کی معراج ہے)

احادیث میں وارد ہے اور اگر پہلے ہی سے ایک شخص پابند نماز نہ ہو اور طریقت اختیار کرے تو اسے معراج کیسے حاصل ہو گی۔ دوسری بات یہ کہ اگر وہ شریعت کا بار برداشت نہیں کر سکتا تو طریقت، معرفت اور حقیقت جن کو شریعت کی تفضیل کا درجہ حاصل ہے کیسے برداشت کر سکے گا۔ جو شخص نماز پڑھے گا تو وضو ضرور بنائے گا چنانچہ مناسب ہے کہ مسواک کرتا رہے۔ کیونکہ مسواک جسم کے لئے بے انتہا مفید ہے آج کل غیر مذہب کے لوگ اگر چہ اسلام کو نہیں مانتے مگر مسواک کو ضرور مانتے ہیں اور اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ ہندوؤں نے تو اسے فرض کی طرح اپنے اوپر لازم کیا ہوا ہے دراصل جو شخص بھی مسواک کا استعمال کرتا ہے دماغی بیماریوں سے محفوظ ہوتا ہے۔ اس کے منہ سے بدبو بھی نہیں آتی اور مسواک نہ کرنے سے جو قسم قسم کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں ان سے بھی محفوظ رہتا ہے

نزھتہ المجالس میں لکھا ہے کہ "ایک دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک

دریائے کے کنارے جا رہے تھے کہ اچانک ایک پرندے پر ان کی نظر پڑ گئی وہ پرندہ اپنے آپ کو گندے کیچڑ میں آلودہ کرتا اور اس کے بعد پانی میں غوطہ مار کر اپنے آپ کو پاک و صاف کر لیتا۔ پرندے نے یہ عمل پانچ مرتبہ دہرایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس سے تعجب ہوا۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور ان سے فرمایا کہ یہ پرندہ خدا نے امت محمدی ﷺ کی ایک مثال کے طور پر پیش فرمایا ہے یہ پرندہ امت محمدی ﷺ کی مثل ہے اور کیچڑ کا مطلب گناہیں ہیں اور پانی سے مراد نماز ہے یہ ایک اعلیٰ ترین فرض ہے اور آدمی کو گناہوں سے پاک کرتی ہے" اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن پاک میں نماز کی یہ تعریف بیان فرمائی ہے۔ ان الصلٰوۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر یعنی نماز' نمازی کو برے افعال سے بچاتی ہے۔ نماز فرض ہے اور کوئی سالک یا مومن اگر نماز پڑھتا ہو تو فرض ادا کرتا ہے اور یہ فرض ہے جس کے بارے میں پوچھ گچھ ہو گی مراد یہ کہ اگر کسی کی خواہش ہو کہ وہ تقویٰ دار ہو جائے تو لازم ہے کہ فرض نماز کے علاوہ نماز تہجد بھی ادا کرے فتھجد بہ نافلنہ لک" حضور اقدس ﷺ سے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے لئے نماز تہجد میں بڑا فائدہ ہے اور اس کے ساتھ ہی سمجھ لینا چاہیے کہ جو فعل حضور اقدس ﷺ نے مداومت کے ساتھ کیا ہے تو بلاشبہ وہی فعل انتہائی سودمند ہے۔ مطلب یہ کہ تہجد کے علاوہ اپنے اپنے مواقع پر بھی نفل نماز پڑھی جا سکتی ہے اور پڑھنی چاہیے خصوصاً" پرہیزگاروں کے لئے تو بہت ضروری ہے۔ حق تعالیٰ ایک حدیث قدسی میں ارشاد فرماتے ہیں عبدی لی یتقرب بالنوافل......الخ یعنی میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے جبکہ سلوک کا اصلی مطلب بھی یہی قرب الٰہی ہے۔ چنانچہ نوافل کی مداومت بے حد ضروری ہے اسی طرح اشراق کی نماز بھی پڑھنی چاہیے۔

اسلام کی ایک اور بنا زکوٰۃ ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی دولت یا کھانے پینے کا محتاج نہیں۔ یہ تو اس نے اپنی مخلوق کے لئے ایک نظام وضع کیا ہے۔ وہ ساری دنیا کو صاحبان دولت پیدا کرنے پر قادر تھا مگر پوشیدہ نہیں کہ ایسا کرنے سے دنیا کے نظام میں خلل پیدا ہوتا۔ چنانچہ بعض لوگوں کو غریب اور بعض کو امیر پیدا فرمایا۔ مگر غریبوں کے گزر اوقات کے لئے دولت مندوں کو زکوۃ دینے کا پابند بنا دیا جو ایک طرح سے خدائی ٹیکس ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ دولت مند لوگوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے کہ آیا یہ لوگ میرے حکم کے بموجب اپنی عزیز ترین دولت غربا کو دیتے ہیں یا نہیں دیتے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں پوری صراحت کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے کہ جو صاحب نصاب شخص زکوۃ ادا نہ کرے قیامت کے روز اسی نافرمان کو اسی کی دولت سے داغا جائے گا۔ اس لئے کہ زکوۃ نکالنا ایک استحبابی امر ہے۔ اور اکثر لوگ اپنی مرضی سے دیا کرتے تھے مگر جب مالوں سے زکوۃ نکالنا فرض کیا گیا تو اب یہ اپنے مالوں سے خدا کے خوف کی وجہ سے دیتے ہیں اور اب اس میں صلہ رحمی کا جذبہ بھی شامل ہو گیا ہے اور اسی طرح خدا کے حکم کی بجا آوری بھی۔ اس لئے زکوۃ ادا کرنے میں سستی یا غفلت سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اب اگر ایک آدمی اتنا خسیس ہو کہ ایک پیسہ بھی خدا کی راہ میں دینے کا روادار نہ ہو تو ایسا شخص اگر طریقت اختیار بھی کر لے تو اسے کیا حاصل ہو گا جبکہ طریقت میں تو ایثار اور کسر نفسی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

علاوہ ازیں رمضان میں روزے رکھنا بھی لازمی ہیں۔ کیونکہ روزہ رکھنا ایک ایسا فریضہ ہے جو انتہائی اعلیٰ اور نتیجہ خیز بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یا ایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔ تاکہ تم متقی بن جاؤ"۔ یعنی خدا روزوں کی علت

غائی یہ بیان کرتا ہے کہ "تم متقی ہو جاؤ" اور یہ حقیقت بھی ہے کہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو روزہ دار کو متقی بناتا ہے۔ دوسرے مذاہب میں تزکیہ نفس کے لئے اقسام و انواع کے احکام دیئے گئے ہیں مثلاً" عضو تناسل کو کاٹنا' زہریلی اشیاء کھانا' ہاتھ پاؤں کاٹ لینا اتنی کثیر تعداد میں مرچ کھانا کہ آدمی کا خون ہی خشک ہو جائے مگر اسلام نے ان تمام بکواسیات کی نفی فرمائی ہے اور تزکیہ نفس کے لئے ایسے احکام وضع فرمائے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں جن میں سے ایک روزہ بھی ہے چنانچہ مبارک ہیں وہ لوگ جو پابندی کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں بلکہ جو فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزے بھی رکھتے ہیں۔

انسان جو فرشتوں سے بہتر ہے تو اس کی وجہ عبادت وغیرہ نہیں بلکہ وہ محض نفسانی ایثار ہے اور پھر باوجود انتہائی نفسانی خواہش کے یہی انسان مجاہدہ سے اپنے نفس میں ملکوتی صفات پیدا کرتا ہے۔ اور اگر چہ اسلام دین فطرت ہے مگر پھر بھی دوسرے مذاہب شروع سے اس کے مخالف ہیں مگر اسلام کا کمال یہ ہے کہ بہت سے لوگ ہر روز اسلام قبول کر رہے ہیں۔ ڈاکٹروں کی تحقیق بھی یہی ہے کہ خطرناک سے خطرناک مرض کے لئے روزہ رکھنا مفید ہے اور یہ بات عام تجربے سے ثابت ہے کہ بہت سے امراض کا دفعیہ روزہ رکھنے سے ہو جاتا ہے اور صبر کرنے کی صفت بھی انسان میں پیدا ہو جاتی ہے اگر ایک مسلمان جو روزے کا پابند ہو اور ایک ہندو یا عیسائی کے ساتھ ایک کمرے میں قید کاٹ رہا ہو اور ان کو تین چار روز کھانا پینا نہ دیا جائے تو روزہ رکھنے کا عادی مسلمان بھوک اور پیاس سے نہ مرے گا جبکہ اس کے ہندو اور عیسائی ساتھی ہلاک ہو جائیں گے۔ مطلب یہ کہ نفس کی اصلاح کے لئے روزہ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

حج اسلام کا ایک اور رکن ہے یہ غنی لوگوں پر فرض کیا گیا ہے اس کے

طفیل اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے اکثر گناہ معاف فرماتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دلوں میں اسلام کی شوکت، عظمت، باہمی محبت اور مودت بھی پیدا ہوتی ہے۔

مراد یہ کہ طریقت کو اختیار کرنے سے قبل انتہائی ضروری ہے کہ شریعت غرا کی پوری پوری پابندی کی جائے اور اس کے بعد ایک کامل سے بیعت کی جائے۔

مولانا محمد روشن خان صاحب عفی عنہ

☆☆☆☆☆

عام لوگوں تک پہنچانے کے لئے

ایک چھوٹی سی کوشش

طالب دعا: ودان علی حمزوی

تجلیاتِ محمدیہ ﷺ
یعنی عقائد صوفیہ
سید طاہر بخاری چشتی نظامی نیازی